اٹھارھویں صدی میں

ہندستانی معاشرت

(میر کا عہد)

محمد عمر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

اٹھارھویں صدی میں

ہندستانی مَعاشرت

میر کا عہد

اٹھارھویں صدی میں

ہندستانی معاشرت

میر کا عہد

یعنی اٹھارھویں صدی میں ہندستانی سماج کی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور ادبی تاریخ، جس میں خصوصی طور پر میر تقی میر دہلوی کی حیات اور شاعری کا تحلیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

محمد عمر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

اشاعت اول	:	1973
قومی اردو کونسل کی پہلی اشاعت	:	2013
تعداد	:	550
قیمت	:	-/177روپے
سلسلہ مطبوعات	:	1695

Atharween Sadi mein Hindustani Moashrat

By: Mohammad Umar

ISBN :978-81-7587-901-0

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی110025، فون نمبر: 49539000، فیکس:49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر:26109746 فیکس:26108159

ای۔میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in

طابع: بھارت گرافکس، C-83، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز۔1، نئی دہلی110020

اس کتاب کی چھپائی میں70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اشرف المخلوقات ہے۔ تمام مخلوق میں وہ اشرف اس لیے ہے کہ اسے شعور ونطق عطا کیا گیا ہے۔ اس شعور کی بدولت اس نے اسرارِ کائنات سے آگہی حاصل کی تو نطق نے کائنات کے ان اسرار و رموز کو دوسروں پر ظاہر کیا۔ نطق نے جو اسرار و رموز بیان کیے اُنھیں سینہ بہ سینہ محفوظ رکھا گیا اور جب فنِ تحریر کا آغاز ہوا تو ان اسرار کو تحریر میں لاکر زیادہ لمبے عرصے کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔

پیغمبروں سے لے کر صوفی سنتوں اور اصلاحی نقطۂ نظر رکھنے والے شاعروں تک نے اس اشرف المخلوق یعنی انسان کے باطن کی تطہیر کا کام کیا ہے۔ ان مقدس پیغمبروں اور صوفی سنتوں کے اقوال سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے رہے۔ انسان کے باطن کی تہذیب وتطہیر کے ساتھ ساتھ اسے ظاہری علوم سے واقفیت کی ضرورت بھی محسوس ہوئی اور اس نے تاریخ، فلسفہ، سیاست، سائنس اقتصادیات اور سماجیات وغیرہ کا علم بھی حاصل کیا۔ ان دونوں طرح کے علوم یعنی باطنی وظاہری کو زیادہ عرصے تک محفوظ رکھنے اور دوسری نسلوں کے لیے مشعلِ راہ بنانے کے لیے انسان کو تحریر کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہی ضرورت فنِ تحریر کی ایجاد کا محرک بنی۔

انسانی ذہن چونکہ تغیر پسند اور مسلسل ترقی کا متلاشی رہا ہے لہٰذا فنِ تحریر کے بعد اس نے چھپائی کا فن ایجاد کیا اس فن نے الفاظ کے ذخیرے کو عرصۂ دراز تک کے لیے محفوظ کر دیا۔ الفاظ کے ذخیرے کا نام ہی کتاب ہے۔ کتابوں میں موجود یہ الفاظ کا ذخیرہ مختلف علوم وفنون سے متعلق ہے اور ان علوم کی ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کا بنیادی مقصد اُردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم وادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اُردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کو سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دل عزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی توجہ صرف کی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نے اب تک جو کتابیں بھی شائع کی ہیں، اُردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہلِ علم سے میری گزارش ہے کہ اگر اس کتاب میں اُنھیں کوئی غلطی نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلی اشاعت میں اسے دور کردیا جائے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
ڈائرکٹر

دیباچہ

میر تقی میر کی شاعرانہ عظمت ورفعت کے سامنے سب نے عقیدت سے سر جھکایا ہے، انھیں اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں ہی شہرت ومقبولیت نصیب ہوگئی تھی، وہ ایک مسلمہ روایت کے مطابق 1722-23 1135ھ میں پیدا ہوئے[1]۔ اور اُنھوں نے 1739 1152ھ کے بعد کسی وقت دہلی میں سکونت اختیار کی[2]۔ اور یہاں سید سعادت علی امروہوی کی ترغیب وتحریک سے ''زبان اردوے معلی شاہجہان آباد'' میں شعر گوئی کا آغاز کیا[3]۔ گویا خود میر نے اپنے قول کے مطابق 16-17 سال کی عمر میں ریختہ کہا- 1165ھ 1751-52 کے لگ بھگ جب وہ اپنا تذکرہ نکات الشعرا مرتب کر رہے تھے۔ اُن کی عمر 30 سال سے زیادہ

---

1 اس کا مدار نوادر الکملا (کتب خانہ راجا محمود آباد) کی ایک عبارت پر ہے، علاوہ بریں دیوان چہارم کے ایک مخطوطے میں محمد محسن نے لکھا ہے کہ میر نے نوے سال کی عمر میں 1225ھ 1810 میں انتقال کیا۔

تفصیل دیکھیے مقدمہ کلیات میر۔ مرتبہ عبدالباری آسی۔ طبع نول کشور۔

2 میر کی آپ بیتی:92۔

3 میر کی آپ بیتی:97 (سید سعادت علی کے تفصیلی حالات اور تقریباً کل معلوم اشعار کے لیے دہلی کالج میگزین میر نمبر (1963) صفحات 72 تا 78)

نہیں تھی[1]۔ خواجہ میر درد کے بیان میں انھوں نے درد کے والد بزرگوار خواجہ محمد ناصر عندلیب (متوفی 1172ھ/59-1758) سے اپنی ملاقات کا بھی حوالہ دیا ہے۔

"ایّامے کہ فقیر بخدمتِ آں بزرگوار شرف اندوزمی شد،
از زبانِ مبارکش می فرمود کہ میر محمد تقی تو میر مجلس خواہی شد
الحمدُ لِلّٰہ والمِنّۃ کہ حرفِ آخر سر سلسلۂ خدا پرستاں
مؤثر افتاد۔"[2]

گویا نکات الشعرا کی تالیف کے وقت تک خود میر کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ "میر مجلس" ہو چکے ہیں، اُن کا کلام گلی کوچوں میں پڑھا جاتا تھا، اور اُس کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ

میر دریا ہے، سُنے شعر زبانی اُس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اُس کی
خاطرِ بادیہ سے دیر میں جاوے گی کہیں
خاک مانند بگولے کے اُڑانی اُس کی
ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اُس کی!
مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیے لوگوں کو
شہرِ دلی میں ہے سب پاس نشانی اُس کی [3]

لیکن وہ ایک ایسے پُر آشوب دور میں پیدا ہوا کہ اُسے فراغِ خاطر کے ساتھ اپنے فن پر ریاض کرنے کے مواقع نہیں ملے۔ مغلیہ سلطنت کا دورِ زوال بہت ہی خلفشار، سیاسی ہیجان، ریشہ دوانیوں اور دسیسہ کاریوں کا عہد ہے۔ میر خود ان حالات کی بے رحمی کا شکار ہوا۔ اور اُسے حوادث کے سیلاب میں ایک بے سہارا تنکے کی طرح بہنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اُس نے اپنی سوانح

1۔ نکات الشعرا کی تالیف کے سلسلے میں مقدمہ دستور الفصاحت : 46-43 کے علاوہ میرا مضمون "معشوقِ چہل سالہ" اردو ادب علی گڑھ شمارہ 1967 بھی ملاحظہ ہوں۔

2۔ نکات الشعرا (ط) 54۔

3۔ کلیاتِ میر (طبع مجلس دلی 460)

عمری "ذکر میر" لکھی تو اپنے بارے میں ضروری اور بنیادی باتیں بھی نہیں بتائیں۔ تمام تر اپنے عہد کے سیاسی واقعات کی تاریخ بیان کر دی ہے۔ "ذکر میر" کو پڑھنے والا کوئی شخص بھی یہ محسوس کر سکتا ہے کہ اِس کتاب کا نام "ذکرِ عہدِ میر" ہونا چاہیے تھا۔ اس میں میر اپنے دادا پَر دادا کا نام نہیں بتاتا۔ اپنی ولادت، تعلیم، تربیت، سکونت، کسی بات کا ذکر وضاحت سے نہیں کرتا۔ والد کا نام بھی ایک موقع پر ضمناً بیان کر دیا ہے۔ وہ اگر کسی نواب کے دربار سے متوسل رہا تو اس کا منصبی کام کیا تھا۔ تنخواہ کتنی تھی۔ اس نے کب اور کہاں شادی کی۔ کتنا بڑا کنبہ تھا۔ حلقۂ احباب کیسا تھا۔ مکروہات و مرغوبات کیا کیا تھے۔ غرض کوئی ایسا سوال سوچ لیجیے جس کا جواب کسی کی سوانح عمری میں ڈھونڈا جاتا ہے۔ وہ جواب آپ کو "ذکرِ میر" میں نہیں ملے گا۔ اس کے برعکس آپ دیکھیں گے کہ میر نے بہت سرسری انداز میں اپنے اجداد کے حجاز سے گجرات اور وہاں سے آگرہ کو منتقل ہونے کا بیان کیا ہے۔ پھر اپنے باپ کی درویشی اور صوفیانہ طرزِ زندگی کا ذکر اور اُن کے مختصر حالات و ملفوظات ہیں۔ یہ ملفوظات تمام تر میر کے خلاق ذہن کی اختراع ہیں۔ اگر اُن کے باپ اوسط درجے کے درویش یا صوفی بھی ہوتے اور آگرہ میں اُن کی وہ مقبولیت ہوتی جو میر نے بتائی ہے تو اُن کا حال کہیں نہ کہیں ضرور ملتا۔ اس عہد کے تمام تاریخی اور نیم تاریخی ماخذ اُن کے وجود سے بے خبر ہیں۔

والد کے انتقال کے بعد میر نے نادر شاہی حملہ کا بیان کیا ہے، اور یہاں سے جو تاریخی وقائع کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو بس تاریخ ہی لکھتے چلے گئے ہیں۔ کہیں کہیں درمیان میں سرسری اور ضمنی طور پر اُن کی اپنی شخصیت بھی نمودار ہو جاتی ہے۔ مگر اس کی حیثیت کسی ڈرامے کے غیر اہم کردار کی ہے۔ پھر وہ وقائع سیاسی کے یلغار میں گم ہو جاتے ہیں۔

جس شاعر کے کلام میں ایسی خود پسندی اور اتنی انانیت ہو، وہ اپنی سوانح عمری لکھتے ہوئے خود کو اپنے ماحول میں اتنا گم کر دے، یہ عجب طرح کا تضاد ہے۔ لیکن آپ اس پر غور و تامل کریں تو معلوم ہوگا کہ میر اس ماحول کی پیداوار تھا جو بے یقینی، تشکیک، ناپائداری اور کس مپرسی سے عبارت تھا اس وقت حالات کی کشاکش شخصیتوں کو بگاڑ رہی تھی، بنا نہیں رہی تھی۔ میر کے ذہن و مزاج، شخصیت و افکار، اور افتادِ طبع کو سمجھنے کے لیے اس سے بہتر پیرایہ اور اس سے زیادہ بلیغ ترسیل ہو ہی نہیں سکتی تھی، کہ اس کے عہد کی سیاسی اور سماجی تاریخ کا آئینہ سامنے رکھ دیا جائے، تاریخ میں بڑی

وسعتیں پنہاں ہوتی ہیں۔ یہ صرف سیاسی وقائع ہی نہیں ہوتے اس میں پورا سماج، اس کی طرز بود و ماند، آدابِ خورد و نوش، بھیے، اور ہنگامے، رسوم، رواج، میلے، تہوار، عقائد، توہمات، سب کچھ شامل ہوتے ہیں، اس طرح اقتصادی عوامل، تہذیبی رشتے، ثقافتی محرکات اور ان سب کا فعل وانفعال اور تاثیر و تأثر مل کر تاریخ کو معنی خیز اور عبرت انگیز بناتا ہے۔ سیاسی حالات بھی اپنے سماجی پس منظر اور معاشرتی تعبیروں سے جدا ہو کر سمجھ میں نہیں آسکتے۔

جس طرح میر کی زندگی اس کے عہد کے سیاسی خلفشار اور سماجی مظاہر میں گم ہوگئی ہے، اُسی طرح یہ دَور اُس کی شاعری کا جزو لاینفک بن گیا ہے، خود میر کو بھی اس کا احساس ہوگیا ہے کہ وہ ''دلی اور دل'' کے مرثیے لکھتا ہے۔ یہ ''دلی'' دراصل اُس ہند ایرانی شائستگی کی علامت ہے جس کے آثار میر کی نگاہوں کے سامنے برباد ہو رہے تھے۔

پہلا تاریخی واقعہ، جس کا حوالہ ''ذکرِ میر'' میں آیا ہے[1] وہ نادر شاہ کا حملہ (مارچ 1739) ہے۔ اس میں میر کے اولین مربی نواب صمصام الدولہ کام آئے تھے۔ آخری واقعہ غلام قادر روہیلہ کا قلعہ معلّٰی پر قبضہ اور پھر مادھو جی سیندھیا کے ہاتھوں گرفتار ہونا ہے۔[2] (مارچ 1789) اس طرح ذکرِ میر میں پورے پچاس سال کی تاریخ کے اہم واقعات کا حوالہ ملتا ہے۔ اور عجیب اتفاق ہے، کہ سر جادو ناتھ سرکار کی مشہور کتاب ''زوالِ سلطنتِ مغلیہ'' (Fall of the Mughal Empire) کی پہلی جلد بھی مارچ 1739 سے شروع ہوتی ہے اور تیسری جلد کا اختتام مارچ 1789 کے وقائع پر ہوتا ہے۔ اس طرح سرکار کی کتاب کو ہم ''ذکرِ میر'' کی تاریخی تفسیر کہہ سکتے ہیں۔ ان دونوں کتابوں کا تقابلی مطالعہ اہم نتائج کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

میر جتنا عظیم شاعر ہے اتنا ہی بڑا بدنصیب بھی ہے۔ غالب اور اقبال کو بہترین دماغ اور قلم مل گئے، اور اُن کی تشریح و تعبیر کے اتنے پہلو سامنے آگئے کہ اب انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ میر ان دونوں سے کم پلہ نہیں ہے۔ مگر اُس کی زندگی اور فن پر ابھی تک کوئی سنجیدہ تحقیقی و تنقیدی کام نہیں ہوا۔ مولانا عبدالباری آسی کا مرتبہ کلیات میر اور اس کا مقدمہ، مولوی عبدالحق مرحوم کے مضامین

---

1. میر کی آپ بیتی: 92
2. میر کی آپ بیتی: 19

جوذکرِ میر اور نکات الشعرا (طبع ثانی) کے مقدموں کی صورت میں شامل ہیں۔ اثر لکھنوی کی مرتبہ ''مزامیر'' کا دیباچہ۔ یہ سب کام اچھے ہیں، مگر ابتدائی اور اشاراتی ہیں۔ تنقیدِ میر کے موضوع پر ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب ''تنقیدِ میر'' متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ اگرچہ میر کے طالب علموں کے لیے بہت نافع ہے۔ مگر کوئی مربوط اور منظم مطالعہ نہیں ہے۔

خواجہ احمد فاروقی کی کتاب ''میر تقی میر: حیات اور شاعری'' کے اوصاف حمیدہ سے بحث کرنے کا یہ مناسب محل نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ کتاب بھی میر کا حق ادا کرنے میں ناکام رہی ہے۔

تصانیف میر کے اچھے اور قابلِ استناد متون بھی موجود نہیں ہیں۔

1 نکات الشعرا: تین بار چھپ چکا ہے۔ لیکن ضروری حواشی اور متقاطع حوالوں کے ساتھ اس کے ایک انتقادی متن کی ضرورت ابھی باقی ہے۔

2 ذکرِ میر۔ صرف ایک بار 1929 میں چھپی تھی۔ 1957 میں اس کا اردو ترجمہ شائع ہوا، مگر فارسی متن تمام قلمی نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد تیار ہونا چاہیے تھا ابھی تک کسی نے اس کی اہمیت کا احساس نہیں کیا۔[1]

3 کلیاتِ میر۔ متعدد بار چھپ چکی ہے، نسخہ فورٹ ولیم تو میر کی زندگی میں مرتب ہوا ہے اور ان کی وفات سے چھ ماہ بعد شائع ہوا۔ یہ بھی جدید اصول ترتیب کے مطابق نہیں ہے۔ اس نسخے کو علمی مجلس دہلی نے 1968 میں چھاپا ہے، مگر اس کی دوسری جلد ابھی باقی ہے ایسا کوئی نسخہ ابھی تک مرتب نہیں ہوا، جس میں دستیاب قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہو۔

4 فیضِ میر دو بار چھپی ہے، ساتھ ہی ترجمہ بھی ہے، اسے پروفیسر مسعود حسن رضوی نے مرتب کیا ہے اور تصانیفِ میر میں یہی ایک ایسا رسالہ ہے، جو سلیقے سے چھپ گیا ہے۔

5 دیوانِ فارسی۔ ابھی تک نہیں چھپا۔

6 دریائے عشق (نثر): اس کا متن دہلی کالج میگزین: میر نمبر میں شامل ہے متون کی انتقادی ترتیب و تدوین کے بعد دوسرا مرحلہ اُن کی تاریخی بازیافت کا ہے۔ یعنی یہ طے کیا

---

[1] اب میر کی آپ بیتی کے دوسرے ایڈیشن میں یہ فارسی متن بھی نئی ترتیب کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔

جائے کہ کون سا دیوان کب مرتب ہوا اس سے فنکار کے شعوری ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جزوی طور پر کلام میر کی تاریخی ترتیب کا کام تذکروں کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ''نکات الشعرا میں میر نے اپنی جن غزلوں کو انتخاب کیا ہے، اُن کے بارے میں یہ طے ہو جاتا ہے کہ وہ غزلیں 1165 ھ 52-1751 تک کہی جا چکی تھیں۔ اس طرح جو کلام ''مخزنِ نکات'' ''چمنستانِ شعرا'' اور ''تذکرہ میر حسن'' یا ''طبقات الشعرا'' (قدرت اللہ شوق) میں ملتا ہے۔ وہ سب میر کے سفر لکھنؤ سے پہلے کا قرار پاتا ہے۔ اُن کا یہ سفر 1196 ھ/82-1781 میں ہوا ہے۔ کلام میر کی تاریخی ترتیب کے موضوع پر ابھی تک کسی نے قلم اُٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ حالانکہ یہ مطالعہ اہم نتائج تک ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔

میر کا کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی قدیم بیاضوں اور تذکروں میں محفوظ ہوگا، اُسے تلاش کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

پھر میر کی ایک جامع فرہنگ اردو اور فارسی کی تیار ہونا باقی ہے۔ اس سے اُن کے کلام کا لسانیاتی مطالعہ کرنے میں رہنمائی حاصل ہوگی۔ میر سے پہلے کون سے الفاظ اور محاورات استعمال ہوئے ہیں، اور کن الفاظ کو خود میر نے چلن دیا ہے۔ کون سے محاورات اُس نے فارسی سے ترجمہ کیے ہیں، اور زبان کے بنیادی ڈھانچے میں کون سی تبدیلیاں کی ہیں جن کی وجہ سے اُس کی زبان اور اُسلوب معاصرین و متقدمین سے ممتاز ہو گیا ہے۔ اس کے اسلوبِ نظم و نثر کا فنی اور تکنیکی مطالعہ و تجزیہ بھی ہنوز باقی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بعض مضامین میں اس طرح کی کوشش ملتی ہے۔ مگر یہ زیادہ سائنٹفک سطح پر ہونا چاہیے۔

میر کی غزل، قصیدہ، مثنوی اور دوسری اصنافِ سخن کا علاحدہ علاحدہ انتقادی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اُن کی فارسی نثر و نظم پر ابھی تک بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ ''ذکر میر'' سوانح عمری کی تعریف پر کہاں تک پوری اُترتی ہے اور معاصر تاریخ کے ماخذ کی حیثیت سے کتنی قابل اعتماد ہے، یہ دونوں موضوع ابھی تک تشنہ ہیں۔

سب سے آخر میں میر کے افکار کا تجزیہ ہے۔ اُن کے مذہبی عقائد، صوفیانہ افکار، اخلاقی تصورات، فلسفیانہ نظریات، معاشرتی اور تہذیبی اقدار، کس حد تک روایاتی ہیں اور کہاں اُن کی جڑیں گہرے علم و عرفان کی زمین میں پیوست ہیں۔ یہ سب جانے بغیر ہم میر کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔ جب ان سب پہلوؤں پر گفتگو ہو جائے گی تب میر کے اصلی خد و خال اُجاگر ہوں گے اور اُسے کسی ابہام کے بغیر سمجھنا ممکن ہوگا۔

میر پر جو کام ہونا باقی ہیں اُنھیں ہم پہلے تنقید اور تحقیق کے دو بڑے خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ تحقیق میر کے دو اہم پہلو ہیں: پہلا تو ذاتی اور سوانحی ہے۔ اس میں ابھی تک اُن کے خاندان کا مسئلہ ہی طے نہیں ہو سکا ہے انھوں نے ذکر میر کے آغاز ہی میں لکھا ہے۔

"میرے آبا و اجداد ملکِ حجاز کو خیر باد کہہ کر ہندستان میں پہلے پہل دکنی ساحلوں کی طرف آئے تھے اور وہاں سے یہ پورا قبیلہ احمد آباد (گجرات) میں آ کر بس گیا پھر اُن میں سے کچھ تو مستقل طور پر وہیں رہ پڑے اور کچھ نے آگے بڑھ کر تلاش روزگار کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ میرے جدّ اعلیٰ دار الخلافہ (اکبر آباد) گئے۔[1]

میر نے شیخ عبدالعزیز عزت اور اُن کے فرزند سے "قرابت قریبہ" کا اعتراف کیا ہے[2] اور عزت کے احوال میں لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے لکھا ہے۔

"نسبش بہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما می رسد، یکے از اجداد
اُو بتصاریف ایام از مکہ معظمہ بہ ہند اُفتاد، بعضے آبائے اُو
در قصبۂ ذہبائی[3] از توابعِ اکبر آباد توطن گرفت[4]"

عزت کا شجرۂ خاندان اس طرح بنتا ہے۔

---

1. میر کی آپ بیتی: 31

2. میر کی آپ بیتی: 39 (یہاں ناقل کی غلطی سے قمر الدین خاں نام چھپا ہے۔ یہی فارسی متن میں بھی ہے مگر صحیح فخر الدین خاں ہے اور میر کی آپ بیتی: 96 میں بھی اسی طرح آیا ہے۔ نیز تاریخ محمدی: 75)

3. یہ قصبہ ذہائی ضلع بلند شہر میں ہے اور آگرہ سے قریب ہے۔

4. تین تذکرے: 446

ملا عبدالرشید اکبر آبادی
(ف 1088ھ)

شیخ عطاء اللہ (ف 1118ھ) — شیخ عبدالعزیز عزّت
(ف 1089)

سعدالدین خاں (ف 1118ھ) — فخرالدین خاں[1] (ف 1143ھ)

قطب الدین خاں[2] — حفیظ الدین خاں[3]
مخاطب بہ سعدالدین خاں

اگر یہ صحیح ہے کہ عزت اور میر تقی میر کے اجداد ایک ہی قبیلے کے تھے تو میر بھی شیخ صدیقی ہوئے وہ اپنے اور اپنے برادر خورد محمد رضی کے ناموں کے ساتھ التزاماً لفظ ''میر'' لکھتے ہیں۔ اپنے برادر علاتی حافظ محمد حسن یا اُن کے بیٹے محمد محسن کو میر نہیں کہتے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ محمد علی نے دوسری شادی کسی شیعہ خاتون سے کی ہوگی، جو سیادت کا دعویٰ بھی رکھتی ہوں گی۔ اس بارے میں یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ توران میں سلسلۂ نسب ماں کی طرف بھی ملایا جاتا ہے اور سیادت کی حد تک ایرانیوں نے بھی اس رسم کو قبول کر لیا تھا۔ ایسے لوگوں کو ''دنبالہ سادات'' کہا جاتا ہے۔ اورنگ زیب کی وفات (1707) کے بعد شیعت کے فروغ کا ایک دور آیا تھا۔ خود اورنگ زیب کے اس جانشین نے شیعی عقائد اختیار کر لیے تھے اور ماں کی طرف سے سیّد ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا تھا۔ قصہ یہ ہے

---

1. ان کا حوالہ میر کی آپ بیتی میں دو جگہ آیا ہے۔ ص 39 (یہاں نام غلطی سے قمرالدین چھپا ہے) ص 96: انھوں نے ستر سال کی عمر میں انتقال کیا (تاریخ محمدی: 75)

2. ذکر میر کے نسخۂ لاہور کے خاتمے کی عبارت (میر کی آپ بیتی: 19) میں ان کا حوالہ ہے۔

میر کی آپ بیتی 112،130

کہ بہادر شاہ اول کی ماں ایک کشمیری راجا (راجوری) کی لڑکی تھی، جو اورنگ زیب کو نذر کی گئی تھی۔ اُس کے بارے میں یہ افسانہ گڑھا گیا کہ حضرت غوث الاعظم کی اولاد میں سے ایک نہایت مقدس بزرگ ''سید شاہ میر'' کشمیر میں وارد ہوئے تھے اور راجا اُن کا اس حد تک معتقد ہو گیا تھا کہ اپنی ایک بیٹی اُن سے بیاہ دی تھی۔ جس کے بطن سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ پھر سید شاہ میر، حج کرنے کی غرض سے روانہ ہو گئے اور کبھی واپس نہیں آئے۔ ان بچوں نے اپنے نانا کے پاس پرورش پائی اور جب شاہ جہاں نے راجا سے خراج طلب کیا تو اس نے یہی لڑکی بادشاہ کو ''ڈولے'' کی رسم کے طور پر بھیج دی۔ جو شاہ زادہ اورنگ زیب سے بیاہ دی گئی اس کا نام ''کلمۃ النسا بیگم'' تھا۔ مگر نواب بائی بیگم کہلاتی تھی۔ اس کے بطن سے بہادر شاہ اول پیدا ہوا۔ لہٰذا اس نے بھی سید ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ نواب بائی کے نسب کا یہ افسانہ شاہ جہاں کے عہد میں نہیں گڑھا گیا تھا بلکہ اورنگ زیب کے زمانۂ اقتدار میں بنایا گیا اور اسی لیے سلسلۂ نسب بھی حضرت غوث الاعظم سے ملایا۔ زمانۂ مابعد میں اگر یہ بات شائع کی جاتی تو ظاہر ہے کہ یہ نسب کہیں اور جا کر ملتا۔

میرا خیال ہے کہ اتنی کم سنی میں شیعی عقائد کی طرف میر کا مائل ہونا تعلیم یا مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہو سکتا، بلکہ انھوں نے یہ اثر اپنی ماں سے قبول کیا اور مادری سلسلہ سے ہی وہ اپنے تئیں سید سمجھتے رہے۔ انھوں نے اپنے باپ سے جو کلمات منسوب کیے ہیں غالباً ان میں سے دو چار فیصد کا انتساب بھی محمد علی عرف علی متقی سے درست نہیں ہے۔ لیکن یہ ملفوظات یا واقعات و اشارات، بے مقصد نہیں ہیں۔ ان کے لکھنے سے میر کا منشا کچھ اور باتوں کا ثابت کرنا ہے جنھیں ان واقعات کے بین السطور میں پڑھا جا سکتا ہے مثلاً وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ میرے باپ بھی شیعی عقائد رکھتے تھے اس کے ثبوت میں ایک واقعہ تو انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ''ایک دن (میر کے والد نے) اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے آپ کی خدمت میں رہ کر اپنے عقائد جیسا کچھ درست کر لیے ہیں وہ آپ پر واضح ہی ہے۔ لیکن حاکم شام کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔؟ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''کسی دن بتائیں گے''

مدت بعد ایک صبح، منہ اندھیرے، محرم خان، خواجہ سرائے شاہ جہانی، کی مسجد میں تشریف لائے۔ میرے والد کے ملازم ان کے وضو کے لیے پانی لانے کو دوڑے۔ مگر والد صاحب خود

اٹھے۔لوٹا لیا۔اور شاہ صاحب کو وضو کرانے لگے۔اس وقت شاہ صاحب نے فرمایا: ''میاں علی متقی۔تمام عمر اس کا نام میری زبان پر نہیں آیا۔اس کے لیے میں خدا کا شکر کس طرح ادا کروں''۔ میرے والد کہتے تھے''۔خدا کا شکر ہے کہ اس کے بعد میں نے بھی کبھی اس کا نام نہیں لیا[1] ''

یہاں حاکم شام سے حضرت امیر معاویہ (ف-60ھ/680-679) مراد ہیں۔میر نے غالباً اپنے باپ کے تفصیلی عقائد اختیار کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی میں خلفائے ثلاثہ پر حضرت علی کی فضیلت تو مانتا ہی ہوں۔مگر حضرت معاویہ کے باب میں کیا عقیدہ رکھوں؟ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ مرشد نے اس بات کا جواب دینے کے لیے مہلت کیوں طلب کی تھی۔محرم خاں، خواجہ سرا جس کی مسجد کا حوالہ ہے، خواجہ وقار مخاطب بہ محرم خاں (ف-1095ھ) ہے، یہ غالباً شیعی عقیدہ رکھتا تھا۔

خواجہ علی اکبر مودودی (ف 1209ھ/95-1794) کے ملفوظات ''لطائف اکبری'' میں بھی ایک ایسی ہی عبارت ملتی ہے۔

> ایک روز الہٰ آباد میں ایک شخص فقیر کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ پسر حاکمِ شام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے کہا کہ اسے جو بھی آپ کہیں اُس سے بھی بدتر ہے۔مگر میں کچھ نہیں کہتا۔مجھے اس سے کیا سروکار۔؟ میں اُس کا نام اپنی زبان پر کیوں لاؤں۔؟ مجھے اُس کا نام لینے سے کراہیت آتی ہے[2]

ان ملفوظات کے جامع خواجہ حسن مودودی کھاری ہیں[3] جو میر کے ہم عصر بھی ہیں۔ہو سکتا ہے کہ میر نے یہ واقعہ اُن سے سن رکھا ہو۔

اپنے باپ کی شیعیت کے اثبات میں دوسرا اشارہ انھوں نے ''رؤیت باری کا مسئلہ چھیڑ کر کیا

---

1. میر کی آپ بیتی: 33-32

2. لطائف اکبری ہنوز غیر مطبوعہ ہے اس کی تلخیص مفتی محمد رضا انصاری نے رسالہ بُرہان (دہلی) میں شائع کرائی تھی۔مذکورہ بالا اقتباس کے لیے دیکھیے بُرہان جلد 67 شمارہ1 (جولائی 1971) ص51

3. خواجہ حسن مودودی کے لیے: انیس الاحبا (قلمی: علی گڑھ) طبقات سخن (قلمی) ورق 17 الف سفینہ ہندی 63-62 مسرت افزا: 57 مخمخانہ جاوید 2: 428۔رسالہ صحیفہ (لاہور) شمار 1967/39

ہے۔شیعی عقیدہ یہ ہے کہ ''لا تُدرِکُہُ العُیُونُ بِمُشَاھِدَۃِ العیانِ ولکِنْ تدرکہ القلوبُ بحقائِقِ الایمان'' (خدا کو یہ ظاہری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں بلکہ اس کا دیدار حقائق ایمان کے ذریعہ سے قلب کو ہو سکتا ہے۔)

میر نے لکھا ہے کہ ایک دن اسد اللہ نامی درویش نے اُن کے باپ سے سوال کیا کہ مجھے خدا کی رؤیت کے مسئلہ میں کچھ تردد ہے۔درویشوں کی دو جماعتیں ہیں ایک کا خیال ہے کہ ایک دن ہم اُس غیرتِ ماہ (خدا) کو بدرِ کامل کی طرح (عیان و برملا) دیکھیں گے۔اور دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ اس آفتاب کا دیکھنا انسانی بصیرت کے امکان میں نہیں ہے''۔والد نے فرمایا کہ ہم فقیروں کو کچھ فکر نہیں۔ جب یہ طے شدہ ہے کہ وہ عینِ کائنات ہے۔تو جدھر نظر ڈالتے ہیں وہ دکھائی دیتا ہے۔اور جس کسی میں دیکھتے ہیں جلوہ دکھاتا ہے۔وہ معنی ہے اور ہر صورت میں جلوہ گر ہے۔نظر ہو تو اس کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔''

رؤیت باری کا مسئلہ بحث و تمحیص کے گرما گرم مسائل میں سے ایک رہا ہے۔اِسے معتزلہ نے اتنی ہوا دی کہ یہ تسنّن اور اعتزال کے درمیان حدّ فاصل بن گیا۔معتزلہ کہتے ہیں کہ رویت کے لیے جسمانیت، جہت، اور لَون وغیرہ لازم ہیں۔اور خدا اِن سب سے مُنزّہ ہے۔پھر قرآن میں ہے۔

''لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَار''

اسی طرح حضرت موسیٰ نے خدا سے رویت کا مطالبہ کیا تو ارشاد ہوا کہ ''لَنْ تَرَانی'' اُن کے مخالفین یعنی اَشاعرہ کہتے تھے کہ قرآن میں نصِ صریح موجود ہے۔''وجوہ یومئذٍ ناضرۃ الیٰ رَبِّهَا ناظرۃ۔''

اور حضرت موسیٰ سے خدا نے یہی تو کہا تھا کہ ''تم مجھے نہیں دیکھ سکتے'' یہ کب کہا تھا کہ ''میں دیکھا نہیں جا سکتا[1] ''یعنی حضرت موسیٰ نے بھی رویت باری کو محال نہیں سمجھا تھا ورنہ وہ خدا سے ایک امر محال کے لیے مطالبہ نہ کرتے وہ بہر حال معتزلہ سے زیادہ علم رکھتے تھے کہ کیا ممکن ہے اور کیا محال ہے[2]

---

1. الاشعری: مقالات الاسلامیین

2. تفسیر الکشاف 198/1

جن احادیث سے رویتِ باری کا اثبات ہوتا تھا اُن سے معتزلہ منکر ہو گئے۔ اور جہاں حدیث کی صحت میں شک کرنے کی گنجائش کم نظر آئی وہاں کہتے تھے کہ حدیث ناسخِ قرآن نہیں ہو سکتی۔ اشاعرہ کا کہنا تھا کہ خدا ''موجود'' ہے اور ہر موجود کو دیکھنا ممکن ہے باقی رویت کی قیود جہت، زمان مکان،، لون وغیرہ تو اس عالم کی شرائط ہیں۔ یہ خدا ہی جانتا ہے کہ آخرت میں رویت کس شان کی ہوگی [1]

اصل عقیدہ رویت باری کے مستحیل ہونے کا درحقیقت معتزلہ کا ہی ہے۔ اور یہ اُن کے نظریۂ توحید کی ایک فروعی بحث کے طور پر سامنے آیا تھا مگر اس پر اتنی جرح و تعدیل ہوئی کہ اسے ''اہل سنت والجماعت'' ہونے کی نشانی سمجھ لیا گیا اسی وجہ سے شیعوں نے بھی مسلکِ معتزلہ ہی اختیار کر لیا۔

میر نے اپنے والد کا جو نظریۂ توحید پیش کیا ہے وہ صرف رویت کی حد تک معتزلہ سے مطابقت رکھتا ہے، لیکن یہاں بھی میر نے ''جواب گریز'' دینے کی کوشش کی ہے۔ فلسفۂ وحدت الوجود کا معتزلہ یا امامیہ فرقہ سے کچھ سروکار نہیں۔ یہ مسلک اشاعرہ کا ہے۔ میر کے باپ رویت کے مسئلہ میں تو معتزلی ہیں۔ نظریۂ توحید میں اشعری اور دوسرے اُمور میں شیعہ۔ یہ ایسا تضاد ہے جو میر کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ میر خود اس مسئلہ کو پورے فلسفیانہ سیاق و سباق میں سمجھے ہوئے نہیں ہیں۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ مسئلہ رویت حضرات اہلِ سنت اور امامیہ کے درمیان وجہِ امتیاز ہے۔ لہٰذا انھوں نے ایسا مکالمہ تیار کیا جسے دونوں طرح سے معنی پہنائے جا سکیں۔

یہاں ایک بات پر اور توجہ کر لیجیے۔ میر کے والد بزرگوار سے یہ سوال کس نے کیا ہے۔؟ یہ ایک درویش ہے جس کا نام اسد اللہ ہے یہ میر کے والد کا پیر بھائی ہے۔ رہنے والا ''کبود جامہ'' کا ہے۔ پیشہ ''سیرابہ پز'' [2] یعنی نہاری پکا کر بیچنے والا۔ میر کے والد نے اپنے پیر سے کہا تھا کہ کوئی صورت ایسی ہو کہ مجھے اپنی موت کا علم پہلے سے ہو جائے۔ پیر نے کہا کہ جب تم اس ''سیرابہ پز کبود جامہ'' کو دیکھو تو سمجھ لینا کہ سالِ آئندہ تک زندہ نہ رہو گے۔ 1145ھ 1732-1733 میں کسی وقت اسد اللہ نے خواب میں اپنے پیر سے ہدایت حاصل کی کہ تم فوراً آگرہ کی طرف روانہ

---

1. ظہر الاسلام 82/4
2. میر کی آپ بیتی :76

ہو جاؤ میرے اور علی متقی کے درمیان ایک اشارہ ہے جو وہ تمھارے پہونچنے سے سمجھ جائیں گے۔

اسداللہ بہت معمولی حیثیت کا آدمی ہے۔ ہندستان میں جس طرح صبح کو نہاری پکا کر بیچنے کا رواج ہے۔ اسی طرح ایران میں "سیرابہ" پکاتے ہیں۔ یہ غالباً سر اور آب کا مرکب ہے خانِ آرزو نے اہلِ زبان سے تحقیق کر کے اس کے معنیٰ لکھے ہیں اس میں "کلہ و پارچہ" (یعنی سری) ہوتی تھی میر نے ایک لفظ چراغ ہدایت میں نیا دیکھا جو عام لغات میں نہیں ملتا اور جس کی تشریح آرزو نے محض اہلِ زبان سے ذاتی تحقیق کرنے کی بعد کی ہے تو انھوں نے یہ لفظ استعمال کرنے کے شوق میں شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی سے اسداللہ کو بیعت کرایا اب یہ ضروری تھا کہ اس کا ایران سے کچھ رشتہ پیدا کیا جائے تا کہ "سیرابہ پز" کہلانے کا جواز پیدا ہو۔ لہٰذا اُسے "کبود جامہ" کا باشندہ بتایا گیا۔ اس میں درویشی سے لفظی مناسبت بھی اتفاق سے موجود ہے۔ یہ ایران میں ایک چھوٹا سا گاوں ہے۔ عموماً دیہات میں نہاری فروش کی دوکان نہیں ہوتی۔ خیر یہ مان لیا کہ اس کی دوکان تھی۔ خود میر نے لکھا ہے کہ کساد بازاری تھی اور تجارت بالکل ٹھپ پڑی تھی۔[1] اس عالم میں شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی آگرہ سے کبود جامہ تک اسے خواب میں یہ حکم دینے پہنچ گئے کہ تمھیں آگرہ جانا ہے۔ یہی بشارت وہ خود آگرہ میں علی متقی کو بھی دے سکتے تھے۔ اتنا سارا مزبتانے کے لیے ایک غریب نہاری فروش کو تقریباً ڈھائی ہزار میل پیدل چلا کر آگرہ بھجوانے کی کیا ضرورت تھی۔؟

یہ نہاری فروش اسداللہ، اتنی علمیت کا آدمی بھی ہے کہ رویت باری جیسے دقیق مسائل پر علی متقی سے گفتگو کرتا ہے۔ آج بھی اچھے خاصے تعلیم یافتہ حضرات اس مسئلے پر آسانی سے بحث نہیں کر سکتے۔ میر نے یہ قطعاً نہ سوچا کہ وہ کون سا مکالمہ کس کردار کی زبان سے ادا کرا رہے ہیں۔

اسی طرح کی ایک مثال وہ ہے کہ علی متقی ایک دن رنج کے عالم میں سید امان اللہ کی موت کا حلوہ تقسیم کر رہے تھے کہ ایک "شکری رنگ" خوش وضع نوجوان جس کا نام احمد بیگ تھا، آیا اور شکر انگور کے کچھ دانے ہاتھ پر رکھ کر نذر گزارنے لگا اور کہا کہ ابھی ولایت سے آرہا ہوں اور حج کے لیے جانے کا ارادہ ہے۔ اس شہر میں آیا تو آپ کی درویشی کا آوازہ سنا۔ مشتاقِ دیدار ہو کر خدمتِ سامی میں حاضر ہوا ہوں۔

---

1. میر کی آپ بیتی: 77

یہ واقعہ بھی شاید ہی کبھی خارج میں واقع ہوا ہو۔ میر نے ''شکری رنگ اور شکر انگور'' کا لفظ استعمال کرنے کے شوق میں پوری داستان وضع کرلی۔ یہ انگور کی ایک قسم ہے اور ایران سے مخصوص ہے۔ احمد بیگ اگر ایران سے حج کرنے کی خاطر نکلا تھا۔ تو ظاہر ہے اس سفر میں آگرہ تک پہنچنے کے لیے کئی ماہ کا عرصہ درکار ہے۔ اتنی مدت تک انگوروں کا محفوظ رکھنا ممکن نہیں۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اس نے ان کی حفاظت کے لیے کچھ خصوصی تدابیر اختیار کی ہوں گی۔ تو اس شبہ کا رفع کرنا کس طرح ممکن ہے کہ ایران سے عرب کی طرف جاتے ہوئے آگرہ کسی طرح درمیان میں نہیں آسکتا، تاوقتے کہ اس کا سفر بالقصد کیا جائے۔

میر نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دن ماموں (سراج الدین علی خاں آرزو) نے مجھے کھانے پر بلایا اور پھٹکارنا شروع کیا۔ میں بہت کڑھا اور کھانے میں ہاتھ ڈالے بغیر اُٹھ گیا۔ جب ان سے نبھتی نہ دیکھی تو شام کو ان کے گھر سے نکلا۔ اور جامع مسجد کا راستہ لیا۔ اتفاق سے راہ بھول گیا اور قاضی حوض پر آنکلا جو وزیرالممالک اعتمادالدولہ کی حویلی کے پاس ایک چھوٹی سی نہر ہے یہاں میں نے پانی پیا۔ کسی نہر یا حوض سے پانی پینا۔ کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے کہ اس کا تذکرہ سوانح عمری میں کیا جائے۔ یہاں '' آب کشیدن'' کے محاورہ کا استعمال مقصود تھا۔ اصل واقعہ اتنا ہوگا کہ حافظ محمد حسن نے خان آرزو کو کوئی خط لکھا ہوگا۔ جس سے متاثر ہوکر انھوں نے میر کے ساتھ دشمنوں کا سا برتاؤ شروع کردیا۔ میر کے باپ کا جب انتقال ہوا تو میر 11-10 سال کے تھے اور اس زمانے سے انھیں فکر معاش میں سرگرداں پھرنا پڑا۔ سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن نے باپ کے ترکے کی تین سو کتابوں میں سے بھی میر کو ان کا حصہ نہیں دیا۔ اور باپ کی زندگی ہی میں یہ کہہ دیا تھا۔ میر ان کتابوں کا کیا کریں گے۔ پھر میر دلی آئے تو یہاں بھی محمد حسن نے اپنے حقیقی ماموں خانِ آرزو کو لکھ بھیجا کہ میر تقی فتنہ روزگار ہے۔ اس کی تربیت ہرگز نہ کی جائے۔ خان آرزو نے بھی ایک کم سن یتیم پر رحم نہ کیا۔ اور بھانجے کے ورغلانے میں آگئے۔ آخر اس کے کیا اسباب ہوسکتے ہیں۔ یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ ہمارے سامنے صرف میر کا بیان ہے اور محمد حسن یا خان آرزو کا بیانِ صفائی موجود نہیں ہے۔ یک طرفہ بیان پر جو فیصلہ کیا جائے گا وہ ظاہر ہے کہ منصفانہ نہیں ہوسکتا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ محمد حسن اور آرزو کے سلوک کا سبب میر کا مذہب رہا ہوگا۔ انھوں نے اپنے ابتدائی ماحول ہی میں تشیع کے اثرات قبول

کر لیے تھے اور یہ بات اُن کے باپ کی زندگی ہی میں ظاہر ہو چکی ہوگی کہ میر شیعیت کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ حافظ محمد حسن (ان کے نام کے ساتھ لفظ 'حافظ' ہی بتا رہا ہے کہ یہ شیعہ نہیں تھے، اور میر نے بھی کہیں ان کے نام کے ساتھ لفظ 'میر' نہیں لکھا) نے اس وجہ سے باپ کی متروکہ کتابوں میں سے انھیں حصہ نہیں دیا۔ انھوں نے باپ سے ہی کہا ہوگا کہ محمد تقی شیعہ ہو گیا ہے۔ آپ کی سب کتابیں تصوف کی ہیں یا مذہب تسنن سے علاقہ رکھتی ہیں۔ میر آخر ان کتابوں کا کیا کرے گا۔؟ اس لیے شاید انھوں نے خان آرزو کو بھی لکھ بھیجا ہوگا کہ میر کی تربیت نہ کریں [1]۔

اٹھارھویں اور اُنیسویں صدی کے اسلامی ہند کی معاشرت میں مذہبی عقائد کی بہت اہمیت تھی۔ ایک ہی فرقے میں فروعی اختلافات عقائد بھی اکثر افتراق کا سبب بن جاتے تھے۔ ہمارے موجودہ معاشرہ میں بھی اہل سنت کے دو گروہ ''دیوبندی'' اور ''بریلوی'' کہلاتے ہیں ان میں عقائد کی سطح پر کبھی کبھی اتفاق بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اور یہ اختلافات شادی بیاہ یا دوسرے سماجی روابط کے قیام میں خاصی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ میر اگر اس خاندان کے تھے جس سے عبدالعزیز عزت اکبرآبادی (ف 1089ھ) کا تعلق تھا تو یہ خاندان عقائد اہلِ سنت میں بہت راسخ رہا ہے۔ خود عزت نے شیعیت کے رد میں ایک کتاب ''کشف الغطاء'' لکھی تھی۔ اور عملاً بھی اپنے عقائد کی ترویج میں کوشاں رہتے تھے۔ چنانچہ ان کی ترغیب سے ایزد بخش رسا (ف 1119ھ) نے مذہب تشیع چھوڑ کر عقائدِ اہلِ سنت کو اختیار کیا تھا۔ ایک ایسے خاندان کا فرد اگر اپنے عقائد تبدیل کر لے تو اُس دور کی سماجی زندگی میں اس کے لیے دشواریاں پیدا ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔

اس کے باوجود جب میر پر جنون کا حملہ ہوا تو عزت کے بیٹے فخرالدین خاں کی بیوی نے ان کے علاج پر بہت روپیہ صرف کیا تھا۔

میر نے بہت سی باتوں کو وضاحت سے نہیں لکھا وہ یہ نہیں بتاتے کہ اُن کے والد کی وفات کے بعد سارے ماحول نے ان کے خلاف کیوں بغاوت کر دی۔ اور اتنے کم سن بچوں (محمد تقی اور محمد

---

1 حافظ محمد حسن کے بیٹے محمد محسن تھے۔ جن کا حال نکات ط ا/148 میں ہے۔ تالیف تذکرہ کے وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ 1145ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ اس سے حافظ محمد حسن کی عمر کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محمد علی کی وفات (1146ھ) کے وقت وہ شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے۔

رضی) کو زمانے کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑ دیا۔ صرف میر کے مبہم بیانات کی بنیاد پر دوسروں کو ظالم اور بے رحم مان لینا قرین انصاف نہیں ہے۔ ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ میر نے اس زمانے میں کوئی معاشقہ بہت شد و مد کے ساتھ کیا تھا۔ اور اس جذباتی ہیجان کی لہریں ان کی شاعری میں بھی نظر آ رہی ہیں جسے وہ "جنون" بتا رہے ہیں۔ وہ اسی "حضرتِ عشق" کی کرامات معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے چاند میں ایک صورت کے نظر آنے اور اس سے تنہائی میں گفتگو کرنے کا بیان کیا ہے۔ میر کی شاعری میں "چاند' چاندنی" مہتاب" مہتابی' گلِ مہتابی' قمر اور 'ماہ' کے الفاظ اتنی کثرت سے آئے ہیں کہ انھیں دیکھ کر مجھے گمان ہوتا ہے کہ جن صاحبزادی سے میر عشق فرماتے تھے ان کا نام بھی کچھ "چاندنی" یا مہتاب یا قمر" وغیرہ رہا ہوگا۔ عالم جنوں میں میر اس کے تصور سے باتیں کرتے تھے اور اس کا نام لے کر سوتے سے چونک اٹھتے تھے۔ اس کی تاویل اپنی سوانح عمری میں اس طرح کر رہے ہیں" چاندنی رات میں ایک حسین پیکر کرۂ قمر سے میری طرف آتا اور مجھے بے خود کر دیتا تھا۔ جدھر بھی آنکھ اٹھتی اسی رشک پری پر پڑتی۔ جس طرف دیکھتا اسی غیرتِ حور کا تماشا دیکھتا۔ میرے گھر کے در و بام اور صحن گویا ورق تصویر ہو گئے تھے۔ یعنی ہر سمت وہی حیرت افزا چہرہ نظر آتا۔ کبھی چودھویں کے چاند کی طرح سامنے، کبھی سیرگاہِ دل میں محوِ خرام۔ اگر گل مہتاب پر نظر پڑ جاتی تو جان اور بھی بے قرار ہو جاتی۔ ہر رات اس پری پیکر سے ملاقات ہوتی اور ہر صبح اس کی جدائی میں وحشت...... چار مہینے تک وہ گل شب افروز نئے انداز دکھاتا رہا۔ اور اپنے فتنۂ خرام سے قیامت ڈھاتا رہا ..... وہ خیالی صورت ہمہ وقت نظروں کے سامنے رہتی اور اس کی مشکیں زلفوں کا دھیان سر میں"۔

خان آرزو سے اُن کے تعلقات شاید اسی معاشقے کی وجہ سے خراب رہے ہوں۔ ورنہ ان سے اتنی سنگ دلی کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایک یتیم بچے کی پرورش سے نہ صرف گریز کریں بلکہ وہ بیمار ہو تو اس کی دوا دارو سے بھی کوئی دل چسپی نہ رکھیں۔ اس موقع پر فخر الدین خاں کی بیوی کا ہمدردانہ رویہ ایک عورت کی نفسیات کا اشاریہ ہے۔ جو ایسے حالات میں فطری طور پر دل سوزی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اس دور کے سماج کا گہرا مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر یہ راز سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ اس زمانے میں کسی شریف گھرانے کی لڑکی سے معاشقہ کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اور اس کا صریح مطلب پورے ماحول کی مخالفت کو دعوت دینا تھا۔ اب میر کے اس معاشقے کی تفصیلات

کا دستیاب ہونا تو ممکن ہی نہیں۔ لیکن میر کے سوانح کی دل کشی اور رنگینی میں اضافے کی خاطر اگر کچھ اشارات بھی مل سکیں تو بسا غنیمت ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ یہاں داخلی شواہد کا اصول سب سے زیادہ معاون ثابت ہوگا۔

میر نے اپنے اولین استادوں میں میر جعفر علی عظیم آبادی اور سید سعادت علی امروہوی کا تذکرہ کیا ہے۔ یعنی وہ خانِ آرزو کو اپنا استاد بھی تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔ میر جعفر ایک مجہول شخصیت ہیں اور ایسا گمان ہوتا ہے کہ وہ شیعی مسلک رکھتے ہوں گے۔ سعادت علی کے بارے میں ہمیں معلوم ہے۔ امروہہ کے مشہور بزرگ حضرت سید شاہ شرف الدین نقوی الواسطی معروف بہ ''شاہِ ولایت'' کی اولاد میں تھے۔ اور امروہہ کے محلہ حقانی میں رہتے تھے۔ شاہِ ولایت ابن بطوطہ کے معاصرین میں سے ہیں۔ بعد کے زمانہ میں ان کی اولاد میں سے بعض نے مذہب امامیہ قبول کر لیا تھا۔ اور سعادت کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔

میر نے خانِ آرزو کے تلمذ سے اپنے برأت کا اظہار کرنا بھی شاید اسی اختلاف عقائد کی وجہ سے ضروری سمجھا ہو۔ ورنہ خود میر کی فارسی تحریریں اس کی گواہ ہیں کہ انھوں نے فارسی کی حد تک جو کچھ سیکھا ہے وہ سب خانِ آرزو کا فیضان ہے۔

میں نے 1957 میں ''ذکرِ میر'' کا اردو ترجمہ ''میر کی آپ بیتی'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ ذکرِ میر میں جو فارسی محاورات استعمال کیے گئے ہیں وہ فارسی کی مروجہ کتب لغات میں عام طور سے نہیں ملتے۔ اور خانِ آرزو کی مرتبہ ''چراغ ہدایت'' میں عموماً موجود ہیں۔ اور ان میں سے بھی اکثر محاورات کے لیے خان آرزو نے لکھا ہے کہ یہ اہلِ زبان سے تحقیق کر کے لکھا گیا ہے۔ غور سے مطالعہ کرنے پر اندازہ ہوا کہ ''ذکرِ میر'' کا پہلا تہائی حصہ میر نے اس طرح لکھا ہے کہ ایک ہی صفحے کے محاورے اپنی کتاب کے ایک پیراگراف میں استعمال کر لیے ہیں اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے کہ کتاب چراغ ہدایت اُن کے سامنے کھلی ہوئی رکھی ہو۔ مثلاً یہ جملے دیکھیے۔

''دلے مبہم رساں کہ او پسندِ جانے پیدا کن کہ با دو پیوندد، دست بدستِ بہ از خودے دہ کہ ازیں راہ، این راہِ دور دست، دست بدست است، زنہار دست بردست مَنہ کہ چوں دست و پا خشک شوند راہ پست است''

دوسرے موقع پر پھر دست کے محاورے یوں باندھے ہیں:-

''دست دستِ ظالماں بود، دست کجی می کروند، دست پلشتی میمنو وند، دستِ چرب بر سرمی کشی دند، دست بہ بازوے زناں میرسیدند، تیغہا می آختند، دست گاہ می ساختند، از دستِ شہریاں ہیچ نمی آمد، زیرا کہ دست ودِل ایشاں سرد شدہ بود، کسے دست پاچہ می شدو کسے دست بزیرِ سرستون می نمود......''

میر کی آپ بیتی کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت میر کی فارسی نگاری کے اس پہلو پر تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے صرف مقدمہ میں اس کی طرف اشارہ کر دیا تھا کہ ذکر میر کے محاورے چراغ ہدایت کے سوا دوسری لغت میں شاذ ہی ملتے ہیں۔ اب اس موضوع پر دوسرے ایڈیشن میں خاصی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب نے ایک موقع پر لکھ دیا تھا کہ: میر نہ منصف ہیں نہ راست گفتار، ان کا حافظہ بھی زیادہ مضبوط نہیں۔'' بعض حضرات نے اس ریمارک پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور اسے میر کے استخفاف پر محمول کیا۔ اس ناگواری کا سبب ایک تو مشرق کی روایتی ''میر و پرستی'' ہے اور دوسری وجہ میر پر علمی تحقیق کا فقدان بھی ہے۔ اگر ہمارا علم میر کے بارے میں اتنا محدود نہ ہوتا جتنا کہ وہ آج ہے تو اس ریمارک پر خفگی کا اظہار نہ کیا جاتا۔

میر نے اپنی سوانح عمری کے آغاز ہی میں لکھا ہے کہ ان کے دادا کو ''فوجداری نواح'' اکبرآباد کا عہدہ مل گیا تھا۔ اور یہ کہ انھوں نے ملازمت کے زمانے ہی میں گوالیار میں انتقال کیا۔ دادا کا نام انھوں نے ظاہر نہیں کیا۔ ''فوجداریِ نواح'' خاصا بڑا عہدہ تھا۔ اور آج کل کے ڈپٹی کمشنر کے برابر تھا۔ اگر ان کے دادا واقعی فوجدار نواح تھے تو ان کا زمانہ اورنگ زیب کا عہد رہا ہوگا۔ اور عہد عالمگیری کے بیشتر امرا کا حال تاریخوں میں دستیاب ہے۔ ان میں کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جسے نواح اکبرآباد کی فوجداری کا عہدہ حاصل ہوا اور اس پر جدِّ میر ہونے کا گمان کیا جا سکے۔

پہلے یہ اندازہ کر لیجیے کہ ''فوجدار'' کس حیثیت کا حاکم ہوتا تھا۔ شکر اللہ خاں خاکسار (ف 1108 ھ) جو مرزا عبدالقادر بیدل (ف 1133 ھ) کے مربی اور ممدوح اور نواب عاقل خاں

---

1. ذکر میر/29۔ میر کی آپ بیتی/55

2. ذکر میر صفحہ 87۔ میر کی آپ بیتی/122

رازی (ف 1108 ھ) کے داماد ہیں 1098 ھ میں ''فوجداری نواحی جہان آباد'' یعنی نواحِ دہلی کے فوجدار تھے۔ اوران کا زمانہ وہی ہے جو میر کے دادا کا عہد ہونا چاہیے۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اگر جدِّ میر اس عہدے پر تھے تو وہ کس مرتبے کے حاکم ہوں گے۔

اسی طرح بہادر شاہ اول کے عہد میں چین قلیچ خان گورکھپور کے فوجدار تھے۔ یہ ہفت ہزاری تھے۔ نواب محمد امین خاں بہادر جو بعد کو محمد شاہ کے وزیر اعظم ہوئے۔ پہلے مراد آباد کے فوجدار تھے۔ عہد عالمگیری میں نواب ارادت خانِ واضح ''نواحِ اورنگ آباد'' کے فوجدار تھے۔ انھیں ارادت خاں خطاب اور ہفت صدی ہزار ذات منصب ملا ہوا تھا۔

فوجداری کا عہدہ عموماً منصب کے ساتھ ملتا تھا یعنی خطاب بھی عطا ہوتا تھا اور جاگیر بھی میر کے دادا ہفت ہزاری نہ سہی، ہزاری منصب پر بھی ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ اس دور کے مصادر تاریخی میں ان کا حوالہ نہ آتا۔ دوسرا نکتہ یہ کہ وہ بقول میر حالتِ ملازمت میں مرے تھے۔ مغلیہ حکومت کے طریق کار کے مطابق اگر کوئی سرکاری ملازم خدمت کی حالت میں فوت ہوتا تھا تو قاضی کا مصدقہ وراثت نامہ داخل کرنے پر اس کے ورثہ کے نام اس کی پوری تنخواہ جاری ہو جاتی تھی یا اس متوفی کے بیٹے کو وہی خطاب اور منصب دے دیا جاتا تھا۔ اگر میر کے دادا نواح اکبر آباد کے فوجدار ہوتے تو ان کے انتقال پر یہ منصب محمد علی عرف علی متقی کو اور پھر خود میر کو ملنے میں بظاہر کوئی مانع ہونا نہیں چاہیے تھا۔ میرا خیال ہے کہ میر نے اپنے دادا کا عہدہ بڑھا کر بیان کیا ہے۔

دوسری مثال حافظے کی کمزوری کی بھی دیکھ لیجیے انھوں نے ایک درویش احسان اللہ کی خدمت میں اپنی حاضری کا بیان لکھا ہے۔ اُس میں ہے کہ ''شہر کے صوبے دار کا مصاحب آیا اور اس کی درخواست پیش کی کہ نصرت یار خاں قدم بوسی کے لیے حاضر ہو رہا ہے جب صوبے دار دروازہ پر آیا ہاتھی سے اتر پڑا اور دوڑ کر شرف پابوسی حاصل کیا اور پانچ اشرفیاں نذر کیں۔ اسی میں ایک عبارت سے مترشح ہے کہ میر امان اللہ اس ملاقات کے وقت وہاں موجود تھے اور میر بھی ان کے ساتھ گئے تھے۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ہدایت اللہ رکن الدولہ نصرت یار خاں ساداتِ بارہہ میں سے تھا۔ یہ نواب شہامت خاں کا بھتیجا اور ہفت ہزاری منصب دار تھا۔ اس نے 22/رمضان 1134 ھ کو ساٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اس کی وفات سے تقریباً ایک سال کے بعد میر کی

ولادت ہوئی ہے۔ نصرت یار خاں نام کا دوسرا کوئی صوبے دار آگرہ میں نہیں ہوا۔ میر نے اس کا نام سن رکھا ہوگا۔ لیکن ذکر میر لکھتے وقت انھیں یہ دھیان نہ رہا کہ جس گورنر کو وہ درویش کی خدمت میں حاضر کررہے ہیں وہ ان کی ولادت سے پہلے ہی مر چکا تھا۔

اسی طرح بایزید نامی ایک فقیر سے ملاقات کرنے گئے ہیں تو لکھتے ہیں کہ ''ایک دن عصر کی نماز کے بعد ان سے ملاقات کرنے گئے۔'' مگر لکھتے لکھتے حافظہ نے دھوکا دیا اور چار صفحوں کے بعد کہتے ہیں ''اسی دوران میں عصر کا وقت ہوگیا ہم اٹھے اور ان کے ساتھ نماز پڑھی۔''

ذکر میر کے سلسلے میں دو باتیں خاص طور سے بحث وفکر کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کتاب میں جو تاریخی واقعات آئے ہیں وہ میر نے اپنی معلومات عامہ سے فراہم کیے ہیں۔ یا ان کا کوئی ماخذ تحریری بھی رہا ہے۔؟ دوسرے یہ کہ ذکر میر کا زمانہ تالیف کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ متعین کرنا بھی ضروری ہے کہ تاریخی ماخذ کی حیثیت سے ذکر میر کا پایۂ استناد کیا ہے؟ اس کی بحث میں نے میر کی آپ بیتی طبع ثانی کے مقدمہ میں کی ہے۔

یہ ان امور کی طرف کچھ سرسری اشارے ہیں جن کا تعلق میر کی سوانح اور ان کے عہد کے وقائع تاریخی سے ہے۔ ان کا تذکرہ اس لیے کیا گیا کہ اس امر کو ثابت کیا جاسکے کہ میر کی تحقیق اور اس کے بارے میں معلوم حقائق کی تاویلات میں ابھی بہت کچھ گنجائش بحث ونظر کی ہے۔

میر کا کلام سمجھنے کے لیے اس عہد کے معاشی اور سماجی ڈھانچے کو اچھی طرح دیکھنا بھی ضروری ہے۔ اور اس کے لیے سب سے پہلے حکومت اور سرکاری نظام کا علم ہونا چاہیے۔ میر کی اور سودا کی شاعری میں ایسی اصطلاحیں بکثرت استعمال ہوئی ہیں جن کے مفہوم کو اب سمجھنا ممکن نہیں رہا ہے تاوقتیکہ تاریخ کی کتابوں سے رجوع کیا جائے۔ مثلاً سرکاری عہدوں میں بخشی، میر بخشی اور اس عہدے کے دوسرے مراتب یا احدی، والا شاہی، یساول، کمبل پوش، میردہ، نجیب، بارگیر، مینک باشی، قدر انداز، ذوالقدر، ڈھلیت سہ بندی وغیرہ۔ اسلحہ میں بان، جزائر، رھکلہ، غازی خان، شیر دھان، زنبورک، فوجی اصطلاحوں میں التمش، برنغار، چنداول، قول، وغیرہ۔ اسبابِ شاہی میں تختِ رواں، کوکبہ، اختہ بیگی، ماہی مراتب، چتر توغ، یہ ایسے الفاظ ہیں کہ لغت کی عام کتابوں میں ان کی قابلِ اطمینان تشریح نہیں ملتی۔ اگر اس سماج کی کوئی مفصل تاریخ لکھی جائے یا اس عہد کے کسی فن کار

کی زندگی کا گہرا مطالعہ کرنا مقصود ہو تو ایسے الفاظ اور اصطلاحوں کا پورا پس منظر ذہن میں رہنا ضروری ہے۔

معاشی ڈھانچے پر گفتگو کرتے ہوئے یہ ملحوظ رکھا جائے کہ آج کی حکومتوں کے زیر انتظام جو محکمات ہیں وہ اس زمانے میں تمام تر عوام کی ذمہ داری تھے۔ تعلیم اور صحت عامہ کا محکمہ بھی سرکاری نہیں تھا۔ صنعت وحرفت کے کارخانوں کا بھی حکومت سے سروکار نہیں تھا۔ بلکہ بادشاہ وقت اپنی ضروریات کی چیزیں عوام کے کارخانوں سے حاصل کرتا تھا یا سرکاری کارخانہ جات میں ہنر مندوں کو ملازم رکھا جاتا تھا۔ جاگیرداروں کی مالی حالت خراب ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اہلِ حرفہ بے روزگار ہو جاتے تھے۔ شہر آشوب کا موضوع اسی لیے مختلف پیشہ وروں کی بے روزگاری اور کساد بازاری ہوتا ہے کہ ان لوگوں پر حکومت کی اقتصادی کمزوری کا براہ راست اثر پڑتا تھا۔

میر کے عہد میں لوگوں کے لیے معاشی ذرائع یہ تھے۔

(1) سرکاری منصب وجاگیر (2) زراعت (3) صنعت وحرفت (4) سپاہ گری، میر کے عہد میں جاگیرداروں کا حال بہت ابتر ہو چکا تھا۔ اور آئے دن کی یورشوں اور خانہ جنگیوں نے زراعت اور صنعت وحرفت کو بھی بہت نقصان پہونچایا تھا۔ سپاہ گری ایسا پیشہ تھا جسے آج کل کی اصطلاح میں سرکاری ملازمت کے برابر سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر مرکز کی کمزوری سے یہ بھی ''نیم سرکاری'' اور پہلے سے زیادہ غیر یقینی ہو گیا تھا۔ چند امرا تو خود مختار ہو کر اور اپنی الگ فوج لے کر مرکز سے دور جا بیٹھے تھے۔ باقی امیروں کا حال کسی جواری کا سا تھا جو ہمہ وقت طالع آزمائی میں مصروف رہتا ہے۔ اس کی سپاہ کو بروقت تنخواہ نہیں ملتی تھی تو وہ ڈیوڑھی پر دنگا کرتے تھے۔

ان امرا میں دراصل اقتصادی شعور کی کمی تھی اور یہ اپنی فوج کی تنظیم کسی پلان کے تحت نہیں کرتے تھے۔ اپنے روپوں کی وصولیابی کی فکر میں ہی ایک فوجی اپنے سردار کی حفاظت آخر وقت تک کرتا تھا کیوں کہ اس کے مارے جانے کا مطلب کئی کئی ماہ کی بقایا تنخواہ کا بھی سوخت ہو جانا تھا۔ سپاہی کے گھر والے اس عرصہ میں بنیے سے ادھار لے کر کھاتے رہتے تھے اور آہستہ آہستہ گھر کا سب سازوسامان بنیے کے پاس رہن ہو جاتا تھا۔ اگر سپاہی مال غنیمت لے کر واپس آ گیا تب تو اس کا بڑا حصہ بنیے کی اصل اور سود میں چلا گیا۔ ورنہ گھر والوں کے لیے فاقہ کشی کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

اس وقت فوج میں رجمنٹ بھی نہیں تھے۔ ہر سپاہی کسی منصب دار کا نوکر ہوتا تھا۔ اور وہ منصب دار اپنے سے بڑے امیر سے الحاق کر لیتا تھا۔ اس طرح چھوٹی بڑی ٹکڑیاں مل کر پوری فوج بن جاتی تھی۔ مگر اس فوج کی ایک متحدہ کمان نہیں تھی۔ ہر گروہ کا سپاہی صرف اپنے آقا ہی کا حکم مانتا تھا۔ اور اسی کا مفاد دیکھتا تھا۔ اس کے کمزور ہونے کی صورت میں وہ باغیانہ سرگرمیاں بھی اختیار کر لیتا تھا۔ اور اس سے خلق آزاری کا آغاز ہوتا تھا۔ جس کی مثالوں سے ذکرِ میر بھی خالی نہیں ہے۔

ہر منصب دار جو فوج رکھتا تھا اسے مختلف کاری گر اور ماہرین فن بھی رکھنے ہوتے تھے۔ مثلاً لوہار، بڑھئی، جراح، نعل بند، وغیرہ۔ ایک سہ ہزاری امیر کے پاس کم سے کم دو جراح، دو آہن گر اور چھ نعل بند ضرور ہوتے تھے۔ معاشی بدحالی کے زمانے میں یا اس منصب دار کا زوال ہونے پر یہ سب بے روزگار ہو جاتے تھے۔ میر اور سودا کی شاعری میں جہاں معاشی زبوں حالی کا رونا ہے یا اس عہد میں اہل حرفہ کی ناقدری کا بیان آیا ہے، اس کا عالمانہ تجزیہ ہو ہی نہیں سکتا جب تک ان سب کی صحیح پوزیشن اور اس سماج میں ان کے رول کا پورا علم نہ ہو۔

ایک اور پہلو رسوم و رواج کا ہے۔ یہ رسمیں کچھ تو مذہبی عقائد سے پیدا ہوتی ہیں اور کچھ کا سرچشمہ عوام کے میل جول میں ہوتا ہے۔ جاگیردارانہ عہد کی بہت سی رسمیں اور رواج اب ختم ہو چکے ہیں۔ بہت سے توہمات بھی دم توڑ گئے ہیں۔ مگر شاعری میں ان کا حوالہ موجود ہے۔ لباس، گفتار، کھانے پینے اور رہنے سہنے کے آداب سمجھنے سے بھی کلام کا صحیح پس منظر اور اس کا مفہوم ذہن نشین ہوتا ہے۔ اس کی ضرورت صرف میر کی شاعری کی بازیافت ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ عمومی طور پر اس عہد کے شاعروں کا کلام ان تفصیلات کے بغیر سمجھ میں نہیں آتا۔ میر کی شاعری میں چونکہ سماجی روابط کے حوالے اور ان حالات کا عکس زیادہ شدت سے آیا ہے اور انھوں نے طویل عمر بھی پائی ہے اور اتفاق سے وہ پوری عمر اس زوال آمادہ دور میں صرف بھی ہوئی ہے۔ اس لیے انھیں علامات مان کر اس طرح کا جو مطالعہ کیا جائے گا وہ دوسرے شاعروں کو سمجھنے میں بھی اتنا ہی نافع ہوگا۔

سب جانتے ہیں کہ کسی ملک کا ادب اس کے سیاسی سماجی اور تہذیبی حالات کا آئینہ ہوتا ہے۔ یہ حالات تیزی سے بدلتے رہتے ہیں۔ اور اس بات کو اگر مارکسی نقطۂ نظر سے کہا جائے تو یہ خود اپنی نفی کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے ہم کسی مخصوص زمانے کا ادب پڑھ کر اس دور کی ہر کشمکش کو زیریں لہر

کی طرح اس میں تلاش کر سکتے ہیں۔ لیکن جب کوئی تہذیب اتنا طویل سفر طے کر کے ماضی کے دھندلکوں میں روپوش ہو چکی ہو۔ جتنا اس ہند ایرانی کلچر نے کیا ہے۔ اور وہ اتنی بیگانہ بھی ہو گئی ہو جتنا یہ مشترک کلچر آج کے ہندستان میں ہو چکا ہے تو ادب میں اس تہذیب کی تلاش کا پہلا مرحلہ یہ ہو گا کہ خود اس تہذیب میں ادب کی تلاش کی جائے۔

تاریخی مطالعے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ واقعات کا تاریخی تجزیہ کیا جائے۔ یہ کام بہت نازک ہے۔ ناقد کو حالات کے ساتھ ساتھ پورا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ اور اس ماحول کو اپنے ذہن میں دوبارہ زندہ کرنا ہوتا ہے۔ واقعات کا فراہم کر لینا تو کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے۔ اسباب وعلل کا سُراغ لگانا یہ اصل غایت ہوتی ہے۔ اور اس میں عموماً کوتاہی یوں ہوتی ہے کہ مورخ جانب دار یا متعصب ہو جاتا ہے۔ اور واقعات کو ان کی اصلی روپ میں دیکھنے کی بجائے اپنے نقطۂ نظر کی عینک سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ اس لیے تجزیاتی مطالعے میں ہمیشہ اختلاف رائے کی گنجائش رہ جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاتا ہے کہ واقعات کو ایک اپنے زاویے سے ہم نے بھی پیش کیا ہے۔

دوسری صورت قطعاً معروضی ہے۔ یعنی صرف وقائع سے بحث ہو اور ان کا تجزیہ نہ ہو۔ اس میں تحقیق اور تاریخ کے طریق کار اور مسلمہ ضوابط کے احترام کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے یعنی کن ماخذ سے استفادہ کیا ہے۔ اگر یہ منظور ہے کہ موضوع کا کامل احاطہ ہو۔ تب تو اولین اور پھر ثانوی مصادر تاریخی ترتیب سے آتے ہیں۔ اور اگر صرف ایک مجموعی تصویر بنانی ہے تو ماخذ کے زمانی تقدم وتأخر سے زیادہ ان کی پہنائی کو دیکھا جاتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب اسی دوسری نوعیت سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے بجائے خود ایک ماخذ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہاں واقعات پر زیادہ، اور تجزیہ پر کم زور دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد عمر، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تاریخ کے استاد ہیں۔ اور انھوں نے پروفیسر خلیق احمد نظامی کی نگرانی میں ہندوستان کی اٹھارہویں صدی کی معاشرت پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ ابھی چند سال ہوئے وہ ''ہفت تماشا'' کا اردو ترجمہ کر کے اپنی تاریخی سوجھ بوجھ اور علمی لگن کا ثبوت دے چکے ہیں۔ ان کا ایک اور قابل ذکر علمی کارنامہ ''مسلمانوں پر ہندو تہذیب کے اثرات'' کا مطالعہ ہے۔ یہ کتاب عنقریب حکومت ہند کی وزارت نشریات کی طرف سے شائع ہونے والی ہے۔

1963 میں جب میں نے دہلی کالج اردو میگزین کا میر نمبر ترتیب دیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اس نمبر میں ایک مضمون ایسا بھی ہونا چاہیے جس سے یہ معلوم ہو کہ میر کا معاشرہ کیسا تھا۔ ؟اس عہد میں ایک عام آدمی کی زندگی کیا تھی؟ رسوم ورواج کیا تھے، مرنے جینے کی تقریبات، لباس، زیورات، مکانوں کی آرائش کے ڈھنگ، میلے ٹھیلے، ادبی اجتماعات، مذہبی تقریبات اور اس طرح کی وہ سب باتیں جو اس سماج کی زندہ اور متحرک تصویر نگاہوں کے سامنے لے آئیں۔ بہت غور کرنے پر بھی محمد عمر صاحب سے زیادہ موزوں دوسرا نام ذہن میں نہیں آیا، اس لیے کہ انھوں نے اپنا تحقیقی مقالہ اس دور پر لکھا ہے جو عہدِ میر کہلاتا ہے۔ میری فرمائش پر انھوں نے یہ مضمون لکھا تو وہ اتنا طویل ہو گیا کہ اس میں قطع وبرید کرنے کو دل آمادہ نہ تھا۔ اور ''میر نمبر'' کے دامن میں اس کی گنجائش نہ تھی۔ آخر یہ طے ہوا کہ اب اِسے اور شرح وبسط سے لکھا جائے اور کتابی صورت میں سامنے لایا جائے۔ زیرِ نظر کتاب اس ابتدائی مضمون کی ترقی یافتہ شکل ہے اس کتاب کے سامنے آنے سے عہدِ میر کا سمجھنا اردو والوں کے لیے آسان ہو جائے گا۔ اور میر کی تعبیر وتشریح کے بھی نئے امکانات روشن ہوں گے۔

دہلی کالج دہلی۔ 25/دسمبر 1972

نثار احمد فاروقی

تمہید

کسی ملک اور قوم کا ادب اس کی زندگی، کردار، عقائد، رسوم و رواج، تصورات، خوشیوں اور غموں، امیدوں، امنگوں اور خطرات کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ صرف فن کار کی نفسیات کا آئینہ ہی نہیں ہوتا بلکہ تاریخ کا عکاس بھی ہوا کرتا ہے۔ اس سے کسی ملک کے باشندوں کی ترقی کے عوامل اور انحطاط کے اسباب اجاگر ہوتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے اردو ادب کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ ہندستانی معاشرت کے ہر پہلو کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کے آئینے میں ساری قوم کا چہرہ نظر آ جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ سیاسی اور اقتصادی زبوں حالی، مذہبی اور اخلاقی انحطاط نے اس عہد کے لوگوں میں کیا ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ اس دور کے شاعروں نے اپنے سماج کا جو حال قلم بند کیا ہے یا اس سے متعلق جو تلمیحات استعمال کی ہیں، وہ خاصی معنی خیز ہیں۔ اور ایک مورخ کے لیے اس میں وافر معلوماتی اشارے مل جاتے ہیں۔

پی۔ایچ۔ڈی کے لیے اپنے مقالے کی تیاری کے زمانے میں مجھے میر تقی میر (1722-1810) کے کلام اور ان کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ میر نے طویل عمر پائی تھی۔ وہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے تھے کہ سلطنت مغلیہ زوال پذیر تھی۔ اور زندگی کے ہر شعبے میں انحطاط کا اثر پیدا ہو چلا تھا۔ میر نے اپنی زندگی کے نوّے سال دلی اور لکھنؤ میں بسر کیے تھے۔ اور وہ اپنے دور کے حالات سے بڑی حد تک براہ راست متاثر تھے۔ کیونکہ سیاسی اور معاشی بحران کے وہ خود بھی ہدف بنے تھے۔

گھر اجڑا، وطن چھوٹا، تنگ دستی اور عسرت سے دو چار ہوئے۔ دردر کاسۂ گدائی لیے پھرنا پڑا۔ اس لیے اس دور کے حالات کی عکاسی ان کے کلام کے علاوہ ان کی تصنیف ذکرِ میر میں بھی بخوبی کی گئی ہے۔ میں نے میر کے کلام اور دوسری تصانیف کی بنیاد پر ایک مقالہ "اٹھارھویں صدی میں ہندستانی معاشرت: میر کا عہد" کے عنوان سے مرتب کیا ہے۔ اور اس میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس دور کے سیاسی حوادث، سماجی حالات اور تہذیبی رجحانات کا ایک مرقع پیش کر دیا جائے جس سے میر کی شخصیت اور ان کے ذہن کی نشوونما، نیز ان کے فن کی داخلی فضا کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

مقالے کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ دہلی کے اس دور سے متعلق ہے جو میر نے اس شہر میں گزارا تھا۔ یعنی حملۂ نادرشاہ (1739) سے میر کے سفرِ لکھنؤ (82-1781) تک، دوسرے حصہ میں لکھنؤ کی معاشرت، سیاسی، اقتصادی، مذہبی اخلاقی حالات پر بحث کی گئی ہے اور یہ زمانہ 1718 سے 1810 تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس مقالے میں اس دور کے تمام جزدی حالات بھی آ گئے ہیں۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اہم رجحانات کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ اور اس مقالہ کی ترتیب میں یہ بات پیش نظر رہی ہے کہ یہ میر تقی میر کی شخصیت، فن، اور ان کے عہد کے پس منظر کے طور پر لکھا جا رہا ہے۔ چونکہ مجملاً ہی سہی، مگر تمام اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنی ضروری تھی۔ اس لیے یہ مقالہ قدرے طویل ہو گیا ہے لیکن امید یہی ہے کہ اس سے بڑی حد تک اس سماج کی تصویر سامنے آ جائے گی۔ جس میں میر نے زندگی گزاری اور جس میں ان کا فن جاوداں بن گیا۔ دونوں حصوں کو چار چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (الف) سیاسی (ب) اقتصادی (ج) معاشرتی وتہذیبی (د) مذہبی اور اخلاقی۔ آخری باب میر کی آخری زندگی کے ایام پر مشتمل ہے۔ ادبی رُجحانات سے ان حالات کا رابطہ قائم کرنے کے لیے اس دور کے شاعروں کے کلام سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔ اور ان کے بیانات کی تصدیق وتوثیق کے لیے فارسی ادب سے بھی مدد لی گئی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت میں جن احباب سے مجھے مدد ملی ہے۔ ان میں جناب ڈاکٹر عظیم الشان اور جناب نظیر حسن زبیری اور محمد ذہین کا شکریہ ادا کرنا میرا خوش گوار فرض ہے۔ اپنے بزرگ جناب مولانا شبیر احمد صاحب کا ممنوں ہوں جنھوں نے کتاب کی طباعت میں پوری دل چسپی لی اور وقتاً فوقتاً مجھے نیک مشوروں سے نوازا۔

محمد عمر............جنوری 1973

فہرست

باب دوم

باب سوم

عہد میر کے سماجی حالات

مسلم جشن، تہوار اور تقریبات

میلے ٹھیلے اور بزرگان دین کے عُرس

کھیل تماشے

باب چہارم

حصہ دوم

میر لکھنؤ میں 1196ھ / 1781 تا 1225ھ / 1810

باب پنجم

سیاسی حالات

بابِ ششم

اقتصادی حالت

بابِ ہفتم

لکھنؤ کا معاشرہ وتمدن

باب نہم

باب اول

سیاسی حالات واندرونی خلفشار

دہلی میں

ہمارا موضوعِ سخن اٹھارھویں صدی عیسوی ہے، یہ زمانہ عہدِ حاضر کے انقلاب کا دیباچہ تھا۔ اور اس کا نظر غائر سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی عوامل اس طرح اپنا کام کر رہے تھے جو آگے چل کر زندگی کا دھارا بدلنے میں مدد دیں، بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی یہ عبوری عہد "صرف ہندستان ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں بڑی اہم سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ کچھ ملک غلامی کی زنجیریں توڑنے میں مصروف تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کی گردنوں میں غلامی کے طوق ڈالنے کی تیاری کی جارہی تھی۔ امریکہ کی جنگ آزادی کامیاب طور پر لڑی جاچکی تھی۔ انقلاب فرانس نے سارے یورپ میں آزادی کی تحریکوں کو ابھار دیا تھا۔[1]" لیکن دنیائے اسلام کی حالت اس سے مختلف تھی۔ مجموعی طور پر وہاں کا عام رجحان تنزل اور پستی کی طرف تھا۔ چنانچہ ہندستان میں مغلیہ حکومت بھی زوال کے کنارے پر آچکی تھی، اس وقت ہندستان صرف سیاسی طور پر ہی کمزور نہیں تھا بلکہ اقتصادی حالات بھی اتنے پیچیدہ ہوچکے تھے کہ عوام اور طبقۂ خواص اس کی زد میں آگئے تھے۔ 3/مارچ 1707 کو اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ تو گویا حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ ایک طرف تخت نشینی کی جنگوں نے سیاسی نظام کو متزلزل کر رکھا تھا دوسری طرف اورنگ زیب کے جانشینوں کی کوتاہ اندیشی، عیش پسندی اور پست ہمتی نے

1۔ تاریخ مشائخ چشت۔ ص309

حالات کو نازک سے نازک تر اور بد سے بدتر بنا رکھا تھا۔ انھوں نے اپنی طاقت آپس ہی میں لڑ کر ختم کر دی تھی اور بیرونی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کی تاب باقی نہیں رہی تھی۔ ایک شاعر نے ذیل کے شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کہیں ہے شیشہ سرنگوں اور کہیں شکستہ جام ہے
کیا مچائی مے کشوں نے آج میخانے میں دھوم[1]

شاہی خزانہ عیش و عشرت کی محفلوں کی نذر ہو کر خالی ہوتا رہا اور ان بادشاہوں نے جو اورنگ زیب کے بعد مسند نشین ہوئے، حالات کو اپنے قابو سے باہر دیکھا تو عیش و عشرت میں اس طرح غرق ہو گئے، جس طرح شتر مرغ ریگستانوں میں آندھیوں کے وقت ریت میں سر چھپا لیتا ہے، اور دنیا و مافیہا سے بے خبر رہ کر زندگی گزارنے لگے۔

ان حالات کا ردِ عمل اس دور کی شاعری میں ملتا ہے، حاتم، حسرت، قائم اور سودا کے شہرِ آشوب اس زوال پذیر معاشرے کی بڑی واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔

حاتم

امیر زادے ہیں حیران، اپنے حال کے بیچ
تھے آفتاب پر، اب آگیے زوال کے بیچ
پھریں ہیں چرخی سے ہر دن، تلاشِ مال کے بیچ
وہی گھمنڈِ امارت ہے پھر خیال کے بیچ
خدا جو چاہے تو پھر ہو، پر اب تو ہے دشوار

عجب یہ الٹی بہی ہے کی باؤ دلی میں
کہ شاہ باز چڑی مار کی ہے اٹی میں
روغن فروش کی ہیں پانچوں انگلیاں گھی میں
جنگل کو چھوڑ کے بوم آبسے ہیں بستی میں
نجیب چھوڑ کے شہروں کو ہیں جنگل میں خوار

1۔ چمنستان الشعرا (مرتبہ مولوی عبدالحق) ص38۔

ہر ایک جنس کے خاوند، ہیں گے دست فروش
کسیری صاحب خرقوں کے آج ہیں سر بوش
جوتی فروش دکھاتے ہیں سب کے تئیں پاپوش
نجیب خانہ بدوش، ایک بنی دوگوش
ہے باغباں کے گھر میں بہار جوں گلزار

تمام شہر میں کھٹوں کے مالک ہیں گے بزاز
اور آج سب میں بڑے خودنما ہیں آئینہ ساز
ستارا اپنا کو دکھاتے ہیں سب کو آتش باز
کمان گر بھی ہوئے گھر میں اپنے تیر انداز
نہانی آری چلاتا ہے خلق پر نجار

جہاں میں صاحب شمشیر ہیں گے صیقل گر
ہے گندھیوں کا معطر سدا دکان اور گھر
ہمیشہ نازاں ہیں بھڑبھونجے اپنے بختوں پر
اہیر دود ملائی دہی سے ہیں خوگر
بنا ہے خانۂ نقّاش، رشکِ نقش ونگار

دلوں کے بیچ صفائی نہیں ہے یاروں میں
کہیں جو ہوئے بھی شاید تو اب ہزاروں میں
صندوق ساز کے زر ہے بھراپٹاروں میں
جو تھے سائیس سو نوکر ہیں اب سواروں میں
عراقیوں کے ہوئے ہیں سرطویلہ حمار[1]

مرزا جعفر علی حسرت

کسی کو حسن پرستی وعاشقی سے شوق

1۔ دیوان زادہ (قلمی) ص 347-346

کسی کو مطرب وے سے، کسی کو زہد سے ذوق
برائے گُل کوئی بلبل سے نالہ زن مافوق
ہَوائے سرو سے، جوں قمری اک رکھے کوئی طوق
سو، آہ سب ہوئے دامِ بلا میں بے پروبال

مٹے وہ چہچہے، سب کی گئی خوش الحانی
اسیر غم ہوئے یہ بلبلِ گلستانی
اب آب و دانے کی خاطر اٹھے ہے حیرانی
گہر فشانوں کی اب ہو چکی پَرافشانی
کٹی وہ شاخ ہی کرتے تھے جس پہ سب کریال

جو بادشاہ وہاں کا رکھے تھا تخت اور تاج
وہ اپنی قوت کو، اطفال کا ہوا محتاج
خدائی ہے جسے دیتا تھا سارا ہند خراج
غنیم (اس کا) لے اس سے، اس کے شہر سے خراج
وہ شکل ہے کہ کرے، شیر کو شکار شغال

وہ شہ سپہرِ انجم نمط تھی جس کی سپاہ
سو اس کی دیوڑھی پہ کئی پیادے ہیں بحال تباہ
سو مارے فاقوں کے مرتے ہیں، چھٹے نے تنخواہ
کہیں ہیں ہم کو ملے کیا خوراک خاص کو آہ
سحر کو تب ہو، جو پہونچے کڑوڑ، یا کتوال

جواہر اور خزانہ تو سب لٹا یکسر
رہیں سو کس پہ یہ فرقے کے نوکر اور چاکر
رہا نہ مال بجز سنگ کوٹھوں کے اندر
جو چھت تھی چاندی کی دیوانِ خاص میں پر زور

سو وہ وزیر نے کی خرچ، بھیج کر ٹکسال
جو اصطبل ہے سو دیوانِ خاص اس کا مکان
عراقی اور عربی سو بھی اس کی بیچ کہاں
جو فیل خانہ ہے، سو اس میں فیل کا نہ نشان
یہ میگذ نبراب اس سے لنگڑے گئے رواں (کذا)
کہ جس پہ جنگ کے دن لاتے تھے ایک نہال[1]
ہے میری ڈیوڑھی کے ناظر کو تیسرا فاقہ
جو محل دار ہے اس نے دیا ہے استعفیٰ
مچایا ترکنی کشمیرنی نے اب غوغا
رہے بچارے سلاطین ان کا حال سو کیا
کسی کے مرنے کی نوبت کوئی پڑا ہے نڈھال[2]

قائم چاندپوری
گردش کا آسماں کی جو ہو ہے کوئی سبب
اہل زمین پر آئے ہیں ایک رنج یا تعب
ٹوٹے غضب یہ تجھ پہ نہ اتنا کہیں غضب
مردوں کے جو کھڑنکھ سے پُر ہو نہ تا بلب
ایسی تا باؤلی ہے، نہ چشمہ نہ، چاہ ہے
قصبات، اک جگہ تھی، شریفوں کی بود و باش
فاسق نظر پڑے جو کوئی وہاں، بصد تلاش
عصمت زنوں کی، عفتِ مریم سے زیادہ فاش
تقوے کی رو سے مرد فرشتوں کی سی معاش

---

1 دیوان مرزا جعفر علی حسرت (قلمی رامپور) ص 133 (الف) اور (ب)

2 حوالۂ بالا ص 133 (ب)

سو بھوکھ سے حرام پر ان کی نگاہ ہے

جو شہرلیس تھے مصر سے، ہر چیز میں خراج
ٹھیکے دوا کے گنج میں، رہتے تھے جوں اناج
واں درد سے شکم کے کوئی مرنچا ہو آج
کس چیز سے حکیم کرے بیٹھ کر علاج

نے زیرہ ہے، نے سونف ہے، نے نان خواہ ہے

تن زیب پہرتے جنھیں آئی تھی جی میں عار
خاصہ ہمیشہ چشم میں ان کی تھا، بے وقار
سو ظلم سے تیرنے ہیں وے یاں تک ذلیل وخوار
دستار موے سر سے ہے اب ان سروں پہ بار

جامہ اگر ہے تن پہ تو وہ گردراہ ہے

وہ دن گیے کہ ساگ کو، گاہے جو من چلا
میتھی کو ایک دیر تلک، گوشت میں تلا
کھاتے ہیں اب تو آئے جو کچھ خاک یا بلا
نالی کے ساگ کا ہو الٰہی بہت بھلا

روٹی کا جس کے ساتھ، تنک اب، نباہ ہے

نوشہ کہے ہے یاروں سے اپنے یہ، بھر کے آہ
کس خبط میں ہیں بند خدا جانے قبلہ گاہ
احوال پر مرے بھی یہ کچھ کرتے ہیں نگاہ
مرتا ہوں میں تو جی سے یہ کس کا کریں ہیں بیاہ

فاقوں سے یاں کمر میں نہ قوت نہ باہ ہے

اس سب پر اب ہے عاشق ومعشوق تک یہ ڈھنگ
دیکھے جو نور شمع پہ تو جل مرے پتنگ

عالَم سے اٹھ گیا غمِ ناموس وپاس ننگ
جس سے سنو تو رشک سے بیٹی کے ماں ہے تنگ
دیکھو جدھر تو باپ کا بیٹا کا ڈاہ ہے [1]

سودا

باغ دلی میں جو اک روز ہوا میرا گزر
نہ وہ گل ہی نظر آیا، نہ وہ گلشن، نہ بہار
نخل بے بار پڑے، سوکھی پڑی ہیں روشیں
خاک اڑتی ہے ہر سمت پڑے ہیں خس وخار
مسکراتا تھا جہاں غنچہ وگل ہنستا تھا
اشک شبنم کے بھی قطرے کا نہیں واں آثار
جس جگہ جلوہ نما رہتے تھے سرو و شمشاد
مشت پر قمری کے اس جا نظر آئے اک بار
دیکھتا کیا ہوں مگر سوکھی سی اک شاخ اوپر
عندلیب ایک ہے بے بال وپرودل افگار
بدمِ سَردو بصد حسرت وصد سوز جگر
دیکھ کر سوئے چمن کہتی ہے بانالہ وزار
"حیف در چشمِ زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم وبہار آخر شد [2]"
فرصت چمن کی سیر کی لیکن ہمیں کہاں
فکرِ معاش وعشقِ بتاں یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے [3]

---

1. شہر آشوب قائم چاندپوری (مرتبہ جناب نثار احمد صاحب فاروقی) نقوش، اکتوبر 1961 ص 100-95
2. کلیات سودا (نول کشور 1932) جلد اول۔ ص 447-446۔ 3. ایضاً۔ 1 ص 210

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار
تلاش کرکے ڈبلیچے انھوں نے ہونا چار
ندانِ قرض میں بنیوں کے، دی سپر تلوار
گھروں سے اب جو نکلتے ہیں، لے کے وہ ہتھیار
بغل کے بیچ تو سوٹا ہے ہاتھ میں کچکول

کرے ہے بھوک سے شاگرد پیشہ اب یہ معاش
کہیں پلاؤ تو باورچی واں پکاویں آش
کریں قناتوں میں دربان بیٹھے پردہ فاش
تلے سے کھینچ لے مسند کو آن کر فراش
اگر کہیں کہ منا اٹھ کے چاندنی کا جھول

یہ خادمانِ محل کی ہے اِن دنوں صورت
نہ خوان ڈھونے کا کشمیرنی میں باقی ست
نہ اٹھ کے ہلنے کی ہرگز رونے میں طاقت
بنی ہے بھوک سے درباریوں کی یہ گت
کہ بوڑھی ہتھنی کے جس طرح بیٹھ جائیں کپول

مچارکھی ہے سلاطینوں نے، یہ توبہ دھاڑ
کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں، گریباں پھاڑ
کوئی دراپنے پہ آوے، دے مارتا ہے کواڑ
کوئی کہے ہے جو ہم ایسے چھاتی کے ہیں پہاڑ
تو چاہیے کہ ہمیں سب کو، زہر دیجیے گھول[1]

میر

ہیں خرابے آج جتنے کل یہ تھے لوگوں کے گھر

1۔ کلیاتِ سودا جلد اول۔ ص368-369

مت بنائے خانہ میں منعم رہا کر اس قدر

•

گھر کا صاحب تو اُڑایا کر کے یکساں خاک سے
اینٹ ماریں اینٹ سے یہ کچھ ہوا اس گھر اوپر

•

کیسے کیسے خان وادے خاک میں یاں مل گیے
جائے عبرت ہے یہ معمورہ جہاں کا بے خبر

•

سبز اِن تازہ رو کی جہاں جلوہ گاہ تھی
اب دیکھئے تو واں نہیں سایہ درخت کا

•

دمِ صبح بزمِ خوش جہاں شب غم سے کم نہ تھی مہرباں
کہ چراغ تھا سو دود تھا جو پتنگ تھا سو غبار تھا

•

حال گلزار زمانہ کا ہے جیسے کہ شفق — رنگ کچھ اور ہی ہو جائے ہے اک آن کے بیچ

•

خاک بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں — کس خرابے میں ہم ہوئے آباد

•

کیسے کیسے مکاں ہیں ستھرے — ایک ازاں جملہ کربلا ہے یہاں
اک سسکتا ہے ایک مرتا ہے — ہر طرف ظلم ہو رہا ہے یہاں

اس زمانے میں صوفیا اور علما نے اصلاحی کوششیں بھی کیں، چناں چہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس دور میں اپنی بصیرت سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ہندستان کا اقتصادی نظام بگڑ چکا ہے اور مذہب کی صحیح فکر بیدار کرنا ضروری ہے، انھوں نے حکمراں طبقہ کو اس کے فرائض یاد دلاتے ہوئے مطالبہ کیا۔

"یہ کہ بادشاہِ اسلام اور امرا عظام ناجائز عیش و عشرت میں مشغول نہ ہوں گزشتہ گناہوں سے سچے دل سے توبہ کریں اور آئندہ گناہوں سے بچتے رہیں"۔[1]

اسی طرح شاہ فخر الدین[2] دہلوی نے بادشاہِ وقت کو ہدایت کی:

"پس پہلی مقدم بات یہ ہے کہ وہ لوگ بذاتِ خود محنت کشی اور ملک گیری کے لیے مستعد ہوں"۔[3]

لیکن صوفیا اور علما کی یہ کوشش بارآور نہ ہو سکی، زوال اور انحطاط کی رفتار تیز سے تیز تر ہوگئی۔ مرکزی حکومت میں رخنے پیدا ہو چکے تھے۔ ایرانی اور تورانی گروپ کی آویزش بڑھ کر بحران کی کیفیت اختیار کر چکی تھی اور اسی کا اثر تھا کہ صوبائی حکومتیں مرکز سے زیادہ طاقت ور اور تقریباً خود مختار ہوگئی تھیں، جو سلطنت مغلیہ بائیس صوبوں پر مشتمل تھی، اور جس کا ڈنکا کشمیر سے دکن تک اور بنگال سے کابل و قندھار تک بجتا تھا، اب سمٹ کر قلعۂ معلٰی کی چار دیواری میں آگئی تھی۔[4] یقین کا ذیل کا شعر اس تباہی و بربادی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔[1]

گر نہ ہوتا آشیانِ بلبلِ غم گیں خراب
کر نہ سکتا باغ کو اے باغباں گلچیں خراب[5]

---

1. شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ص96

2. شاہ فخر الدین دہلوی (1126ھ 1199ھ) شاہ نظام الدین اورنگ آبادی کے بیٹے اور جانشین تھے 1165ھ میں دہلی تشریف لائے اور اجمیری دروازہ کے مدرسہ میں جو آج کل دہلی کالج کہلاتا ہے درس و تدریس کا کام شروع کیا تھا۔ اور درسی کتابوں کے علاوہ حقائق و معارف کے دریا بہا دیئے۔ آخری وقت تک دہلی میں قیام رہا اور یہیں انتقال فرمایا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پاک کے قریب سپرد خاک کیا گیا۔ مفصل حالات کے لیے ملاحظہ ہو، مناقب فخریہ، فخر الطالبین، تکملہ سیر الاولیا، تاریخ مشائخ چشت۔ ص۔460-529۔

3. مناقب فخریہ (قلمی مملوکہ پروفیسر خلیق احمد نظامی) ص36-35۔

4. چہار گلزار شجاعی (قلمی) ص484۔

5. دیوان یقین۔ ص9۔

بادشاہوں کی غفلت شعاری اور عیش پرستی سے امرا کا طبقہ سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے، ہندستان میں بھی ایسا ہی ہوا۔ جادو ناتھ سرکار نے صحیح لکھا ہے کہ ان امرا کی آویزش اور گروہ بندی کے مسموم اثرات محلاتِ شاہی سے لے کر دور دراز کے جھونپڑوں تک پہنچتے تھے، اور سماجی زندگی میں کشمکش اور تلخیاں پیدا کرتے تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد دربار میں دو جتھے بن گئے تھے۔ ایرانی (شیعہ) اور تورانی (سنی) انھوں نے سیاسی حالات کو اپنا تختۂ مشق بنا رکھا تھا اور اس دور کی تاریخ دراصل انھیں فرقوں کی کشمکش کی داستان ہے۔ حتیٰ کہ بادشاہوں کی قسمت بھی انھیں امرا سے وابستہ ہو کر رہ گئی تھی۔ سرکار نے تاریخ احمد شاہ کے حوالے سے لکھا ہے۔

''یہ تمام فتنہ و فساد ایرانی اور تورانی امرا کے آپس کے جھگڑوں کا نتیجہ ہے۔''[1]

ان حالات میں ملک کی تمام دبی ہوئی سیاسی قوتوں نے قسمت آزمائی شروع کردی۔ مرہٹے، سکھ، روہیلے اور جاٹ، سب اس پراگندہ سیاسی ماحول کا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اور ملک سے امن واماں رخصت ہو چکا تھا۔

اس اندرونی کمزوری اور کشمکش کا پورا فائدہ ایک بیرونی طاقت نے اٹھایا یعنی انگریزوں نے اس تفریق کو اور بھی ہوا دے کر اپنی حکومت کے لیے میدان ہموار کرلیا۔ اور جن صوبائی طاقتوں سے کبھی سرکشی متوقع ہوسکتی تھی انھیں ختم کردیا یا مفلوج کرکے رکھ دیا۔

یہ تھا ایک مجمل خاکہ اس ماحول کا جہاں میر محمد تقی میر (1135ھ 1722) میں پیدا ہوئے اور ان ہی حالات میں ان کی نشوونما ہوئی۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سیاسی حوادث کا جائزہ قدرے تفصیل سے لیا جائے جن کا میر نے مشاہدہ کیا یا ان سے متاثر ہوئے اور جن حالات کی طرف انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح عمری، ذکر میر، میں اشارے کیے ہیں۔

---

1. مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی) جلد 1۔ ص8۔ ایرانی و تورانی جتھوں کے آپسی جھگڑوں کے مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو۔

Parties And Politics At the Mughal Court Satish Chandra, Aligarh, 1959

بیرونی حملے

اٹھارھویں صدی میں ہندستان پر متعدد بیرونی حملے ہوئے کیوں کہ مغربی سرحد کی حفاظت کی طرف اورنگ زیب کے بعد کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی، ان حملوں نے ملک کے سیاسی اور اقتصادی نظام کو درہم برہم کر دیا اور باغیانہ قوتوں کو سلطنتِ مغلیہ میں ہر طرف سے ابتری اور انتشار پیدا کرنے کے مواقع فراہم کر دیے۔

دربارِ مغلیہ کی حالت

اس زمانے میں تختِ مغلیہ پر محمد شاہ رنگیلا (1719-1748) جلوہ افروز تھا۔ یہ بادشاہ فطرتاً کمزور، بزدل، عیش پرست اور کاہل واقع ہوا تھا۔ افیون کھا کھا کر اپنی تندرستی اتنی خراب کر لی تھی کہ چلنا پھرنا بھی اس کے لیے مشکل ہو گیا تھا، ہاتھیوں کی جنگ دیکھ کر دل بہلاتا اور امورِ مملکت سے تغافل برتتا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے عام طور پر اپنے درباری امرا اور خاص طور پر کچھ منظورِ نظر امرا کو بے حد حقوق تفویض کر دیے تھے۔

بقول غلام علی طباطبائی:

''لیکن روشن الدولہ دخیل مزاج بادشاہ ہو کر برآمد کار مقدمۂ خلائق کرتا تھا اور شاہ جہاں محمد فقیر کی لڑکی کوکی نے محمد شاہ کے حضور میں نہایت ادب حاصل کیا اور بادشاہ کا قلم دان اس کے سپرد تھا وہ بادشاہ کی طرف سے صاحبِ دستخط تھی۔ محل کے اندر حاجت مندوں کی عرضی توقیع کرتی تھی۔ بادشاہ چوں کہ جوان اور کم جرأت تھا، عیش و عشرت میں پڑا رہتا۔ عمدۃ الملک امیر خاں وغیرہ امرا اور امرا زادہ خوش طبع و رنگین مزاج کی طرف طبعیت کو اپنی رغبت دی۔ کارِ سلطنت سے بے غرض تھا۔ اس سبب سے کچھ کچھ خوف و ہراس امرا بلکہ عوام کے دلوں سے دور ہونے لگا۔ ہر شخص اپنے اپنے خیالی پلاؤ پکانے میں مصروف نظر آنے لگا۔'' بجائے خود دمِ استقلال بھرتے تھے[1] اس طرح بادشاہ کے منظورِ نظر امرا امورِ ملکی میں سفید و سیاہ کے مالک بن بیٹھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درباری امرا میں نفاق اور عناد کی گرم بازاری ہو گئی۔ ہر ایک امیر اپنے مدِ مقابل کی بیخ کنی میں اپنی تمام قوت ضائع کرنے لگا۔ حاتم اپنے ذیل کے شعر میں امرا کے نفاق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

1۔ سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج 2 ص 82 نیز ملاحظہ ہو۔ مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی سرکار) ج 1 ص 10-9۔

سارے تونگروں میں جو دیکھا تو ہے نفاق
آپس میں ہے جو کچھ تو غریباں کی دوستی [1]

اس زمانے میں درباری امرادو گروہوں۔ایرانی،اور تورانی میں منقسم تھے۔ایک گروہ دوسرے کے خون کا پیاسا تھا۔اس عنادونفاق کے مسموم اثرات سارے ملک کی سیاسی فضا کو متاثر کرر ہے تھے۔[2]
نظام الملک[3] آصف جاہ تورانی گروہ کا لیڈر اور وزیر الممالک تھا،اس کے مدِ مقابل عمدۃ الملک امیر خان[4] میر اسحاق انجام اور اسحاق خاں[5] نجم الدولہ تھے اور ایرانی جماعت کی پیشوائی کرر ہے

---

1. دیوان زادہ (قلمی) ص299۔ 2. مغلیہ سلطنت کا زوال۔ج1 ص8

3. نظام الملک کے نانا،سعد اللہ خاں،شاہ جہاں بادشاہ کے وزیر اعظم تھے،والدہ کی طرف سے اُن کا سلسلۂ نسب شیخ شہاب الدین سہروردی تک پہنچتا ہے،ان کے والد میر شہاب الدین غازی الدین خان،اورنگ زیب کے عہد میں اعلیٰ مناصب پر فائز رہے۔نظام الملک کا اصلی نام میر قمر الدین تھا۔بہادر شاہ کے زمانے میں خانِ دوراں بہادر کا خطاب ملا اور صوبۂ اودھ کی صوبیداری اور لکھنؤ کی فوجداری تفویض ہوئی۔ناسامعد حالات سے مجبور ہوکر کچھ دنوں خانہ نشیں رہے جہاں دار شاہ کے زمانہ میں پھر سابق عہدہ ملا۔فرخ سیر کے زمانہ میں نظام الملک فتح جنگ کے خطاب کے ساتھ دکن کی نظامت کا منصب ملا۔سید بھائیوں کے زوال اور محمد امین خاں وزیر کے انتقال کے بعد محمد شاہ نے ان کو اپنا وزیر مقرر کیا۔

آصف جاہ صاحب دیوان شاعر تھے،ان کے دربار سے عرب،خراسان عراق اور ماوراء النہر کے علما،شعرا اور ادبا منسلک تھے۔ان کی وفات 1134ھ میں ہوئی۔برائے تفصیل دیکھیے ماثر الامرا (فارسی) ج3 ص848- 838 ،خزانۂ عامرہ ص49-35۔سفینۂ ہندی،بھگوان داس ہندی) ص8-7،عقد ثریا ص6،گل عجائب ص22-21

4. یہ میر میران نعمت اللہ ولی کی نسل سے تھے۔امیر خاں نام اور عمدۃ الملک خطاب تھا۔محمد شاہ کے جلیس خاص تھے۔نہایت ظریف،حاضر جواب،لطیفہ گو اور شیریں کلام تھے۔موسیقی اور گانے میں بڑا درک تھا۔فارسی اور ریختہ دونوں میں شعر کہتے تھے۔شاعروں کے قدردان بھی تھے،میر شاکر ناجی ان کے داروغہ دیوان خانہ تھے۔1159ھ میں قلعۂ معلیٰ کے دروازے پر کسی سپاہی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔برائے تفصیل۔سفینۂ ہندی۔ص7-6 ماثر الامرا (فارسی ج2 ص 839-841 عقد ثریا ص9 تذکرہ ریختہ گویان ص20۔مخزن نکات ص31۔گل رعنا ص107 ،گلشن ہند ص14 زوال سلطنت مغلیہ،ج1 ص11-10

5. محمد اسحاق خان معتمد الدولہ (برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ماثر الامرا۔(فارسی) ج3 ص775-774) کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے اسحاق خاں دوم (نجم الدولہ) کو محمد شاہ کی قربت حاصل ہوئی۔دیوان خالصہ کا منصب ملا۔احمد شاہ کے عہد میں سابق منصب قائم رہا۔جب صفدر جنگ نے بنگش افغانوں کے خلاف فوج کشی کی تو محمد اسحٰق خان اس کے ساتھ گیا۔افغانوں سے جنگ کے موقع پر اس نے بڑی بہادری دکھائی لیکن میدان جنگ میں کام آیا۔ماثر الامرا (فارسی) ج3 ص776-775

تھے۔ بقول سر جادو ناتھ سرکار "1736 کے بعد کی تاریخ مغلیہ درحقیقت ان دونوں گروہوں کی تاریخ ہے۔[1] سنی امرا نظام الملک کو معزول کرانے کی کوشش میں ہر وقت لگے رہتے تھے۔ وزیر الممالک امور ملکی اور مالی میں چند ضروری اصلاحیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہ لوگ اس کے اس کام میں رکاوٹیں پیدا کرتے تھے طباطبائی کا بیان ہے کہ

"نظام الملک چاہتا تھا کہ بادشاہ اس کی رائے کے بموجب تعمیل کرے اور صحبت رنگین مزاجان نازنین منش واختیار مدار المہامی زنانِ نازک سرشت مثل کوکی وغیرہ دل بادشاہ اور کاروبار ملکی مالی سے نکل جاوے، اس سبب سے ہر ایک امیر وامرا اور بادشاہ اس کی طرف سے بدظن اور مسخرگی کرتے اور غیبت میں اس کے حق میں کلماتِ رکیک زبان پر لاتے تھے"[2]

اس وقت نظام الملک کی عمر 94 سال سے بھی زیادہ تھی، اب اس کے قویٰ میں اتنی طاقت باقی نہ تھی کہ وہ اپنے مخالفین کو بزور شمشیر دبا سکتا۔ لہٰذا اس بے بسی، دل برداشتگی، مایوسی و پریشانی کے عالم میں اپنے دشمنوں سے پیچھا چھڑانے کی غرض سے اس نے نادرشاہ کو ہندستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ نادرشاہ نے جو پہلے ہی ایسے موقع کی تلاش میں تھا، فوراً دعوت قبول کر لی اور 1151ھ 1739 میں اس نے ہندستان کا رُخ کیا۔ اٹک ندی پار کر نادرشاہ ہندستان کی سرحد میں داخل ہو گیا جب لاہور کے ناظم زکریا خان[3] کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ اپنی فوج لے کر آگے بڑھا اور نادرشاہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور دہلی سے کمک بھیجنے کی درخواست کی، لیکن

1۔ مغلیہ سلطنت کا زوال، ج 1، ص 8۔

اپنے ہاتھوں آپ ہی کرتے ہیں سر تن سے جدا   ورنہ کیا طاقت ہے آوے اس جگہ جلاد کو

تذکرہ ہندی ص 151۔   کس جنگ جو کی صبح کو باتیں نکالیاں ☆ باہم صبا چمن میں الجھتی ہیں ڈالیاں

2۔ سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج 2 ص 82۔ تذکرہ گلشنِ ہند، ص 36

3۔ یہ سیف الدولہ عبد الصمد خاں (برائے تفصیل، ماثر الامرا (فارسی) ج 2 ص 517-514) کا بیٹا تھا والد کی زندگی میں لاہور کا صوبہ دار بنایا گیا اور بعد میں ملتان بھی اس کے سپرد ہوا۔ نادرشاہ جب ہندستان سے واپس چلا گیا اور اس نے زکریا خان کو سندھ بھیجا۔ 1158ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ ماثر الامرا (فارسی) ج 2 ص 107-106۔

بادشاہ اور اس کے امرا رقص و سرود کی محفلیں سجائے بیٹھے تھے، کسے فرصت تھی کہ اس درخواست پر غور کرتا۔ زکریا خان نے ایسے حالات میں ہتھیار ڈال دینا ہی مناسب سمجھا۔ نادر شاہ فاتح کی حیثیت سے لاہور شہر میں داخل ہوا، ایرانی سپاہ نے شہر اور گردونواح کے قصبوں اور گاؤں کو تخت وتاراج کرنا شروع کر دیا۔

آنند رام مخلص نے اس تباہی و بربادی کا نقشہ اپنے مخصوص انداز میں یوں پیش کیا ہے۔

''چہ نوشتہ شود، کہ برآں دیار وسکنہ آں گلزار چہ قیامت گزشت، مثل وزیر آباد، آمن آباد، گجرات وقصبہ جات کہ ہر یکی بنا بر کثرت آبادی نیچہ شہرے بودہ است، بخاک سیاہ برابر گشت، برہمگی آں گل زمین بہزار رنگ بیداد رفت، مالہا بتاراج وناموسہا برباد رفت۔''

نوک خاری نیست کز خونِ شکاری سُرخ نیست

آفتی بود، ایں شکار افگن کزیں صحرا گزشت 1

جب زکریا خان کے مغلوب ہونے کی خبر دربار دہلی میں پہونچی تو بادشاہ اور امرا دونوں کا نشہ کافور ہو گیا۔ جوں توں محمد شاہ نے فوج آراستہ کی اور بذاتِ خود نادر شاہ کے مقابلے کو روانہ ہوا۔ کرنال پہونچ کر فروکش ہوا۔ لیکن اس جنگ میں مغلوں نے منہ کی کھائی، اور مفتوح کا کافی جانی و مالی نقصان ہوا، مرزا محمد مہدی نے ذیل کے اشعار میں اس تباہ کن جنگ کا نقشہ پیش کیا ہے۔

شد افروختہ آتشِ رزم کیں	زخون گشت گلگوں سرای زمیں
گرفتہ زگرد سپہ مہر وماہ	فضائے جہاں گشتہ چوں شب سیاہ
زنوک سنا نہائے خارا گزر	شدہ چشمہ چشمہ زدہ سُر بسر
زغلطیدن کشتگاں در مصاف	شدہ پشتہ برپشتہ چوں کوہ قاف
زبسیاری کشتہ وخستہا	در آں عرصہ خالی نبد وجای پا 2

1 اقتباس بدائع (اورئنٹل کالج میگزین، ماہ اگست 1950) ص 65 سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج 2 ص 105-108

2 برائے تفصیل جہاں کشائے نادری ص 233 تا 237، نیز لیٹر مغلس (انگریزی) ج 2۔ ص 349، میر کی آپ بیتی۔ ص 92۔

بے شمار مالِ غنیمہ، سامانِ حرب، ہاتھی گھوڑے فاتح کو دستیاب ہوئے۔ بقول مرزا محمد مہدی ''خزائن بے حدود یر دفیلان کوہ پیکر وتوپخانہ ہا بادشاہی وامرا کہ بعرصۂ جنگ آمدہ بودند با غنایم بسیار واسباب واثاثۂ فزوں از شمار بحیطۂ تصرف درآمد[1]،،

بعدازیں امرا کی وساطت سے صلح کی گفتگو شروع ہوئی، محمد شاہ، نظام الملک کے ساتھ نادر شاہ سے ملاقات کرنے اس کے قیام گاہ پر گیا، یہ ملاقات خوشگوار رہی، اس کے بعد محمد شاہ اور نادر شاہ نے دہلی کے لیے کوچ کیا، دہلی میں نادر شاہ مہمان کی حیثیت سے قلعۂ معلی میں فروکش ہوا۔ محمد شاہ نے دل کھول کر مہمان نوازی کے فرائض انجام دیے۔ یہ واقعہ 1151 ھ کا ہے جب دہلی کے قلعہ میں دو بادشاہ رونق افروز تھے مخلص نے اس واقعہ کی تاریخ کہی ہے۔

در ہزارو صد پنجاہ ویک شاہِ ایراں گزشت از آبِ اٹک
یک مملکتِ ہند دو خسرو دارد چیدہ است عجب بازی شطرنج فلک[2]

اس سال عیدالاضحیٰ کے موقع پر جامع مسجد میں اور دیگر مقامات میں نادر شاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا[3]

دہلی میں قتلِ عام

ایک دن کا واقعہ ہے کہ ایرانی سپاہی شہر میں گشت کرتے پھر رہے تھے، کچھ ناعاقبت اندیش ہندستانیوں نے افواہ اڑا دی کہ نادر شاہ مارا گیا۔ اب کیا تھا شہر کے کچھ غنڈوں نے ان پر وار کیا۔ اس وجہ سے شہر میں بدامنی پھیل گئی، اور اس ہنگامہ میں سات سو ایرانی مارے گئے[4]۔ جب نادر شاہ کو اس حادثہ کی خبر پہونچی تو اس کے غیض وغضب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ قلعہ معلی سے نکل کر چاندنی چوک کی سنہری مسجد (جو آج بھی کوتوالی کے پاس ہے) میں آیا اور قتل عام کا حکم صادر کیا۔ آناً فاناً ایرانی سپاہیوں نے لوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم کردیا۔ ہنگامۂ کشت وخون صرّافہ اردو ئی (یہ مقامِ لال قلعہ کے قریب تھا) سے پرانی عیدگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ خانم کا بازار جامع مسجد کے قرب وجوار کا علاقہ، روئی فروشوں اور جوہریوں کے بازار تباہ کردیے گیے، کئی مقامات پر آگ لگادی گئی، جس کسی کو گلی کوچوں، سڑکوں اور دکانوں پر پایا، چاہے وہ بڑا ہو یا چھوٹا، عورت یا مرد،

1۔ جہاں کشائے نادری ص۔ 237) 2۔ اقتباس بدائع وقائع دار نٹیل کالج میگزین۔ ماہ اگست 1950) ص 61

3۔ سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج 2۔ ص۔ 109 4۔ سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج 2۔ ص۔ 109

اسے تہِ تیغ کر دیا۔ یہاں تک کہ جانور بھی اِس زد سے محفوظ نہ رہ سکے اور ہزاروں کی تعداد میں عورتیں مقید کر لی گئیں اور ہزاروں نے ''جوہر'' کیا۔ قتل اور غارت گری کا یہ بازار صبح آٹھ بجے سے سہ پہر تک گرم رہا۔ ایک لاکھ بیس ہزار افراد قتل ہوئے، پندرہ ہزار مجروح اور زخمی ہوئے۔1 طباطبائی نے لکھا کہ ''دوپہر تک وہ زدوکشت ہوئی کہ خون کے نالے بہے اور مقتولوں کا شمار اندازۂ قیاس سے باہر ہوا...... لاشوں کی کثرت سے راہ میں وہ تعفن تھی کہ گزر دشوار ہوا۔ آخر صفائی کا حکم ہوا اور کوتوال شہر نے سب لاشیں جمع کرا کے بے تلاش ہندو مسلمان کے خس وخاشاک میں جلوا دیں''2

معاصر لٹریچر میں اس غارت گری وتباہی کا بڑا دل دوز نقشہ ملتا ہے۔

اشرف علی خاں پیام

دہلی کے کجکلاہ لڑکوں نے کام عشاق کا تمام کیا
ایک عاشق نظر نہیں آتا ٹوپی والوں نے قتل عام کیا 3

مرزا عسکری

تو نادر شاہ ہے ملک پری رویوں کا اے ظالم
جدھر بھر کر نظر دیکھے تو قتلِ عام ہو جائے 4

تاریخ ہندی کے مصنف کا بیان ملاحظہ ہو:

''چناں چہ سہ پاس قتلِ عام بر خاص وعام بود، بروایتی عدد مقتولان قریب یک لک رسید ہرج ومرج بر مردم شاہ جہاں آباد بدرجہ از دیا درو داد، چناں چہ خانہ بوعلی کوکہ وخانہ تربیت خاں کہ از امرای عالی شان بود بتاراج رفت وحکیم امام الدین کہ سید برحق وبکمالات حکمت وطبابت سر آمد حکماء روزگار بود ودر جود وسخاوت ممتاز ایں دیار بود بہ معہ توابعان بدرجۂ شہادت رسید بروایتی حکیم علوی خان کہ در کمال علوم حکیمی وقت بود نیز ہم چناں شد،

---

1 نادر شاہ (انگریزی) فریزر ص 18 تا 183۔

2 سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج 2۔ ص۔ 110۔

3 اقتباس بدائع وقائع (اورینٹل کالج میگزین 1941) ص 133

4 عیار الشعرا (قلمی) ص 316۔

وبسیاری از علما وصلحاء وحافظ قرآن وقرا بدرجۂ شہادت فائز شدند، شہوار خاں، وسید نیاز خان وخوشحال رای مشرف تخت راد بگیر ساختہ شکم پارہ نمودہ ووالہ بر ویخاں قراول بیگی کہ از امرا قدیم وبمنصب ہزاری سرفرازی داشت بنابر درشتی مخلصان خود را کشت،،1

بقول اعظم خان بہادر:-

''عالم راہ سیوف آبدار ساختند وجہانے راچوں خس وخاشاک درہم شکستند، بسان دیوان عربدہ خوں وفیلان بدمست خوی تمیز از دست دادہ ونیک وبدہیچ نشناخطہ طفلانِ معصوم وزنانِ معصوم رادولخت می ساختند، جانوروں مجبور ووحشیاں معذور از تیغ بیدریغ آنہا پناہ نیافتند، بلکہ گربہ وسگاں راازدست شان رہائی نیافتہ، طعمۂ مرگ شدند، چہ گویم ازاں قتلِ عام وچہ نالم ازاں روز بد سرانجام آں موکلان ملک الموت ونایبان عزرائیل بداں شکل وشمائل در کوچہ وبازار وخانہ ودیوار برآمدہ فیض ارواح عالم نمودہ دست بغارت کشادند، زروجواہر وخزینہ ودفینہ ومال ومتاع کہ خراج مملکت اقسام بتاش وتاراج کردند...... از جمیع اطراف شہر فراہم آمدہ در شہر پناہ واردو ئے معلا ومحلات چاندنی چوک وفیض اللہ بازار وجوہری بازار ودیگر امکنہ محفوظ ومحروس پنداشتہ، مال گزیدہ بود، ہمہ تلف وپائمال گشتند، وننگ وناموس غربا ؤ اغنیا بدست آنہا گرفتار شدند، ہزاراں پری پیکر بدیع جمال کہ از عصمت وعفت گاہے بطرف خورشید ومہ درست نگاہ نکردپیش وپس آنہا دررستہ وبازار برہنہ بدتر از احوالِ خاکساران وگنہ گاران می رفتند بجز آں کارنامہ دیگر انچہ احمال واثقال از طاقتِ بشری خود فراواں دیدند، حوالۂ آتش نمودند۔ شعلۂ آتش جوش برفلک رسید ونائرۂ غضب درخروش اطراف عالم رویدہ زلزلہ کلاں درستخیز نمایاں آشکارہ بودہ۔ بقیۃ السیف، اکثری از اہل ناموس علی الخصوص بیشتر از جوہریان، جوہر عزت خود آشکارا کردہ ''جوہر'' نمودند، بسیاری زنان بچہای خود را کشتند وداغ حسرت

1۔ تاریخ ہندی (قلمی) ص 573-572۔

وخجالت وندامت بالملامت بروند، برخون ودل جگر کون برداشتند" (کذا)[1]

مختصر یہ کہ محمد شاہ رنگیلے کی دلی[2] کے جو کوچے گلزار کی روشوں سے خوبصورتی میں کسی طرح بھی کم نہ تھے، اور ہر ایک کوچہ دلاویز زُلف کے مانند تھا اور جس کے ہر محلے میں بلبلوں کی سی شور انگیزی تھی، اسے اب ایسی نظرِ بد لگی تھی کہ زلفِ بتاں کے مانند پریشان حال تھا اور بقول آنندرام مخلص "اپنی اصلی حالت پر دوبارہ آنے کے لیے اسے ایک مدتِ دراز درکار ہوگی" آتش زنی کی وجہ سے اب شہر خاکِ سیاہ ہو گیا ہے۔

دل سروکارش برنگا رنگ داغ افتادہ است
ہمچو دہلی شہر خوبی بے چراغ افتادہ است[3]

مختصر یہ کہ دلی تباہ و برباد ہوگئی، بقول خواجہ برہان الدین عاصمی:

چمن کے تخت پر جس دن شہ گل کا تجمل تھا ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اور شور تھا غل تھا
خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں بتاتا باغباں رو رو کے یہاں غنچہ تھا واں گل تھا[4]

1۔ تاریخ مبارکنامہ از اعظم خاں بہادر (قلمی) ص149 (الف)، 149 (ب)

2۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ "مرقع دہلی" از درگاہ قلی خاں، کلیات میر، حدیقۃ الاقالیم ص41

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے ☆ جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں ☆ دلی سے بھی دیار ہوتے ہیں
دلی تھی طلسمات کی ہر جاگہ میر ☆ ان آنکھوں سے ہم نے آہ کیا کیا نہیں دیکھا

3۔ وقائع آنندرام مخلص (قلمی) حصہ دوم ص17 (الف) تا 18 (الف)۔ نیز ملاحظہ ہو۔ اقتباس بدائع وقائع اورینٹل کالج میگزین ماہ نومبر 1941) ص-80

اب شہر ہر طرف سے میدان ہو گیا ہے ☆ پھیلا تھا اس طرح سے کا ہیکو یاں خرابا: کلیات میر ص26

4۔ نکات الشعرا۔ میر (مرتبہ مولوی عبدالحق) ص119، نادر شاہ کے حملے اور دہلی کی تباہی و بربادی کے متعلق تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو۔ مراۃ آفتاب نما (قلمی) ص150 (الف) نادر نامہ (قلمی) ص231 (الف) تا ص233 (ب)

وقائع آنندرام مخلص (قلمی) حصہ دوم ص17 (الف) تاریخ چغتائی (قلمی) 406۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

نادرشاہ نے اپنے لڑکے نصراللہ کی شادی شاہی خاندان کی ایک شہزادی سے رچائی۔ تاوان اور دیگر طریقوں سے نادرشاہ کے قبضے میں بے حساب دولت پہونچ گئی، چوں کہ ایک طرح سے محمد شاہ کو اپنی گئی ہوئی سلطنت پھر سے ملی تھی اس لیے اس نے بطور پیش کش دریائے اٹک کے اس طرف کے تمام علاقے مثلاً کابل اور دیگر چار محال، ٹھٹھ اور ملتان کا نصف صوبہ نادرشاہ کی خدمت میں پیش کیا جو اس نے بڑی خوشی سے قبول کر لیے[1]

نادرشاہ کے حملے کے نتائج

نادرشاہ کا حملہ اپنے اثرات ونتائج کے اعتبار سے بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ پہلی بار ہندستان سے بے حساب دولت، مغل بادشاہوں کی سات پشتوں کے جمع کیے ہوئے خزانے کسی بیرونی ملک کی طرف منتقل ہوئے اور انھوں نے ہندستان کو اقتصادی طور پر بدحال کر دیا تھا۔ شیوداس لکھنوی کے اندازے کے مطابق سب زرونقد، ساز و براق، گھوڑے، ہاتھی، سونے چاندی کے ظروف اور جواہرات وغیرہ جو نادرشاہ اپنے ساتھ لے گیا، ایک ارب اسی کروڑ روپے کی مالیت کے تھے۔ ان میں صرف تختِ طاؤس جو بقول آنند رام مخلص ''آبروئے

(بقیہ صفحہ نمبر 19 کا)

مجمع النفائس (قلمی) ص 103 تاریخ مبارکنامہ (قلمی) ص 147 (الف)، 147 (ب)، سیر المتاخرین اردو ترجمہ، ج 2، ص 110-109۔ دیوان مرزا جعفر علی حسرت (قلمی) ص 132 (ب) تا 135 (ب)، مجمع الاخبار (قلمی) ص 452 (الف)، عماد السعادت (قلمی) ص 37، (ب) دیوان مصحفی (مرتبہ حسرت موہانی) ص۔ 66 اخبار محبت (قلمی) ص 478 تا 479، بیان وقائع نادرشاہ (قلمی) ص 16 (الف) 16 (ب) جہاں کشائے نادری (مطبوعہ 1292ھ) ص 241۔ حدیقۃ الاقالیم 44، شہر آشوب سودا، حاتم، تاریخ محمد شاہی (قلمی) 129 (ب) 130 (الف) نیز 144 (الف) تاریخ مظفری (قلمی) ص 237 (ب) لیٹر مغلس (انگریزی) ج 2۔ ص۔ 370-364 عیار الشعرا (قلمی) 316،

فہرست خاندان مغلیہ (قلمی) ص 107 (ب)

1. جہاں کشائے نادری، ص 243، تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص 47، تاریخ مبارکنامہ (قلمی) ص 155 (ب) تاریخ مظفری (قلمی) ج 1، ص 239 (الف) مجمع الاخبار (قلمی) ص 453 (الف) نادرشاہ، فریزر 226-222۔

ہندوستان[1]، تھا، سات کروڑ کی لاگت سے تیار ہوا تھا[2] اس حملے کے بعد بقول شاکر خان "ہمہ مداخل کمی فاحش پذیرفت ومخارج بحال ہیچ رونق در سلطنت نماند"[3]

سیاسی اعتبار سے یہ حملہ اپنے نتائج کے لحاظ سے بہت خطرناک اور نقصان رساں ثابت ہوا، اس نے مغلیہ بادشاہوں کے ظاہری وقار کو بڑا دھکا پہونچایا اور ان کی کمزوری کو ظاہر کر دیا، اس کی وجہ سے ملک کی باغی سیاسی طاقتوں کو ابھرنے کا سنہرا موقع ملا۔ مرہٹہ، جاٹ، سکھ وغیرہ کی نظریں دہلی پر جمی ہوئی تھیں۔

مرہٹوں نے بنگال وبہار میں لوٹ مار وغارت گری شروع کر دی پنجاب میں سکھوں نے حالات کو بد سے بدتر کر دیا، تاخت وتاراج کی وجہ سے تجارت کے راستے مسدود ہو گئے، زراعت تباہ وبرباد ہو گئی۔ اس حملے کے دس سال بعد احمد شاہ ابدالی نے ہندستان پر مسلسل نو حملے کیے اور ملک کو خوب لوٹا گھسوٹا اور برباد کیا۔

جارج ہنری گروز کا یہ بیان بہت اہم ہے کہ جنوبی ہند اور مرکز سے دور کے صوبوں میں اس حملے کے ان سیاسی نتائج کو محسوس نہیں کیا گیا جو چند برسوں کے بعد ظہور پذیر ہوئے، اس حملے نے مغلیہ سلطنت کے اقتصادی نظام کے علاوہ سیاسی اقتدار وصولت کو بہت بڑا دھکا پہونچایا تھا، حالانکہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد سے ہی مغلیہ سلطنت کا اقتدار ووقار زوال کی طرف مائل تھا، لیکن اس خطرناک وتباہ کن حملے نے زوال کی اس رفتار کو تیز تر کر دیا، اور مغلوں کے رہے سہے اقتدار کو یک قلم ختم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ داروں نے اپنے طرزِ عمل میں آزادانہ رویہ اختیار کر لیا۔ بادشاہِ وقت کی مرضی کے خلاف اپنے اپنے صوبوں پر قابض رہنے لگے اور اس کی مرضی کے خلاف اپنے علاقوں میں جاگیرداروں کا تقرر کرنے لگے۔ علاوہ ازیں یہ صوبہ دار اپنے جانشین خود مقرر کرنے لگے۔ یہ طرزِ عمل وطریقہ کار ایسا تھا کہ اس سے بادشاہ اور صوبہ دار دونوں کا

---

1. مراۃ الاصطلاح، (قلمی) ص60 (الف)

2. تاریخ فرخ سیر بادشاہ (قلمی مملوکہ جناب حسن عسکری صاحب، پٹنہ) 267، نیز ملاحظہ، نادر شاہ (فریزر) ص220-219۔ تذکرہ مشاہیرِ عالم، تاریخ مبارکنامہ (قلمی) ص152 (الف) ص152 (ب) جہاں کشائے نادری صفحہ 243، چہار گلزار شجاعی (قلمی) ص305

3. تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص47۔

عوام کی نظر میں وقار گر گیا۔[1]

میر تقی میرؔ اسی زمانے میں آگرہ سے دہلی آئے تھے اور یہاں خواجہ باسط کے توسط سے ان کی رسائی امیر الامرا صمصام الدولہ[2] کے دربار میں ہوئی۔ نواب نے حقوق سابق پر نظر کر کے ایک روپیہ روزان کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ لیکن نادر شاہ کے حملے کی خبر سن کر محمد شاہ کی طرف سے جو لشکر مقابلہ کرنے کے لیے کرنال تک گیا، اس میں صمصام الدولہ بھی تھے جو وہیں نادر شاہ کا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔[3] اور میر کا یہ روزینہ بھی بند ہو گیا۔ میر نے حملۂ نادر شاہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے اِس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ اس کے شاہدِ عینی نہ تھے۔

(ب) احمد شاہ ابدالی

احمد شاہ ابدالی نے نادر شاہ کے حملہ کے آٹھ سال بعد 1747 سے 1769 تک ہندستان پر نو حملے[4] کیے۔ یہ حملے اپنے ہولناک نتائج اور مظالم کے اعتبار سے کسی طرح بھی نادر شاہ کے حملے سے کم نہ تھے۔ عام طور پر بد امنی اور بے اطمینانی کا دور دورہ تھا۔ ابدالی سپاہ کے ہاتھوں شرفا کی بہو بیٹیوں کی عزت و عصمت بھی خطرے میں رہتی تھی۔ قدر اللہ قاسم کا بیان ہے کہ خوب چند ذکا کے گھر کی مستورات نے ابدالیوں کے مظالم سے بچنے کے لیے ''رسم جوہر'' ادا کی تھی[5] سیکڑوں صاحب غیرت دہلی سے ترکِ وطن کر گئے اور یہاں سے نکل کر لکھنؤ، مرشد آباد، شاہجہاں پور، ٹانڈہ یا حیدرآباد کا رخ کرتے تھے۔ میر نے دہلی کی تباہی و بربادی کا حال بہت تفصیل سے اور دل دوز پیرائے میں لکھا ہے، خود ان کا مکان بھی اس غارت گری میں منہدم ہوا تھا، اور انھیں بھی در در کی خاک چھاننی پڑی تھی۔

میر ان تمام حملوں کے زمانہ میں دلی میں موجود تھے، ان کے بیانات کی روشنی میں ان حملوں کا حال مختصراً پیش کیا جاتا ہے۔

---

1. سفر نامہ (مقدمہ) ج2 ص7، نیز ص275 تا 277۔

2. برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مآثر الامرا (فارسی) ج1، ص819 تا 823

3. مآثر الامرا ج 3، ص880 تاریخ محمدی ص106 سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج2 ص108 میر کی آپ بیتی۔

4. ہندستانی مورخین نے صرف سات حملوں کا ذکر کیا ہے۔ 5. مجموعہ نغز، ج 1، ص260، نیز ملاحظہ ہو، ج2، ص41، 20

پہلا حملہ 1161ھ-1747

یہ حملہ پنجاب پر ہوا۔ احمد شاہ ابدالی ہندستان کی بدنظمی اور نظم ونسق کے انحطاط اور زوال پذیری سے ہمت افزا ہو کر ایک بڑی فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا، یہ محمد شاہی دور تھا، اس زمانے میں شاہ نواز خاں [1] پسر زکریا خاں [2] لاہور کا ناظم تھا، شاہ نواز خاں ابدالی سے مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ابدالی شہر میں داخل ہوا اور اس کی سپاہ نے تباہی و بربادی کا دروازہ کھول دیا۔ وہاں کے باشندوں پر طرح طرح کے مظالم توڑے، ان کی عزت و ناموس خاک میں ملا دی، بے حساب مال غنیمت ابدالیوں کے ہاتھ لگا۔ ناظم اور اس کے خاندان سے تحصیل کردہ مال ومتاع و زر خلاصی کے علاوہ وہ تمام سامانِ حرب، جس میں بندوقیں، رہکلے، اور منجنیق شامل تھے، ان کے قبضے میں آیا جو گزشتہ پچیس برسوں سے جمع تھا، اس مال و اسباب کی بار برداری کے لیے ابدالیوں نے شہر اور گرد و نواح کے تمام گھوڑے اپنے قبضے میں کر لیے تھے [3]

جب محمد شاہ بادشاہ کو اس امر کی خبر پہونچی تو اس نے اپنے بیٹے احمد شاہ کو مع وزیر الممالک اعتماد الدولہ قمر الدین خاں، صفدر جنگ اور ایشر سنگھ پسر راجا جے سنگھ سوائی والیِ جے پور، ابدالی سے مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا، ابدالی نے سرہند پر قابض ہو کر اس شہر کو خوب لوٹا کھسوٹا اور اور وہاں کے بے گناہ لوگوں کو تہِ تیغ کر دیا۔ [4] سرہند کے قریب طرفین کی افواج صف بستہ

1۔ زکریا خاں کے دو لڑکے تھے، بڑا لڑکا میر یحییٰ خان درویشانہ زندگی بسر کرتا تھا اور چھوٹا لڑکا جس کا اصلی نام مرزا پہلوی حیات اللہ خان تھا، نادر شاہ کی طرف سے شاہ نواز خاں کے خطاب سے سرفراز ہو کر ملتان کا ناظم مقرر ہوا تھا۔ معین الملک میر منو بن اعتماد الدولہ قمر الدین خان سے جنگ کرتے وقت کام آیا۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ ماثر الامرا (فارسی) ج 2، ص 107، خزانہ عامرہ، ص 97،

2۔ سیف الدولہ عبد الصمد خان برائے حالات ملاحظہ ہو، مآثر الامرا (فارسی) ج 2، ص 517-514) کا بیٹا تھا اور اپنے والد کی زندگی ہی میں لاہور کا گورنر ہو گیا تھا۔ اس کا نظم و نسق، حسنِ سلوک اور عدل گستری زبان زد خاص و عام تھی۔ والد کے انتقال کے بعد ملتان بھی اس کے علاقے میں شامل کر دیا گیا تھا۔ نادر شاہ سے تاب مقاومت نہ لا کر اس نے نادر کو اپنا حاکم مان لیا تھا 1158ھ میں انتقال ہوا، برائے تفصیل ملاحظہ ہو، مآثر الامرا (فارسی) ج 2، ص 107-106۔

3۔ خزانہ عامرہ ص 97، سیر المتاخرین (اردو ترجمہ ج 3، ص 15- تا 18۔ 4۔ خزانہ عامرہ ص، 98-97۔

ہوئیں۔ جنگ شروع ہوئی، وزیر قمرالدین خاں ایک گولہ کی زد میں آکر شہید ہوا۔ اس حادثہ کی وجہ سے ایشر سنگھ جیسے سرداروں کی ہمت ٹوٹ گئی لیکن معین[1] الملک (پسر قمرالدین خان) اور صفدر[2] جنگ، شہزادہ احمد شاہ کو ساتھ لے کر افغانوں سے بھڑ گئے اور انھوں نے جان کی بازی لگادی اور ابدالیوں کو مار بھگایا۔[3]

سید محمد علی الحسینی نے میدانِ جنگ کا منظر ان اشعار میں پیش کیا ہے:

دراں دشت پر محنت وہولناک — برآمیخت خونِ دو لشکر بہ خاک
تو گوئی دراں وادی سہم ناک — زتیر یلاں، سربر آورد خاک
دم تیغ چوں شعلہ آتش فشاں — سنان باز زخم یلان خوں چکاں
نہادند پر خشم وکیں اوبہم — دلیرانِ جنگ آزمایش وکم
زبس کشتہا پشتہا شدپدید — دگر آن چناں روزگیتی نہ دید
سواراں زہر سو گریزاں شدند — سلاح از تنِ خویش ریزاں شدند

1۔ اصلی نام میر منو تھا۔ احمد شاہ ابدالی سے مقابلہ کے وقت اس نے جان کی بازی لگادی۔ فتح کے بعد ''رستم ہند'' کا خطاب پایا اور ملتان اور لاہور کی صوبے داری ملی۔ 1167ھ میں جب احمد شاہ ابدالی نے پھر ہندستان پر حملہ کیا تو معین الملک نے پہلے تو اس کا مقابلہ کیا اور بعد میں صلح کر کے اس کے نائب کی حیثیت سے صوبیداری کے عہدہ پر بدستور سابق قائم رہا۔ بدہضمی کی وجہ سے فوت ہوا۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مآثر الامرا (فارسی) ج1، ص360

2۔ میرزا مقیم نام، اور برہان الملک سعادت خاں (ملاحظہ ہو، مآثر الامرا (فارسی) ج2، 463-466) کا بھانجا اور داماد تھا، محمد شاہ کے زمانے میں صفدر جنگ خطاب ملا اور صوبۂ اودھ کی نظامت تفویض ہوئی، برائے تفصیل، مآثر الامرا (فارسی) ج2، ص368-365۔

3۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو، خلاصۃ التواریخ (قلمی، نندرام مخلص) ص190، 141، مجمل التواریخ ص، 360-357 اقبال نامہ (قلمی شیو پرشاد لکھنوی) ص335 جام جہاں نماں (قلمی) ص498-497، مفتاح التواریخ ص326 خزانۂ عامرہ ص98، سیر المتاخرین (اردو ترجمہ، ج2 ص18، مآثر الامرا (فارسی ج2 ص719 وقائع بعد اورنگ زیب (قلمی) ص148-147

بزرگانِ لشکر سرانِ سپاہ بہ خواری فتادند از عزوجاہ [1]

میر اس جنگ کے موقع پر رعایت خان کی خدمت میں تھے۔ ابدالی فوج جب بُری طرح ہار کر بھاگ گئی تو معین الملک لاہور کا ناظم مقرر رہوا۔ میر صفدر جنگ کے ساتھ دہلی واپس چلے آئے [2]

محمد شاہ کا انتقال اور احمد شاہ کی تخت نشینی

واپسی کے وقت جب مغلیہ سردار پانی پت کے قریب پہونچے تو انھیں محمد شاہ کے انتقال کی خبر ملی۔ فوج شاہی میں اس خبر سے تہلکہ مچ گیا۔ صفدر جنگ نے احمد شاہ کو تختِ شاہی پر بٹھادیا[3] احمد شاہ بڑے کروفر سے شہر دہلی میں داخل ہوا اور اس موقع پر جاوید[4] خاں کو، جو مرحوم بادشاہ (محمد شاہ) کا خواجہ سرا تھا، نواب بہادر کا خطاب ملا۔ اور اختیاراتِ سلطنت اس کے سپرد ہوئے۔ [5]

صفدر جنگ کی وزارت

نظام الملک آصف[6] جاہ کے فوت ہونے کے بعد عہدۂ وزارت صفدر جنگ کو ملا، اور سعادت خان ذوالفقار جنگ، بخشی گری کے منصب پر فائز کیا گیا۔ صفدر جنگ کی وزارت کے زمانے میں اندرونی خلفشار تیزی سے بڑھنے لگا۔ نئے بخشی نے راجہ بخت سنگھ کو جو بڑا تجربہ کار اور نام برآوردہ زمین دار تھا اور اس کا بڑا بھائی ابھے سنگھ ریاست جودھ پور پر متمکن تھا صوبہ اجمیر کی نیابت دے کر بھائی کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔ راجہ نے رعایت خاں کو فوج کا سردار بنایا اور اپنے ساتھ لے گیا۔ اس موقع پر میر بھی رعایت خان کے ہمراہ اجمیر گئے اور درگاہ مبارک کی زیارت سے

---

1. تاریخ راحت افزا۔ ص 159-157۔

2. میر کی آپ بیتی۔ ص 100

3. میر کی آپ بیتی۔ ص 101-100، تاریخ راحت افزا۔ ص 160-159 اقبال نامہ (قلمی شیو پرشاد لکھنوی) ص 335 مجمل التواریخ ص 262-260 م مفتاح التواریخ ص 327-326۔

4. برائے تفصیل ملاحظہ ہو، مآثر الامرا (فارسی) ج 1 ص 367-362 مفتاح التواریخ ص 333

5. میر کی آپ بیتی۔ ص 101

6. مفتاح التواریخ ص 329-327، مآثر الامرا (فارسی) ج 3 ص 348-338 خزانۂ عامرہ ص 38-35 بحر عجائب ص 22-21

سعادت اندوز ہوئے، اور اجمیر کے نواح کی سیر کر کے واپس چلے آئے۔1

صفدر جنگ، بنگش اور روہیلہ خاندانوں سے پرانی عداوت رکھتا تھا اور وہ دونوں خاندانوں کو ملیامیٹ کرنے کے منصوبے بہت دنوں سے بنا رہا تھا۔ آخر اس نے یہ ترکیب کی کہ محمد خان 2 بنگش کے انتقال کے بعد، اس کے جانشین قائم خان بنگش کے نام اس نے روہیل کھنڈ کی صوبہ داری کا فرمان بادشاہ سے لکھوا کر بھیج دیا۔ اور یہ لکھ دیا کہ اس علاقہ پر تم قبضہ کر لو۔ اِدھر روہیلہ سرداروں کو لکھ بھیجا کہ وہ قائم خان کا ڈٹ کر مقابلہ کر لیں۔ قائم خان نے وزیر کی پشت پناہی کے زعم میں آکر روہیلہ افغانوں پر حملہ کر دیا اور میدانِ جنگ میں کام آیا۔3

بعد ازیں صفدر جنگ نے قائم خاں کی املاک کی ضبطی کی غرض سے فرخ آباد کے لیے کوچ کیا۔ میر بھی اسحاق خان نجم الدولہ کے ساتھ اس نواح کی سیر کو گئے۔ قائم خان کے چھوٹے بھائی احمد خان اور وزیر کے درمیان بھاری جنگ ہوئی اور وزیر کو منہ کی کھانی پڑی۔ اسحاق خان بھی قتل

1۔ میر کی آپ بیتی۔ ص102۔

2۔ بہادر شاہ کے عہد تک وہ مین پوری کے راجا کے ہاں ایک سپاہی کی حیثیت سے ملازم تھا، رفتہ رفتہ اس نے ترقی کی اور راجہ نے اس کا ایک روپیہ اور بعد میں پانچ روپیہ یومیہ مقرر کر دیا تھا، فرخ سیر کے زمانے میں اس نے کارنمایاں انجام دیے اور شاہی ملازمت حاصل کر لی اور مالوہ کی صوبے داری ملی، اس کے پاس پچاس ہزار فوج تھی، اس نے فرخ آباد کے اردگرد کے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا، نادر شاہ سے جنگ کے موقع پر وہ میدانِ جنگ میں محمد شاہ کے ساتھ گیا تھا۔ 1156ھ میں فوت ہوا برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مفتاح التواریخ، ص349 اقبال نامہ (قلمی) ص169-162، مآثر الامرا (فارسی) ج3، ص771۔

جام جہاں نما (قلمی) ص497-493 تاریخِ راحت افزا، ص121-120، رسالہ محمد شاہ و خان دوراں "نواب محمد خاں بنگش در وقتِ جنگ نادر شاہ در میدان و چند اولی لشکر قضا و قدر (محمد شاہ بادشاہ) بوجود قابض الوجود مورد عنایات بادشاہی مہبط السلطف نامتناہی نواب محمد خاں بنگش ترتیب یافت ص103 (الف)

3۔ مآثر الامرا (فارسی) ج3، ص774-772، مفتاح التواریخ، ص35، حیات حافظ رحمت خان ص47-40 میر کی آپ بیتی، ص104 وقائع از وفات عالمگیر (قلمی) ص151 (الف) 52 (ب) جام جہاں نما (قلمی) ص500-499

ہوئے۔میراس ہارے ہوئے لشکر کے ساتھ بڑی زحمت اٹھا کر شہر دہلی واپس آئے۔1

بعدازیں 1751 میں صفدر جنگ نے مرہٹہ سرداروں، ملہارراؤ، ہلکر اور اپاسندیھیا، کو کثیر رقم کی لالچ دے کر اپنے ساتھ کرلیا اور دولاکھ فوج لے کر دوبارہ فرخ آباد پر حملہ کیا۔اس بار احمد خاں بنگش کو شکست ہوئی لیکن اس شرط پر صلح ہوگئی کہ احمد خان صفدر جنگ کو پچاس لاکھ روپیہ بطور تاوانِ جنگ اور پانچ لاکھ سالانہ شاہی خراج ادا کرے گا۔2

نواب بہادر کا بادشاہ پر اتنا اثر تھا کہ اس نے ذوالفقار جنگ کو میر بخشی کے عہدہ سے معزول کرادیا۔امیرالامرا کا منصب غازی الدین خاں فیروز جنگ پسر نظام الملک آصف جاہ کو عنایت ہوا۔اس کے انتقال کے بعد بخشی گری کی خدمت اس کے بیٹے عمادالملک کو تفویض ہوئی۔3 ان حالات سے تنگ آکر ان دنوں میر نے گوشہ نشینی اختیار کرلی اور پڑھنے میں لگ گئے۔4

صفدر جنگ نے دھوکے سے نواب جاوید خان بہادر کو مرواڈالا۔5

دوسرا حملہ 1162ھ 1750

احمد شاہ ابدالی نے دوسری مرتبہ پنجاب پر حملہ کیا۔احمد شاہ بادشاہ کے ایما پر وزیر صفدر جنگ نے ابدالی سے مقابلہ کرنے کی غرض سے مرہٹوں کی امداد حاصل کی لیکن اس سے کوئی بارآور نتیجہ نہ نکلا۔لاہور کے ناظم معین الملک نے ابدالی سے صلح کرلی۔احمد شاہ ابدالی نے نادر شاہ کی طرح، سیالکوٹ، گجرات،

1۔ میر کی آپ بیتی۔ص105-104 وقائع بعدازوفات عالمگیر (قلمی) ص152 (الف) تا156 (الف)

2۔ میر کی آپ بیتی، ص105، حیات حافظ رحمت خان، ص52-51 مآثرالامرا (فارسی) ج3، ص772، وقائع بعدازوفات عالمگیر (قلمی) ص152 (الف) جام جہاں نما (قلمی) ص، 501-500 تاریخ راحت افزا، ص 170-169، ملخص التواریخ، ص372-371۔

3۔ میر کی آپ بیتی ص105۔

4۔ ایضاً ص105۔

5۔ ایضاً ص106، جامِ جہاں نما (قلمی) ص502-501، تاریخ راحت افزا۔ص273، وقائع بعدازوفات عالمگیر (قلمی) ص157 ب تا160 الف، مفتاح التواریخ ص333 مآثرالامرا (فارسی) ج1، ص367-362 ملخص التواریخ ص388۔

اورنگ آباد اور پرسرور کے چاروں محال، جن کی سالانہ آمدنی 14 لاکھ روپے تھی، اپنے قبضے میں کر لیے۔ صلح نامہ کی رو سے ان محالوں کی سالانہ آمدنی ابدالی کو بطور پیش کش ادا ہونا طے پایا۔ علاوہ ازیں معین الملک نے سندھ کے مغربی علاقے ابدالی کے حوالے کر دیے۔[1] بقول مصنف تاریخ احمد بادشاہ مرکزی حکومت کی ہدایت کے مطابق معین الملک نے یہ علاقے احمد شاہ ابدالی کے سپرد کیے تھے۔[2]

تیسرا حملہ[3] 1165ھ 1751

پچھلے صلح نامہ کی رو سے سالانہ پیش کش کا روپیہ ادا نہیں کیا گیا تھا۔ ابدالی نے اس وجہ سے 1751 میں پھر حملہ کر دیا۔ جب معین الملک کو ابدالی حملے کی خبر ملی تو اس نے اس بلا کو ٹالنے کی غرض سے فوراً ابدالی کی خدمت میں نو لاکھ روپے بھیج دیے۔ لیکن چوں کہ مطالبہ چودہ لاکھ کا تھا، بنابریں احمد شاہ ابدالی نے پیش قدمی جاری رکھی۔ معین الملک نے شہر سے نکل کر ابدالی کا مقابلہ کیا اور شکست کھا کر ابدالی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے درمیان از سرِ نو ایک سمجھوتہ ہوا۔ معین الملک نے جان بخشی کے عوض دس لاکھ روپیہ دینا منظور کیا۔ مزید برآں اس علاقے کے بدلے میں دس لاکھ روپے کی ادائیگی طے ہوئی جو اس کے حوالے کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہندستان سے واپس چلے جانے کے صلے میں دس لاکھ روپیہ اور دیا گیا۔ شاہ ابدالی نے ملتان اور لاہور کے صوبے اپنے علاقے میں شامل کر لیے۔[4]

چوتھا حملہ 1170ھ 1752

احمد شاہ ابدالی نے کشمیر کے حاکم سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کر لے، حاکم کشمیر نے جب اس مطالبے کو رد کر دیا تو ابدالی نے 1752 میں چوتھی مرتبہ ہندستان پر حملہ کیا۔ رنجیت دیو 1735 تا 1781) راجا جموں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن آخر میں نتیجہ شکست ہی میں نکلا اور کشمیر شاہ ابدالی کے قبضے میں چلا گیا۔[5]

---

1 خزانہ عامرہ، ص 98۔ ملخص التواریخ ص 371-370، تاریخ احمد شاہ (قلمی) ص 6 ب، 7 الف۔

2 ایلیٹ وڈوسن (انگریزی، ج 8 ص 115-114۔

3 برائے تفصیل ملاحظہ ہو، احمد شاہ درانی (انگریزی) ص 101,127 مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی، ج 1 ص 427,428۔

4 خزانہ عامرہ، ص 99-98 ملخص التواریخ، ص 388-385 مآثر الامرا (فارسی) ج 2۔ ص 719

5 احمد شاہ درانی (انگریزی) ص 101,127 (Islamic Culture) Vol. No. 4 PP. 498,500)

احمد شاہ بادشاہ اور صفدر جنگ وزیر

نواب بہادر کے قتل کے بعد سے بادشاہ اور وزیر کے تعلقات کشیدہ ہو گیے تھے اور وزیر کے دل میں بادشاہ کی طرف بدظنی پیدا ہو گئی تھی۔ ''وزیر نے بادشاہ سے بغاوت کر دی۔ ہر چند صلح کی کوشش کی گئی لیکن اس نے امارت کے گھمنڈ میں اپنا سر نیچا نہ کیا۔ مجبوراً بادشاہ نے اسے سزا دینے کا ارادہ کیا۔ صفدر جنگ شہر سے نکل کر اپنے خداوندِ نعمت (احمد شاہ سے جنگ کرنے پر تل گیا۔ ادھر عماد الملک (جو نظام الملک آصف جاہ کا پوتا تھا) اور بخشی گری پر مامور تھا۔ نیز اس کے ماموں اور انتظام الدولہ اور شاہی فوج کے دوسرے سرداروں نے شہر کی حفاظت کی۔ پُرانا شہر تو سب تاراج ہو گیا۔ چھ مہینے تک جنگ جاری رہی۔ لیکن شاہی فوج نے ایسی جی توڑ کوشش کی کہ میدان مار لیا اور باغی وزیر کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مجبور ہو کر اس نے صلح کا پیغام بھیجا، بادشاہ نے اس کی شکست کو غنیمت جان کر اسے اس کے صوبے (اودھ) کی گورنری مرحمت کر دی اور وزیر انتظام الدولہ ہوا[1]۔

احمد شاہ بادشاہ کا قتل اور عالمگیر ثانی کی تخت نشینی

انتظام الدولہ کے قتل کے بعد قلم دانِ وزارت عماد الملک کے سپرد ہوا۔ اس نے بادشاہ کو تخت شاہی سے معزول کر دیا اور قید کر کے احمد شاہ بادشاہ اور اس کی ماں کی آنکھوں میں سلائیاں پھروادیں۔[2] میر نے اپنے ایک شعر میں اس واقعہ کو بیان کیا ہے:

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی　　انھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں[3]

بعد ازیں عزیز الدین بن معز الدین جہاں دار شاہ بن بہادر شاہ بن اورنگ زیب کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھایا گیا[4]۔

---

1. میر کی آپ بیتی، ص 107-106، مخلص التواریخ ص 392-389، تاریخ راحت افزا، ص 273۔
2. میر کی آپ بیتی، ص 109 جام جہاں نما (قلمی) ص 502 مخلص التواریخ، ص 395۔
تاریخ راحت افزا، ص 293-292، تاریخ احمد شاہ۔
3. کلیات میر (نول کشور) ص 82
4. جام جہاں نما (قلمی) ص 502 مخلص التواریخ ص 395 تاریخ راحت افزا ص 292،293۔

میر

نواب بہادر جاوید خان کے قتل ہونے کے بعد میر بے روزگار ہو گئے تھے۔ مہانرائن نے (جو وزیر کے دیوان تھے) اپنے داروغہ دیوان خانہ میر نجم الدین علی سلام کے ہاتھ جو میر شریف الدین پیام[1] کے بیٹے تھے، کچھ نقدی بھیجی اور بڑے اشتیاق سے میر کو اپنے ہاں بلایا۔ میر نے اس ملازمت کو قبول کرلیا اور اس طرح کچھ دن فراغت سے بسر کیے[2]

انھیں دنوں میں زمانے کی نامساعدت سے تنگ آکر میر نے اپنے ماموں (سراج الدین علی خاں آرزو[3]) کی ہمسائگی ترک کردی کیوں کہ آرزو، میر کو ہلکی نظر سے دیکھتے تھے اور برابر تاؤ کرتے تھے۔ اور امیر خان کی حویلی میں سکونت اختیار کی[4]

جس زمانے میں عمادالملک نے سورج مل جاٹ پر یورش کی تھی، اور بادشاہ احمد شاہ بھی شہر (دہلی) سے نکلا تھا، اور دریائے جمنا سے بیس میل ادھر سکندرآباد کے قریب ڈیرے ڈال دیے تھے۔ لیکن یہ خبر سن کر کہ سردارانِ دکن اور عمادالملک نے سورج مل سے گٹھ جوڑ کرلیا ہے اور وہ شاہی لشکر کو لوٹنے اور برباد کرنے کے لیے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر چل پڑے ہیں تو بادشاہ مضطرب و سراسیمہ ہو کر بھاگ کھڑا

---

1 اکبرآباد کے باشندے، فارسی کے شعرا میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے، ریختہ میں بھی شعر کہتے تھے اور صاحب دیوان تھے 1166ھ میں انتقال ہوا، ملاحظہ ہو، نکات الشعرا ص 66 تذکرہ ریختہ گویان ص 66 مخزن نکات ص 22،23، ریاض الفصحا، ص 52، سفینۂ ہندی۔ ص 27۔

2 میر کی آپ بیتی ص 106۔

3 سراج الدین خاں آرزو، حسام الدین حسام کے بیٹے تھے، ان کا سلسلۂ نسب شیخ کمال الدین خواہرزادۂ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی (خلیفہ شیخ نظام الدین اولیا) تک پہونچتا ہے، اور ننہال کا سلسلہ شیخ محمد غوث گوالیاری پر منتہی ہوتا ہے، آرزو 1101ھ 1689 میں پیدا ہوئے۔ 23 ربیع الثانی 1169ھ 1755 کو لکھنؤ میں انتقال کیا، ان کی نعش دہلی لاکر دفن کی گئی، ملاحظہ ہو، نکات الشعرا ص 3۔ خزانۂ عامرہ، ص 116 تا 119، قاموس المشاہیر، ج 1 ص 285، سفینۂ ہندی، ص 5، تذکرۂ ریختہ گویان، ص 6 اور ینٹیل کالج میگزین (نومبر 1943) جلد 20 عدد 1، ص 3 تا 25، میر کی آپ بیتی، ص 110-109۔

4 میر کی آپ بیتی، ص 107۔

ہوا۔اس سفرِ وحشت اثر میں میر بھی احمد شاہ بادشاہ کے ہمراہ تھے، واپس آ کر میر گوشہ نشین ہو گئے تھے [1]

دو تین مہینے کے بعد راجا جگل کشور،[2] میر کو گھر سے بلا کر لے گئے، اور اپنے اشعار پر اصلاح کی خدمت سپرد کی، مگر راجا کے اشعار ایسے نہ تھے کہ ان کی اصلاح کی جا سکتی، لہٰذا میر نے" ان کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا۔"[3]

میر نے ابدالی کے چوتھے اور پانچویں حملے میں امتیاز نہیں کیا۔ ان کا بیان ہے کہ احمد شاہ ابدالی سرہند سے شکست کھا کر واپس چلا تو گیا لیکن ہندستان فتح کرنے کی ترکیبیں برابر سوچتا رہا۔ بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ لاہور آیا،" وہاں کے وضیع و شریف لوگوں نے کون سا ستم تھا جو نہ جھیلا اور کون سی جفا تھی جو نہ سہی، کوئی روکنے والا تو تھا نہیں، وہاں سے ابدالی نے دلی کا قصد کیا۔

معین الملک پہلے ہی مغلوب ہو چکا تھا، اور کچھ دنوں بعد گھوڑے سے گر کر مر گیا ابدالی کی آمد سے سب کے اوسان خطا ہو گئے۔ بادشاہ اور وزیر سے کچھ بن نہ پڑا۔ آخر اس کی پذیرائی کے لیے بڑھے اور قید کر لیے گیے .... تقریباً ایک مہینے تک شہر میں رسد کی تنگی رہی اور بعد ازیں احمد شاہ نے عالم گیر ثانی کو سلطنت سپرد کی اور وزیر عماد الملک کو ساتھ لے کر آگرہ کا رخ کیا۔ اس کی فوج نے لوٹ مار شروع کر دی۔ متھرا شہر...... (جو) بڑا پُر رونق اور آباد شہر تھا، سب برباد ہو گیا۔ جب ہوا متعفن ہو گئی تو شاہ ابدالی نے طاعون کے خوف سے سورج مل کے معاملے کو ملتوی کر کے دفعتاً کوچ کر دیا۔ اور محمد شاہ کی بیٹی سے عقد کر کے بالا بالا نکل گیا۔[4]

عماد الملک آگرے کے نواح میں رہ گیا اور نجیب الدولہ جو صفدر جنگ اور احمد شاہ بادشاہ کی لڑائی میں بادشاہ کا ملازم ہوا تھا، نمایاں ترقی کر کے میر بخشی اور مختار سلطنت بن گیا۔[5]

---

1. میر کی آپ بیتی ص۔109۔

2. راجا جگل کشور محمد شاہ کے زمانے میں وکیل بنگالہ تھے اور بڑی جاہ و حشمت سے زندگی بسر کرتے تھے، میر کی آپ بیتی، ص110

3. میر کی آپ بیتی، ص110

4. میر کی آپ بیتی، ص111-113

5. میر کی آپ بیتی ص113، خزانۂ عامرہ ص100

نجیب الدولہ سے جھڑپ

احمد شاہ ابدالی کے واپس چلے جانے کے بعد عماد الملک مرہٹوں کو نجیب الدولہ پر چڑھا لے گیا، نجیب الدولہ شہر بند ہو گیا، توپ خانے کی جنگ ہوئی، آخر کار عماد الملک نے نجیب الدولہ سے صلح کر لی اور وہ اپنی جاگیر سہارن پور چلا گیا۔ وزیر (عماد الملک) اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ شہر میں داخل ہوا۔ دکنی فوج کو رخصت کر دیا۔ توپ خانے کی داروغگی راجا (ناگرمل) کے لڑکے کو تفویض ہوئی اور احمد خان میر بخشی ہو گیا۔[1]

اس زمانے میں میر کی حالت

بقول میر "چونکہ چاقو ہڈی تک پہنچ گیا یعنی فقر و فاقہ کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہو گئی، اضطراب بہت بڑھ گیا، ایک دن صبح کی نماز کے بعد اس (راجا جگل کشور) کے دروازے پر پہنچ گیا، چوب داروں کا میر۔ جے سنگھ نامی، میرے سامنے آیا اور کہنے لگا" یہ دربار کا کون سا وقت ہے؟" میں نے کہا، "اضطراب کا عالم ہے"! بولا "تم لوگوں کو درویش کہتے ہیں، تم شاید یہ نہیں جانتے کہ ایک ذرہ بھی خدا کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرتا، یہاں اپنی ریاست کے آگے تمھاری فکر کسے ہے، صابر و شاکر رہنا چاہیے۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، یہاں تو تمھاری رسائی مشکل ہے، البتہ ان کے بڑے لڑکے سے مل سکتے ہیں، میں نہایت شرمندہ ہوا، اور واپس آ گیا۔[2]

بعد ازیں خواجہ غالب کے توسل میر راجا کے لڑکے کی خدمت میں پہونچے اور اس نے کچھ مقرر کر دیا جو میر کو ایک سال تک ملتا رہا، اس دن سے عشا کی نماز کے بعد ملازموں کے طریقے سے میر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور دو گھڑی رات گئے تک بیٹھتے تھے اس خدمت کا پھل یہ تھا کہ چین سکھ سے گزر اوقات ہو رہی تھی۔[3]

پانچواں حملہ 1757

اس حملے کی نوعیت پچھلے چار حملوں سے بالکل مختلف تھی، اس مرتبہ احمد شاہ ابدالی خود نہیں آیا تھا بلکہ اپنے مغرور طاقت ور وزیر عماد الملک غازی الدین سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے عالمگیر ثانی نے خود ابدالی کو بلایا تھا۔[4] فرحت الناظرین کے ایک بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

---

1. میر کی آپ بیتی ص۔ 115-114۔
2. میر کی آپ بیتی ص 115۔
3. حوالہ بالا ص 116۔
4. سیاسی مکتوبات۔ ص۔ 195 History of The Reign of Shah Aluam pi.c.

عالمگیر ثانی نے نجیب الدولہ کے توسل سے ابدالی کو دعوت نامہ بھیجا تھا۔[1]

خزانہ عامرہ میں لکھا ہے کہ عماد الملک نے لاہور کے اس نظام کو، جو شاہ ابدالی نے قائم کیا تھا، درہم برہم کر دیا تھا اور معین الملک کی بیوی مغلانی بیگم کو معزول کر کے وہاں کی حکومت آدینہ بیگ خان کے سپرد کر دی تھی۔[2]

اس بات سے ناراض ہو کر شاہ ابدالی نے ہندستان پر حملہ کیا۔ آدینہ بیگ مقابلے کی تاب نہ لا کر وہاں سے فرار ہو کر حصار اور ہانسی کے جنگلوں سے ہوتا ہوا ہانسی کے قلعہ میں چلا آیا۔ شاہ ابدالی اس کے تعاقب میں دہلی تک پہنچ گیا۔ عماد الملک، جو بے سروسامانی کی حالت میں تھا اور مقابلے کی تاب بھی نہ تھی، اپنی عافیت کے لیے شاہ ابدالی کی خدمت میں بذاتِ خود حاضر ہو گیا۔[3]

شاہ ابدالی شہر شاہ جہاں آباد میں اور اس کی سپاہ کے ظلم وستم

شاہ ابدالی قلعۂ معلیٰ میں داخل ہوا اور عالمگیر ثانی سے ملاقات کی۔[4] سارے ملک کے وکیلوں کو طلب کیا گیا، اور انھوں نے شاہ ابدالی کی خدمت میں نذریں پیش کیں۔ جاٹوں کے سردار سورج مل کے علاوہ سب نے ابدالی کی اطاعت قبول کر لی۔ ابدالی نے غازی الدین کو معطل کر کے عالمگیر ثانی کے بڑے بیٹے عالی گہر کو نائب سلطنت مقرر کیا[5] اور اپنے بیٹے تیمور شاہ کی شادی عالمگیر ثانی کی بھتیجی سے رچائی۔[6]

اس موقع پر ابدالی سپاہ نے جو مظالم اور جبر وتشدد کیے تھے، ان کی بڑی دردناک تصویر اس زمانے کے لٹریچر میں تفصیل سے ملتی ہے، غلام علی آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ۔

"دست بتاراج اموال وناموس متوطان شہر دراز کردہ دقیقہ از نہیب وغارت مہمل نگذاشت،

---

1. ایلیٹ ڈاوسن (انگریزی) ج 8، ص 163۔

2. خزانہ عامرہ ص 98,99، سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج 3 ص 48-50۔

3. خزانہ عامرہ ص 99، سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج 3 ص 52۔

4. مجمل التواریخ ص 402، خزانہ عامرہ ص 99۔

5. History of The Reign of Shah Aullam PP.5.6.

6. خزانہ عامرہ۔ ص 99، مجمل التواریخ۔ ص 402، تاریخ عالم گیر ثانی ص 101 (الف) میرکی آپ بیتی ص [illegible]

اہلِ غیرت خود را بہ سم وسلاح ہلاک کردند۔"[1]

اس حملہ میں خود میر کا مکان بھی منہدم ہوا تھا، اس تباہی و بربادی کا حال میر نے بڑے دل دوز پیرائے میں لکھا ہے، ان کا بیان ہے:

"بندہ (میر) اپنی عزت تھامے شہر میں بیٹھا رہا۔ شام کے بعد منادی ہوئی کہ" بادشاہ نے امان دے دی ہے، رعایا کو چاہیے کہ پریشان نہ ہو" مگر جب گھڑی بھر رات گزری تو غارت گروں نے ظلم وستم ڈھانا شروع کیے، شہر کو آگ لگادی، گھروں کو جلادیا، اور سارا ساز وسامان لے گئے، صبح کو جو (گویا) صبحِ قیامت تھی تمام شاہی (درّانی) فوج اور روہیلے ٹوٹ پڑے اور قتل وغارت میں لگ گئے، (شہر کے) دروازوں کو توڑ ڈالا اور لوگوں کو قید کرلیا۔ بہتوں کو جلادیا اور سر کاٹ لیے، ایک عالم پر یہ مظالم توڑے اور تین دن رات تک اس ظلم سے ہاتھ نہ کھینچا۔ کھانے اور پینے کی چیزوں میں سے کچھ نہ چھوڑا، چھتیں توڑ دیں، دیواریں ڈھادیں (ان مصیبتوں سے کتنوں ہی کے) سینے زخمی اور کلیجے چھلنی کردیے، وہ فتنہ گر ہر طرف چھائے ہوئے تھے اور شرفا کی مٹی پلید ہورہی تھی، شہر کے عمایدخستہ حال ہو گئے تھے، بڑے بڑے امیر ایک گھونٹ پانی کے لیے بھی محتاج بن گئے گوشہ نشین بے گھر اور نواب گدا گر بن گئے۔ شرفا ننگے تھے، گھر والے نکھرے، ہر ایک بلا میں گرفتار اور رسوائے کوچہ وبازار تھا، اکثر لوگ مصیبت میں مبتلا، اور ان کے زن وفرزند اسیر، شہر میں (غارت گروں کا) ہجوم تھا اور بے روک ٹوک قتل وغارت ہورہی تھی، لوگوں کا حال ابتر ہوگیا۔ بہتوں کی جان لبوں تک آگئی (یہ غارت گر) زخم بھی لگاتے اور گالیاں گفتاریاں بھی دیتے، روپیہ بھی سب چھین لیتے اور مار الگ لگاتے، جو سامنے آجاتا اس کے بدن کے کپڑے تک نہ چھوڑتے، ایک عالم تکلیفیں جھیل کر مرگیا، ایک جہان کی عزت وناموس برباد ہوگئی، نیا شہر جل کر سیاہ ہوگیا، تیسرے دن انتظام سنبھلا، انزلا خان نامی سنتچی آیا تو رہا سہا اس نے لوٹ لیا، بارے منتظمین نے لوٹ مچانے والوں کو شہر سے نکال کر احتیاطی تدابیر شروع کیں، اب وہ بے رحم لوگ پرانے شہر کو تاراج کرنے میں لگ گئے۔ وہاں بے شمار انسانوں کو قتل کردیا۔ سات آٹھ دن تک یہ ہنگامہ رہا، ایک وقت کھانے اور ستر ڈھکنے کے وسائل بھی کسی کے گھر میں نہ رہے، مردوں کے سر ننگے تھے اور عورتوں کے پاس اوڑھنی بھی نہ تھی، چوں کہ راستے بند تھے، بہت سے لوگ

1۔ خزانہ عامرہ ص 99، نیز ملاحظہ ہو، تلخیص التواریخ ص 402۔

زخم کھا کھا کر مر گئے۔ کچھ سردی کی شدت سے اکڑ گئے (اس فوج نے) بڑی بے حیائی سے لوٹ مچائی اور شہریوں کو بے آبرو کیا۔ غلہ زبردستی چھینتے اور مفلسوں کے ہاتھ دھونس سے فروخت کرتے۔ ان غارت گروں کا شور و ہنگامہ ساتویں آسمان تک پہنچ رہا تھا۔ مگر بادشاہ جو خود کو فقیر سمجھتا تھا، استغراق کے باعث سنتا ہی نہ تھا، ہزاروں خراب اس ہنگامے سے نکل کر بصد حسرت ترکِ وطن کر گئے، اور جنگل کی طرف منہ اٹھا کر چل دیے۔ چوں کہ ان جفا کاروں کی بن آئی تھی، لوٹتے کھسوٹتے،، ایذائیں دیتے، ستم ڈھاتے، عورتوں کی بے حرمتی کرتے، اپنی تلواریں لیے مال بٹورتے پھرتے، شہریوں سے کچھ نہ ہو سکتا تھا، کیوں کہ ان میں قوت مدافعت نہ تھی، کوئی سراسیمہ و مضطرب تھا کوئی حسرت و افسوس کرتا تھا، ہر گھر میں ہر گلی کوچے میں، ہر بازار میں غارت گر تھے اور ان کی دار و گیر،، ہر طرف خوں ریزی ہر سمت ظلم و ستم ایذا بھی دیتے اور طمانچے بھی مارتے، غریب لوگ خوف سے سہمے جاتے، یہ لٹیرے ملندریاں مارتے پھر رہے تھے، گھر جل گئے، محلے ویران ہو گئے، سینکڑوں لوگ ان سختیوں کی تاب نہ لا کر چل بسے، اور کسی کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا، ایک عالم ان کے ستم سے ہلاک ہو گیا، مگر کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی، پرانے شہر کا علاقہ جسے رونق و شادابی کے باعث ''جہاں تازہ'' کہتے تھے، کسی گری ہوئی منقش دیوار کی مانند تھا یعنی جہاں تک نظر جاتی تھی، مقتولوں کے سر، ہاتھ، پاؤں اور سینے ہی نظر آتے تھے، ان مظلوموں کے گھر ایسے جل رہے تھے کہ آتش کدے کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔ یعنی جہاں تک آنکھ دیکھ سکتی تھی، خاک سیاہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، جو مظلوم مر گیا گویا آرام پا گیا اور جوان کی زد میں آ گیا بچ کے نہ جا سکا، میں کہ (پہلے ہی) فقیر تھا، اب اور زیادہ مفلس ہو گیا، افلاس اور تہی دستی سے حال بہت ابتر ہو گیا، سڑک کے کنارے جو مکان تھا وہ بھی ڈھ کر برابر ہو گیا، غرض کہ وہ ظالم سارے شہر کا اسباب لاد کر لے گئے، اور شہر کے لوگ بڑی ذلت و رسوائی اٹھا کر جان سے گزر گئے۔[1]

دلی کی تباہی کے مرثیے

کم و بیش اٹھارھویں صدی کے ہر شاعر نے دہلی کی تباہی و بربادی کا ماتم کیا ہے، اور شہر آشوب کی

---

1. میر کی آپ بیتی، ص 121,124، نیز ملاحظہ ہو، تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص 1,2 کلیاتِ میر۔
شہر میں گھر خراب ہے اپنا ☆ آتے ہیں یاں اب اس نشاں سے لوگ، ص 348 نیز وقائع بعد از وفات عالمگیر (قلمی) ص 162 (الف)

صورت میں اپنے تاثرات بیان کیے ہیں، ان میں سماجی اور سیاسی مطالعہ کے نقطۂ نظر سے سودا، حاتم، جعفر علی، حسرت، میر اور قائم چاند پوری کے شہر آشوب خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں، ان شعرا کے کلام سے بعض ایسی مثالیں، یہاں پیش کی جاتی ہیں جن سے اس عہد کا انتشار اور بدامنی سامنے آجاتی ہے۔

سودا:

سخن جو شہر کی ویرانی سے کروں آغاز ☆ تو اس کو سن کے کریں ہوش چغد کے پرواز
نہیں وہ گھر، ہو جس میں شغال کی آواز کوئی جو، شام کو مسجد میں جائے بہرِ نماز
تو واں چراغ نہیں ہے، بجز چراغ غول
کسی کے ہاں نہ رہا آسیا سے نہ تابہ اجاغ ہزار گھر میں کہیں ایک گھر جلے ہے چراغ
سو کیا چراغ وہ گھر ہے گھروں کے غم سے داغ اور ان مکانوں میں ہر سمت رینگتے ہیں الاغ
جہاں بہار میں سنتے تھے بیٹھ کر ہنڈول
خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک و پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہوئے زندگی سے اداس بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے، کہیں ڈھے مرغول 1

حاتم:

جہاں سنتے تھے شب و روز طنبورا ڈھولک ☆ تہاں اب مرد ہیں مانند زناں نوحہ کناں
کیا زمانہ کی ہوا پھر گئی سبحان اللہ ☆ زندگی ہوئی ہر ایک کی اب دشمن جاں
گرم ہے ظلم کا بازار خدا خیر کرے ☆ کہیں مظلوموں کے رونے سے نہ آوے طوفاں
غرض یہ کہ کوئی کام نہ آیا میرے ☆ آشنا تھا مرا از بسکہ تمام ہندستاں 2

مصحفی:

دلی ہوئی ہے ویراں سونے کھنڈر پڑے ہیں
ویران ہیں محلے، سنسان گھر پڑے ہیں

---

1 کلیات سودا (نول کشور) جلد اول ص 370۔

2 دیوان زادہ (قلمی) علی گڑھ ص 188-187۔

دیکھا تو اس چمن میں بادِ خزاں کے ہاتھوں
اکھڑے ہوئے زمیں سے کیا کیا شجر پڑے ہیں
بلبل کا باغباں سے اب کیا نشاں پوچھوں
بیرونِ درِ چمن کے ، یک مشت پر پڑے ہیں
گئے وہ دن جو رہتے تھے جہان آباد میں ہم
خرابی شہر کی صحرا کے آواروں سے مت پوچھ [1]

مرزا جعفر علی حسرت:

کیا غنیم کے لشکر نے یوں اُسے ویراں ☆ کہ جیسے بادِ خزاں سے ہو حالتِ بستاں
نہ سیل حادثہ لاوے کسی پہ یوں طوفاں ☆ گزر کیا ستم افغاں[2] کے ظلم سے جو وہاں
فغاں کہ ہو گیا، یہ کشت سبز سب پامال

وہ باغ جس میں کہ گل رو تھے سب حسیں گل سے ☆ اور ان کی زلفیں فزوں تر تھیں جعدہ سنبل سے
چمن کے رشک تھے رخسار و خط و کاکل سے ☆ دراز اس پہ ہو دستِ ستم تطاوُل سے
دریغ مٹ گیا نقشا، رہا نہ وہ خط و خال

سواد اس کے سے تھی زلفِ مہوشاں زنجیر ☆ بہار اس کی سے عرفات شرم تھا کشمیر
ہر ایک اس کے مکاں میں بہشت کی تعمیر ☆ جدھر نظر کرو سوجھے تھا عالمِ تصویر
نہ سرکی وہاں سے جدھر جا پڑے نگاہِ خیال

سوا اَب نہ نہر نظر آوے ہے نہ اس میں آب ☆ کنارے جمنا کے ہے سنگِ قلعہ اور سیر آب
پڑے ہے اُن کے مَنزل جہاں تھا عطر و گلاب ☆ کھنڈر ہیں سنگ کے ٹوٹے ستون اور محراب
جو ترشے سرو کی صورت تھے اور شکلِ ہلال

نہ چھت نہ تختہ مکانوں میں اور نہ خوبی کہیں ☆ سوائے سنگ اس انگشتری کے گھر میں نہیں
پہچانی جاوے نہ ویرانی سے وہاں کی زمیں ☆ مَلک سجود سے گھستے تھے جس پہ آ کے جبیں

---

1. مصحفی ص 66۔ دلی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی: میں رہنے والا ہوں اسی اجڑے دیار کا (ریاض الفصحا۔ مقدمہ ص ب)

2. افغاں سے مراد ابدالی کی افواج ہیں۔

وہاں پھرے ہے شرارت سے لشکرِ دجّال

رہے نہ آئینہ خانے نہ دیکھنے والے ☆ پڑے ہیں آبلے سینوں میں پاؤں میں چھالے
نہیں وہ مست وہ شیشے وہ جام وہ پیالے ☆ جو دل تھے شیشہ صفت، توڑ چرخ نے ڈالے
پڑی ہیں خاک میں نکلیں جو کیجئے غربال (کذا)[1]

قائم چاند پوری:

شہر داخل ہوا جب ابدالی ☆ دیکھ دڑانیوں کے چہرہ رفت
ایک شش و نج میں تھی خلقِ خدا ☆ کہ کہیں ہو نہ اون سے ہشت و ہفت
نہ فقیروں کی چھوڑتے تھے کلاہ ☆ نہ امیروں کا جامۂ زربفت
شاہ از تخت گاہ دہلی رفت [2]

خواری سے جب جہاں کا ٹھہرا یہ آ کے رنگ ☆ تھا دس کہاں و صبر کدھر کس کا عار و ننگ
کٹنے کا صبح و شام کے باقی رہا نہ ڈھنگ ☆ ہر صبح غم سے شام کے عالم بجاں ہے تنگ
ہر شام دل میں خلق کے فکرِ پگاہ ہے

مُردوں کے ہر طرف ہیں پڑے سیکڑوں اٹم ☆ سسکے ہے کوئی راہ میں نکلے ہے کسی کا دم
ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھے ایک سرِ شکم ☆ مانندِ چوب پاؤں میں خشکی سے پیچ و خم
چہرے کا ڈول، فاقے کے اوپر گواہ ہے

پھوٹے ڈھے خراب ہوئے اس قدر مکاں ☆ چوتی نہ ہو جو سقف وہ زیرِ فلک کہاں
دیوار کی نمی سے پڑی سوکھتی ہے جاں ☆ تلرو کے ڈر سے چار طرف نالہ و فغاں
ساون کے تس پہ مینہ کی یہ تخت چاہ ہے[3]

میر:

جہاں اب خارزاریں ہو گئی ہیں ☆ یہیں آگے بہاریں ہو گئی ہیں [4]

---

1. دیوان حسرت (جعفر علی، قلمی رام پور، ص 132 ب / 133 (الف)۔
2. دیوان قائم چاند پوری (قلمی رام پور) ص 181 (الف)۔
3. نقوش (اکتوبر 1961ء، لاہور) ص 100-95۔ 4. کلیات میر۔ (عبدالباری ایڈیشن) مطبع نول کشور لکھنؤ 1941 ص 116۔

یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ ☆ یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا
سرسری تم جہان سے گزرے ☆ ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
اب خرابہ ہوا جہان آباد ☆ ورنہ ہر اک قدم پہ یہاں گھر تھا[1]

دلی میں بہت سخت کی اب کے گزران.........دل کو کر سنگ
غیرت نہ رہی عاقبت کار نہ شاں.......... ....کھینچا یہ ننگ
یاروں میں نہ تھا کوئی مروت جو کرے.........عرصہ تھا تنگ[2]

غارت گری و تباہی کے بعد احمد شاہ ابدالی اپنے ساتھ بے حساب دولت لے گیا تھا۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کی فوج کے اسی ہزار سوار جو سب غارت ولوٹ کا مال لیے جا رہے تھے، پیدل چل رہے تھے، سواریوں پر مال واسباب لدا ہوا تھا۔ جہاں جہاں سے ابدالی گذرا ایک مریل ٹٹو بھی اس نے نہیں چھوڑا تھا۔[3] قمر الدین خاں وزیر کے گھر میں تو صاف جھاڑو دے گئے۔ ایک تنکا بھی نہ چھوڑا۔[4]

آخر کار شاہ ابدالی نے سورج مل جاٹ کا تعاقب کیا اور اسی طرح متھرا تک جا پہونچا، اس شہر کو خوب تباہ و برباد کیا۔ جاٹ ابدالی کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے اور اپنے قلعوں میں محصور ہو گئے۔ بعد ازیں شاہ ابدالی اکبر آباد کی طرف آیا، وہاں کے قلعہ دار نے شاہ کی اطاعت قبول نہ کی اور مقابلہ کرنے کی تیاری کی، شاہ ابدالی نے جہاں خان کو جاٹوں کے قلعوں کی تسخیر کے لیے پیچھے چھوڑا اور خود ولایت کے لیے روانہ ہو گیا، کیوں کہ اس کی فوج میں طاعون پھیل گیا تھا۔

جب شاہ ابدالی دہلی کے قریب سے گزرا تو عالمگیر ثانی اور نجیب الدولہ نے مقصود آباد کے تالاب کے کنارے اس سے ملاقات کی۔ اس موقع پر احمد شاہ ابدالی نے محمد شاہ کی بیٹی سے نکاح

---

1. کلیات میر (نول کشور) ص 41۔

2. کلیات میر۔ ص 473۔

3. احمد شاہ درانی (انگریزی) ص 168-165 مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی) ج۔ 2 ص 93۔

4. خزانہ عامرہ، ص 100-99 ملخص التواریخ ص 404-403۔
تاریخ فرح بخش (قلمی) ص 61 (الف)

کیا، اور عماد الملک غازی الدین کو قلمدانِ وزارت سپرد کیا اور نجیب الدولہ کو امیر الامرائی۔ [1]

عالمگیر ثانی اور انتظام الدولہ کا قتل اور شاہ جہاں ثانی کی تخت نشینی

احمد شاہ ابدالی کے پانچویں اور چھٹے حملے کے درمیان میں ہندستان میں وقوع پذیر واقعات کا میر نے مجملاً ذکر کیا ہے، احمد شاہ ابدالی کے واپس چلے جانے کے بعد مرہٹوں نے دکن سے آ کر دہلی کے اطراف میں اپنے خیمے لگا دیے، اس واقعہ سے بہتوں کے دل ہل گئے۔ ایک ہلڑ مچ گیا۔ امیروں کی سٹی گم ہوگئی، بادشاہ اور وزیر نے ان سے صلح کر لی، دتا نامی سردار کو جو اس بہادر اور جیالے جوان (جنگو) کا مدار المہام تھا، نجیب الدولہ کی طرف بھیج دیا جو گنگا کے کنارے وسطی علاقے میں قدم جمائے بیٹھا تھا، وہاں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ [2]

> ''اب یہاں سب نے وزیر کے ہاں جمع ہو کر مشورہ کیا کہ اگر یہ بھاری سپاہ واپسی میں ہم پر ٹوٹ پڑی تو ایسی تباہی مچائے گی کہ عالم تہ و بالا کر دے گی اور سارا شہر غارت ہو جائے گا۔ بن پڑے تو ان سے مل کر نجیب الدولہ کا کام تمام کر دیں، ورنہ درمیان میں پڑ کر صلح کرا دیں۔''

وزیر نے بادشاہ سے اس منصوبے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اس نے بیماری کے بہانے صاف انکار کر دیا۔ چوں کہ لوگوں کو بادشاہ کی طرف سے اطمینان نہیں تھا، مشورہ کیا کہ شہر جا کر بادشاہ کو ختم کر دیں اور انتظام الدولہ کو بھی جیتا نہ چھوڑیں۔ [3]

درحقیقت وزیر اور بادشاہ کے تعلقات اس وجہ سے کشیدہ ہوئے کہ بادشاہ اپنی زبوں حالی اور تذلیل سے تنگ آ کر وزیر کے چنگل سے نکلنے کا خواہش مند تھا۔ اسی مقصد کے تحت اس نے شہزادہ عالی گہر کو 1757-1758 میں اور عالی جاہ کو (1757) میں دوآبہ کو فتح کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ لیکن انھیں اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی، بادشاہ کے اس طرزِ عمل سے ناراض ہو کر وزیر نے عالی گہر کے مسکن کا محاصرہ کر کے گولہ باری کی۔ مگر شہزادہ جان بچا کر نکل بھاگا

1۔ سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج 3، ص 52۔

2۔ میر کی آپ بیتی، ص 118-117

3۔ ملخص التواریخ، ص 411-408۔

اور شجاع الدولہ کے پاس اودھ پہنچ گیا۔[1]

مختصر یہ کہ وزیر کے چند اشخاص "لشکر سے نکل کر شہر آئے اور بادشاہ کے سامنے قسمیں کھائیں کہ ہم وزیر سے خوش نہیں ہیں لیکن زمانہ سازی کر رہے ہیں، اگر حضور فائدہ اٹھائیں تو ایک نادر موقع ہاتھ آیا ہے، وہ سادہ لوح (بادشاہ) ان بدباطنوں کے فریب میں آ گیا، پوچھا: "وہ کیا؟" انھوں نے کہا "ایک پہونچا ہوا فقیر جو تارکِ دنیا ہے، دو تین روز سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں وارد ہے، کل چلا جائے گا اگر آپ شام کو اس سے مل لیں تو غالب ہے کہ اس خدا رسیدہ بزرگ کی دعا سے ہم ان آفتوں سے محفوظ ہو جائیں اور وزیر پر غلبہ پالیں۔" بادشاہ ان نمک حراموں کی منافقت سے بے خبر تھا، وعدہ کر لیا کہ ہم ضرور ملیں گے،، آخر شام کے قریب اُسے سوار کر کے لے گئے۔ جب کوٹلے میں پہونچے تو اس بے گناہ کو چاقو مار کر ہلاک کر دیا اور اس کی نعش دیوار کے نیچے پھینک دی، شام کے بعد وہاں سے پلٹ کر خانِ خاناں کے گلے میں پھندا ڈالا، جب کہ وہ نماز پڑھ رہا تھا، اسے بڑی بے رحمی سے ہلاک کر دیا اس کے مردے کو سب کی نگاہوں سے بچا کر لے گئے اور دریا میں ڈال دیا، بادشاہ کی نعش تمام دن کس مپرسی کی حالت میں زمین پر پڑی رہی، جو دیکھتا وہ اس وحشیانہ فعل پر لعنت کرتا تھا، آخر اس کے وارثوں نے جی کڑا کر کے اس کی میت راتوں رات دفنا دی...... دوسرے دن صبح وہ اشقیا قلعے میں آئے، اور شاہ جہاں نامی ایک جوان شہزادہ کو تخت پر بٹھا کر نذریں پیش کیں۔[2]

---

1. برائے تفصیل۔ ملخص التواریخ ص 408، جام جہاں نما (قلمی رام پور) ص 504۔

2. میر کی آپ بیتی، ص 119-118، مفتاح التواریخ ص۔340 تا 342۔ جام جہاں نما (قلمی رام پور) ص 505 وقائع بعد از وفات عالمگیر (قلمی) 161 (ب) تاریخ فرح بخش (قلمی) ص 68 الف، 69 ب تاریخ احمد شاہ (قلمی) ص 29 (الف) (ب) تاریخ مظفری (قلمی) ج 2 ص 76 (الف و ب) تاریخ راحت افزا ص 343۔

ملخص التواریخ میں لکھا ہے کہ "اول انتظام الدولہ را کہ مقید داشت، بہ تیغ جفا در گزرانید و بعد از سہ روز مہدی علی خان کشمیری را تلقین نمودہ پیش بادشاہ فرستاد او آمدہ بخدع و دغا ظاہر ساخت کہ درویشی صاحب حال در کوٹلہ فیروز شاہ وارد گردیدہ قابل زیارت است آں ابلہ بہ تلبیس ابلیس مزکور جریدہ بملاقات درویش مجہول قاصد گردید چوں بجائے معبود رسیدہ اندرونِ حجرۂ کہ قاتلانش رانشانیدہ بود رفت کشمیری مزکور درراز بیرون بزنجیر بند نمود، مرزا بابر اخلاف اعز الدین، داماد بادشاہ شمشیر کشیدہ یکے را مجروح ساخت، مردم عماد الملک اسیرش نمودہ (باقی صفحہ 84 پر)

میر کا بیان ہے کہ بادشاہ اور انتظام الدولہ کے قتل سے فارغ ہو کر عماد الملک بھاگم بھاگ راستہ طے کر کے مرہٹوں کی فوج سے مل گیا اور جنگ میں ان کا شریک بن گیا۔[1] چوں کہ نجیب الدولہ اور مرہٹوں کے مابین صلح ہو گئی اور اسی اثنا میں احمد شاہ ابدالی کے ہندستان آنے کا شور وغل اٹھا تو اپنی عافیت کے لیے عماد الملک سورج مل جاٹ کے پاس چلا گیا۔[2]

چھٹا حملہ 1760-61

ہندستان کی تاریخ میں شاہ ابدالی کا یہ حملہ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اسی حملے کے موقع پر جنگ پانی پت ہوئی جس نے مرہٹوں کی روز افزوں طاقت کا قلع قمع کر دیا تھا۔

غلام علی آزاد بلگرامی نے اس حملے کی دو وجوہ بیان کی ہیں، پہلی وجہ تو یہ بتائی ہے کہ مرہٹہ سردار بالا جی راؤ کے دونوں بھائی رگھناتھ اور شمشیر بہادر، ہولکر اور دیگر سرداروں کو ہمراہ لے کر شمالی ہند میں دہلی تک بڑھ آئے تھے، اور وہاں سے لاہور پہونچے، عبد الصمد خاں سے جو شاہ ابدالی کی طرف سے سرہند کا فوجدار تھا، جنگ کر کے اسے گرفتار کر لیا، بعد ازیں لاہور پہونچے، وہاں کا حاکم مرہٹوں کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور شاہ ابدالی کے بیٹے تیمور شاہ کو ساتھ لے کر بھاگ کھڑا ہوا اور کابل چلا گیا۔ ان کا تمام مال واسباب وخزانہ غنیم کے ہاتھ آیا۔ بعد ازیں مرہٹوں کا تسلط واقتدار ملتان وڈیرہ غازی خان سے چناب ندی تک قائم ہو گیا۔ برسات کی وجہ سے وہ لوگ زیادہ دن تک وہاں قیام نہ کر سکے اور 75 لاکھ سالانہ پیش کش کے عوض لاہور آدینہ بیگ کے حوالے کر کے دہلی واپس چلے آئے اور کچھ دنوں وہاں قیام کر کے دکن واپس چلے گئے۔[3]

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) برپا کی مخفوف نشانیدہ مجلس خانہ سلاطین رسانیدند و سہ چہار ازبک خونخوار کہ در حجرہ بانتظار ورود بادشاہ نشستہ بودند، بی چارہ بادشاہ را بی یراق تنہا یافتہ زخمہائی کارد پی در پی زدہ از پالیش در آوردند و لاش را بطرف دریا بر ریگ افگندند، لچہ ہا لباسش را از بر گرفتہ عریاں ساختند، بعد شش پہر حسب الامر آں کشمیری لاشش را برداشتہ در مقبرۂ ہمایوں مدفون کردند" ص 412۔

1. میر کی آپ بیتی، ص 120۔

2. خلاصۃ التواریخ۔ ص 413-412۔

3. خزانۂ عامرہ، ص 101-100۔ نیز ملاحظہ ہو میر کی آپ بیتی۔ ص 116۔

اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد آدینہ بیگ کا انتقال ہو گیا، جنگو نامی مرہٹہ سردار نے سرہند کی فوجداری پر آدینہ بیگ کے ایک عزیز صدیق بیگ خاں کو مقرر کیا اور دوآبہ کا علاقہ آدینہ بیگ کی بیوی کو عطا کیا اور صاحبا نامی مرہٹہ سردار کو لاہور کی صوبہ داری تفویض ہوئی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ ہندستان کے تمام قدیم راجاؤں کا مرہٹوں[1] نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ان کے روز افزوں اقتدار سے وہ لوگ پریشاں اور ہراساں تھے۔

دتا سندھیہ نے ایک مدت سے نجیب الدولہ کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ نجیب الدولہ اور دیگر افغان سرداروں نے عموماً تقویتِ اسلام اور خصوصاً اپنی نجات کی غرض سے اور دوسرے راجاؤں نے اپنے ملک اور رعیت کی حفاظت کے لیے درّانی کی خدمت میں عرضیاں بھیجیں اور اس سے ہندستان تشریف لانے کی درخواست کی[2]

نجیب الدولہ نے ایک خط میں شاہ ابدالی کو لکھا:

"ایں تمام آفات از دستِ کفار مرہٹہ بر تمام ما مردم می رسد و شما بادشاہ مسلمانان ایدی باید کہ چیزے تدارک ایں امر بکنید"[3]

سید نورالدین حسین خاں بہادر فخری کا بیان ہے کہ:

"نجیب الدولہ در ہر ماہ آدم پیش احمد شاہ درّانی رواں می کردو بطرف سرداران افاغنہ و شجاع الدولہ گفتہ می فرستاد کہ مالا انہا بر من رسیدند، من تنہا طاقتِ استقامت با انہا ندارم شما ہم شریک شوید"۔[4]

دوسرے خط میں نجیب الدولہ نے شاہ ابدالی کو لکھا:

"تا استیصال مرہٹہ بالکل نہ شود ما مردم را در ہندستان ماندن مشکل است[5]

---

1. خزانہ عامرہ ص 101۔
2. خزانۂ عامرہ۔ ص، 101-100۔
3. سرگزشت نواب نجیب الدولہ۔ ص۔9۔
4. سرگزشت نواب نجیب الدولہ، ص 11، اقبال نامہ (قلمی رام پور) ص 347-346۔
5. سرگزشت نواب نجیب الدولہ، ص .117 اقبال نامہ (قلمی رام پور)

پروفیسر خلیق احمد نظامی کا خیال ہے کہ شاہ ولی اللہ کا مکتوب دوم ''بنام شاہے'' شاہ ابدالی کے نام تھا، اس مکتوب میں ہندستان کی ان سیاسی جماعتوں کا جن کو شاہانِ مغلیہ کی عدم دور اندیشی، غفلت شعاری، اختلافِ فکر، اور عیش وعشرت کی وجہ سے پھلنے پھولنے اور اپنے اقتدار کو جمانے کا سنہری موقع مل گیا تھا تفصیلی ذکر کیا ہے۔'' بعد ازیں شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو لکھا:

''اس زمانے میں ایسا بادشاہ جو صاحب اقتدار وشوکت ہو اور لشکر مخالفین کو شکست دے سکتا ہو، دور اندیش اور جنگ آزما ہو، سوائے آنجناب کے اور کوئی موجود نہیں ہے، یقینی طور پر جناب عالی پر فرضِ عین ہے ہندستان کا قصد کرنا اور مرہٹوں کا تسلط توڑنا اور ضعفائے مسلمین کو غیر مسلموں کے پنجے سے آزاد کرنا، اگر غلبۂ کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا زمانہ نہ گزرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ ہو سکے گی، یہ بھی ایک بلائے عظیم ہے، اس بلائے عظیم کے دفع کرنے کی قدرت بہ فضلِ خداوندی جناب عالی کے علاوہ کسی کو میسر نہیں ہے۔''

''ہم بندگانِ الٰہی، حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو شفیع گردانتے ہیں اور خدائے عزوجل کے نام پر التماس کرتے ہیں کہ ہمتِ مبارک کو اس جانب متوجہ فرما کر مخالفین سے مقابلہ کریں تاکہ خدائے تعالیٰ کے یہاں بڑا ثواب جناب کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے اور مجاہدین فی سبیل اللہ کی فہرست میں نام درج ہو جائے۔''[1]

خلاصہ یہ کہ شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو ہندستان آنے کی دعوت دی تھی۔

''نہیں کہا جا سکتا کہ شاہ صاحب اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے، لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جنگِ پانی پت نے ہندستان کی تاریخ کا رخ ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔''[2]

1۔ سیاسی مکتوبات۔ ص 106-105۔

2۔ سیاسی مکتوبات ص۔ 18۔

سرہند کے قریب مرہٹہ اور ابدالی کا معرکہ

میر نے لکھا ہے کہ "ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ یہ خبر آئی کہ شاہی فوج (ابدالیوں) نے اٹک پار کر کے صاحبا[1] کو شکست دے دی، مرہٹے نجیب الدولہ کی جنگ یونہی اُدھڑ میں چھوڑ کر (ابدالی) فوج کو روکنے کے لیے بدحواس ہو کر بھاگے، اور پانی پت کے قریب دریائے جون عبور کر کے اترے، راستے میں ایک عالم پر مصائب توڑتے اور تاخت وتاراج کرتے ہوئے کرنال کے اس طرف خیمہ زن ہوئے...... شام کو سنا گیا کہ شاہی فوج دریا کی سمت پہنچ چکی ہے، انھوں نے بھی اپنی فوج کو آگے بڑھایا۔ دوسرے دن سورج نکلنے سے پہلے تقریباً آٹھ ہزار جیالے سوار ایک سردار کی سرکردگی میں بھیجے، وہ شاہی فوج سے مقابل ہوئے مگر ایک ہی دھاوے میں بہتوں کے پاؤں اکھڑ گئے، بڑے بڑے سورماؤں کا گھمنڈ نکل گیا، جو بہت دوُن کی لیتے تھے، اوندھے ہو گئے۔ ادھر خون خواروں نے ایسا بلا بولا کہ آن کی آن میں کشتوں کے پشتے لگا دیے..... یہ لوگ تو ہار کر واپس آ گئے اور وہ (درّانی) مال غنیمت لوٹ کر دریا کے پار اتر گئے۔" اس معرکہ کے موقع پر میر میدانِ جنگ میں موجود تھے[2]

معرکۂ باؤلی[3]

بعد ازیں احمد شاہ ابدالی نے دوآبے میں ڈیرے ڈالے اور نجیب الدولہ ان سے آ کر مل گیا تو دکنی سرداروں نے لشکر اور شہر کی محافظت کے لیے وزیر کو دستوری مرحمت کر دی اور خود وہاں سے نکل کر چھ کوس ادھر خیمے گاڑ دیے۔"

"چار روز کے بعد شاہ ابدالی اور نجیب الدولہ کی فوجیں کوچ پر کوچ کرتی ہوئی دریا پار پہنچ گئیں اور ان کی جنگ جو فوج (مرہٹوں کی) گوش مالی کرنے پر متوجہ ہوئی، روہیلہ فوج کے پیادوں نے پیش قدمی کر کے جنگ شروع کر دی اور خوب کٹ کٹ کر لڑے، اِدھر سے دتا جو مرہٹہ فوج کا سردار تھا، اپنی فوج سے آملا اور جی جان سے لڑا، ادھر سے پہلا ہی حملہ ہوا تو ایک تیر دتا کے پہلو میں بہت کاری لگا، مرہٹوں کے ہاتھ

1. مخلص التواریخ ودیگر تواریخ میں سابا نام لکھا ہے۔ ص۔415۔

2. میر کی آپ بیتی ص،120 / خزانۂ عامرہ،، ص102 / سرگزشت نجیب الدولہ ص18-14۔ مخلص التواریخ ص، 415 / تاریخ مرہٹہ وابدالی از علی ابراہیم خان، ص29۔

3. باؤلی کا میدان شاہ جہاں آباد کے قرب وجوار میں تھا۔

پاؤں پھول گئے، وہ دتا کے مُردے کو دریا کے پار لے گئے، انھوں نے بھی دریا کے پار اتر کر مار دھاڑ شروع کی اور یہ مرہٹے بھاگنے لگے...... درّانیوں نے بھگوڑی فوج کا تعاقب کیا اور ان میں سے اکثروں کو قتل کر دیا۔[1]

بقول علی ابراہیم خاں "درّانیوں نے زخمِ تیر اور بندوق اور تلوار سے سپاہ مخالف کے تئیں مضمحل کیا اور باقی نہ چھوڑا کہ ایک تن اس میں سلامت میدانِ کارزار سے باہر جاوے۔"[2]

معرکہ سکندرہ

میر کا بیان ہے "کہ مرہٹوں کی فوج جو ہار کر بھاگی تھی، اس لشکر کے ساتھ جو میوات کے علاقے میں تھا، مل گئی ہے اور ان کے ارادے ناپاک ہیں، ابدالی نے یہ خبر سن کر ان کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا، شاہجہاں ثانی کو جو چند مہینے کی برائے نام سلطنت کا گنہ گار تھا، پہلے کی طرح سلاطین میں بھیج دیا اور عالی گہر کے لڑکے جواں بخت کو اس کا ولی عہد مقرر کر کے شہر سے کوچ کر گیا، جب شاہ ابدالی میوات کے قرب و جوار میں پہونچا اور مرہٹوں نے دیکھا کہ ہمارا حملہ کارگر نہیں ہوتا اور فوج سہم گئی ہے، تو وہ اپنے قدیم معمول کے مطابق بھگدڑ مچاتے ہوئے شاہ جہاں آباد تک آگئے اور دریا عبور کر لیا، شاہ نے بھی ان کا تعاقب کیا، اور رات شہر کے قریب بسر کر کے (صبح کو دریا کے) پار اتر گیا، جو پایاب تھا، جب دریا کے اس طرف لشکر جما لیا اور اس کی فوج کا سردار جہاں خان آگے بڑھا اور سکندرہ آباد کے قریب ملہار کی فوجوں سے بھڑ گیا، شاہ (ابدالی) بھی یہاں سے تین ہزار لشکریوں کو لے کر دو گھڑی میں اس سے جا ملا، ادھر کے سردار (ملہار) میں مقابلے کی ہمت نہ رہی تو وہ اپنی جگہ مرہٹہ سرداروں میں سے ایک کو سونپ کر خود چپکے سے بھاگ گیا، اس (مرہٹہ) سردار نے بہادری کے جوہر دکھائے اور لڑتے لڑتے مارا گیا، اس کے سپاہی پسپا ہو کر (ابدالی) کے لشکر جرار کے مقابلے سے بھاگ پڑے اور منتشر ہو گئے، شاہ ابدالی کول تک ان کے تعاقب میں گیا، ان بھگوڑوں نے سورج مل کے قلعوں میں پناہ لی اور دو تین دن کے بعد آگے روانہ ہو گئے، شاہی فوج اس کے قلعوں

---

1. میر کی آپ بیتی ص 121، خزانہ عامرہ، ص 102، بماہ جمادی الآخر 1173ھ میں یہ جنگ ہوئی تھی آزاد بلگرامی نے تاریخ کہی ہے، کرد سلطان عصر درّانی ☆ قتل دتا بہ تیغ دشمن کاہ گفت تاریخ ایں ظفر آزاد ☆ نصرت بادشاہ عالی جاہ مخص التواریخ، ص 416-415۔

2. تاریخ مرہٹہ و ابدالی، ص 30۔

میں سے ایک قلعے پر جو دریائے جون کی دوسری جانب تھا، دھرنا دے بیٹھی اور محاصرہ کر کے لوگوں کے ناک میں دم کر دیا۔ زمیں دار مذکور (سورج مل) نے ان کی مدد کرنے میں اپنا کوئی فائدہ نہ دیکھا تو وہ بھی طرح دے گیا، مجبور ہو کر محصورین نے اپنا سفیر بھیج کر صلح کر لی اور قلعہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔[1]

سداشیوراؤ اور دیگر مرہٹہ سرداروں کا شمالی ہند میں آنا

جب دتا کے قتل اور ہولکر کے مغلوب ہونے کی خبر دکن پہنچی تو سداشیوراؤ عرف بھاؤ برادر بالاجی راؤ مع نامی گرامی سرداروں اور جرار لشکر و توپ خانہ مرہٹوں کی گزشتہ شکست کا انتقام لینے کی غرض سے شمالی ہند آیا۔ طباطبائی کا بیان ہے کہ "بجہیہ تدارک و انتقام کشی از ابدالی و بر انداختن بنیاد سلاطین بابری و نشانیدن بسواس راؤ بر تخت سلطنت رہ گرای ہندستان از دکہن گردید"۔[2]

میر نے لکھا ہے کہ "ابھی یہ فوج (ابدالی) دوآب ہی میں تھی جو یہ خبر پھیل گئی کہ (مرہٹوں کی) بڑی فوج جنگ کرنے کے ارادے سے دکن سے آئی ہے، اور آگرے تک پہنچ گئی ہے، بس یہاں تک آیا ہی چاہتی ہے، نجیب الدولہ نے پورب کے سرداروں مثل شجاع الدولہ، احمد خان بنگش اور حافظ رحمت خاں (روہیلہ) وغیرہ کو اپنے ساتھ ملا لیا اور سب کو ملک (میں حصہ) دینے کا لالچ دے کر خلعت دی، اور (مرہٹوں سے) جنگ کرنے پر آمادہ کر لیا۔"

"انہیں دنوں، بھاؤ جو مرہٹوں کا بڑا سردار تھا اپنے بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ سورج مل کے علاقے سے گزرا۔ وزیر (عمادالملک) اور راجا اسے بہلا پھسلا کر ساتھ لے آئے اور شہر پر قبضہ کر لیا، یعقوب علی خاں، جو شاہ درّانی کے وزیر شاہ ولی خاں سے قرابت بھی رکھتا تھا (اور ان دنوں دلی میں شاہی قلعدار تھا) یہ سوچ کر کہ شاہی فوج دریا کے اس طرف موجود ہے اور وہ مدد میں دریغ نہ کرے گی، (مرہٹوں سے) مصروف جنگ ہو گیا، دکنی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر کے اسے فتح کر لیا اور اکثر مکانات شاہی کو جو خوبصورتی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے، خاک میں ملا دیا، چوں کہ دریا کا (برسات کے باعث) پار کرنا مشکل تھا اور شاہ ابدالی وہاں سے گزر نہیں سکتا تھا، خان مذکور

---

1. میر کی آپ بیتی، ص 127-124 / نیز ملاحظہ ہو، خزانۂ عامرہ۔ ص، 103-102 ملخص التواریخ ص۔ 417-416، تاریخ مرہٹہ و ابدالی۔ ص، 31۔

2. ملخص التواریخ، ص 417، تاریخ مرہٹہ و ابدالی، ص 32، خزانۂ عامرہ، ص 103۔

(یعقوب علی خان) نے راجا سے صلح کر لی اور قلعہ سے نکل آیا۔ معاہدے کی رو سے کسی نے اس سے روک ٹوک نہ کی،"[1]

بقول آزاد بلگرامی اور علی ابراہیم خان "بسواس راؤ داخل قلعہ ہوا اور جو کچھ مال و اسباب کار خانجات قدیم بادشاہی میں تھا سب پر قابض و متصرف ہوا، اور چھت چاندی کی جو دیوانِ خاص میں تھی اس کو توڑ کر بہت سی چاندی انبار کر کے سترہ لاکھ روپیہ بنوا کر سکہ اپنا لیے[2] بعد ازیں قدم شریف، سلطان المشائخ نظام الدین اولیا کی درگاہ اور فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) کے مزار سے متعلقہ سونے چاندی کے آلات اپنے قبضے میں کر لیے[3]

دلی سے میر کا کوچ

اس زمانے میں میر راجا جگل کشور کے ہاں ملازم تھے، مگر دہلی پر آئے دن آنے والی مصیبتوں سے تنگ آ کر انھوں نے شہر چھوڑنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور راجا سے رخصت طلب کی۔

بقول میر" (میں) راجا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ زمانے کے ہاتھوں سخت پریشان ہوں، چاہتا ہوں کہ شہر سے نکل جاؤں اور جہاں سینگ سمائیں چلا جاؤں، ممکن ہے اسی طرح کچھ آسودگی نصیب ہو جائے۔ انھوں نے میرے ساتھ رعایت کی اور مجھے رخصت کر دیا۔"[4]

بال بچوں کو لے کر میر نکل پڑے، دن بھر میں 9-8 کوس کی مسافت طے ہو سکی، رات ایک سرائے میں ایک درخت کے نیچے گزارنی پڑی، اگلی صبح کو ادھر سے راجا جگل کشور کی بیوی کا گزر ہوا، انھوں نے ان مجبوروں کی دست گیری کی اور اپنے ساتھ برسانہ[5] تک لے آئیں اور ان کے ساتھ طرح طرح کے سلوک کیے[6]

---

1. میر کی آپ بیتی ص 127،128۔ نیز ملاحظہ ہو خزانہ عامرہ، ص 104،105 تاریخ مرہٹہ و ابدالی، ص 418،420

2. خزانہ عامرہ، 105 تاریخ مرہٹہ و ابدالی۔ ص، 38، ملخص التواریخ ص 420۔

3. خزانہ عامرہ ص / 105، ملخص التواریخ ص، 420 اقبال نامہ (قلمی رام پور) ص 349، تاریخ مظفری (ق) ص 85 ب۔

4. میر کی آپ بیتی، ص 128، صحیفۂ اقبال (قلمی) ص 87 (الف) و (ب)۔

5. یہ مقام ہندوؤں کا تیرتھ اور سورج مل کے قلعوں سے آٹھ کوس ادھر ایک قصبہ تھا۔

6. میر کی آپ بیتی، ص 128،129۔

میر کا کامان جانا

راجا جگل کشور کی بیوی کے ساتھ میر کامان[1] گئے، اپنے اہل وعیال کے ساتھ عشرۂ محرم میں وہیں قیام کیا، بعدازیں کمھیر گئے۔[2]

کمھیر میں قیام

ایک دن صفدر جنگ کے سابق خزانچی لالہ رادھا کشن کا بیٹا، بہادر سنگھ میر کے پاس آیا اور انھیں اپنے ساتھ لے گیا اور ان کی مدد و اعانت کی، کچھ دن سکھ چین سے بسر ہوئے۔[3]

میر کی عسرت اور تنگ دستی

میر کے لیے یہ زمانہ بڑی مصیبت اور عسرت کا تھا کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ان کے پاس کھانے پینے کی اشیا تک نہ ہوتی تھیں ان کا بیان ہے:-

> ''ایک دن کھانے پینے کا سامان نہ ہونے کے باعث پریشان بیٹھا تھا، جی میں آئی کہ اعظم خاں کلاں جو فردوس آرام آگاہ (محمد شاہ بادشاہ) کے عہد میں شش ہزاری امیر، اور نہایت کریم النفس انسان تھا، کے لڑکے اعظم خان سے ملا جائے تو شاید (وہ امداد کرے اور) کچھ دن سکھ سے گزر جائیں۔ (چنانچہ) گیا، اور سورج مل کے طویلے میں اس سے ملا جو دہلی کے خانہ خرابوں کی جائے پناہ بنا ہوا تھا۔ اس عزیز نے خدا بخشے، میری خیر و عافیت معلوم کی، میں نے اپنا دُکھڑا سنایا (تو) سننے والے بہت متاثر ہوئے، جب قہوہ اور حقہ لایا گیا تو یہ شعر (میری) زبان پر آیا۔
>
> امروز چوکار من و عرفی بہم اُفتاد
>
> باہم نگرستیم و گرستیم و گزشتیم

ایسے ہی چند شعر میں نے پڑھے اور دو تین آنسو پلکوں سے گرائے چند لمحوں کے بعد دیکھا کہ

---

1. یہ مقام برسانہ سے تین کوس پر راجا جے سنگھ والئی جے پور کی سرحد پر تھا۔
2. میر کی آپ بیتی۔ ص،129۔
3. میر کی آپ بیتی۔ ص،129۔

خان فکر مند ہے میں نے کہا آپ کس سوچ میں پڑ گئے، بولا'' کچھ نہیں'' میں نے کہا: '' کچھ تو ہے!'' کہنے لگا'' جب تم شہر (دہلی) میں آتے تھے تو ہم طرح طرح کی مٹھائیاں اور قسم قسم کے حلوے منگاتے اور دونوں کھاتے تھے، آج عجب اتفاق ہے کہ کچی کھانڈ بھی میسر نہیں جو تمھارے لیے ایک پیالہ شربت بنا سکوں'' میں نے کہا میں ان سب چیزوں کا ندیدہ نہیں ہوں۔

وہ بات بھی تفریحاً ہو جاتی تھی، آپ تو جانتے ہیں کہ میں حریص اور لالچی نہیں، زمانہ بدلتا رہتا ہے وہ شربت وشیرینی کا وقت تھا، یہ تلخیاں جھیلنے کا موسم ہے[1]

اعظم خاں خود مفلسی اور عسرت کے شکار تھے، ان کے پاس نقد تو کچھ نہ تھا[2] لیکن اس نے اصرار کر کے حلوے کی قاب اور مٹھائی کا خوان میرے گھر بھجوا دیا اور مجھے ہنسی خوشی رخصت کیا، دو دن اس مٹھائی پر گزر رہوئی۔''[3]

تیسرے دن راجا جگل کشور کے چھوٹے بیٹے بشن سنگھ نے میر کو اپنے پاس بلایا اور حالات دریافت کرنے کے بعد کہا کہ'' راجا صاحب کے آنے تک میرے پاس رہو'' میں نے کہا کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں'' ہے'' بولا مطمئن رہو، یہاں سب کچھ موجود ہے۔ باغ کرم کے اس گلِ تو دیدہ نے خدا اسے خوش رکھے، میری ضرورت کا سب سامان مہیا کر دیا[4]

جنگِ پانی پت 1761

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کہ بھاؤ نے دہلی کے قلعے پر قابض ہو کر خوب لوٹ مار کی، کچھ دنوں بعد دانہ اور گھاس کی قلت سے تنگ آ کر اس نے 19 رتاریخ ماہِ صفر 1174ھ کو شاہ جہاں ثانی کو معزول کر کے شہزادہ جواں بخت کو تختِ شاہی پر بٹھایا اور منصب وزارت شجاع الدولہ کے نام مشہور کر دیا، ایسا کرنے میں اس کا مقصد یہ تھا کہ شاہ ابدالی نواب شجاع الدولہ سے آزردہ ہو جائے اور ممکن تھا کہ وہ اپنے ملک کو واپس چلا جائے، مختصر یہ کہ بھاؤ اپنا لاؤ لشکر لے کر کنجپورہ کی طرف بڑھا اور

---

1. میر کی آپ بیتی، ص129,130۔
2. میر کی آپ بیتی ص130,131۔
3. میر کی آپ بیتی ص،131۔
4. میر کی آپ بیتی ص،131۔

عبدالصمد خاں اور قطب خاں کو شہید کر کے قلعہ فتح کر لیا، باقیوں کو قید کر کے کنجپورہ کو لوٹ لیا اور تاخت وتاراج کر دیا۔ یہ خبر سن کر شاہ ابدالی کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی، حالانکہ جمنا ندی برسات کی وجہ سے پایاب نہ تھی پھر بھی اس نے چڑھے ہوئے دریا کو پار کیا، ادھر بھاؤ کنجپورہ سے آگے بڑھ کر پانی پت کے میدان میں خیمہ زن ہوا اور اِدھر سے شاہ ابدالی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ وہاں پہونچا، اور مرہٹوں کے لشکر کو چاروں طرف سے گھیر لیا، اس وجہ سے مرہٹوں کو سب سے بڑی دقت رسد اور روپیہ کی ہوگئی، اسی اثنا میں یہ واقعہ پیش آیا کہ نارو شنکر جو قلع دار دہلی تھا، دو ہزار سوار کی جمعیت کے ساتھ خزانہ بھاؤ کے لشکر میں پہونچانے جا رہا تھا، اتفاقاً اندھیرے میں راستہ بھول گیا اور شاہ ابدالی کے لشکر کی طرف آن پڑا۔ بہادرانِ شاہ کو جب یہ خبر ملی تو ''مانند بھیڑیے بھوکے کے فوج غنیم پر دوڑ پڑے اور ہزار آدمی مع نارو شنکر جان سے مارے اور باقیوں کو گھیر کر قید کر کے مانند بھیڑوں کے اردوی بادشاہی میں لے گئے اور خزانہ چھین لیا، بھاؤ یہ خبر سُن کر بہت غمگین ہوا۔''

درانیوں نے ناکہ بندی کر کے، بجلی کی مانند ہر طرف دوڑ دھوپ کر کے مرہٹہ لشکر میں غلّہ و رسد پہنچنے کے راستے بند کر دیے، اس وجہ سے ان کے لشکر پر عظیم قحط پڑا، اور رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ ہر روز بہت سے آدمی، گھوڑے، ٹٹو، اونٹ اور بیل بھوک سے مرنے لگے، ایک شاعر نے[1] ذیل کے اشعار میں مرہٹوں کی فاقہ کشی کا نقشہ پیش کیا ہے۔

ہوئی شکل روٹی کی ایسی ہی مشتاق — کہ نقشِ پا کو کلچہ جانتے تھے
نکلتا تھا جو لکڑی میں سے بورا — غنیمت جان اس کو پھانکتے تھے
سپاہی جو دکن کے تھے دلاور — پڑے تھے راہ میں عریان دلاغر
کوئی مردے پہ گر ہوتا تھا غمناک — خود گرتا تھا مثل اشک برخاک (کذا)
فغاں منھ سے نکلتا تھا نہ باہر — گزر کوئے خموشاں میں تھا اکثر (کذا)
جہاں میں تھے حباب سادہ — تھے امید زندگی سے ہاتھ دھوے (کذا)

---

1. برائے تفصیل ملاحظہ ہو، ملخص التواریخ، ص 420،423، تاریخ مرہٹہ وابدالی ص 42،57۔ خزانہ عامرہ ص 106،108۔ اقبال نامہ (قلمی رام پور) ص 358،359۔ صحیفۂ اقبال (قلمی) ص 88، تاریخ مظفری (ق) ج۔2، ص 86 الف تا 90 ب) (الف و ب)

آخر الامر فاقہ کش مرہٹہ سپاہی بھاؤ کے پاس پہونچے اور انھوں نے لعنت ملامت کی اور کہا ''تم نے ایسا سرشتۂ تدبیر گم کیا ہے کہ کچھ تجھ سے بن نہیں پڑتا، اور چاہتا ہے تو کہ جتنے سردار نامی اور بہادر لڑنے والے ہیں سب مفت ہلاک ہوں اور بھوکے مارے مرجاویں۔کل جس وقت صبح ہوگی اور آفتاب نکلے گا ہم کمرِ ہمت باندھ کر میدانِ کارزار میں نکلیں گے اور کوشش لڑائی میں کریں گے، آگے خدا مالک ہے چاہے جسے فتح دے،،[1]

چنانچہ ششم جمادی الآخرہ، روز چہارشنبہ، 1174ھ 1761 کو ایک ایسی زبردست جنگ ہوئی جس کی نظیر ہندستان کی تاریخ میں نہیں ملتی، چاروں طرف سے'' ہر ہر مہادیو، یا علی یا علی کی آوازیں سنائی دیتی تھی[2]

میر کا بیان ہے کہ:

''مرہٹے اگر اپنے قدیم دستور کے مطابق جنگِ گریز کرتے تو عین ممکن تھا کہ غالب آجاتے۔ وہ توپ خانے کو گھیر کر بیٹھ گئے اور شاہی فوج اس فکر میں لگ گئی کہ رسد نہ آنے دے جب رسد نہ آنے سے پریشانی بہت بڑھ گئی تو مرہٹہ فوج جنگ پر آمادہ ہوئی اور اس کے سردار مورچوں سے باہر آکر ڈٹ گئے (ابدالی فوج کے) جگردار بھی انھیں شکست دینے کے لیے جی توڑ کوشش میں لگ گئے، بہادروں نے بڑی تنظیم کے ساتھ ہلّا بولا اور متحد ہو کر تیروں کی بوچھار شروع کر دی، آزمودہ کاروں نے بندوقیں سنبھال لیں، اور دنادن گولیاں برسائیں، کچھ مقابل فوج نے پیادہ ہو کر لڑنا شروع کیا مگر منھ کی کھائی، ان کے جوانوں کے بڑے کاری زخم لگے اور بہت سے ہلاک ہو گئے، یہ جنگ آور دونوں طرف سے چل پڑے اور تیر و تفنگ سے حملہ کرتے رہے (اب) دکن کا سردار پامردی کے ساتھ میدان میں آیا اور اس نے شاہی فوج کے بہت سے دستوں کو مار بھگایا لیکن فتح تو شاہ کے لیے مقدر ہو چکی تھی، اِن کوششوں

---

1. تاریخ مرہٹہ و ابدالی ص 50،51۔

2. مخص التواریخ ص 423۔

سے کچھ نہ ہوا، بہتری بندوقیں چلاتے تھے، مگر ادھر کے ایک آدمی پر اثر نہ کرتی تھی، ان کی فوج کے بہت سے کار آمد سپاہی اِدھر کی تفنگ اندازی سے زخمی ہو گئے، چنانچہ پہلے ہی ہلّے میں ایک تیر وشواس راؤ کے لگا جو مرہٹہ ریاست کا ولی عہد تھا، وہ خاک وخون میں لوٹ گیا، کہتے ہیں کہ بھاؤ بڑا غیور جوان تھا اور وہ دادِ مردانگی دے رہا تھا، جب اس نے اپنی آنکھوں سے یہ سانحہ دیکھا تو کہنے لگا کہ اب دکن جانے کا منہ نہیں رہا جان پر کھیل کر (ابدالی کی) فوج کے قلب پر حملہ کیا یعنی جان بوجھ کر اپنے تئیں موت کے منہ میں دھکیل دیا"۔[1]

مختصر یہ کہ بڑے نامی گرامی مرہٹہ سردار مثل جسونت راؤ، بھاؤ، تکوجی سندھیا، جنکو سندھیا، ابراہیم خان گاردی، شمشیر بہادر اور انیتاجی سب ہلاک ہو گئے، سنتاجی کے چالیس زخم آئے اور مہادجی سندھیا کے پیر میں ایسی کاری چوٹ آئی کہ عمر بھر یہ زخم ٹھیک نہ ہو سکا۔

مرہٹوں کی تباہی و بربادی، جانی و مالی نقصانات کا ذکر کرتے ہوئے میر نے لکھا ہے کہ:

"ملہار راؤ وہاں سے دو تین ہزار سواروں کو ساتھ لے کر بھاگا اور باقی تمام لشکر غارت ہو گیا جو سردار زندہ بچ رہے تھے وہ گداگروں کے حال میں آوارہ پھرتے تھے، ہزاروں بھگوڑے سپاہیوں کے گھوڑے اور ہتھیار اطرافِ شہر کے زمینداروں کے قبضے میں آ گئے، کیا لکھوں کہ کیسا روزِ بد اس قوم کو دیکھنا پڑا، ہزاروں ننگے سپاہی روتے ہوئے جس راستے سے گزرتے تھے، اور ان کی تباہ حالی کا موازنہ اپنے حال سے کر کے خدا کا شکر ادا کرتے تھے، لوگوں کے لیے عبرت کا سامان نظر آتے تھے۔ گاؤں کے لوگ بھنے ہوئے چنے سب کو ایک ایک مٹھی تقسیم کرتے تھے ایسی عبرت انجام شکست کسی کو کم ہوئی ہوگی، بہت سے بھوک سے مر گئے اور بہتوں نے ٹھنڈی ہوا میں اکڑ کر جان دے دی، وہ فوج جسے یہ قلعے میں چھوڑ کر آئے تھے، شاہی فوج کی لوٹ مار کے خوف سے رات کے وقت بھاگ گئی، کروڑوں روپیہ کا ساز و سامان (احمد شاہ ابدالی) اور

1. میر کی آپ بیتی۔ ص 134-133۔

پورب کے سرداروں کے ہاتھ لگا، جسے انھوں نے آپس میں تقسیم کرلیا، نقد وجنس کے سوا توپ خانہ اور دوسرا جنگی سامان ہاتھی، بیل، گھوڑے اور اونٹ شجاع الدولہ وغیرہ نے اپنے حصے میں لے لیے، درّانی سپاہی جو فقیر محض تھے مالا مال ہو گئے، ہر دہ باشی کو سو اُونٹوں کا سامان ملا اور ہر شخص کو دو خروار، بڑی دولت ہاتھ لگ گئی، ہر شخص پھولا نہ سماتا تھا،[1]

سید نورالدین حسین خان نے مرہٹوں کی تباہی کا بڑا دل دوز نقشہ پیش کیا ہے:

''بھاؤ دریں اثنا کشتہ شد، و سر آں را مردم در ذیلِ سر ہا بریدند، و تمام لشکر افغانان و مغل و روہیلہ و شجاع الدولہ در پے ایں مردم افتادند و غارت شروع شد و اسباب بے حساب و بے حد بدست لشکر افتاد و تا شام تعاقب نمودند ہمیں کہ شب شد دست از تعاقب باز داشتند و در لشکر ایں قدر غارت بدست خوانین آمد کہ زیادہ بر شمار است و مردم دیگر ایرانی و تورانی را تا مقدور دستہ خوانین غارت کردن نمی داد، خود متصرف می شد مگر بدستِ لشکر ہندستان بقیمت یک یک تومان زنہائے خوش شکل مزین و اسپ ہائے خوب بدو دو تومان می فروختند و ہر کہ را تا شب یافتند بلا تحاشی سر از تن جدا می کردند، و در میان خندق صد ہا مردم مرہٹہ مع اسپ افتادہ بود و لاش را شمارے نیست کہ تا چند سال در آں میداں بہ سبب استخواں مردم مردہ مزار عان کشت و کار مشکل بود و بسیار مردم لشکر کہ در میان قصبۂ پانی پت پناہ گرفتند تا دو روز مردم درّانی سُراغ گرفتہ ہر جا می یافتند بدست آوردہ می کشتند۔''[2]

---

1. میر کی آپ بیتی ص 135۔

2. سرگشت نجیب الدولہ ص 28 تا 29۔ علی ابراہیم کا بیان ہے کہ "آخر الامر خوں ریزی یہاں تک پہنچی کہ لوگوں کو رسی سے باندھ کر لاتے تھے اور سر ان کا تلوار سے جدا کر ڈالتے تھے" ص 57۔ بقول شیو پرشاد لکھنوی "غارت و قتل نمودہ کہ سطح زمین از کشتگان پُر لاش بود، قریب یک لک کس آں روز از سپاہ و چہ از میکاہ بقتل آمدہ و کم کس جان بر شدہ واری آں ورا و بدست زمین داراں بسیار کس مرہٹہ از غارت و قتل (بقیہ صفحہ اگلے صفحہ پر)

مختصر یہ کہ ''مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اڑگئی''
سرجادوناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ ''مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صفِ ماتم نہ بچھ گئی ہو، سرداروں کی ایک پوری نسل ایک ہی معرکہ میں غائب ہوگئی۔''

نتائج

اس جنگ کے نتائج بہت دوررس تھے بشرطیکہ مغل بادشاہوں میں سے کوئی ایسا ہوتا جو اس فتح سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا، اس جنگ کے دوررس نتائج کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ

''اگر سلطنتِ مغلیہ میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو وہ جنگ پانی پت کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو ہندستان میں پھر صدیوں کے لیے قائم کر سکتی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت اس وقت ایک بے روح جسم کے مانند تھی، جنگ پانی پت کا اصلی فائدہ فاتحین جنگ پلاسی نے اٹھایا۔''[1]

ابدالی کے اِس حملے کے زمانے میں شاہ عالم[2] ثانی بہار میں تھا، جنگِ پانی پت اور مرہٹوں

(بقیہ صفحہ 54 کا) شدند چہ شرح دہر یک یک سوار و دہ بست شتر پر انبار جنس کشیدہ آوردند و اسپاں معروتہ راچہ شمار مثل گلہ گوسپنداں بود و افیال خوب و کنیزان و غلامان نیز قریب چہل ہزار کس اسیر شدہ آمدند و قریب بست ہزار کس غارت شدہ''

احوال جنگ بہاؤ و احمد شاہ ابدالی و اقبال نامہ، قلمی رام پور) ص 371,372 بقول شیو پرشاد ''چنداں مردماں و فیلان و اسپان و شتران و گاوان در آن معرکہ کشتہ و خستہ افتادہ بودند کہ بہایم و سباع و طیور گوشت خواران نواح تا سالہا درانہ از تلاش معاش فارغ گشتہ خوش زیست می نمودند'' تاریخ فرح بخش (قلمی) ص60۔ (الف)

1۔ سیاسی مکتوبات ص،19۔

2۔ شاہِ عالم بن عزیز الدین عالم گیر ثانی 17/ ذیقعدہ 1140ھ 14/ جون 1028ھ) میں پیدا ہوئے تھے، برائے تفصیل ملاحظہ ہو، مفتاح التواریخ، ص 343,344۔ مراۃ الاشباہ 53۔ یہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ صفدر جنگ وزیر کی بداخلاقیوں اور مظالم سے تنگ آکر شاہ عالم (عالی گہر) پورب کو چلے گئے تھے، آئندہ اس کا تفصیلی ذکر آئے گا۔

کے زور کو توڑنے کے بعد ابدالی نے شاہ عالم ثانی کو دہلی بلانے کی بے حد کوشش کی اور اپنا آدمی بھیجا، جب وہ نہ آیا تو ابدالی نے اس کی والدہ نواب زینت محل سے اسے ایک خط لکھوایا جس کا مضمون حسب ذیل تھا:

> ''شاہنشاہ (احمد شاہ ابدالی) قلعہ میں آ گئے ہیں، آج تک کہ 20 ؍رجب ہے میں کئی مرتبہ ان سے ملی ہوں، وہ تمھارے آنے کے بے حد منتظر ہیں...... میرے بیٹے! تم یقین رکھو کہ تمھارے آنے پر سارے معاملات طے ہو جائیں گے...... تیمور شاہ نے خلوص و محبت سے مجھے تحائف بھیجے ہیں، تمھارے بدخواہ بدگمانیاں پیدا کرنے کی کوشش کریں گے، تم ان کے کہنے اور بہکانے میں نہ آنا، میرے بیٹے تم جلد آ جاؤ، اگر خدانخواستہ شاہ چلے گئے تو پھر تم مصیبتوں میں پھنس جاؤ گے۔''[1]

ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے اس بارے میں انگریزوں کو بھی لکھا تھا تا کہ وہ لوگ شاہ عالم کو دہلی پہونچانے کے لیے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہونچائیں، ویسی ٹارٹ نے احمد شاہ ابدالی کو لکھا تھا:

> ''اگر شہنشاہ (ابدالی) کی یہ خواہش ہے تو اس (شاہ عالم) کو دہلی تک برٹش سپاہ کی حفاظت میں پہونچا دیا جائے گا،،[2]

گمان غالب ہے کہ شاہ عالم کو دہلی بلانے میں اسے انگریزوں کے اثر سے خلاصی دلانے کا راز پنہاں تھا، اور احمد شاہ ابدالی ہندستان میں اپنے قیام کے زمانے میں اس کی طاقت کو دہلی میں مستحکم کرنے کا خواہش مند تھا، لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہا، کیوں کہ شاہ عالم دہلی نہ آیا اور احمد شاہ ابدالی اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔

میر کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنگ پانی پت کے بعد جب ابدالی سپاہ دہلی آئی تو اس مرتبہ پھر انھوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کیا تھا، ''دلی پھر لٹی'' کے عنوان سے میر نے لکھا ہے کہ:

---

1. Islamic Culture, Vol, XIPP 503-504

2. Islamic Culture, Vol, XP 504

"میں ایک دن ٹہلتا ہوا شہر کے تازہ ویرانوں سے گزرا، ہر قدم پر روتا اور
عبرت حاصل کرتا تھا جوں جوں آگے بڑھتا، حیرت بڑھتی گئی، مکانوں
کو شناخت نہ کر سکا، آبادی کا پتہ تھا نہ عمارتوں کے آثار نہ ان کے مکینوں
کی خبر!

از ہر کہ سخن کردم گفتند کہ ایں جا نیست ☆ از ہر کہ نشاں جستم گفتند کہ پیدا نیست

گھر کے گھر مسمار تھے اور دیواریں شکستہ، خانقاہیں صوفیوں سے، خرابات، رندوں سے۔
یہاں سے وہاں تک ایک ویرانہ تھا لق ودق!

ہر کجا افتادہ دیدم خشت در ویرانہ
بود فرد دفتر احوال صاحب خانہ

نہ وہ بازار تھے جن کا بیان کروں، نہ بازار کے وہ حسین لڑکے، اب حسن کہاں جسے تلاش کروں؟
وہ یارانِ عاشق مزاج کدھر گئے پیرانِ پارسا چلے گئے، بڑے بڑے محل خراب ہو گئے، گلیاں ناپید
ہو گئیں، اور ہر طرف وحشت برس رہی تھی، اُنس ناپید تھا، ایک استاد کی رُباعی مجھے یاد آئی ۔

افتاد گزارم چو بو برانہ طوس ☆ دیدم چغدے نشستہ برجائے خروس
گفتم چہ خبرداری ازیں ویرانہ؟ ☆ گفتا خبر این ست کہ افسوس افسوس

ناگاہ اس محلے میں آنکلا جہاں میں رہتا تھا جلسے کرتا تھا، شعر پڑھتا تھا،
عاشقانہ زندگی گزارتا تھا، راتوں کو آہ وزاری کرتا، خوش قدوں سے عشق
لڑاتا، ان (کے حسن) کی تعریفیں کرتا اور لمبی لمبی زلفوں والے (معشوقوں)
کے ساتھ رہتا تھا، حسینوں کی پرستش کرتا اور ایک لمحے کے لیے بھی ان سے
جدائی ہوتی تو بے قرار ہو جاتا تھا، محفل سجاتا تھا، حسینوں کو بلاتا تھا، ان کی
مہمان داری کرتا تھا (اور یوں) زندگی گزارتا تھا، اب کوئی ایسا مانوس چہرہ
نظر نہ آیا جس سے دو باتیں کر لیتا، کوئی معقول انسان نہ پایا جس کے پاس جا
بیٹھتا، اس وحشت انگیز گلی سے نکل کر ویران راستے پر آ کھڑا ہوا اور حیرت سے
تباہی کے چھوڑے ہوئے نشانات دیکھتا رہا، بہت صدمہ اٹھایا اور عہد کیا

کہ اب اِدھر نہ آؤں گا، اور جب تک رہوں، شہر کا قصد نہ کروں گا،،[1]

بعد ازیں ابدالی فوج نے ہندستان سے واپس جانے کے بارے میں ہنگامہ برپا کیا اور مجبوراً ابدالی کو واپس جانا پڑا۔[2]

ساتواں حملہ 1175ھ 1762

اس حملہ کا خاص مقصد سکھوں کی ہنگامہ آرائی اور شورش کی روک تھام کرنا تھا، کیوں کہ چھٹے حملے کے بعد اپنے ملک کو واپس جاتے وقت اسے سکھوں کے ہاتھوں کافی جانی ومالی نقصانات اٹھانے پڑے تھے۔[3] غلام علی آزاد بلگرامی اور طباطبائی نے لکھا ہے کہ جب ہندستان کے سرکشوں نے میدان خالی دیکھا تو اس موقع کو غنیمت جان کر لوٹ مار کشت وخون اور غارت گری شروع کردی، ان سرکشوں کے استیصال کے لیے پھر شاہ ابدالی کو ہندستان آنا پڑا۔[4]

بقول میر:

''اس بار بھی شاہ درانی ستلج کے جو ایک مشہور دریا ہے، اس طرف تک آیا اور بے حقیقت سکھوں کے ہاتھوں نقصان اٹھا کر واپس ہو گیا،،[5]

طباطبائی کا بیان ہے کہ:

''قریب بست ہزار کس راطعمۂ شمشیر خون آشام ساخت ومتائی کہ کیست آن را غیر علام الغیوب احدی نمی داند بہ غنیمت برد، بعد ازاں اطراف وجوانبش تاختہ بقتل وتاراج آں نواح پرداخت،،[6]

---

1. میر کی آپ بیتی، ص 137,139۔
2. برائے تفصیل۔ میر کی آپ بیتی ص 139 سرگزشت نجیب الدولہ ص 31۔ خزانہ عامرہ ص 112 ملخص التواریخ ص 425
3. میر کی آپ بیتی، ص 139,149۔ تاریخ حسینی (قلمی) ص 115 (الف) تا 116 (الف)
4. خزانہ عامرہ ص 113,114۔ سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج 3، ص 74,75۔ اس حملہ کی تفصیل ملاحظہ ہو Ahmad Shah Durrani 318۔
5. میر کی آپ بیتی ص 55۔
6. ملخص التواریخ، ص 428، نیز خزانہ عامرہ، 114 صحیفۂ اقبال (قلمی) ص 91 ب تاریخ احمد شاہ ص 91 ب۔ تاریخ مظفری (ق) ج 2 ص 123 (الف)

آٹھواں حملہ[1] 1767

اس زمانے میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ شاہ ابدالی کا مقصد انگریزوں سے جنگ کرنا اور ان کو بنگال سے مار نکالنا ہے اس وجہ سے انگریزوں نے ایک فوجی دستہ الہ آباد بھیج دیا تا کہ اس سے اودھ میں مقابلہ کیا جائے۔

درحقیقت 1765 تا 1766 کے درمیانی زمانے میں شاہ ابدالی اپنے ملک کے انتظامی اور دیگر اندرونی امور میں مشغول رہا اور اس سبب سے اسے پنجاب کے معاملات کو سلجھانے کا موقع نہ مل سکا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر سکھوں نے اس علاقے پر اپنا قبضہ جما لیا اور آخر میں انھوں نے لاہور پر بھی قبضہ کر لیا تھا[2]

شاہ درانی سکھوں کی طاقت کو توڑنا چاہتا تھا اور اس بارے میں اس نے کوشش بھی کی تھی، لیکن اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی، مجبوراً اس نے راجا الاسنگھ کو تین لاکھ سالانہ پیش کش کے وعدے پر پنجاب کا حاکم مقرر کر دیا تھا، کیوں کہ ابدالی فوج نے بغاوت کر دی، ان میں سے تقریباً چار پانچ ہزار سپاہی اپنے ملک کو واپس چلے گئے، کیوں کہ کچھ دنوں سے انھیں تنخواہیں نہیں ملی تھیں، اس بنا پر ان میں بے اطمینانی پھیل گئی تھی[3]

آخری حملہ 1769

شاہ ابدالی نے آخری بار سکھوں پر حملہ کیا، جب وہ کابل اور پشاور کے مابین پہونچا تو اس کی سپاہ نے بغاوت کا پرچم لہرا دیا، تمام لاؤ لشکر لوٹ لیا اور کئی سرداروں کو تہِ تیغ کر دیا شاہ ابدالی کو قندھار واپس جانا پڑا[4] اور سارا پنجاب سکھوں کے قبضے میں چلا گیا[5]

---

1 اس حملے کی تفصیل ملاحظہ ہو، Ahmad Shah Durrani 308,318

2 تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص 9، مختص التواریخ، ص 427، خزانہ عامرہ۔ 114
تاریخ احمد شاہ (قلمی) ص 352

3 برائے تفصیل Ahmad Shah Durrani 313

4 برائے تفصیل۔ Ahmad Shah Durrani 319,23

5 جامِ جہاں نما (قلمی رامپور ص 506۔

انگریز

ہندستان میں انگریزوں کے تسلط کی داستان بہت طویل ہے۔ جسے یہاں اختصار کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا، لیکن ہم صرف یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اٹھارھویں صدی میں انگریزوں کی سیاسی حیثیت کیا تھی، 1757 میں جنگِ پلاسی میں فتح مند ہو کر انھوں نے مغلیہ سلطنت کے متمول اور خوشحال صوبہ بنگال پر اپنا مضبوط اقتدار جما لیا تھا۔[1] 1759 میں شہزادہ عالی گہر،[2] جو بعد میں شاہ عالم ثانی کے لقب سے دہلی کے تخت پر بیٹھا، دہلی سے نکل کر بنگال اور بہار کے صوبوں کو فتح کرنے کی غرض سے بہار کے حدود پر پہونچا۔[3] بکسر (1764) کی جنگ میں انگریزوں نے شہزادہ، شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ اور میر قاسم[4] کو شکست دی۔[5] میر نے بکسر کی جنگ کا

1۔ The Oxford History of India (Smith) PP 494

2۔ عزیز الدین عالمگیر ثانی کے بیٹے معز الدین جہاں دار شاہ کے پوتے اور شاہ عالم بہادر شاہ اول کے پڑ پوتے تھے، ماں کا نام لال کنور تھا، لال کنور کی وفات کے بعد نواب زینت محل نے گود لیا تھا، عزیز الدین عالمگیر ثانی کو فرخ سیر نے جس زمانے میں قید کر دیا تھا اسی حالت میں 17/ ذیقعدہ 1140ھ مطابق 14/ جون 1728) کو شاہ عالم پیدا ہوئے تھے، اصلی نام مرزا عبداللہ اور خاندانی عالی گہر تھا، بچپن میں لال میاں اور مرزا ابا تی بھی کہلاتے تھے واقعات اظفری، ص۔2 مفتاح التواریخ، ص 344، مراۃ الاشباہ (قلمی) ص 53، بادشاہ ہو کر ابو المظفر جلال الدین محمد شاہ عالم ثانی لقب اختیار کیا۔

3۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو، ملخص التواریخ، ص 405,408۔ مفتاح التواریخ ص 340۔ تاریخ مظفری (قلمی) ج 2، ص 85 ب 86۔ الف/ تاریخ احمد شاہی (قلمی) ص 344,345۔

4۔ میر نے میر قاسم کی معزولی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو، میر کی آپ بیتی ص 143,145۔

5۔ میر کی آپ بیتی ص 151۔ ملخص التواریخ 442۔ مفتاح التواریخ کے مؤلف کا بیان ہے کہ "از ہمیں وقت پایہ دولت کمپنی انگریز بلندی کرا شد و ابتدائی عمل داری کمپنی انگریز را از ہمیں زماں تصور باید فرمود" برائے تفصیل ص 346,348۔

نیز ملاحظہ ہو، تاریخ مظفری (قلمی) ج 2۔ ص 162 (الف) تا 164 ب، 169 (الف) تا 172 (الف) جام جہاں نما (قلمی) ص 507 تاریخ فرح بخش (شیو پرشاد) ص 71 ب تا 73 (الف)

ذکر کیا:

"شجاع الدولہ نے کچھ نا تجربہ کاروں اور نا اہلوں کے سمجھانے سے، جو اس کی ناک کا بال بنے ہوئے تھے اس لالچ میں کہ اگر صوبہ عظیم آباد ذرا سی تگ ودَو سے ہاتھ آ جائے تو مفت برابر ہے، شاہ عالم کو اپنے ساتھ لے کر اس طرف لشکر کشی کر دی عیسائیوں کے کشیش، یعنی فرنگیوں کے سردار نے شہر کی حفاظت کے انتظامات (مکمل) کر کے (انھیں) لکھا کہ "ہمیں جس سے پرُخاش تھی اسے ہم نے مار لیا، اور اس ملک سے نکال دیا، اب ہمیں نواب (شجاع الدولہ) اور بادشاہ سے کوئی سروکار نہیں، اس حرکت (فوج کشی) کا سبب معلوم نہیں کیا ہے؟ اور فتنہ وفساد کے سلسلہ کا محرک کون ہے؟ اگر ہم سے اطاعت (قبول کرانا منظور ہے تو ہم پہلے ہی سے مطیع ومنقاد ہیں۔

بے فائدہ زحمت اٹھانے کی کیا حاجت ہے؟ اور اگر کچھ بے سمجھ نو دولتوں کے اُکسانے پر ہمارا استیصال (ہی) مقصود ہے، تو ہم کیا کر سکتے ہیں، بڑے لوگوں کا مزاج سیلاب کی طرح تند ہوتا ہے۔ جدھر کو چل پڑا بس چل پڑا، ہم لوگ خس وخاشاک ہیں، ہماری کیا طاقت اور سروسان ہے جو اس کے سدِ راہ ہو سکیں، سرداروں کی طبیعت کو آندھی سے تشبیہ دی جاتی ہے، ہم مشتِ خاک ہیں، ہمارے پاس کیا ساز وبرگ رکھا ہے جو اس کا راستہ روک دیں!"

"لیکن شاہی مشیروں نے جو نا معاملہ فہم تھے اور عقل وشعور سے بیگانے، اس تحریر کو فرنگیوں کی بزدلی اور نامردی پر محمول کیا اور باصرار کوچ کرنے کا مشورہ دیا۔

"جب اس شہر عظیم آباد کے نواح میں دونوں فریقوں کی ملاقات ہوئی تو فرنگی بندوقیں لے کر لڑائی پر تل گئے اور نمک حرام مغل آقا کے خزانوں پر

جھپٹ پڑے، عیسائیوں نے بڑی جرأت سے مقابلہ کیا، نواب کے ایک چیلے عیسیٰ نامی نے دلیری کا مظاہرہ کیا اور لڑتا ہوا مارا گیا، بادشاہ فقط تماشائیوں کی طرح کھڑا دیکھتا رہا انجام یہ ہوا کہ شکست ہوگئی، نواب نے جو شہر کے آس پاس کہیں لڑ رہا تھا، توقف کرنا خلاف مصلحت دیکھا، اور باقی ماندہ چند لوگوں کے ساتھ اپنے صوبے کی طرف چلا گیا، اتنی لمبی مسافت صرف ڈیڑھ دن میں طے کر کے اپنے ٹھکانے پر آ گیا، وہاں سے نقد و جنس اور فوج بقدر ضرورت لے کر فرخ آباد روانہ ہوا،"[1]

بعد ازیں میر نے لکھا ہے کہ:

''اگر چہ یہ دنیا دار جزا نہیں، لیکن کبھی ایسا اتفاق بھی ہوتا ہے (کہ بدلہ ہاتھ کے ہاتھ مل جاتا ہے) چنانچہ اس بھاری لشکر کی یہ شکستِ فاش اس (غداری) کا بدلہ تھی، جو انھوں نے قاسم علی خان سے کی تھی''۔[2]

اس کے بعد کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے میر نے لکھا ہے کہ:

''فتح و نصرت کے بعد نصرانیوں نے خیموں اور آلاتِ جنگ وغیرہ پر قبضہ کر لیا اور بادشاہ کو اپنے ساتھ لے کر اطمینان کے ساتھ اس طرف عازم ہوئے، آٹھ سات دن کے عرصے میں اودھ پہونچے جو شجاع الدولہ کا مستقر تھا اور اس فتح کے شکرانے میں جو ان کے تصور سے بھی بڑھ چڑھ کر تھی، یہاں کسی شخص کو آزار نہیں پہونچایا، ایک ہفتے کے بعد بادشاہ کا دو لاکھ روپیہ ماہانہ مقرر کر دیا کہ حضرت بطورِ خود رہیں، اب ہم جانیں اور ملک''۔[3]

اس صلح نامے کی رُو سے شہزادہ عالی گہر نے انگریزوں کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی

---

1. میر کی آپ بیتی۔ ص، 149،151۔
2. میر کی آپ بیتی۔ ص 151۔
3. میر کی آپ بیتی۔ ص 151۔

تفویض کردی 1 اور انگریزوں نے بنگال کی مال گزاری میں سے بادشاہ کے لیے 24 لاکھ سالانہ مقرر کردیے۔ 2

لارڈ کلائیو نے نواب وزیر (شجاع الدولہ) سے جو اس زمانے میں مسلمان حکمرانوں میں سب سے زیادہ طاقت ور اور پیشوا سمجھے جاتے تھے، مصالحت کرلی اور یہ طے پایا کہ نواب پچاس لاکھ روپیہ صوبہ اودھ کے عوض ادا کرے، اس صوبے سے الہ آباد اور اس کے اضلاع الگ کر کے بادشاہ شاہِ عالم کو دے دیے گئے، شجاع الدولہ کی وفات کا میر نے ذکر کیا ہے۔ 3

اس کی موت پر ماتم کرتے ہوئے میر نے لکھا ہے کہ:

''نواب کے ماتم میں سارا عالم سیاہ پوش ہوگیا، یہ حادثہ بہت سخت ہوا اگر آسمان ہزار سال گھومتا رہے تب کہیں ایسا ہمہ تن جرأت اور سراپا مروّت سردار پیدا ہوتا ہے۔'' 4

دہلی تا پالم

بکسر کی شکست کے بعد بادشاہ کا قیام الہٰ آباد میں قرار پایا۔ اب گویا بادشاہ انگریزوں کی حراست میں تھے۔

الہٰ آباد میں شاہ عالم کا قیام تقریباً سات برس رہا، پچھلی ناکامیوں اور ناگفتہ بہ حالات نے انھیں پست ہمت اور بہت افسردہ کر دیا تھا، ایسی حالت میں دل بہلانے کی بے حد ضرورت تھی، اس زمانے میں بعض کمینہ اور نالائق امیر بھی ان کے دربار میں جمع ہو گئے، انھوں نے ناچنے گانے والی عورتیں پیش کرنا شروع کر دیں، ملخص التواریخ کے مؤلف کا بیان ہے کہ:

''بعضی از سفلہ کان ملازم بادشاہ مثل حسام الدین خان و راجا رام ناتھ و بہادر علی خاں محلی بنا

1 سیر المتاخرین (فارسی) ج 2، ص 77، نیز ملاحظہ ہو، جارج فارسٹر (انگریزی) ج 1، ص 170-169۔

2 سیر المتاخرین (فارسی) میں 26 لاکھ روپیہ سالانہ لکھا ہے ج، 2، ص 81، مفتاح التواریخ 346۔

3 شجاع الدولہ کی وفات 23 / ذی قعدہ 1188ھ روز پنج شنبہ کو چار گھڑی باقی رہے پر ہوئی تھی تاریخ اودھ 2/294 میر کی آپ بیتی، ص 175۔

4 میر کی آپ بیتی، ص۔ 151۔

برمناسبت طبیعت کہ باپادشاہ داشتند تقرب می یافتند خصوصی حسام الدین خان کہ زنکہ ہای نوخاستہ رابرقص وخوانندگی تربیت کردہ بخدمت بادشاہ می رسانید[1]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کے دربار میں ہر وقت رقص وسرود کا مشغلہ رہنے لگا، اور اس وجہ سے عیش پرستی اور کاہلی ان کا شیوہ بن گیا۔

شاہ عالم الہٰ آباد میں رہتے رہتے تنگ آ چکے تھے اور دہلی جانے کے لیے بے قرار تھے، مگر کوئی ایسی صورت نظر نہ آتی تھی کہ یہ آرزو برآئے جب انھیں مرہٹوں کی دعوت ملی تو انگریزوں اور شجاع الدولہ دونوں کی مرضی کے خلاف دہلی کے لیے روانہ ہو گئے[2]

کچھ دنوں فرخ آباد میں قیام کرتے اور نئے نواب مظفر جنگ بن احمد خان بنگش سے نذرانہ لیتے ہوئے[3]'' 29 رمضان 1185ھ (مطابق 25 دسمبر 1771 کو دہلی میں داخل ہوئے[4]

شاہ عالم بادشاہ دہلی کے قلعہ میں پہنچ تو گئے لیکن اب ان کے قبضے میں ملک ومال کچھ بھی نہ تھا، حالانکہ اب بھی ہندستان کے ہی نہیں بلکہ دنیا کے بادشاہ کہلاتے تھے 1194ھ تک تمام ہندستان اور مغلوں کے تمام مقبوضات دوسروں کے قبضے میں جا چکے تھے، بقول ہرچرن داس، التمش کے دور حکومت سے اس وقت یعنی (اورنگ زیب بادشاہ) کے عہد تک ہندستان کے بائیس صوبے شاہان مغلیہ کے زیرنگیں تھے، محمد شاہ کے زمانہ حکومت (1131ھ) سے اسی زمانے تک (1194ھ) ان صوبوں کا حال ذیل ہے، کابل، قندھار اور پشاور، کشمیر کے تین صوبے احمد خان (شاہ) ابدالی کے لڑکے کے قبضے میں ہیں، اٹک (ندی) کے اس کنارے سے صوبہ ملتان، ٹھٹھہ اور بھکر کے تینوں صوبے اور علاوہ ازیں کرنال وغیرہ کے بعض محالات پر سکھ قابض ہیں، چھ صوبہ ہائے دکن، گجرات اور مالوہ، یہ آٹھ صوبے مرہٹوں کے قبضے میں ہیں اور ان کے علاوہ جھانسی،

1. ملخص التواریخ، ص443۔
2. ملخص التواریخ، ص449،450۔ وقائع بعد از وفات عالمگیر، (قلمی) ص166 الف 167 الف۔
3. ملخص التواریخ۔ ص450۔
4. جام جہاں نما (قلمی) ص۔509، وقائع عالم شاہی۔ ص6،7۔

گوالیار کا قلعہ اور کالپی بھی۔ مختصر یہ کہ دریائے چنبل کے کنارے تک کے تمام اقطاع مرہٹوں کے تصرف میں ہیں دکن کے صوبوں میں حیدرآباد کا ایک صوبہ میر نظام علی خاں ولد نظام الملک آصف جاہ کے قبضے میں ہے، بنگال کے تین صوبوں، بنگالہ، ڈھاکہ اور عظیم آباد پر قاسم علی خاں کی معزولی کے بعد فرنگی قابض ہیں، صوبہ اودھ، الہٰ آباد اور بعضے اقطاع مثل سنبھل، مرادآباد اور اٹاوہ وغیرہ جو اکبرآباد اور دہلی کے تعلقہ میں ہیں، غرض کہ دریائے گنگا کے کنارے تک کے کل علاقے نواب آصف الدولہ وزیر الممالک بہادر بن نواب شجاع الدولہ کے قبضے میں ہیں، اور ان صوبوں میں بھی فرنگی ملازم ہو کر مداخلت کرتے ہیں، اجمیر کا صوبہ راجاؤں کے تسلط میں ہے، اکبرآباد کا صوبہ اور دہلی کے بعض محالات نجف خاں کے قبضے میں ہیں، دہلی کا صوبہ بادشاہ (شاہ عالم) کے زیر نگیں ہے[1]

سودا نے شہر آشوب میں اس حقیقت کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے،

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند ☆ سو آمدان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند ☆ جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول[2]

شاہ عالم کی وفات (1806) کے بعد اکبر[3] ثانی اس کے جانشین ہوئے مگر حالات بدستور سابق رہے، بہادر شاہ ظفر (جلوس 1253ھ) کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز دہلوی لکھتے ہیں:

"بجز نام سلطانی اختیار ندارد و ہمہ ملک ہندستان در قبضۂ انگریزاں است[4]

1857 میں بہادر شاہ ظفر کو جلاوطن کر کے انگریز ہندستان پر پوری طرح قابض ہو گئے تھے۔

1۔ چہار گلزار شجاعی (قلمی) ص 484,486۔

2۔ کلیات سودا ج اول۔ ص، 367۔

3۔ 28/ جمادی الثانی 1253ھ (مطابق 28/ ستمبر 1837) کو مغرب کے بعد اسی سال کی عمر میں اکبر ثانی نے رحلت کی، مفتاح التواریخ۔ ص 396۔

4۔ تاریخ عزیزی (قلمی) ص، 30 (الف)

مرہٹے

اورنگ زیب نے اپنی عمر عزیز کے آخری تیس سال دکن میں رہ کر مرہٹہ طاقت کا قلع قمع کرنے میں صرف کیے تھے، وہ اپنی زندگی میں تو اس مقصد میں کامیاب رہا لیکن کوئی ایسا بند نہ باندھ سکا، جو مستقبل کے لیے بھی اس خطرے کا سدّ باب کردے، اصل میں دکن کی جغرافیائی حالت نے مرہٹوں کا مکمل خاتمہ ناممکن کر دیا تھا، عالمگیر نے مرہٹوں کی اجتماعی طاقت اور قوت کو ختم کر دیا تھا اور اگر اس کے جانشین پوری طرح سے جدوجہد کرتے اور اس کی وصیت پر پوری طرح عمل پیرا ہوتے اور جنگ تخت نشینی میں اپنی قوت ضائع نہ کرتے تو مرہٹوں کی سیاسی طاقت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جاتا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مرہٹوں نے اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو ازسرِ نو حاصل کرنا شروع کیا اور انھوں نے دکن کے ان علاقوں پر دھیرے دھیرے قبضہ کرلیا، جو ان سے مغلوں نے بزورِ شمشیر چھین لیے تھے۔ اس مہم سے فارغ ہو کر انھوں نے شمالی ہندستان کی طرف اپنے قدم بڑھانے شروع کر دیے۔ جادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ دکن اور گجرات کی صوبہ داری پر امرا آپس میں شمشیر زنی کرتے تھے اور اس طرح مرہٹوں کی طاقت بڑھتی تھی۔ [1] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مرہٹوں کا طوفان شمالی ہند کی طرف بڑھتا تھا تو اس کا مقابلہ کرنے کے بجائے حکومت کی طرف سے مرہٹوں کو مراعات دی جاتی تھیں تاکہ وقتی طور پر یہ طوفان رک جائے۔ امیر الامرا صمصام الدولہ اور اعتماد الدولہ قمر الدین خان نے مرہٹوں کو تین لاکھ روپے دے کر ان سے شاہی ملک سے واپس لوٹ جانے کی درخواست کی تھی۔ [2]

غلام طباطبائی نے مغلیہ امرا کی پست ہمتی اور بزدلی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

از یں ہمہ امرائے مقتدر مشہور کسے را جرأت نبود کہ خود بر سر مرہٹہ تاختہ

1۔ زوال سلطنت مغلیہ (انگریزی) جادو ناتھ سرکار) ج 1۔ص، 67۔

2۔ سیر المتاخرین (فارسی) ص 467، تذکرۃ الملوک کا مصنف رقم طراز ہے کہ مغل امرا عیش و عشرت میں اس قدر غرق ہو چکے تھے اور ان کے قوائے عمل اس قدر شل ہو چکے تھے کہ مرہٹوں سے منہ کی کھانے کے بعد بھی ان کی حمیت بیدار نہ ہوتی تھی کہ آگے بڑھ کر ان کے دانت کھٹے کر دیں۔ ص، 133 (الف)

وکاراو (بادشاہ) ساختہ نامی برآورد"۔[1]

"امرائے بے مقدور ومنصب داران اکثرے رالیاقت کاری ہم نبود۔

ہر یکے آرزومند مصالحہ بامرہٹہ بودند"۔[2]

جب فرخ سیر بادشاہ اور سید برادران.......... میں کش مکش چل رہی تھی تو سید حسین علی خاں نے مرہٹوں کو اپنا مددگار اور معاون بنانے کے لیے بالا جی وشوا ناتھ کو دکن کے چھ صوبوں سے چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کا حق دے دیا۔[3] ماثر الامرا کا مصنف رقم طراز ہے کہ جس دن سے مرہٹوں کو دکن کے چھ صوبوں سے چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کا پروانہ ملا۔ اس دن سے ان کی طاقت میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔[4] بادشاہ نے مرہٹوں کو یہ حق دینے سے انکار کر دیا تو سید حسین علی خاں نے مرہٹوں کی مدد سے دہلی پر دھاوا بول دیا۔[5] قائم چاند پوری نے اسی واقعہ کو ان اشعار میں بیان کیا ہے:

کفار سے کیا ہے جو یہ آپ نے ملاپ — حاصل تو کیا ہے اس سے مگر خلق کا ستاپ
کیا آج پُن سمجھتے ہو تم مرہٹوں کا پاپ — پوجا کو کیس گڑھ بھی سدھاریں گے کل کو آپ

کہتے ہیں عنقریب "گرو کا گڑاہ ہے"۔[6]

میر محمدی بیدار نے اپنے شاعرانہ انداز میں لکھا ہے کہ جب امرا بذاتِ خود دشمنوں سے سازباز کرلیں تو ان کے مطیع سپاہی پھر کیا کر سکتے ہیں۔

"جب اہل ہی مل جائیں کیا سپاہ کرے"۔[7]

---

1. سیر المتاخرین (فارسی) ص، 474۔
2. سیر المتاخرین" ص474,475۔
3. منتخب اللباب ج2، ص784، خزانہ عامرہ ص/42، سیر المتاخرین (فارسی) ج2/410
4. ماثر الامرا۔1/344 نیز ملاحظہ ہو2/353,358۔
5. منتخب اللباب2/786-87، خزانہ عامرہ ص/42، سیر المتاخرین (فارسی)2/414
6. نقوش (اکتوبر1961 لاہور) دیوان قائم چاند پوری (قلمی) ص189 الف۔
7. دیوان بیدار ص/100

مختصر یہ کہ جس دن امیر الامرا حسین علی خاں مرہٹوں کو اپنا معاون بنا کر دار السلطنت میں لایا، مغلیہ سلطنت کی طاقت، وقار اور سطوت کو بہت بڑا دھکا پہونچا تھا۔[1]

1720 سے 1740 تک بالاجی وشوانا تھ، مالوہ اور گجرات کے صوبوں سے چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرتا رہا[2] اور آخر میں یہ دونوں صوبے ان کے حوالے کر دیے گئے۔[3]

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

''غیر مسلموں میں ایک قوم مرہٹہ نامی ہے کہ...... ان میں ایک سردار ہے، اس قوم نے کچھ عرصہ سے اطراف دکن میں سر اٹھایا ہے، اور تمام ملک ہندستان میں اثر انداز ہے، شاہان مغلیہ میں سے بعد کے بادشاہوں نے عدم دور اندیشی غفلت اور اختلاف فکر کی بنا پر ملک گجرات مرہٹوں کو دے دیا اور پھر اسی ست اندیشی اور غفلت کی وجہ سے ملک مالوہ بھی ان کے سپرد کر دیا، اور ان کو وہاں کا صوبہ دار بنا دیا... مرہٹوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں سے باج لینا شروع کر دیا۔[4]

اس سے مرہٹوں کی ہمت اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور حکومت کی کمزوری کا راز بھی ان پر ظاہر ہو گیا (و مرہٹہ کہ ضعف ارکان سلطنت دریافتہ) بعد ازیں انھوں نے شمالی ہند کی طرف اپنے قدم بڑھائے، طبا طبائی نے لکھا ہے:

بدیں سبب کہ مرہٹوں نے گجرات و مالوہ کو جو تدارک حضور سے......

عمل میں نہ آیا تھا، اور لوٹ مار اور دست ہوس ان کا دراز ہوتا رہا تھا آہستہ آہستہ قدم بڑھانا شروع کیا اور بعد گزرنے ایک زمانہ، ماہ و سال کے انھوں نے رفتہ رفتہ اہبل مدت میں ایک دو محال لیتے ہوئے حصار گوالیار تک جو نہایت قرب و جوار اکبرآباد میں واقع ہے، آپہونچے اور متصرف ہو کر دم استقلال مار رہے تھے، جاگیرات امیر الامرا اور محالات خالصہ کی لوٹ مار میں بھی جرأت کی، جب گوالیار سے بھی گزر کر اجمیر و اکبرآباد کے

1. خافی خاں 2/ 754,784,786 لیٹر مغلس 193/2
2. خزانۂ عامرہ ص/43 تاریخ ہندی (قلمی) ص/55
3. لیٹر مغلس 278/2
4. سیاسی مکتوبات۔ ص 99۔

متعلقات میں بھی قدم زن ہوئے[1]

اس کے بعد مرہٹے اور آگے بڑھے اور سانبھر میں جو کہ شاہ جہاں آباد سے سوکوس کی دوری پر واقع تھا، ڈاکہ مارا، اس وقت وہاں کے فخرو نامی فوجدار نے چار ہاتھی اور تین لاکھ روپے کی لاگت کا مال مرہٹوں کو دے کر امان چاہی، مرہٹوں نے اس پیش کش پر توجہ نہ کرکے جس طرح چاہا اس علاقے کو لوٹا کھسوٹا۔ فوجدار مذکور کو صرف اسی لباس میں جو اس کے جسم پر تھا چھوڑ دیا، اس قصبہ کے قاضی نے اپنی جہالت کی وجہ سے اپنے عیال واطفال کو مار دیا۔ اس رسم کو اصطلاح ہند میں جوہر کہتے ہیں اور مرہٹوں کا مقابلہ کرتا ہوا کام آیا۔[2]

کئی برسوں سے دربار میں یہ ہو رہا تھا کہ جب گجرات و مالوہ[3] میں مرہٹوں کی یورش کی خبر دربار معلا تک پہنچتی تھی تو محمد شاہ کو دارالسلطنت کے نواحی باغوں اور سیرگاہوں میں سیر وتفریح کے لیے یا شاہی شکارگاہوں میں شکار کھیلنے کی غرض سے بھیج دیا جاتا تھا[4] کیوں کہ عیش پرست اور بزدل امرا مرہٹوں سے آمنے سامنے ہو کر مقابلہ کرنے میں پہلوتہی کیا کرتے تھے اور آپسی جھگڑوں میں اپنے جنگی وسائل ضائع کرتے تھے۔[5]

غلام طباطبائی رقم طراز ہے:

> ''امرائے نفاق پیشہ حضور کہ بہرہ از حمیت و ایمان نداشتند چنیں فتنہ ہائے بزرگ مذکور وا سہل و خورد شمردہ ہمیشہ در فکر استیصال امثال خود مشغول وبہمیں اعمال مسرور و مشغوف بودند و بشومی کینۂ دیرینہ از قتل مسلمین وسادات پروائی نداشتند''[6]

---

1. سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) 90/2
2. سیر المتاخرین 90,91/2 نیز ملاحظہ ہو، چہار گلزار شجاعی (قلمی) ص476، ماثر الامرا 353/2
3. مالوہ میں مرہٹہ گردی کے لیے ملاحظہ ہو، تاریخ شہادت فرخ سیر بادشاہ وجلوس محمد شاہ (قلمی) ص96 (الف) 105 ب
4. لیٹر مغلس (انگریزی) 278/2
5. سیر المتاخرین (فارسی) 474/2، نیز احوال الخواقین (قلمی) ص201 ب تا 202 (الف)
6. سیر المتاخرین (فارسی) 477/2

مغلوں کی اس پست ہمتی سے فائدہ اٹھا کر باجی راؤ نے جو ایک مرہٹہ سردار تھا، دہلی کے آس پاس کے علاقوں میں غارت گری شروع کر دی اور 1737 (1149ھ) میں ایک دفعہ تو مہرولی تک لوٹ مار کرتا ہوا آ گیا تھا۔ اس موقعہ پر کالکاجی کا میلہ ہو رہا تھا اور شہر کے بہت سے لوگ وہاں برائے زیارت اور تفریح جمع تھے، مرہٹوں نے لوٹ مار مچائی، وہاں سے سراسیمہ بھاگ کر تماشائیوں نے شہر میں آ کر اس حادثہ کی خبر پہونچائی تو محمد شاہ اتنا گھبرایا کہ جمنا کے دہلی گھاٹ سے پندرہ سے بیس کوس تک کے گھاٹوں سے کشتیاں منگوا کر قلعہ کی کھڑکی کے نیچے جمع کرا دیں تا کہ بوقت ضرورت آسانی سے فرار ہو سکیں [1] شاہی امرا کے مقابلے کے خوف سے مرہٹے آگے نہ بڑھے، واپسی میں انھوں نے قصبہ ریواڑی اور پاٹودی کو لوٹا اور گھروں میں آگ لگا دی اور وہاں سے گجرات اور مالوہ کی طرف چلے گئے [2]

مرہٹوں کے ایک حملے کا میر نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ ''ابھی یہ ساری بلائیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ چرخ فتنہ انگیز نے ایک نیا ہنگامہ برپا کر دیا عجب افراتفری پھیل گئی۔ یعنی جنکو نامی سردار بھاری فوج لے کر دکن سے آیا اور اس کا لشکر (دہلی) کے اطراف میں خیمہ زن ہوا، بہتوں کے دل دہل گئے، ایک بلڑ مچ گیا، امیروں کی سٹی گم ہوگئی، بادشاہ و وزیر نے اس سے صلح کر لی۔ دتا نامی سردار کو جو اس بہادر اور جیالے جوان (جن کو) کا مدارالمہام تھا، نجیب الدولہ کی طرف بھیج دیا جو جمنا کے کنارے وسطی علاقے میں قدم جمائے بیٹھا تھا، وہاں گھمسان کی جنگ ہوئی [3]

رفتہ رفتہ مرہٹوں نے گجرات سے نارنول اور لاہور تک اپنا تسلط جما لیا اور چوتھ وصول کرنے کے لیے اپنے افسروں کو مقرر کر دیا، اب مرہٹوں کے زیر نگیں، بہار، بنگال، اڑیسہ اور بندیل کھنڈ

---

1. سیرالمتاخرین (اردو ترجمہ، 99/2، نیز تاریخ فرخ سیر بادشاہ (قلمی) ص 199,200 اخبار محبت (قلمی) ص 455، مجمع الاخبار (قلمی) ص 499 الف، عمادت السعادت (قلمی) 21ب 22 (الف)

2. سیرالمتاخرین (فارسی) 476/2، مجمع الاخبار (قلمی) 9ب (الف) عماد السعادت۔

3. میر کی آپ بیتی۔ ص 117,118 یہ واقعہ 1172ھ میں پیش آیا تھا، سرگزشت نجیب الدولہ 11,12 تاریخ مرہٹہ و ابدالی ا/ص 24,25 ماثر الامرا 356/2۔

کے صوبے بھی آ گئے تھے 1 بنگال میں مرہٹوں نے جو ظلم و ستم توڑے اس کا حال بنگال کے ایک مشہور شاعر گنگا رام نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"برگیوں (مرہٹوں) نے دیہاتوں کو لوٹنا شروع کیا...... کچھ لوگوں کے انھوں نے ہاتھ، ناک اور کان کاٹ لیے، خوبصورت عورتوں کو وہ رسیوں میں باندھ کر لے گئے جب ایک برگی زنا بالجبر کر چکتا تھا تو دوسرا کرتا تھا، عورتیں چیخیں مارتی تھیں...... انھوں نے گھروں کو آگ لگا دی اور ہر طرف لوٹ مار کرتے ہوئے گھومتے۔ 2 1173ھ/1759 میں بھاؤ نے دہلی کے قلعہ پر قبضہ کر لیا، شاہی حرم اور سرکاری کارخانہ جات پر مرہٹے قابض ہو گئے۔

دیوان خاص کی چھت پر لگا ہوا چاندی سونا نکلوا لیا اور اس کے بدلے نو لاکھ روپیہ حاصل کیے۔ 3

جعفر علی حسرت نے اپنے شہر آشوب میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جواہر اور خزانہ تو سب لٹا یکسر — رہیں تو کس پہ یہ فرقے کے نوکر اور چاکر
رہا نہ مال بجز سنگ، کوٹھوں کے اندر — جو چھت تھی چاندی کی دیوانِ خاص میں پُر زر
سو وہ وزیر نے کی خرچ بھیج کر ٹکسال 4

بھاؤ نے نارو شنکر کو قلعۂ شاہ جہاں آباد کا قلعہ دار مقرر کیا۔ 5 اس کی دست درازی اس حد تک بڑھ گئی کہ اس نے بزرگانِ دین کے مزاروں پر بھی ہاتھ ڈالا اور قدم شریف مقبرہ شیخ نظام الدین

---

1 مرہٹوں کے تسلط و اقتدار کے متعلق تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو، سیر المتاخرین (فارسی) 464/2۔ حدیقۃ الاقالیم (قلمی) ص623،

ماثر الامرا (فارسی) 352/2 تا 358، تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص13 ب، خزانہ عامرہ ص45،46، اخبار محبت (قلمی) ص86 تا 88 تذکرۃ الملوک (قلمی) 133ب۔

2 مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی) 86,88/1،

3 انشائے آنندرام مخلص (قلمی) ص5 (الف)۔

4 نقوش (اکتوبر 1962 لاہور) ص247۔ سیر المتاخرین (فارسی) ص912/2۔

5 تاریخ احمد شاہ (قلمی) ص32ب، سیر المتاخرین (فارسی) 192/2۔

اولیا اور محمد شاہ بادشاہ کے مزاروں کے سونے چاندی کے اسباب اٹھا کر لے گیا۔[1] ہندستان میں مرہٹوں کے ظلم وستم کا ذکر آنندرام مخلص نے شاعرانہ انداز میں یوں کیا ہے:

بردل ما تیرہ روزان از صف مژگاں گزشت
آنچہ از فوج دکن بر مُلک ہندستان گزشت
در چمن بر برگِ گلہا نگزرد صبح از نسیم،
برگریباں انچہ از دستم شب ہجراں گزشت[2]

دہلی کے باشندوں کے دل میں مرہٹوں کا کتنا خوف پیدا ہو گیا تھا اور کس قدر ان کے لیے نفرت پیدا ہو گئی تھی، اس کا اندازہ شاہ ولی اللہ[3] مرزا مظہر جان جاناں[4] شاہ عبدالعزیز دہلوی،[5] اور سلیم اللہ[6] کی تصانیف اور ملفوظات سے ہو سکتا ہے۔

غلام علی نقوی کا بیان ہے کہ متھرا اور اکبر آباد کے مابین ایک مقام پر مرہٹوں نے مسلمان شہدا کی لاشوں کو ان کی قبروں سے کھدوا کر نکلوایا اور ان کے دانت توڑتے اور بآواز بلند کہتے۔ ''انھیں دانتوں سے انھوں نے گائے کا گوشت کھایا تھا۔''[7]

ان حالات سے مجبور ہو کر شاہ ولی اللہ نے شمالی ہندستان کے صاحب اقتدار امرا کے اشتراک سے احمد شاہ ابدالی کو ہندستان آکر مرہٹوں کی طاقت توڑنے کے لیے مجبور کیا۔ ان امرا میں نجیب الدولہ نے[8] بہت اہم رول ادا کیا۔ 1761 میں احمد شاہ ابدالی مرہٹوں سے لڑنے کے

---

1. تاریخ احمد شاہ (قلمی) ص 32 ب، سیر المتاخرین (فارسی) 192/2
2. انشائے آنندرام مخلص (قلمی) 4 (ب) نیز ملاحظہ ہو، دیوان قائم چاندپوری (ق) 188 الف تا 199 ب۔
3. سیاسی مکتوبات، ص 45,48۔
4. کلمات طیبات، ص 44,53۔
5. الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر) ص 120,121۔
6. مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی) 49,50/1
7. عماد السعادت (ق)
8. ملاحظہ ہو سرگزشت نجیب الدولہ

لیے آیا، اور پانی پت کی وہ مشہور خوں ریز جنگ ہوئی جو" تیسری جنگ پانی پت کے نام سے مشہور ہے" موّرخوں کا کہنا ہے کہ ہندستان کی سرزمین پر اس سے زیادہ خوف ناک اور تباہ کن، جنگ کبھی نہیں ہوئی تھی، اس میں اتنے مرہٹے مارے گئے تھے کہ بقول جادو ناتھ سرکار، سارا مہاراشٹر سوگوار ہوگیا تھا۔[1]

جنگ پانی پت کا میر نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔[2]

مگر چند ہی برسوں میں مرہٹوں نے پھر اپنا شیرازہ جمع کر لیا۔

1770 میں دہلی پر دوبارہ ان کا قبضہ ہوگیا۔[3]

مرہٹوں نے دہلی پر پوری طرح سے اپنا اقتدار جما کر شاہ عالم ثانی کو الٰہ آباد سے بلا کر دہلی کے تخت پر بٹھا دیا، اور شاہ عالم نے اس کے صلے میں پٹیل کو مختار السلطنت مقرر کیا، مرہٹوں کے تسلط کا ذکر کرتے ہوئے میر نے لکھا ہے کہ،[4]

1۔ جنگ پانی پت اور اس کے نتائج کے لیے ملاحظہ ہو، سرگزشت نجیب الدولہ، بیان جنگ پانی پت از کاشی راج، منزل فتوح، تاریخ فیض بخش از شیو پرشاد، خزانہ عامرہ، میراث احمدی، تاریخ سلطانی گل رحمت، تاریخ درانی، گلشن رحمت۔

2۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو، میر کی آپ بیتی، 35-131۔

3۔ مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی) 21/3 تا 23۔

4۔ نجف خاں کا مولد اصفہان تھا، یہ چونکہ مرزا ایران کے بادشاہ سے متوسل تھا، اس لیے نادر شاہ نے اسے قید کر لیا تھا، جس وقت محمد شاہ کا ایلچی نواب عزت الدولہ مرزا محسن نادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے مرزا کی بہن سے عقد کیا تو مرزا کو خلاصی نصیب ہوئی اور وہ اپنی بہن کے ساتھ سولہ سال کی عمر میں ہندستان آیا، مرزا نے کچھ دنوں تک قاسم علی خاں، نواب بنگالہ کے ہاں ملازمت کی، قاسم علی خاں کا جب وقت بگڑا تو مرزا منیر الدولہ کے توسط سے شاہ عالم کے دربار سے منسلک ہوگیا، بادشاہ کے ساتھ شاہ جہاں آباد آیا اور کارنمایاں انجام دیے اور ذوالفقار الدولہ نواب نجف خاں بہادر غالب جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوا اور بعد ازیں امیر الامرا کے عہدہ پر سرفراز ہوا۔ 22/ اپریل 1778 کو وفات پائی اور شاہ مرداں کے قریب دفن ہوا،
مفتاح التواریخ ص 358,359۔

"چونکہ بادشاہ کے حضور میں نجف خاں کے آدمیوں میں سے جو برسر اقتدار تھے ان میں سے کوئی باقی نہ رہا، مرہٹے جو قریب ہی تھے، حاوی آگئے اور مختار بن کر دندنانے لگے، بادشاہ نے تمام اختیارات مرہٹے کو سونپ دیے، اور نجف خاں کے آدمیوں کا زور ختم ہو گیا، اب اکثر معاملات میں مرہٹے ہی سے مشورہ کیا جاتا ہے اور تمام امور اسی کی منشا کے مطابق انجام پاتے ہیں۔ مرہٹے کی فوج بھی شاہ جہاں آباد پہنچ گئی اور مشہور ہے کہ اس نے پوری طرح قبضہ جمالیا ہے اب مرہٹہ مالک الملک ہے جو چاہتا سو کرتا ہے، بادشاہ کو دست برداشتہ کچھ دے دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے اسے لے جاتا ہے، چنانچہ شہر میں ایک مہینہ رہا اور پھر علی گڑھ لے گیا...... وہاں سے بادشاہ کو راجپوتوں پر چڑھا کر لے گیا، انھوں نے مقاومت کی، کچھ دنوں بعد راجپوتوں سے صلح کر کے بادشاہ شہر دہلی میں آگیا اور مرہٹہ شہر اکبر آباد میں رہ گیا۔[1]

مگر انگریزوں کی روز افزوں طاقت کے سامنے ان کے قدم نہ جم سکے، دھیرے دھیرے شمالی ہند سے مرہٹوں کا تسلط از خود ختم ہو گیا، بعد میں یہ سارا گروہ خود بھی پراگندہ ہو کر افتراق وانتشار کا شکار ہوا اور مرہٹہ طاقت مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔

(د) روہیلے

اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں افغانوں کے مختلف قبیلے تلاش معاش میں ہندستان آئے اور دوآبہ کے علاقوں میں بس گئے ان میں سے ایک قبیلہ روہیل کھنڈ میں بریلی کے قرب وجوار میں آباد ہوا۔ داؤد خاں نامی ایک افغان سردار نے وہاں روہیلہ افغان حکومت کی بنیاد رکھی، ان روہیلوں نے اٹھارھویں صدی کی سیاست میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ داؤد خاں کے انتقال (1721) کے بعد اس کا متبنیٰ علی خاں جانشین ہوا۔ پہلے مرکزی حکومت نے اسے مراد آباد کی فوجداری کے عہدے پر فائز کیا، اس دوران میں اس نے قرب وجوار کے زمینداروں اور جاگیرداروں کو بے دخل کر کے ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا، اور تھوڑی مدت میں بریلی کے ضلع میں وہ ایک بڑی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا، اس نے آنولہ کو اپنا صدر مقام بنایا۔

اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خطرہ محسوس کر کے مرکزی حکومت کے کان کھڑے ہوئے اور

---

1. برائے تفصیل ملاحظہ ہو، میر کی آپ بیتی۔ ص۔ 189-187

اس کے استیصال کے لیے محمد صالح کو بھیجا گیا، اس جنگ میں علی محمد خاں کو فتح ونصرت حاصل ہوئی، اس واقعہ کے بعد اس کا اقتدار اور بھی زیادہ بڑھ گیا، دربار مغلیہ سے اسے نواب کا خطاب ملا اور نوبت بجانے کی اجازت بھی دے دی گئی۔[1]

جیسا کہ لکھا جاچکا ہے، نادر شاہ کے حملے نے مرکزی حکومت کو صرف مفلوج ہی نہیں کر دیا تھا بلکہ اس کی سیاسی اور فوجی کمزوری کو نمایاں کر دیا تھا، اب دربار مغلیہ کی شان وشوکت سیاسی مخالفین کو ہراساں اور خوفزدہ نہ کرسکتی تھی، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر علی محمد خاں نے اپنی حکومت سے ملحق گردونواح کے علاقوں پر چڑھائی کر کے ان پر تسلط جمالیا، مراد آباد کے نائب صوبہ دار، راجا ہرنند آرورا کو شکست دے کر وہ مراد آباد، ہردوئی اور بدایوں کے علاقوں پر قابض ہو گیا، دربار مغلیہ کے امرا آپسی عناد ونفاق کی وجہ سے اس بڑھتے ہوئے فتنے کو دبانے میں ناکامیاب رہے اور انھوں نے بادشاہ سے علی محمد خاں کو کٹیہر ے کے علاقے کا جو بعد میں روہیل کھنڈ کہلایا، قانونی گورنر مقرر کرادیا، مختصر یہ کہ 1740 میں بدایوں، بریلی اور مراد آباد پر علی محمد خاں کا قبضہ تھا۔

1741 اور 1748 کے درمیانی وقفہ میں اس نے پیلی بھیت، کمایوں اور بجنور پر بھی قبضہ کرلیا۔ نادر شاہ کی فوج کشی کی وجہ سے قندھار سے سیکڑوں کی تعداد میں افغانوں نے آکر علی محمد خاں کے ہاں ملازمت کرلی تھی، اس وجہ سے 1742 میں اس کے پاس تیس چالیس ہزار کی ایک بڑی فوج تھی۔

صفدر جنگ، میر آتش کے اکسانے پر محمد شاہ بادشاہ نے 1745 میں روہیل کھنڈ پر حملہ کر دیا، بنگڈھ کے مقام پر شاہی فوج اور علی محمد خاں کی فوج میں تصادم ہوا، موسم برسات کی وجہ سے رسد پہنچنے میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں، لہٰذا وزیر الممالک نظام الملک آصف جاہ کے مشورہ پر محمد شاہ نے روہیلہ سردار سے صلح کرلی اور علی محمد خاں کو سرہند کی فوجداری تفویض ہوئی۔[2]

1748 میں احمد شاہ ابدالی کے حملہ کی خبر سنتے ہی علی محمد خاں سرہند سے روہیل کھنڈ واپس چلا آیا اور ازسرنو اپنے علاقہ پر قبضہ حاصل کیا، اسی زمانے میں محمد شاہ بادشاہ فوت ہوا اور ملک میں بدامنی

---

1. سیر المتاخرین (فارسی) ج 2، ص 92
2. برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ سفر نامہ آنند رام مخلص۔

اور بدنظمی پھیل گئی۔[1]

1748 میں وفات سے پہلے علی محمد خاں نے روہیلہ سرداروں کو بلا کر حکومت کا کام ان کے سپرد کیا، کیونکہ اس کے لڑکوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو امور ملکی و مالی کو انجام دے سکتا۔ لہٰذا حافظ رحمت خاں۔[2] کو جانشین مقرر کیا گیا اور اسی طرح دوسرے سرداروں کو بھی عہدے تفویض ہوئے۔[3]

مختصر یہ کہ علی محمد خاں کی ریاست چند امرا کے ہاتھوں میں چلی گئی اور آپس میں انھوں نے اس علاقے کو تقسیم کر لیا، حافظ رحمت خاں نے پیلی بھیت کو اپنا صدر مقام بنایا، اور اسی طرح دیگر امرا نے علاحدہ اپنے مرکز قائم کیے۔[4]

قائم خان بنگش اور حافظ رحمت خان

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، ہندستان میں آئے ہوئے افغان قبائل میں سے ایک قبیلہ فرخ آباد میں آباد ہوا تھا، اس قبیلے نے محمد خان بنگش کی قیادت میں عروج حاصل کیا تھا، ان کی حکومت میں مین پوری، ایٹہ، بدایوں کے چند پرگنے اور شاہ جہاں پور کا کچھ علاقہ شامل تھا، ابتدائی زمانے میں محمد خان بنگش ایک معمولی سردار تھا، لیکن فرخ سیر بادشاہ (1713 تا 1719) کے عہد میں اس نے بڑی تیزی سے ترقی کی، پہلے اسے منصب تفویض ہوا، بعد ازیں نواب کا خطاب ملا اور آخر میں الٰہ آباد جیسے اہم صوبہ کا اسے صوبہ دار بنایا گیا، اس کا صدر مقام فرخ آباد تھا، اس کے انتقال (1743) کے بعد اس کا بڑا بیٹا قائم خاں اس کا جانشین ہوا۔[5]

ابوالمنصور خان صفدر جنگ کی بنگش خاندان سے دیرینہ عداوت تھی، وہ اس خاندان کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے بہت دنوں سے بنا رہا تھا، علاوہ ازیں وہ افغانوں میں بھی پھوٹ

---

1. سیر المتاخرین (فارسی) ج 3 ص 23، تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص 77 ب۔

2. ابتدائی حالات کے لیے ملاحظہ ہو، حیات حافظ رحمت خان ص۔ 16-13۔

3. ملاحظہ ہو، حیات حافظ رحمت خان، ص 39-34۔

4. سیر المتاخرین (فارسی) ج 3، ص، 27، گل رحمت ص 45، ماثر الامرا (فارسی) ج 2، ص 841 تا 853۔

5. محمد خاں بنگش کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو، ماثر الامرا (فارسی) ج 2، ص 77۔ مفتاح التواریخ۔ ص 349۔

ڈالنا چاہتا تھا، آخر کار اس نے اپنی مقصد برآری کی ایک نئی ترکیب نکالی اور روہیل کھنڈ کی صوبہ داری کا فرمان بادشاہ سے لکھوا کر قائم خان کے نام بھیج دیا اور یہ لکھ دیا کہ اس علاقے پر تم قبضہ کرلو۔

اس زمانے میں نواب علی محمد خاں روہیلہ کا انتقال ہو چکا تھا، اور حافظ رحمت خان ان کے علاقے کا منتظم تھا، جب حافظ رحمت خان کو وزیر کی اس سازش اور قائم خان کی پیش قدمی کا علم ہوا تو انھوں نے قائم خان کو بہتیرا سمجھایا کہ وہ فتح روہیل کھنڈ کا خیال اپنے ذہن سے نکال دے، اور صفدر جنگ کے بہکانے میں نہ آئے، مگر صفدر جنگ کی شہ پر قائم خان نے پیش قدمی جاری رکھی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس جنگ میں وہ مارا گیا (نومبر 1749) کو حافظ رحمت خان نے اس کی نعش فرخ آباد بھجوادی [1]

میر کا فرخ آباد کا سفر

روہیلوں کی جنگ میں قائم خان کے مارے جانے کے بعد صفدر جنگ اس کی املاک کی ضبطی کے لیے فرخ آباد گیا، اسحاق خان نجم الدولہ [2] کے ہمراہ میر بھی وہاں گئے۔ میر نے صفدر جنگ اور قائم خان کے چھوٹے بھائی احمد خان کی جنگ کو بچشم خود دیکھا تھا، وزیر کی فوج نے منہ کی کھائی اور اسحاق خان بھی قتل ہوئے، اس شکست خوردہ لشکر کے ساتھ بڑی زحمتیں اٹھا کر میر دہلی واپس پہونچے [3] بعد ازیں از سرِ نو تیاری کر کے صفدر جنگ نے دوبارہ لشکر کشی کی اور افغانوں کو پچھاڑ کر فتح وظفر مندی کے ساتھ دربار شاہی میں حاضر ہوا۔ [4]

---

1. وقائع بعد از وفات عالمگیر، (قلمی) ص 151۔ (الف)۔152 (الف) مآثر الامرا (فارسی) ج 2، ص 772۔ حیاتِ حافظ رحمت خان۔ ص 40 تا 46۔

2. برائے حالات ملاحظہ ہو۔ مآثر الامرا (فارسی ج 2۔ ص 775,776۔

3. میر کی آپ بیتی۔ ص 104,105۔

4. میر کی آپ بیتی ص 105 حیاتِ حافظ رحمت خان، ص 51 تا 53 وقائع بعد از وفات عالمگیر (قلمی) ص 156 (الف) تاریخ فرخ آباد، (شاہ ولی اللہ) ص 62 تا 68۔

روہیلہ سرداراوراودھ سے ان کی کشمکش

نواب سعداللہ خان بن علی محمد خان نے 1763 میں انتقال کیا، اس کے بعد سرداران روہیل کھنڈ نے علی محمد خان کے کسی دوسرے لڑکے کو اپنا والی تسلیم نہ کیا، اور متفقہ طور پر انھوں نے حافظ رحمت خان کو اپنا سردار منتخب کیا اور انھیں مسندِ حکومت پر متمکن کیا۔[1]

مرہٹے اور حافظ رحمت خاں

پانی پت کی مشہور جنگ کو ختم ہوئے ابھی پورے دس سال بھی نہ گزرے تھے کہ مرہٹوں نے ازسرنو اپنی سیاسی اور فوجی طاقت کو مستحکم کر کے اپنے کھوئے اقتدار کو پھر سے حاصل کرنے کی جان توڑ کوشش شروع کر دی۔ 1770 میں انھوں نے نربدا کو عبور کیا اور دوبارہ شمالی ہند کی تسخیر کی طرف متوجہ ہوئے۔

مرہٹوں نے جاٹوں کو نول سنگھ کی قیادت میں بُری طرح ہرا دیا اور بعد ازیں انھوں نے پانی پت والے اپنے اصلی دشمنوں مثلاً نواب نجیب الدولہ، احمد خاں بنگش والیٔ فرخ آباد اور حافظ رحمت خان کی طرف توجہ کی۔ وزیر عماد الملک، احمد خان بنگش اور مرہٹوں کو نجیب الدولہ پر چڑھا لے گیا، نجیب الدولہ شہر بند ہو گیا، مجبوراً نجیب الدولہ نے عماد الملک اور مرہٹوں سے صلح کر لی اور دکنی فوج رخصت کر دی گئی۔[2] اس کے بعد مرہٹوں نے حافظ رحمت خان کی طرف رخ کیا، ان کے درمیان جنگ ہوئی، لیکن فیصلہ کُن جنگ سے پہلے ہی حافظ رحمت خان پیچھے ہٹ گئے، مرہٹوں نے اٹاوہ اور شکوہ آباد پر قبضہ کر لیا اور بعد میں ان کے اور حافظ رحمت خان کے درمیان ایک صلح نامہ کی رو سے یہ علاقے مرہٹوں کے سپرد کر دیے گئے۔[3]

1771 میں مرہٹوں نے شاہ عالم ثانی کو الٰہ آباد سے بلا کر دہلی کے تخت پر بٹھایا، اور اس طرح مغلیہ سلطنت کے امورِ ملکی میں پوری طرح سے دخیل ہو گئے۔ انھوں نے ضابطہ

---

1. حیات حافظ رحمت خان، ص 123۔
2. میر کی آپ بیتی، ص 114۔
3. حیات حافظ رحمت خان، ص 149 تا 155 نیز ص 157,158۔

خان[1] کو شہر دہلی سے مار بھگایا۔ بعدازیں مرہٹوں نے بادشاہ کو ہمراہ لے کر ضابطہ خان پر حملہ کر دیا اور بغیر جنگ کے ہی اسے بھگا دیا، اس کے اموال، اسباب اور جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ سکرتال میں پیش آیا تھا[2]

بعدازیں مرہٹوں نے روہیل کھنڈ پر یورش کی، علاقوں کو تباہ و برباد کیا، لوگوں کو بے حرمت کیا، حافظ رحمت خان نے اپنی کمزوری کے سبب سے ضابطہ خان کے توسط سے شجاع الدولہ، نواب اودھ سے مدد طلب کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شجاع الدولہ نے چالیس لاکھ روپے کے عوض سرداران مرہٹہ سے مصالحت کرانے کا وعدہ کیا اور صلح نامہ کی رو سے یہ طے پایا کہ حافظ رحمت خاں وہ روپیہ شجاع الدولہ کو ادا کریں گے[3]

شجاع الدولہ اور حافظ رحمت کی جنگ

الہٰ آباد اور کوڑا کے علاقوں کو فتح کرنے کی غرض سے مرہٹوں نے کوچ کیا، انھوں نے حافظ رحمت خاں اور ضابطہ خاں سے اس مہم میں مدد طلب کی۔ حافظ رحمت خاں نے مرہٹوں کا ساتھ اس وجہ سے نہ دیا کہ شجاع الدولہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ مرہٹوں کا ساتھ نہ دیں گے تو وہ انھیں چالیس لاکھ روپے کا تمسک واپس کر دے گا۔ چنانچہ حافظ رحمت خاں نے شجاع الدولہ کا ساتھ دیا اور جنگ میں مرہٹوں کو منھ کی کھانی پڑی۔[4]

جب شجاع الدولہ کو مرہٹوں کی طرف سے اطمینان حاصل ہو گیا اور آئی ہوئی بلا ٹل گئی تو اس نے روہیلوں کو ملیا میٹ کرنے کا قصد کیا۔ اور روہیل کھنڈ پر قبضہ حاصل کرنے کے منصوبے

---

1. ضابطہ خان، نجیب الدولہ کا بیٹا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد اس کا جانشین ہوا، اور دربار شاہی سے منصب عطا ہوا، لیکن کچھ الزامات لگا کر اسے معزول کر دیا گیا، اور اس کی املاک ضبط کر لی گئی۔ اس نے سرکشی کی تو شاہ عالم ثانی نے مرہٹوں کی مدد سے سکرتال پر فوج کشی کی اور اسے دبا لیا۔ 1775 میں اس کی وفات ہوئی اور اس کا بیٹا غلام قادر روہیلہ جانشین ہوا، یہ وہی غلام قادر تھا جس نے اپنے والد کے خون کا بدلا لینے کے لیے شاہ عالم ثانی کو معزول اور نابینا کر دیا تھا۔

2. ملخص التواریخ۔ ص 454۔ میر کی آپ بیتی، ص 160,161۔

3. حیات حافظ رحمت خان، ص۔ 69,70۔ نیز ملاحظہ ہو۔

The History of the Reign of Shah Aullam (1915) PP45.46

4. حیات حافظ رحمت خاں۔ ص 188,191۔

گانٹھنے شروع کیے۔ اس سلسلے میں اس نے انگریزوں سے بھی سانٹھ گانٹھ کر لی [1] بعد ازیں شجاع الدولہ نے اپنا پہلا وعدہ فراموش کر دیا، اور حافظ رحمت خاں سے چالیس لاکھ روپے ادا کرنے کا مطالبہ کیا، اور اسی بہانے سے اس پر حملہ کر دیا، کٹرہ میران پور میں حافظ رحمت خان اور شجاع الدولہ کے درمیان جنگ ہوئی، اور حافظ رحمت خاں کام آئے۔ میر نے اس واقعہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ

"جب جنگ اپنے شباب پر آئی تو حریف کی ساری اکڑفوں ہوا ہوگئی، ادھر سے اتنے گولے برسائے گئے کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے، جب زمین (رحمت خان پر) تنگ ہوگئی تو اس نے دیکھا کہ نہ بھاگنے کا راستہ ہے، نہ نکلنے کا موقع تو دل کڑا کر کے میدان جنگ میں جم گیا، اور دنیا سے دل ہٹا کر جان پر کھیل گیا، ایک ہی ہلے میں روہیلوں کے ہوش وحواس اڑ گئے، جانوں پر بن گئی بڑے بڑے دلاوروں کے پتے پانی ہوگئے ایک گولا اس (حافظ رحمت خان) کے سینے پر لگا۔ صفیں درہم برہم ہوگئیں اور دشمن کا سر گیند کی طرح لڑھک گیا۔"[2] اس کا سارا ملک شجاع الدولہ کے قبضے میں چلا گیا۔

نجیب الدولہ اور ضابطہ خان

نجیب الدولہ اپنے چچا بشارت خان کے ہمراہ پشاور کے علاقے سے ہندستان وارد ہوا تھا، ابتدا میں لوٹ مار کے ہی سلسلے میں نجیب خاں، دوندے خان کے علاقے، بسولی، میں پہونچا، دوندے خان نے اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا، دوسو آدمیوں کا افسر مقرر کر دیا، پرگنہ دارانگر بطور جاگیر عنایت کیا اور بعد میں اپنی لڑکی سے اس کا نکاح کر دیا۔

جس زمانے میں صفدر جنگ نے احمد شاہ بادشاہ بن محمد شاہ بادشاہ کے خلاف بغاوت کی تھی اور حافظ رحمت خان سے مدد کا طالب ہوا تھا تو مؤخر الذکر چالیس ہزار سواروں کی جماعت کے ساتھ اس کی استمداد کو گئے لیکن بعد میں حافظ رحمت خان نے بادشاہ کے مقابلے میں صفدر جنگ کو مدد دینا مناسب نہ سمجھا اور اپنے علاقے کو واپس چلے گئے۔ اس دوران میں احمد شاہ بادشاہ کے آدمیوں نے

---

1. ملخص التواریخ ص459,460۔

2. میر کی آپ بیتی۔ ص173۔ نیز ملاحظہ ہو ملخص التواریخ ص459, 464۔

روہیلہ سرداروں کو طرح طرح کی لالچ دے کر اپنی طرف ملانا چاہا اور اس قوم میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش شروع کردی۔ نجیب خان طمع میں آکر بادشاہ سے جاملا، اور حافظ رحمت خان سے اجازت لیے بغیر دہلی کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس نے دہلی میں رہ کر صفدر جنگ کے مقابلے میں کئی معرکے سر کیے جس کی وجہ سے اسے روز افزوں ترقی نصیب ہوئی۔ آخر میں بادشاہ نے اسے نجیب الدولہ کے خطاب سے سرفراز کیا اور اضلاع بجنور، سہارن پور اور میرٹھ وغیرہ بطور جاگیر عطا کیے۔ 1

1756 میں احمد شاہ ابدالی کا تیسرا حملہ ہوا۔ واپسی کے وقت احمد شاہ ابدالی نے نجیب الدولہ کو وزیر مملکت کے عہدہ پر فائز کیا۔ یہ خبر پاکر غازی الدین خان نے، نجیب الدولہ کو برباد کرنے کی غرض سے جاٹوں اور احمد خان بنگش کی فوج کو ساتھ لے کر دہلی پر فوج کشی کی۔ میر تقی میر نے اس یورش کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔!

"ادھر راجا ناگرمل دکن کے سردار (مرہٹوں) سے مل گیا، وزیر (عمادالملک) اور احمد خان اور ان (مرہٹوں) کو نجیب الدولہ پر چڑھا لے گیا، وہ (نجیب الدولہ) شہر بند ہوگیا، توپ خانے کی جنگ ہوئی... .... پایان کار نجیب الدولہ سے صلح کرلی اور اسے شہر سے نکال لائے وہ سہارن پور چلا گیا جو اس کی فوجداری میں تھا۔" 2

دہلی پر اپنا تسلط جمانے کے بعد مرہٹوں نے نجیب الدولہ پر دھاوا بول دیا، چونکہ اس زمانے میں سکھوں نے دوآبہ میں لوٹ مار مچا رکھی تھی، اس سبب سے نجیب الدولہ نے دوآبہ کے کچھ اضلاع مرہٹوں کو دے کر ان سے صلح کرلی، مگر اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ 3

نجیب الدولہ کا بیٹا ضابطہ خان اس کا جانشین ہوا، اور درباری منصب پر فائز ہوا، 1771 میں

---

1 برائے تفصیل ملاحظہ ہو، سرگزشت نجیب الدولہ۔ ص، 1,5۔

2 میر کی آپ بیتی۔ ص، 114۔ سرگزشت نواب نجیب الدولہ۔ ص 6,8۔

3 نجیب الدولہ کی وفات 1770 / 1185ھ میں ہوئی اور نجیب آباد میں اسے دفنایا گیا۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو، مفتاح التواریخ۔ ص 351، سرگزشت نواب نجیب الدولہ۔ ص 71۔

جب مرہٹوں کو جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، دہلی پر اقتدار حاصل ہو گیا تو انھوں نے ضابطہ خان کو مار بھگایا اور وہ اپنی جاگیر کو چلا گیا۔ چونکہ مرہٹہ سردار سارے ہندستان پر اپنا اقتدار جمانا چاہتے تھے، اور ضابطہ خان کی موجودگی میں ان کا یہ مقصد پورا نہ ہو سکتا تھا، اس لیے انھوں نے ضابطہ خان سے سکرتال میں جنگ کی، ضابطہ خان کو شکست ہوئی، وہ بھاگ کر شجاع الدولہ کے سایۂ عاطفت میں چلا گیا، اس کا مال و اسباب لوٹ لیا گیا، اور غوث گڑھ کے علاوہ ان کے تمام مقبوضات پر شاہی قبضہ ہو گیا۔[1]

غلام قادر روہیلہ کا عروج وزوال

اس وقت غلام قادر کی عمر آٹھ یا دس سال کی تھی اور دیگر قیدیوں کے ساتھ بادشاہ نے اس کو قتل کر دینا چاہا لیکن منظور علی خاں، ناظر، کی درخواست پر اس کی جان بخشی ہوئی، وہ بہت خوبصورت تھا۔ اس سبب سے وہ بادشاہ کا منظور نظر ہو گیا، اور اسے خصی کرا دیا گیا۔ قدسیہ باغ میں لا کر رکھا گیا۔ اس زمانے میں شاہ عالم ثانی عیش وعشرت کا اتنا دلدادہ تھا کہ ہمہ وقت رقص وسرود کی محفل جمی رہتی تھی اور شاہی حکم کے مطابق غلام قادر زنانہ لباس میں بادشاہ کے سامنے آیا کرتا تھا۔[2]

اظفری کا بیان ہے کہ:

> ''حضرت سلامت نے جب اس نمک حرام کو اپنی مبارک آنکھوں سے ملاحظہ فرمایا تو نہایت شفقت کی، پورے آرام وحفاظت کے ساتھ دلی میں لا کر قدسیہ

---

1. میر کی آپ بیتی۔ ص 160,161۔ چوں کہ شاہی لشکر کے ساتھ میر بھی سکرتال گئے تھے اس لیے ان کا بیان ملاحظہ ہو۔ ''اس تقریب سے میں بھی شاہی لشکر کے ہمراہ (رائے بہادر کی معیت میں) اس طرف روانہ ہوا، ان لوگوں نے جا کر ضابطہ خان کو بغیر جنگ کے ہی بھگا دیا، اور اس کے اموال واسباب اور جائداد پر قبضہ کر لیا، بادشاہ کو سوائے دو سو مریل گھوڑوں اور چند پھٹے پرانے خیموں کے کچھ نہ دیا، بادشاہ (مرہٹوں کی) اس حرکت سے بہت بددل ہوا، لیکن کرتا کیا۔؟ دکھنیوں کے پاس طاقت تھی اور یہاں نہ زور تھا نہ زر! جب ان مرہٹوں پر زور نہ چلا تو کارپردازوں نے یہاں (اس کے) لوگوں کی جاگیریں دھڑا دھڑ ضبط کرنا شروع کر دیں اور بہت سے انسانوں کو ذلیل وخوار کیا، میر کی آپ بیتی ص 161۔ نیز ملاحظہ ہو، تذکرۂ ہندی (مصحفی) ص 14۔
2. جام جہاں نما (قلمی) 2، ص 71 (الف)، 77 (الف) عبرت نامہ (قلمی) 254۔

باغ میں رکھا، اور چوکی پہرہ مقرر کر دیا۔ روزانہ تین وقت اس کے لیے قسم قسم کے کھانوں کے کئی خوان بھجواتے تھے، اور اکثر حضور میں طلب فرما کر اس کے حالِ زار پر بے حد رحم اور عنایت مبذول فرماتے تھے، اس کی پیٹھ پر محبت سے اپنا مبارک ہاتھ پھیرتے، اس کی تعلیم و تربیت کے لیے بہت کچھ تاکید فرماتے رہتے، یہاں تک کہ اسے اپنا بچہ کہنے لگے اور روشن الدولہ کا خطاب دیا، جب کبھی وہ اپنے ماں باپ کی یاد میں روتا تو اس سے رہائی کا وعدہ فرماتے،،1

بعض امرا نہیں چاہتے تھے کہ وہ رہائی پائے اور رفتہ رفتہ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ مجد الدولہ عبدالصمد خاں 2 بہادر، جو شاہِ عالم کے وزیرِ دوم تھے، غلام قادر کو قتل کرانے کے درپے ہو گیا۔ لیکن چونکہ بادشاہ غلام قادر کو فرزند خاص سے مخاطب کر چکے تھے۔ اور ایک موقع پر بادشاہ نے اپنی نوازش خاص سے اس کے متعلق اردو زبان میں چند شعر بھی کہے تھے، وہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

فرزند خاص ہے یہ اور ہیں غلام سارے	آباد رکھیو یارب فدوی کا گھر ہمارے
پھولا رہے ہمیشہ باغ مراد اس کا	ہرگز خزاں نہ پھٹکے اس باغ کے کنارے
سائے میں پرورش ہو ظلِ الٰہ کے یہ	ہے آفتاب جب لگ انور فلک کے تارے

اس شفقت اور محبت کے سبب سے بادشاہ نے چند خاص رازداروں کی معرفت اس لڑکے کو کافی مصارف اور سامان کے ساتھ رات کے وقت رہا کر کے اس کے ماں باپ کے پاس بھجوا دیا 3

ضابطہ خان کے انتقال کے بعد غلام قادر خان اپنے والد کی جاگیر کا وارث قرار پایا 4 چونکہ مرہٹوں نے اس کے والد کے ساتھ بڑے مظالم توڑے تھے اور غوث گڑھ کی تباہی و بربادی کے باعث ہوئے تھے، اس وجہ سے وہ ان کے تئیں سخت دشمنی رکھتا تھا، اُدھر منظور علی خان ناظر قلعۂ معلا بھی مرہٹوں سے تنگ آ چکا تھا۔ لہٰذا ان دونوں نے دہلی سے مرہٹوں کے نکال بھگانے کا منصوبہ بنایا۔

---

1 واقعات اظفری، ص 4۔

2 ملخص التواریخ، ص 334۔

3 واقعات اظفری ص 4،5۔

4 ایضاً ص 5۔ غلام قادر کی ابتدائی فتوحات کے لیے ملاحظہ ہو، میر کی آپ بیتی، ص 189۔

جب سندھیا، مرزا اسماعیل بیگ سے ہار کر گوالیار کی طرف چلا گیا تو اس دوران میں بادشاہ کے ناظر نے غلام قادر کو اپنا بیٹا بنالیا اور اسے دہلی بلایا کیونکہ بادشاہ اس کے کہنے پر عمل نہ کرتا تھا، یعنی مرہٹوں کی طرف داری سے باز نہ آتا تھا، غلام قادر خان نے دہلی کے قلعہ پر قبضہ کر کے اپنا آبائی منصب امیر الامرائی حاصل کیا۔[1]

بعد ازیں اس نے علی گڑھ کا قلعہ مرہٹوں سے بزور شمشیر چھین لیا اور اسماعیل بیگ کی مدد سے اکبر آباد کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا، مرہٹوں سے زبردست جنگ ہوئی اور روہیلوں نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے لیکن اسی اثنا میں سہارن پور کے علاقے میں سکھوں کے گھس آنے کی خبر غلام قادر کو ملی تو اسے واپس جانا پڑا۔[2]

اکتوبر 1787 میں غلام قادر خان دوبارہ دہلی آیا۔ شاہِ عالم ثانی نے اپنے مددگار مرہٹوں کو بلایا، اس دوران میں ساری مغل سپاہ غلام قادر کے ساتھ ہو گئی، آخر کار بادشاہ نے غلام قادر کو بلا کر پھر امیر الامرائی کا منصب تفویض کیا۔ غلام قادر نے بادشاہ سے سپاہ کو دینے کے لیے روپے طلب کیے، بادشاہ کی غربت کا یہ عالم تھا کہ تحویل میں بالکل روپیہ نہ تھا۔ لالہ سیتل داس نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ ابھی کچھ دنوں پہلے شاہی محافظ سپاہ رکھنے کے لیے سونے کی طشتریاں پگھلا کر سونا فروخت کر کے روپیہ حاصل کیا گیا تھا۔ افغانوں کو دینے کے لیے اب بالکل روپے نہیں ہیں۔ یہ بات سن کر

---

1. اظفری نے لکھا ہے کہ۔ ''جب غلام قادر کا باپ ضابطہ خان اپنی طبعی موت سے مر گیا اور یہ نمک حرام اپنے باپ کا جانشین ہوا تو بالکل ہی فرعون بن گیا، سر پر ترچھی ٹوپی رکھنے لگا، کمینہ پن اور شرارت پر زبان کھولی، کھلم کھلا کہنے لگا کہ بہت جلد میں شاہ جہاں آباد پہنچتا ہوں اور اپنا بدلہ لیتا ہوں، جس طرح ہو مکر و فریب سے کام لوں گا اور اس قلعہ کو جمنا میں غرقاب کروں گا یہ خبریں برابر پہنچتی تھیں، ہر خاص و عام کے زبان زد تھا کہ عنقریب غلام قادر دلی پہنچنے اور اسے تہ و بالا کرنے والا ہے، آخر کار چند مہینے کے عرصے میں اس نمک حرام نے اپنی فوجوں کے ساتھ دھاوا کیا، شاہدرہ اور اندھیاؤلی تک پہنچ گیا۔ یہ دونوں موضع دریائے جمنا کے پار واقع ہیں، وہاں سے قلعہ مبارک پر گولے برسنے لگے، اسی دوران میں چند شرطیں طے پا گئیں، لڑائی بند ہوئی اور یہ اپنے وطن کو روانہ ہو گیا۔ واقعاتِ اظفری۔ ص 5,6۔

2. واقعات اظفری، ص 6۔

غلام قادر کے غیض وغضب کی کوئی انتہا نہ رہی اور بادشاہ کے ساتھ وہ درشت کلامی سے پیش آیا، اور یہاں تک کہ غصہ میں آکر ایک مرتبہ اس نے میان سے تلوار نکال لی، اسماعیل بیگ، ناظر کی درخواست پر بادشاہ زنان خانے میں چلے گئے تین دن تک بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد کو بلادانہ پانی گزارنے پڑے غلام قادر نے بیدار بخت کو تخت پر بٹھادیا بیدار بخت کی مدد سے دفینے کھدوائے گئے۔[1]

بعدازیں غلام قادر نے بادشاہ کو حرم سرا سے طلب کیا، شاہ عالم بادشاہ اور شہزادوں کو موتی محل میں گنہ گاروں کی طرح گرم اینٹوں پر کھڑا کروا کر اور مرزا اکبر اور سلیمان کو بندھوا کر فراشوں کو انھیں پیٹنے کا حکم دیا۔ بیدار بخت نے مشکل کشائی کی، اس کے بعد غلام قادر نے انھیں تیز دھوپ میں بٹھوادیا، شاہی مستورات کے ہاتھوں پاؤں پر کھولتا ہوا روغن ڈالا گیا، اور طرح طرح کی سختیاں کر کے ان سے دفینوں کی نشان دہی کروائی گئی، چلچلاتی دھوپ میں بیٹھا ہوا شاہ عالم، غلام قادر کو بری بری گالیاں دے رہا تھا، اور فریاد و آہ وزاری کر رہا تھا، غلام قادر کے حکم کے مطابق روہیلوں نے اسے زبردستی زمین پر پٹک دیا، اور اس کی آنکھیں نکال لیں، مستورات کے جسم سے کپڑے اور زیورات اتار کر انھیں دربدر کی ٹھوکریں کھانے اور دریوزہ گری کرنے کے لیے محل سے باہر نکال دیا گیا۔[2]

یہ وہ زمانہ تھا جب میر دہلی کی سیاسی اتھل پتھل اور ذاتی افلاس و تنگ دستی سے تنگ آکر نواب آصف الدولہ کی دعوت پر لکھنؤ جا چکے تھے، اس بنا پر اس اہم واقعہ کے بارے میں انھوں نے صرف اتنا ہی لکھا ہے:

---

1. واقعات اظفری ص7، عبرت نامہ (قلمی)

2. برائے تفصیل ملاحظہ ہو، واقعات شاہ عالم (یا عبرت نامہ) مولوی خیر الدین، کلیات قاسم (قلمی) ص40 نیز 401۔ عمادالسعادت، ص4 مفتاح التواریخ۔ ص360۔

The History of The Reign of Shah Aulam (ED.1780) PP.175-180.

Rulers of India (Oxford 1901) PP.133-144, Fall of the Moghal Empire, vol. III PP 302,330.

''اس نے (بادشاہ کے) ساتھ ناگفتہ بہ سلوک کیا اور تمام قلعے کو غارت کردیا اور شہزادوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جو نہ کرنا چاہیے تھا، بہت سازوسامان اس کے ہاتھ آیا، بادشاہ کی آنکھیں نکال لیں اور دوسرا بادشاہ بنادیا،،1

شاہ عالم نے ان واقعات کو خود نوشتہ ایک مرثیہ میں بڑے پر درد انداز میں بیان کیا ہے۔

صرصرِ حادثہ برخاست پئے خواریِ ما — داد برباد سروبرگ جہاں داریِ ما
آفتابِ فلکِ رفعت شاہی بودیم — برد در شامِ زوال آہ سیہ کاریِ ما
چشمِ ما کندہ شد از دستِ فلک بہتر شد — کہ نہ بینم کہ کند غیر جہاں داریِ ما
داد افغان بچۂ شوکتِ شاہی برباد — کیست جز ذاتِ مرہٹہ کہ کند یاریِ ما
کردہ سی سال نظارت کہ مرادا و برباد — زود تریافتہ پاداشِ ستم کاریِ ما
حقِ طفلاں کہ بہ سی سال فراہم کردیم — کردہ تاراج ونمود ندسبک ساریِ ما
قومِ مغلیہ و افغان ہمہ بازی دادند — بسکہ گشتند مجوز بگرفتاریِ ما
شیر دادیم وافعی بچۂ را پروردیم — عاقبت گشت، مجوز بہ گرفتاریِ ما 2

اس کے بعد غلام قادر نے ناظر کو بھی قید کرلیا اور شہر والوں کو پریشان کرنا شروع کردیا۔ جب اس کا غلبہ حد سے بھی زیادہ بڑھ گیا تو کسی بات پر مرزا اسماعیل بیگ سے بھی ٹھن گئی، اور اس نے مرہٹوں سے صلح کرلی۔ اس دوران میں مرہٹہ فوج دہلی کے قریب پہنچ گئی اور اس فرقے کے بعضے سردار شہر میں داخل ہوگئے، غلام قادر قلعہ بند ہوگیا، رات کو مع فوج، اسباب وزر ومال شاہزادوں اور ناظر وغیرہ کو ساتھ لے کر خضری دروازہ سے نکل بھاگا۔ شاہدرہ کے قریب اپنی فوجیں جمادیں، مادھو سندھیا آگیا اور اس نے روہیلوں سے جنگ شروع کردی۔ یہ سلسلہ ایک ماہ تک چلتا رہا۔ بعد ازیں علی بہادر نامی ایک سردار دکن سے آیا اور غلام قادر سے فیصلہ کن جنگ کرنے پر تل گیا۔ اور آخرکار

---

1 میر کی آپ بیتی، ص 190۔ قلعہ معلا کی تباہی و بربادی اور افراد شاہی کی حالت کے لیے ملاحظہ ہو، واقعات اظفری، ص 7،9 دریائے لطافت (اردو) ص 119۔

2 The History of the Reign of Shah Aulam: PP249-54
تذکرہ گلشن ہند، ص 7،9۔

غلام قادر کو اسیر کرنے میں کامیاب ہوا۔ بعد میں اس کو اندھا کر دیا، اس کے ہاتھ اور ناک کان کاٹ لیے اور ایک درخت سے لٹکا دیا۔ بعد ازیں یہ تمام ٹکڑے شاہ عالم کی خدمت میں بھیج دیے گئے۔ 1

اظفری نے غلام قادر کی اسیری اور نہایت سختیوں کے ساتھ اس کے قتل کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، وہ لکھتا ہے:

"آخر قہر مانِ حقیقی کی غیرت کو جوش آیا۔ اور یہ ملعون متھرا میں کمینہ اعمال کی سزا کو پہونچا۔ طرح طرح کے عذاب اور ذلت کا مزہ چکھ کر جہنم واصل ہوا۔ مرہٹہ مذکور نے اس کے دونوں کان، ناک اور نیچے کا ہونٹ کٹوا ڈالا اور آنکھیں بھی نکلوا کر الگ الگ ڈبیوں میں رکھوائیں، پھر یہ چیزیں تحفۂ مبارک بادی طور پر اس مجبور بادشاہ کے حضور میں بھجوائیں" 2

سندھیا نے شاہ عالم کو پھر تختِ شاہی پر متمکن کیا۔ ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے میر کا بیان ہے کہ بادشاہ صرف نام کو تھا عملی طور پر مرہٹوں کی عمل داری تھی، مرہٹوں نے

"قلعے کو جاٹوں کے حوالے کر دیا۔ اب سو روپے روز بادشاہ دیتے ہیں اور تمام ملک پر متصرف ہیں...... اب مرہٹہ (سندھیا) بادشاہ ہے جو چاہتا ہے سو کرتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ یہ رنگ کب تک رہتا ہے۔" 3

جاٹ 4

مرہٹوں اور سکھوں کے علاوہ ایک تیسری سیاسی طاقت جاٹوں کی تھی جو اٹھارھویں صدی عیسوی میں ابھری۔ جاٹ، آگرہ، دہلی کے درمیانی علاقے میں رہتے تھے اور کاشتکاری ان کا آبائی

---

1. برائے تفصیل میر کی آپ بیتی، ص 190,191 مفتاح التواریخ ص 362، تاریخ ہندستان، ج 9، ص 342 واقعات اظفری۔ 9۔

Rulers of Inida (Oxford) (901) PP. 139-142.

Fall of the Moghal Empire, III, PP.329-330

2. واقعات اظفری، ص 10۔ The History of the Reign of Shah Aulam P.249

3. میر کی آپ بیتی، ص 191۔

4. جاٹوں کے عروج کے لیے ملاحظہ ہو۔ History of the jats (Qanungo) PP 1-33 Vol.1

پیشہ تھا۔ شاہ جہاں بادشاہ کے عہد میں انھیں گھوڑے پر سوار ہونے اور گڑھیاں تعمیر کرنے کی اجازت نہ تھی اور نہ وہ اپنے پاس بندوق رکھ سکتے تھے[1] وہ اتنے سرکش تھے کہ فوجی طاقت کا استعمال کیے بغیر ان سے سرکاری لگان بھی وصول نہ ہوتا تھا[2]

اورنگ زیب نے ان کی ابھرتی ہوئی طاقت سے خطرہ محسوس کر لیا تھا اور اس نے اپنے پوتے بیدار بخت کو ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا تھا، مگر وہ ہلکی سی گوشمالی کے بعد ان سے اطاعت کا اقرار کرا کر واپس چلا آیا تھا۔[3]

اورنگ زیب کے کمزور اور عیش پرست جانشینوں نے جاٹوں کی طرف سے غفلت کی اور اس قوم نے اسی فرصت کو غنیمت سمجھ کر بہت سے قلعے اور گڑھیاں تعمیر کر لیں، اور اپنے پاس بندوق رکھ کر بٹ ماری کا طریقہ شروع کر دیا۔ چورامن جاٹ (1721-1695) نے جنگ تخت نشینی کے دوران میں طرفین کی افواج اور اسباب کو خوب لوٹا[4]، چورامن، ایک مدبر اور سیاست داں سردار تھا اس نے بہادر شاہ کی اطاعت قبول کر لی۔ بہادر شاہ نے اس کی گزشتہ خطائیں معاف کر دیں، اور اسے پنج ہزاری ذات وسوار کا منصب عطا کیا، چورامن اجمیر تک بہادر شاہ کے ہمراہ گیا، اور اس کی معیت میں سکھوں سے مقابلے کے لیے بھی گیا۔[5]

جہاں دار شاہ (1713 - 1712) کے دورِ حکومت میں چورامن جاٹ نے جمنا کے مغربی کنارے سے چنبل تک کے علاقے پر قابض ہو کر حکومت کرنا شروع کر دیا۔ محمد فرخ سیر (1719-1713) کے زمانے میں جاٹوں نے پھر شورش کی۔ اور قطب الملک، وزیر کو ان کی سرکوبی کے لیے اپنی فوجیں بھیجنی پڑیں، چورامن نے معمولی جھڑپ کے بعد صلح کر لی اور اسے بادشاہ کے

---

1. سیاسی مکتوبات، ص101۔

2. Twilight of the Mughals (Spear) P.5

History of the JATS. PP 35-48

3. سیاسی مکتوبات 101۔

4. لیٹر مغلس ج2، ص322،

5. لیٹر مغلس ج۔2، ص323۔

حضور میں لا کر معافی دلوادی گئی، یہ عمل سیاسی مصلحت کے بالکل خلاف تھا۔[1]

عہد محمد شاہ (1749 - 1719) میں اس قوم کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی۔ سورج مل جاٹ (1763 - 1756) کی سرداری میں جاٹوں نے فتنہ برپا کیا۔ اس نے بیانہ پر زبردستی قبضہ کر کے وہاں کی مسلمان آبادی کو شہر بدر کر دیا تھا۔ درباری امرا میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی، اگر ایک امیر جاٹوں کی سرکوبی کا ارادہ کرتا تو سورج مل نے اس کے حریف سے ساز باز کر کے اس کوشش کو ناکام بنادیا تھا۔

1752 میں بعہد احمد شاہ، سورج مل جاٹ کو بادشاہ نے سہ ہزاری ذات اور دو ہزاری سوار کا منصب عطا کیا[2] اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد وزیر الممالک صفدر جنگ نے عروج کیا اور سورج مل سے سازش کر کے پرانی دہلی پر حملہ کر دیا۔ اور تمام باشندوں کو لوٹ لیا۔

میر نے اس حملہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

"پرانا شہر تو سب تاراج ہو گیا"[3]

عماد السعادت کا مصنف لکھتا ہے کہ وزیر صفدر جنگ کو خود لڑنے میں تامل تھا، اس لیے اس نے سورج مل کو آگے بڑھا دیا۔ اس نے پرانی دہلی کو خوب لوٹا عوام پر سخت مصیبت نازل ہوئی، بہت سے لوگوں نے خودکشی کر لی، جاٹوں کے اس ہنگامے کو لوگ "جاٹ گردی" کے نام سے یاد کرتے تھے۔[4]

ہرچرن داس، مصنف چہار گلزار شجاعی کا بیان ہے کہ جب جاٹوں نے لوٹ مار کے لیے ہاتھ بڑھایا تو دہلی کے باشندے گھبراہٹ اور پریشانی میں گھروں سے نکل کھڑے ہوئے، ہزاروں کی جانیں تلف ہو گئیں، اور اونچی اور عالی شان عمارتیں جل کر راکھ کی ڈھیر ہو گئیں، اور شہر نو کے لوگوں نے خوف و خطرے کے عالم میں خانہ بدوشی اختیار کی، اور خالص اور قیمتی چیزیں جو اپنے ساتھ لے جا

1. سیاسی مکتوبات، ص 101،102۔ لیٹر مغلس، ج 2 ص 326،327۔
2. وقائع شاہ عالم ثانی۔ ص۔70۔
3. برائے تفصیل ملاحظہ ہو، میر کی آپ بیتی، ص 106،107۔
4. عماد السعادت۔ ص 63۔

سکتے تھے اپنے ہمراہ لے گئے۔ پریشانی کے عالم میں کوچہ وبازار میں مارے مارے پھرتے تھے۔ مختصر یہ کہ شاہ جہاں آباد کے باشندوں کو ایک عجب حالت کا سامنا کرنا پڑا، اور شہر کہنہ اور شہر نو کی خلقت ایک ٹوٹے ہوئے جہاز کے مانند ظالم موجوں کے رحم وکرم پر تھی ہر شخص سراسیمہ اور پریشان نظر آتا تھا۔

شدہ روز قیامت آشکارا — دل مردم شدہ از غم فگارا
خلائق شد سراسیمہ پریشان — دویدند چار سوی چوں گوے چوں گاں
پدر را از پسر خبرے نماندہ — زن وشوہر جدا ہر سو فتادہ
زنانی ہا کہ در پردہ بماندہ — فتاد از خانہ بیروں سرکشادہ
زن ومرداں شدہ در کوے وبازار — سر اسیمہ پریشان ودل افگار
خبر از جان ومال کس نماندہ — خیال مرگ بردلہا نشاندہ 1

سورج مل کی قیادت میں جاٹوں کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے میر کا بیان ہے۔

''سورج مل جو بڑا طاقت ور زمین دار ہے اور اس کے آبا واجداد (مغلیہ) بادشاہوں کی نوازشوں سے ہمیشہ بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں اکبر آباد (آگرہ) شاہ جہاں آباد (دہلی) کے مابین راہ داری اس سے متعلق تھی۔ اس نے مسلمان امرا کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ان دنوں بغاوت کردی اور اکثر محالات پر قابض ہو گیا، اور سیہ روزگار قلعہ داروں کی نمک حرامی سے آگرے کا قلعہ بھی ہتھیا لیا،، 2

نجیب الدولہ سے مقابلہ کرتے ہوئے سورج مل کام آیا۔ میر نے اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے۔

''وہ (سورج مل) شاہ جہاں آباد کی طرف بڑی دلیری سے بڑھا، نجیب الدولہ نے بے پروائی کے ساتھ شہر کے دروازے بند کرا دیے اور جنگ کے ارادے سے باز رہا۔ یہ مغرور ومتکبر اپنے گھمنڈ میں رہا۔ اور دریا سے پار اتر کر تازہ آفت پیدا کردی، اس (نجیب الدولہ) کی انسانیت

---

1 چہار گلزار شجاعی (قلمی) ص 244۔ نیز تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص 69، خزانہ عامرہ ص 104،105 سیاسی مکتوبات ص 153

2 برائے تفصیل، میر کی آپ بیتی ص 141۔

میں شبہ نہیں، اس نے سو بار کہلا بھیجا کہ "میں تم سے جنگ کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس لیے اپنی فوج کو نہیں نکالا ہے۔ شہر کے غریب لوگ مفت میں تکلیف اٹھائیں گے۔ یہاں محاصرہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ لیکن (سورج مل نے) ایک جواب بھی انسانیت کا نہ دیا۔ اور کمین پن کا جواب یہ بھیجا کہ "میں تو نواب کی، فوج دیکھ کر واپس آجاؤں گا، اگر جلدی شہر سے باہر نکل آئیں تو احسان ہوگا، کیوں کہ مجھے اور بھی کام در پیش ہیں، نہیں تو یہ فوج جو میرے اختیار میں نہیں ہے، صبح و شام پر دھاوا ہی کیا چاہتی ہے۔"

"جب روہیلوں نے کشت و خون شروع کیا تو سورج مل نے اپنے تئیں فوج میں چھپا رکھا تھا اور اس سے غافل ہو کر کہ موت اس کی گھات میں ہے، بالا بالا نکل کر اس فوج پر ٹوٹ پڑا جو شہر کی جانب تھی اس پر شور برپا ہو گیا۔ اِدھر نجیب الدولہ کی فوج کے قلب سے کچھ فوج ان کی امداد کے لیے بھاگی اور اس مصیبت کو دور کیا۔ اس گرد و غبار میں اس اجل رسیدہ کے ایسا زخم لگا کہ گھوڑے سے زمین پر گرا اور مر گیا۔"[1]

سورج مل کی وفات کے وقت جاٹوں کی قلمرو میں آگرہ، دھول پور، مین پوری، ہاتھرس، علی گڑھ، ایٹہ، رہتک، فرخ نگر، میوات، ریواڑی، گڑگاؤں، متھرا کے اضلاع کے علاوہ بھرت پور ریاست کے کچھ اضلاع شامل تھے۔[2]

سورج مل کے بعد اس کا لڑکا جواہر سنگھ، جاٹوں کا سردار مقرر ہوا۔ میر کا بیان ہے کہ "جواہر سنگھ جس کی جان یہ خبر سن کر (ہی) نکل گئی تھی اور بظاہر خود کو سنبھالے ہوئے تھا، آیا اور مسندِ ریاست پر متمکن ہو کر لشکر جمع کرنے کی فکر میں لگ گیا، ہمت اور شجاعت اور مروت میں وہ اپنے باپ سے سو گنا بہتر تھا۔ "دولت نہ بہ خدائے راکس بغلط"[3]

میر کا بیان ہے کہ جواہر سنگھ اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے کی غرض سے ملہار راؤ (ہولکر) کی اعانت سے بھاری لشکر لے کر نجیب الدولہ پر حملہ آور ہوا، اور دہلی کا محاصرہ کر لیا، اناج کی مہنگائی سے مخلوق تنگ آگئی، جنگ و جدال اور کشت و خون کا (سلسلہ) قریب دو مہینے تک جاری رہا،

1. برائے تفصیل، میر کی آپ بیتی، ص 145،149۔ نیز ملاحظہ ہو، مفتاح التواریخ حوالہ ص 445 میں اسے آغاز 1764 کا واقعہ لکھا ہے۔

2. جاٹوں کی تاریخ (انگریزی) ج 1۔ ص 167۔

3. میر کی آپ بیتی۔ ص 149۔

عماد الملک، جو اس جنگ سے کنارہ کرنے کی فکر میں تھا (اپنی) فوج کے ساتھ بھرت پور کے قلعہ سے نکلا اور فالتو لوگوں کو فرخ آباد بھیج کر جواہر سنگھ کا شریک ہو گیا۔1

مرزا مظہر جان جاناں نے اپنے سترھویں مکتوب میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"نواب اور جاٹوں کے درمیان صلح کی خبر مجھ تک پہونچی، جو کچھ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا، اس سے مجھے ایسا گمان ہوتا ہے کہ راجا بہادر سنگھ اور داہر سنگھ کے توسل سے جاٹ لوگ اپنے فائدے کے لیے صلح کر رہے ہیں۔ میں نے نواب کو مشورہ دیا کہ اس نے اپنی افواج کی برطرفی اور سامانِ حرب کی کمی اور اپنی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں اپنے کو گرا لیا ہے۔ اب کوئی بھی اس پر اعتماد نہیں کرتا، اس لیے کیوں کوئی نواب کی طرف سے جنگ کرے؟ نواب کو اپنے دوستوں اور حریفوں دونوں کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ جو کوئی بھی شخص نواب کی طرف سے نمائندہ بن کر جاٹوں کے پاس جاتا ہے۔ وہ اپنے فوائد کو مقدم رکھتا ہے۔ ان دنوں کسی کا بھروسہ نہ کرنا چاہیے2۔

مرزا مظہر نے نواب کو آگاہ کیا کہ جاٹ صرف تغافلِ وقتی کی نیت سے صلح کر رہے ہیں یہ خلاف مصلحت عمل ہے، لیکن ایک صوفی کی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ کی گئی3۔

میر نے جاٹوں اور مرہٹوں کی جنگ کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے4۔ اس موقع پر میر راجا ناگرمل کے ہمراہ آگرہ گئے جو جواہر سنگھ سے ملاقات کی غرض سے وہاں گئے تھے5۔

بعد ازیں میر نے جواہر سنگھ اور مادھو سنگھ پسر جے سنگھ کے مابین زمین داری کے مسئلے میں جنگ کا ذکر کیا ہے6۔

میر نے سورج مل کے انتقال کے بعد جاٹوں کی خانہ جنگی کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور ان کا بیان ہے کہ اس آپسی نفاق اور عناد نے ان کی سیاسی طاقت کو کمزور کر دیا تھا۔ بقول میر: جواہر سنگھ آگرے میں کسی بد بخت کے ہاتھوں، تلوار کے ایک وار میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اب ریاست اس کے بھائی، راؤ رتن سنگھ کو ملی۔ یہ سیہ کار ہمیشہ شراب کے نشے میں دھت رہتا تھا اور خلقِ خدا پر حد سے زیادہ مظالم توڑتا

---

1. میر کی آپ بیتی۔ ص 151,152۔
2. کلمات طیبات ص 83,84۔
3. کلمات طیبات ص 84.
4. میر کی آپ بیتی ص 153,155۔
5. میر کی آپ بیتی ص 155
6. میر کی آپ بیتی۔ ص۔ 155,156۔

تھا۔ چنانچہ دس مہینے کی مدت، ریاست میں اس نے ہر کس و ناکس سے بدسلوکیاں کیں۔ انجام کار کسی محبوس نے اسے بھی چاقو سے ہلاک کر ڈالا۔ اب سرداراس کے نابالغ بیٹے کے نام سے کھیری سنگھ مقرر ہوا۔ اختیارات ملازموں کے ہاتھوں میں رہے، جس کے باعث سارا کام ابتر اور نظام درہم برہم ہو گیا۔

"اب کار پردازوں نے سورج مل کے چوتھے بیٹے نول سنگھ کو جو اس وقت موجود نہیں تھا، اس نابالغ لڑکے کی نیابت میں لے لیا ہے اگر سلیقے سے حکومت چلالیں تو اچھا ہے، ورنہ ڈھنگ تو بگڑے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔

"جب اس قوم کے نفاق نے طول پکڑا اور ملک کے انتظام کی نوبت کمینوں تک پہنچی تو نول سنگھ اور اس کا چھوٹا بھائی رنجیت سنگھ جس سے کمبیر کا قلعہ متعلق ہے دونوں جنگ کے لیے کھڑے ہو گئے۔ تقریباً پندرہ دن تک توپ و تفنگ کے ساتھ جنگ ہوتی رہی۔ چونکہ قلعہ مضبوط تھا، ناچار نول سنگھ نے صلح کر کے چھوڑ دیا۔ ہر چند بظاہر دونوں بھائیوں میں صلح و صفائی ہو گئی ہے۔ لیکن کینۂ باطن کا کیا علاج [1]

بعد ازیں میر کا بیان ہے کہ "جب جاٹوں کی شورش اور فتنہ انگیزی حد سے بڑھنے لگی اور زندگی ان کے ہاتھوں اجیرن ہو گئی تو راجا ناگرمل نے بیس ہزار دلی والوں کے گھروں کو لے کر جو اس کی وجہ سے آباد تھے اور ان میں سے اکثر اس کے دامن دولت سے وابستہ تھے... نکل جانے کا فیصلہ کیا...... اب ہم مصیبت کے مارے بھی اس کی نوکری کے تعلق سے اسی قافلے کے ساتھ اقامت گزیں ہیں" [2] باوجود اس آپسی نفاق اور تنازعہ کے جاٹوں کی طاقت بڑھتی رہی۔ میر کا بیان ہے کہ "جاٹ یعنی سورج مل کی اولاد درگاہِ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ تک قابض ہو چکے تھے، جو شہر سے تین چار کوس پر ہے، چوں کہ اس قوم کی شامت قریب تھی، ایک دن ان کی فوج گڑھی کے میدان میں آ گئی، جو درگاہ خواجہؒ کے نزدیک ہی ہے، اور وہاں دھما چوکڑی مچانے لگے۔ [3] نجف خاں اپنی فوج لے کر ان کے مقابلے کو آیا اور میدان مار لیا، جاٹوں کا لشکر شکست کھا کر واپس چلا گیا [4]

مختصر یہ کہ سرداری کے لیے خانہ جنگی نے ان کی طاقت کو کمزور کر دیا اور ان کی رہی سہی طاقت

---

1. میر کی آپ بیتی۔ ص 157،158۔ یہ واقعہ 1768 میں پیش آیا۔ ملاحظہ ہو، ہسٹری آف دی جاٹس، ج 1، ص 217۔
2. میر کی آپ بیتی ص 159،160۔
3. میر کی آپ بیتی ص 167،169۔
4. ایضاً۔ ص 169۔

کا مرہٹوں اور انگریزوں نے خاتمہ کر دیا۔

(د) سکھ

گرو گوبند کے بعد سکھوں کی قیادت بندہ بیراگی کے ہاتھ میں آئی، اور اس نے مظالم شروع کیے، خصوصاً پنجاب کے مسلمان اس کے تشدد کا نشانہ بنے رہے اس نے سرہند کو چار دن تک مسلسل لوٹا، مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی اور مسلمانوں کے گھروں کو جلا کر خاک میں ملا دیا گیا۔1
طباطبائی کا بیان ہے کہ بندہ بیراگی نے مسلمانوں پر بڑے مظالم توڑے، جسے پایا تہِ تیغ کر دیا اور ہر طرح سے ان کو ذلیل وخوار کیا۔ حتیٰ کہ مسلمان حاملہ عورتوں کے شکم پھاڑ کر بچے نکال کر مار ڈالے گئے۔2 قیس قادری کی اولاد کو اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے بزرگوں کی قبریں کھود کر ان کی لاشیں باہر نکالیں۔ مرزا مظہر جان جاناں نے اپنے ایک خط میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

''از ظلم وستم کافرانِ سکھ...... بلدہ متبرکہ سہرندویران شد ومزاراتِ حضرت علیہم الرضوان، بہ شہادت رسید وصاحبزادہا آوارہ ہر شہر ودیار شدند،،3

تھانیسر میں سکھوں کے ہاتھوں جو تباہی وبربادی ہوئی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے بڑے

---

1. FORSTER: Travels in India, 1.PP.304-21

Cunningham: A History of the Sikhs: P.129.

2. سیر المتاخرین (ا۔ت) ج ۱۱/ص 29 بقول خافی خان، سکھوں نے آٹھ نو مہینے تک شاہ جہاں آباد سے دو تین منزل تک کے تمام علاقوں اور لاہور کے قرب وجوار کے تمام قصبوں اور مشہور آبادیوں کو تاخت وتاراج کیا، اور بے شمار آدمیوں کو جامِ شہادت پلایا، تمام لوگوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، مسجدیں مسمار کی گئیں اور بزرگوں کے مزارات کھدوا ڈالے گئے۔ لاہور سے واپسی پر انھوں نے کرنال اور سادھورہ کے قصبوں اور دیہاتوں کے مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اور گرفتار شدہ سو دو سو مسلمان اور ہندوؤں کو ایک جگہ بٹھا کر قتل کر ڈالا گیا۔ منتخب اللباب 2/ ص 66، نیز ملاحظہ ہو۔

دستور الانشا (یار محمد) ص 8، مرزا حیرت، حیات طیبہ ص 131۔ احوال الخواتین (قلمی) ص 40 (الف)

3. کلمات طیبات ص 53۔ نیز ملاحظہ ہو کلیات میر۔ ص: 907۔

کرب کے عالم میں مرزا مظہر فرماتے ہیں:

"حق تعالیٰ اسلام را قوی تر گرداند، دریں روزگار الٰی قوی بدل را یافتہ، در ماہِ گزشتہ قلعہ تھانیسر را کفار سکھ بغدر متصرف شدند و قتل و غارت وافر درمیان آمد۔ مولوی قلندر بخش جیو سلمہ بہ معہ زن و فرزند غارت خوردہ از غایت بی اسبابی درآں نواح متوقف اند[1]

میر نے سکھوں کے ان مظالم و تشددات کا تفصیلی ذکر کیا ہے، جو انھوں نے سرہند کے مسلمانوں اور احمد شاہ ابدالی کی افواج پر کیے تھے۔ بقول میر "چونکہ اس قوم (ابدالیوں) کا غرور حد سے تجاوز کر چکا تھا غیرت خداوندی نے انھیں سکھوں کے ہاتھوں ذلیل کیا، جو پنجاب کے نواح میں بے اصلوں، جولاہوں، ندافوں، بزازوں، دلالوں، نجاروں، بقالوں، قزاقوں، کسانوں، کم مایہ لوگوں، سفلوں، جنگلیوں، بازاریوں، کمینوں، اور تہی دستوں کی ٹولی تھی، تقریباً پچاس ہزار سکھوں نے اس لشکرِ جرار کا مقابلہ کیا، کبھی تو ایسے مقابل آتے کہ زخم پر زخم کھاتے مگر پیٹھ نہ دکھاتے، اور کبھی اِدھر اُدھر منتشر ہو کر سو دو سو (ابدالی) سپاہیوں کو گھیر کر لے جاتے اور سب کو تہِ تیغ کر دیتے، ہر روز صبح کو فتنہ اٹھاتے، ہر شام کو چاروں طرف سے ٹوٹ پڑتے (غرض) انھوں نے (ابدالی) کے لشکریوں کا ناک میں دم کر دیا، انھیں جان بچا کر بھاگنا دوبھر کر دیا، کبھی ظاہر ہوتے اور لشکریوں پر ٹوٹ پڑتے، کبھی شہر پر ہلا بول دیتے اور اسے تاراج کر دیتے، پریشان بالوں اور بندھے ہوئے چٹلوں کے ساتھ فوج میں آتے تھے، رات بھر شور و شر (رہتا) اور سارا دن فریاد و فغاں (کی ہولناک آوازیں آتیں) ان کے پیادے ابدالی سوار کے تلوار لگاتے اور ان کے گھوڑوں کی زین خون میں لت پت ہو جاتی، ان کے معمولی سپاہی (ابدالی کے) تیراندازوں کو پکڑ کر لے جاتے اور طرح طرح کی ایذائیں دیتے،،[2]

درید نے مسلمانوں پر سکھوں کے ظلم و تشدد کا موازنہ فرعون کے اسرائیلیوں پر کیے گئے مظالم سے کیا ہے۔[3]

---

1. کلمات طیبات ص 44۔

2. میر کی آپ بیتی ص 139,140۔ نیز ملاحظہ ہو۔ کلیات میر۔ ص 967۔

3. Irvine: Later Mughals/.P97۔

سکھوں کی چیرہ دستی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ بقول میر "وہ گروہ ابدالیوں کے تعاقب میں لوٹ کھسوٹ اور تاراج کرتا ہوا دریائے اٹک تک گیا اور ان کی اچھی خاصی مرمت وگوشالی کر کے اس صوبے پر قبضہ کر لیا۔ جس کی آمدنی دو کروڑ روپیہ سالانہ تھی۔ کچھ دنوں بعد اس اجل رسیدہ ہندو کو، جو شہر لاہور میں مقیم تھا قتل کر کے (بالکل ہی) مالک ہو گئے۔ اب چونکہ ملک کا دعویدار کوئی نہ تھا، ان کم اصلوں نے ملک کو آپس میں بانٹ لیا۔[1]

1۔ میر کی آپ بیتی۔140۔

باب دوم

اقتصادی حالات

تقریباً 26 سال تک اورنگ زیب دکن میں مرہٹوں[1] اور دوسری سیاسی طاقتوں سے جنگ وجدل کرتا رہا اور شمالی ہندستان کی آمدنی کا بڑا حصہ وہاں صرف ہوتا رہا، لیکن اس پر بھی اس نے اپنی دوراندیشی اور سیاسی بصیرت کی وجہ سے اپنی وفات[2] کے وقت چوبیس کروڑ روپیہ آگرہ کے خزانے میں چھوڑا تھا۔ مگر اس کے نااہل جانشینوں نے اس روپے کو پانی کی طرح بہادیا۔[3] رفتہ رفتہ آمدنی کے سوت سوکھ گئے اور ملک کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔

اکبر بادشاہ نے جاگیرداری نظام کی خرابیوں کے پیشِ نظر خالصہ زمینوں کو بڑھانے کی پالیسی پر عمل کیا تھا، جس زمین کی آمدنی سرکار بذاتِ خود وصول کرتی تھی۔ اس طرح سرکاری آمدنی ہوجاتی تھی، اور ان امیروں کا منھ نہ دیکھنا پڑتا تھا۔ جن پر صوبوں کے لگان کی وصولی اور اس کو خزانے میں بھیجنے کی ذمہ داری تھی۔ اکبر کے جانشینوں نے اس کی اس حکمتِ عملی کو نظرانداز کر کے خالصہ علاقوں میں سے بھی جاگیریں تفویض کرنا شروع کردیا۔ لہٰذا حکومت نے اپنی آمدنی کا ذریعہ کھودیا۔ خود

---

1. میر کی آپ بیتی۔ 140۔
2. کلیاتِ نظیر اکبرآبادی۔ ص 470۔
3. منتخب اللباب (خافی خان) ج 2 ص 598۔

اورنگ زیب کے زمانے میں صوبائی گورنر مرکزی سرکار کو روپیہ نہ بھیجتے تھے اور اس سبب سے فوج اور سول افسروں کی تنخواہیں وقت پر ادا نہ کی جا سکتی تھیں۔[1]

چونکہ اٹھارھویں صدی میں مرکزی سرکار بہت کمزور ہو چکی تھی، لہٰذا دور کے صوبوں مثلاً بنگال اور دکن کے صوبہ داروں نے مرکزی سرکار کو روپے بھیجنا بند کر دیا۔ جہاں تک دار الخلافہ کے قرب وجوار کے صوبوں کا سوال تھا وہاں سے بھی اسی صورت میں روپیہ وصول ہو سکتا تھا کہ بادشاہ بہت طاقت ور ہو اور اپنی فوجی طاقت کا استعمال کر سکتا ہو۔ صوبائی حاکموں کے علاوہ جو صرف نام کے لیے ہی بادشاہ کے ملازم تھے، دوسرے سردار بھی آزادی کا دم بھرنے لگے تھے۔ انھوں نے خالصہ کے علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا اور ان علاقوں کی آمدنی کا رُخ انھوں نے اپنے خزانوں کی طرف موڑ دیا۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، سرکش طاقتیں اور بھی زیادہ بڑھ گئیں۔ خالصہ علاقوں میں بڑی تیزی سے کمی ہو گئی۔ چنانچہ ''سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم،، مشہور ہے۔[2]

علاوہ ازیں نادر شاہ ہندستان کی بہت کافی دولت، مختلف روایتوں کے مطابق ایک سو اسّی کروڑ کا مال غنیمت لے گیا تھا۔[3] جو کچھ بچ رہا، وہ مرہٹوں جاٹوں، روہیلوں اور درباری لوگوں نے

---

1. شاہ ولی اللہ نے مکتوب اول میں جو انھوں نے بادشاہ وزیر اور امرا کے نام لکھا تھا، اس بات کی ہدایت کی ہے کہ خالصہ کو کشادہ تر کرنا چاہیے، خصوصاً وہ علاقہ جو دہلی کے اردگرد ہے' آگرہ' حصار، دریائے گنگ اور حدود سرہند تک سب کا سب علاقہ یا اس میں کا اکثر خالصہ ہو، کیوں کہ امور سلطنت میں ضعف کا سبب خالصہ کی کمی اور خزانہ کی قلت ہوا کرتی ہے سیاسی مکتوبات ص 24، نیز ملاحظہ ہو، احوال الخواقین (قلمی) الف 182، ب 183۔

2. تاریخ محمد شاہی (قلمی) ص 24 ب 25 (الف) نیز ملاحظہ ہو۔

The History of the Reign of Shah Aulam (Francklin)

3. تاریخ فرخ سیر بادشاہ (قلمی) ص 267، اقتباس وقائع بدائع (آنند رام مخلص) اور ہسلپ کالج میگزین (نومبر 1941) ص 81۔ تاریخ محمد شاہی کے مصنف کا بیان ہے کہ ''مملکت چہار صد سالہ وسلطنت وفرماں روائی ایں آمد مدت را برابر ساخت، ص الف 128 ب 135,136۔ (الف) خزانہ شاہی کے متعلق لکھا ہے۔'' گنج ہائے فراواں کہ ہم خزینہ قارونی از شرمندگی بزرگی او بکوچکی رونمود بظہور مین فردی روند،، ص الف 135۔

برباد وتباہ کردیا، ان تمام بربادیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی خاندان کے افراد تک کو کس مپرسی کی حالت میں زندگی گزارنی پڑی۔

اورنگ زیب کا جانشین بہادر شاہ فیاضی کے لیے مشہور تھا۔[1] اس نے سلطنت کی مالی حالت اور بھی زیادہ تباہ کردی۔ اس کے بعد جہان دار شاہ نے اپنی عیاشی میں بے دریغ دولت لٹائی اس نے اپنی محبوبہ لعل کنور کو دو کروڑ روپے سالانہ جیب خرچ کے لیے دیا جب کہ اس کی تمام ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری بادشاہ پر تھی۔ دربار میں اس قدر جشن منائے جاتے اور محفلیں بجتی تھیں اور ان ایام میں کثرت سے چراغاں ہوتا تھا کہ دہلی میں تیل اور روغن کم یاب ہوگیا تھا اور تیل کا نرخ بڑھ گیا تھا۔ گیہوں سات سیر فی روپے بکنے لگا۔[2]

فرخ سیر تخت پر بیٹھا تو اسے گھوڑوں کے پالنے کا شوق تھا، ہزاروں گھوڑے اس کے اصطبل میں بے کار بندھے رہتے تھے اور ہزاروں روپے روزانہ ان پر صرف ہوتا تھا۔[3]

محمد شاہ بادشاہ بھی عیش دوست اور فضول خرچ تھا، اور ملک کی کل آمدنی سال کے آخر تک خرچ کرلیتا تھا۔[4] محمد شاہ کے زمانہ تک اِن سب باتوں کے باوجود حالات ناگفتہ بہ نہ ہوئے تھے۔ اِسی بگڑے ہوئے اقتصادی نظام پر نادر شاہ کا حملہ ہوا اور جیسا کہ لکھا جاچکا ہے۔ وہ کثیر دولت ہندستان سے باہر لے گیا، اس کے بعد شاہی خزانہ اور امیروں کے مکان دولت سے خالی ہوگئے۔[5] اور شاہی کارخانہ جات تباہ و برباد ہوگئے۔[6]

احمد شاہ بادشاہ (1748 ۔ 1754) کے زمانے میں شاہی خزانے کی یہ حالت تھی کہ چھتیس چھتیس مہینوں تک ملازمین اور سپاہیوں کو تنخواہیں نہ ملتی تھیں۔ ایک مرتبہ احمد شاہ کو مجبور ہوکر تمام

1۔ لیٹر مغلس، ج1، ص139، تواریخ ممالک ہندستان (قلمی) ص123 (ب) خافی خان ج607,630,646/2 تذکرۃ الملوک، ص ب117-117 (الف)

2۔ لیٹر مغلس ج1 ص194۔ 3۔ لیٹر مغلس ج1 ص397۔

4۔ 11,PP-36,37 نیز تاریخ شاکر خانی۔ ص37۔

5۔ تاریخ عالم گیر ثانی (قلمی)، ص190، لیٹر مغلس، ج2 ص370۔

6۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو، تاریخ محمد شاہی ص ب160 تا الف183۔

کوٹھوں، سلاح خانوں، فراش خانوں، باورچی خانوں کے برتنوں، کتب خانہ اور نقار خانہ کی چیزوں کو فروخت کر کے سپاہ کی تنخواہیں ادا کرنی پڑیں[1]۔ شاہی وقار اتنا گر چکا تھا کہ مہاجن اور ساہو کار بھی قرض دینے کو تیار نہ ہوتے تھے، اس زمانے میں شہزادوں کو تین تین دن کے فاقے کرنے پڑتے تھے[2]۔ سودا نے اپنے شہر آشوب میں سپاہیوں کی زبوں حالی کا یوں ذکر کیا ہے:

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی — تنخواہ کا پھر، عالمِ بالا پہ مکاں ہے
گزرے ہے سدا یوں علف ودانہ کی خاطر — شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یہاں ہے
ثابت ہو جو دگلا تو نہیں موزوں میں کچھ حال — تیروں میں ہے پر گیری، تو بے چلہ کماں ہے
کہتا ہے نفر غرہ کو صراف سے جا کر — بی بی نے تو کچھ کھایا ہے فاقہ سے میاں ہے
یہ سن کے دیا کچھ، تو ہوئی عید، وگرنہ — شوّال سے پھر ماہِ مبارک رمضاں ہے
اس رنج سے جب چڑھ گئے چھتیس مہینے — تنخواہ کا پیٹنا اس شکل سے یاں ہے۔[3]

میر نے ''مخمس در حال لشکر'' میں شاہی لشکر کی اقتصادی زبوں حالی اور سپاہ کی تنگ دستی کا دلدوز انداز میں نقشہ پیش کیا ہے:

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش — آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کر دیکھی یاں کی طرفہ معاش — ہے لب نان پر سو جگہ پہ خراش
نے دم آب ہے نہ چمچۂ آش

مرنے کے مرتبے میں ہیں احباب — جو شناسا ملا سو بے اسباب
تنگ دستی سے سب بحال خراب — جس کے ہے پال تو نہیں ہے طناب
جس کے ہے فرش تو نہیں فراش[4]

1۔ تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص36۔

2۔ تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص37 Fall of
The Mughal Empire.11,P 36-37

3۔ کلیات سودا (نول کشور) ص150 نیز ملاحظہ ہو، دیوان حسرت (قلمی رام پور) ص ب133، الف134۔

4۔ کلیات میر (نول کشور، لکھنؤ 1941ء) ص952۔

ہیں سپاہی سو بھوکے مرتے ہیں   لوہو پی پی کے زیست کرتے ہیں
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال [1] ۔

''مخمس در ہجو لشکر'' میں میر نے ذیل کا نقشہ پیش کیا ہے:

جس کسو کو خدا کرے گمراہ   آوے لشکر میں' رکھ امیدِ رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ   جس کو دیکھو سو ہے بحالِ تباہ
طرفہ مردم ہوئے اکٹھے آہ

جایئے جس کے یاں وہ روتا ہے   یا کہے چوبدار سوتا ہے
جو مقدر ہے سو تو ہوتا ہے   کون وقتِ عزیز کھوتا ہے
میں تو تھوکوں نہ ایسوں پر واللہ

فوج میں جس کو دیکھو سو ہے اُداس   بھوکھ سے عقل گم نہیں ہیں حواس
بیچ کھایا ہے سب نے سازولباس   چیتھڑوں بن نہیں کسو کے پاس
یعنی حاضر براق ہیں گے سپاہ

خاک اڑتی ہے صبح سے تاشام   شام سے صبح تک ہے فکرِ طعام
رحم کی جا ہے حال تنگ انام   ایک دو ہوں تو لوں کسو کا نام
سیکڑوں کے نہیں جگر میں آہ

مفلسی سے رہا ہے کس میں حال   خورش وخواب ہیں گے خواب وخیال
چار دن عمر کے ہوئے ہیں وبال   زندگی اپنے طور پر ہے محال
مرگ ملتی نہیں ہے خاطر خواہ

جاؤ کرنے تلاش جس کے گھر   پہنچنا اس تلک بہت دو بھر
راہ مطلق نہیں نکلتی اودھر   باعثِ صد فساد وشور وشر
دس تلنگے ہیں درپہ بے گہ دگاہ

فقروفاقہ کی ہر طرف ہے دھوم   دو تلنگے جہاں ہیں واں ہے ہجوم

---

1. کلیات میر ص 957۔(نول کشور)

لشکر اک ہے خرابہ مردم بوم زندگی کرنے کی طرح معلوم
کہ رہے جوں خدا ہی ہے آگاہ [1]

سلاطین اور شاہی خاندان کا حال

مچار رکھی ہے سلاطینوں نے یہ توبہ دھاڑ کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریبان پھاڑ
کوئی در اپنے پہ آدے مارتا ہے کواڑ کوئی کہے جو ہم ایسے ہیں چھائے ہنگی پہاڑ
تو چاہیے کہ ہمیں سب کو زہر دیجیے گھول [2]

اس کے اوپر ہے شہ تماشائی اور چاہے ہے خرچ بالائی
ہر طرف پھیلی ہے یہ رسوائی کل چنانچہ ہمیں نظر آئی
لال خیمے کے گردو سرپال

دینے کا ہو کہیں ٹھکانا بھی جود کو چاہیے زمانہ بھی
یاں نہیں شہ کے گھر میں دانا بھی کبھو ہوتا ہے پینا کھانا بھی
ورنہ بھوکے رہے ہیں بیٹھے نڈھال [3]

شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں شاہی خزانے کی ایسی ابتری تھی کہ آمدنی کی کمی اور خرچ کی زیادتی نے اس کے مزاج میں نازیبا کفایت شعاری اور شاعرانہ حسنِ طلب بھی پیدا کر دیا تھا۔ ایک بار یہ واقعہ پیش آیا کہ شاہی نقارچیوں نے حسب الحکم کوچ کا نقارہ بجا دیا۔ پٹیل کے ایما پر بادشاہ نے سفر ملتوی کر دیا۔ نقارچیوں نے حسب دستور سوا سو روپے ''تاوانی انعام'' کے طلب کیے۔ فراقی کا بیان ہے کہ اس سلطنت بخش بادشاہ نے سوا سو روپیہ با کراہ دیا اور ان کے شور وغل اور واویلے پر کہا ''یہ بھی ہماری ہمت تھی کہ صدائے طبل پر بیس آنے بخش دیے تمھیں یہ بھی کیا بُرے ہیں، جو زیادہ طلبی کرتے ہو''[4]

---

1. کلیات میر (نول کشور) لکھنؤ 1941) ص 806،807۔

2. کلیات سودا، ص 369۔

3. کلیات میر ص 158۔

4. وقائع عالم شاہی (مرتبہ جناب مولوی امتیاز علی خاں عرشی) ص 97۔

میر نے لکھا ہے کہ بادشاہ کی تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ اس پر آٹھ آنے بھی بھاری تھے۔

آٹھ آنے ہیں شاہ پر بھاری — اس کی لوگوں نے کی ہے اب خواری
آپ ہے تو یہ ہے گرفتاری — فوج ہے گی تو قحط کی ماری
کیوں نہ جس جا رہے ہیں واں تھا کال [1]

علاوہ ازیں پٹیل نے ایک مرتبہ پوشاک کی چند کشتیاں مرشد زادوں کے لیے بھیجیں۔ شاہ عالم کو ایک بیٹی بڑی عزیز تھی اور ''میاں صاحب'' کے نام سے ملقب تھی۔ ان کے مطلب کا کوئی کپڑا ان میں نہ تھا، یہ دیکھ کر لانے والوں کے سامنے بادشاہ نے فرمایا'' چونکہ پٹیل جانتے ہیں کہ ہمیں میاں صاحب سے کتنی محبت ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے وہ علاحدہ اچھا سا کپڑا بھیجیں گے''، پٹیل نے ارشاد سنا تو فوراً اعلیٰ درجہ کا کپڑا بھجوا دیا [2]

اتنا سب کچھ ہونے پر بھی شاہ عالم نے عیش و عشرت کا دامن نہ چھوڑا۔ اس بڑھاپے اور (اندھے پن) بے بصری میں ''عزیزن'' نامی ایک معمولی درجہ کی کنچنی پر عاشق ہو کر اسے شرف زوجیت سے مشرف فرمایا۔ اور ''ملکۂ عالم'' خطاب دیا، وہ بدذات جب روٹھ جاتی اور اس وقت تک نہ منتی جب تک بادشاہ کو خوب دق اور ذلیل نہ کر لیتی۔ اس صورت میں بادشاہ اس کی ہی نہیں اس کے بھائی بندوں کی بھی خوشامد کرتے اور بالآخر بہزار منت و سماجت اسے راضی کر کے ہی دم لیتے۔ [3]

اکبر شاہ ثانی (1839-1806) کے زمانے میں اس سے بھی زیادہ بدتر حالت تھی۔ سرسید احمد خاں نے لکھا ہے:

''اکبر شاہ اگرچہ تخت نشین ہوئے۔ مگر اخراجات کی تنگی کا وہی عالم تھا جو شاہ عالم کے وقت میں تھا۔ شاہ عالم کے وقت میں اخراجات کی نہایت تنگی تھی تمام کارخانے ابتر ہو گئے تھے [4] شاہزادوں

---

1. کلیات میر ص 957۔
2. وقائع عالم شاہی ص 22، شاہ حاتم نے ذیل کے شعر میں شاہ عالم کی غربت اور تنگ دستی کا ذکر کیا ہے۔
شاہ عالم گیر کا مصرع ہے حاتم رمز عشق ☆ دل میں آتا ہے کہ شاہی میں گدائی کیجیے۔ (دیوان زادہ ص 286)
3. وقائع عالم شاہی ص 116۔
4. سرکاری کارخانہ جات کی ابتری کی تفصیل ملاحظہ ہو، تاریخ محمد شاہی (قلمی) ص الف 161 تا الف 183۔

کو جو قلعے کے نو محلے میں رہتے تھے، ماہواری روپیہ نہیں ملتا تھا اور وہ چھتوں پر چڑھ کر چلاتے تھے کہ بھوکے مرتے ہیں، بھوکے مرتے ہیں [1]

پروفیسر اسپیر نے اپنی کتاب Twilight of the Mughals میں ان مغل شہزادوں کی زبوں حالی اور ان کے دردناک مصائب کا بڑا پُر درد نقشہ پیش کیا ہے اور انھوں نے لکھا ہے کہ ان شہزادوں کو مرجانے دیا جاتا تھا لیکن کوئی مزدوری یا ملازمت محض اس وجہ سے نہ دی جاتی تھی کہ یہ کام ان کے شایانِ شان نہ تھا ان کے حالات جانوروں سے بدتر تھے [2]

مصحفی نے لکھا ہے:

گل جائے زبان میری کروں ہجو گران کی ــــــ یہ تنگ معاشی کا سلاطیں کا بیاں ہے
اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک ــــــ صاف تو یہ گلشنِ دہلی میں خزاں تھے [3]

امرا کی اخلاقی حالت

اس عہد کے امرا میں عیش وعشرت اور فضول خرچی جزوِ فطرت بن گئی تھی، میر نے لکھا ہے:

لعل خیمہ جو ہے سپہر اساس ــــــ ہیں رنڈیوں کی اس کے پاس
ہے زنا وشراب سے بے وسواس ــــــ رعب کر لیجیے یہیں سے قیاس
قصہ کوتاہ رئیس ہیں عیاش [4]

ولیم ہوجیج کا بیان ہے کہ جب سلطنت مغلیہ اپنے اقتدار اور تسلط کے شباب پر تھی تو درباری امرا کا خصوصاً اور دوسرے امیروں کا عموماً یہ شغل تھا کہ ہزاروں کی تعداد میں حسین وجمیل عورتیں ملک کے مختلف علاقوں سے اور خاص طور پر کشمیر کے علاقے سے منگوا کر اپنے حرم میں داخل کر لیتے تھے [5] قطب الملک عبداللہ خاں عیش وعشرت کا بہت دلدادہ تھا اور دن رات جنسی لذتوں میں

---

1. سیرت فریدیہ ص 24,25۔
2. Twilight of the Mughals. PP62-63
3. دیوان مصحفی (مرتبہ حسرت موہانی) ص 66۔
4. کلیات میر ص 952۔
5. Hodges: Travels in India- PP.2/-22۔

مشغول رہتا تھا، اس نے بے شمار عورتیں اپنے حرم میں جمع کر رکھی تھیں، خافی خاں نے لکھا ہے کہ:

"ازاں کہ سید عبداللہ خاں بحبت زناں وعشرت نسا نہایت رغبت داشت، بروایت مشہور دو سہ زن حور لقا از جملہ محرمان حرم پادشاہی پسند نمودہ بتصرف خود در آورد، ہر چند کہ از زیادتی حرص وخواہش شہوت رانی قریب ہفتاد دو ہشتاد زن خوش ادائی حور مثال فراہم آوردہ با آنہا نردمی باخت۔"[1]

شاہ جہاں آباد کے امیروں کے بارے میں طباطبائی نے لکھا ہے:

"در شاہ جہاں آباد نا اہل بطور امرا بہ نگہداشتنِ نسوان وخریدنِ دختران کلاونت وقوالان ونکاح بازی اختیار نمودہ"[2]

قزلباش خاں امید روزگار کی تلاش میں ایران سے ہندستان آیا تھا محمد شاہ کے عہد میں اسے پنج ہزاری کا منصب عطا ہوا۔ یہ امیر اپنا زیادہ وقت تفریح اور حسینوں کی صحبت اور خوش گپیوں میں صرف کرتا تھا۔[3]

امرد پرستی کی طرف اس کی طبیعت بے حد مائل تھی۔ عبدالحی تاباں "یوسفِ ثانی دعصر" کم سن لڑکوں کو زنانہ لباس میں ملبوس اور زیورات سے آراستہ کر کے ڈولیوں میں بٹھا کر سرِ شام قزلباش خان کے مکان پر بھیجا کرتا تھا اور شب وہ ان کی صحبت میں بسر کرتا تھا۔[4]

خود تاباں کے متعلق مصحفی نے لکھا ہے کہ وہ بے حد حسین تھا۔ اس کی تصویریں دہلی کے قہوہ خانوں میں لگی ہوئی تھیں، مصحفی نے چاندنی چوک کے ایک قہوہ خانے میں اس کی تصویر دیکھی تھی۔[5] ایک بار بادشاہ بھی اس کے حسن کا شہرہ سن کر اسے دیکھنے کے مشتاق ہوئے۔ ہاتھی پر سوار ہو کر گھر سے نکلے اور تاباں کے کوٹھے کے نیچے آ کر پانی پینے کے بہانے سے ہاتھی روکا اور اس کی

1۔ سیر المتاخرین (فارسی) ج 2۔ ص 660۔

2۔ نکات الشعراء ص 7 تذکرہ شعرائے اردو ص 46 مخزن نکات ص 31۔ مجموعہ نغز، ص 71۔

3۔ نکات الشعراء ص 108,109۔ مخزن نکات ص 53 تذکرۂ ہندی ص 47,48۔

4۔ مجموعہ نغز 1 ص 132,133 نیز تذکرہ کریم الدین ص 167۔

5۔ تذکرہ ہندی۔ ص 48۔

زیارت کر کے آگے بڑھے۔

خاں جہاں بہادر کے بھتیجے فدوی خاں کا لڑکا اعظم خاں اپنی دولت حسین لونڈوں کے مہیا کرنے میں صرف کرتا تھا، درگاہ قلی خاں نے اس کے متعلق لکھا ہے:

اس کی طبیعت امارد پسند ہے، اور اس کا مزاج سادہ رویوں کی محبت میں گرفتار، اس کی جاگیر کی آمدنی اس فرقہ کے اخراجات میں صرف ہوتی ہے جس جگہ سے بھی اسے کسی حسین امرد کے متعلق خبر ملتی ہے، اس کی ہر خواہش پوری کر کے اسے اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے اور جس طرح سے بھی اسے کسی خوبصوت لڑکے کا پیام ملتا ہے، اس پر احسانات کا بوجھ ڈال کر اپنے دام میں گرفتار کر لیتا ہے، ان میں سے بعض ہاتھی اور گھوڑوں کی سواری پر بڑے تجمل اور شکوہ سے نکلتے ہیں۔ غرض کہ جہاں کہیں بھی حسین امرد نظر پڑے وہ اعظم خاں سے ضرور وابستہ ہوگا، اس کی تمام زندگی حظِ نفسانی اور لہو ولعب میں گزری[1]

شاکر خاں، جہاں دار شاہ کے عہد کے ایک امیر ذوالفقار خاں کے متعلق لکھتا ہے:

''بعیش وعشرت برداشت[2]

عبدالغفور۔ محمد شاہی ایک امیر حد درجہ عیاش تھا، اس کی ایک امنگ یہ تھی کہ وہ قحبہ زنوں کی طرز پر لباس زیب تن کرتا تھا، نشے میں مدہوش ہو کر وہ اپنے ٹخنوں میں گھنگرو بندھواتا اور سر پر شال اوڑھ کر ان کے ساتھ رقص میں شریک ہوتا، اس کے مکان کے سامنے سے جب غریب آدمیوں کی عورتوں کی ڈولیاں نکلتیں تو انھیں زبردستی ٹھہرا کر عورتوں کو اس کے سامنے پیش کیا جاتا اور ان میں سے جو پسند خاطر ہوتیں، انھیں وہاں روک لیا جاتا[3]

مرزا منو، عہد محمد شاہی کا ایک امیر تھا، درگاہ قلی خان نے اس کی مجلس کا بڑا دلچسپ الفاظ میں نقشہ پیش کیا ہے۔

---

1. مرقع دہلی۔ ص، 27۔ محتشم خاں بہادر کی عیاشی اور اس کی امرد پرستی کے ذوق کے متعلق معلومات کے لیے دیکھیے ماثر الامرا (فارسی) ج3۔ ص796۔

2. تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص101 الف۔

3. لیٹر مغلس (انگریزی) ج2 ص229۔

''اس کا مکان شداد کی بہشت کے مانند تھا اور اس کے مکان پر پری زادوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا، دہلی کے تمام حسین امردوں کا اس کی مجلس سے تعلق تھا۔''[1]

وزیر الممالک کی مجلس یازدھم کا ذکر کرتے ہوئے درگاہ قلی خاں لکھتا ہے کہ اس کا مکان حسینوں کے مجمع کے سبب سے گلشن آباد تھا جس جگہ بھی کوئی حسین امرد تھا وہ اس کی مجلس کی طرف رجوع ہوتا تھا اور حسینوں کی صحبت کے خواہش منداس کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے، کلاونتوں کے حسین جمیل لڑکے ڈولیوں میں اس کی بزم میں حاضر ہوتے تھے۔ ہر ماہ کی گیارہویں تاریخ کو اس کے ہاں اربابِ رقص کا اجتماع ہوتا تھا اور اسی طرح قوال اور نقال بھی حاضر ہوتے تھے۔[2]

حسین علی خاں رقص و بادہ نوشی میں اتنی دولت صَرف کرتا تھا کہ اس کی آمدنی کفایت نہ کرتی تھی۔[3]

ایک محمد شاہی امیر، امین الدین خاں سنبھلی کے متعلق صمصام الدولہ کا بیان ہے:

''مشغوفِ یار باشی وعیش و پرستی بود''[4]

اس کی عمر کے آخری زمانے کے بارے میں مصنف ہذا لکھتا ہے۔

''در آخر ہا امارد پرستی را اعلان وشیوع رسانیدہ۔ ازیں ہوس پرواں سادہ رو ونوخطاں چار ابرو فراہم آوردہ در تقطیع وتزئین آنہا توجہ می گماشت، وہمیں را مصارف ہمت می پنداشت۔''[5]

وزیر قمر الدین خاں، محمد شاہی اپنی زندگی عیش وعشرت و بادہ نوشی میں بسر کرتا تھا۔ ایک مرتبہ نشے کے عالم میں سیڑھیوں پر سے گر پڑنے کی وجہ سے ایسی چوٹ آئی تھی کہ اس کی وجہ سے زیادہ دیر تک کھڑا رہنا اس کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔[6]

عہد محمد شاہی کے ایک امیر روشن الدولہ طرہ باز خان نے ایک موقع پر امیر الامرا

---

1. مرقع دہلی ص29،30۔

2. مرقع دہلی ص33،34۔

3. ماثر الامرا (فارسی) ج1 ص320۔

4. ماثر الامرا (فارسی) ج1 ص358۔

5. ماثر الامرا (فارسی) ج3 ص796۔

6. سیر المتاخرین (ا۔ت) 3/ص۔22۔

خاندوراں خان، سر بلند خان اور سید سعادت خان کو دعوت پر بلایا۔ ان کے اعزاز میں مجلس رقص وسرود کا اہتمام کیا گیا۔ اس محفل کے بارے میں قاضی مرتضیٰ واسطی نے لکھا ہے:

انداز جشنِ طوائفان آں چہ نویسد، گوئی خیل پری بودہ یا حوران بہشتی برائے ربودن ہوش مردم از آسمان فرود آمدہ بودند، وخوبیٔ ونغمہ ورقص از تحریر بیروں بودہ [1]

تواریخ کے صفحات سے اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

فضول خرچی اور فیاضی

حکومتِ برطانیہ کے تسلط سے پہلے ہندستان سونے کی چڑیا کہلاتا تھا اور اپنی دولت کے لیے دنیا میں مشہور تھا۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ایک موقعہ پر محمد شاہی وزیر قمر الدین خاں [2] کی فارغ البالی اور تمول کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

''بخانہ قمر الدین خاں عورات غسل اخیر از گلاب می کردند وبخانہ دیگر نواب سہ صدروپیہ راہر روز گل وی رفت،، [3]

---

1 حدیقۃ الاقالیم ص 45، عمدۃ الملک امیر خاں انجام کی مجلس رقص وسرود کے لیے ملاحظہ ہو، دیوان تاباں ص 268،260۔

2 نام میر محمد فاضل تھا، بہادر شاہ کے عہد میں ایک اعلیٰ منصب اور قمر الدین خاں کا خطاب ملا، فرخ سیر کے عہد میں ایک عمدہ منصب کے علاوہ بخشی احدیان کے عہدے پر فائز ہوا، محمد شاہ کے دور میں شش ہزاری نواب اور شش ہزاری کا منصب اور اعتماد الدولہ قمر الدین کے خطاب کے ساتھ وزارت کا عہدہ بھی ملا، برائے تفصیل ملاحظہ ہو، مآثر الامرا (فارسی) ج اول۔ ص 345،359۔

3 ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی، ص 11۔ محمد شاہ بادشاہ کے منظور نظر عبدالغفور کا جب انتقال ہوا تو اس کے مکان سے دو کروڑ نقدی کے علاوہ دوسری قیمتی چیزیں بھی نکلی تھیں، تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص 36، اعتماد الدولہ قمر الدین کی وفات پر اس کے مکان سے بارہ کروڑ روپیہ کا مال واسباب اور نقدی روپیہ برآمد ہوا تھا، تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص 81۔ ہندستان کے امرا کے سلسلے میں لکھتے ہوئے شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں کہ پیڑھیوں سے وہ لوگ حکمراں رہے ہیں اور ان میں ہر ایک روزانہ کی زندگی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا، ایک ایسا زمانہ آیا کہ اگر کوئی امیر ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا کمر بند باندھتا تھا (بقیہ 109 پر)

بقول غلام علی آزاد بلگرامی، اسی دولت نے مسلمانوں کے قوائی عمل شل کر دیے تھے اور ان کی تمام ذہنی قوتوں کو عیش و عشرت کی طرف منتقل کر دیا تھا۔[1] انشا اللہ خاں انشا نے لکھا ہے کہ اس زمانے کے امیر آدھا سیر پلاؤ کی تیاری میں بیس روپے صرف کر دیتے تھے اور ان مرغن کھانوں کے بعد وہ تنہائی میں بیگموں اور طوائفوں کی صحبت میں رہتے تھے، اسی سبب سے ہندستان کو اس تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔[2]

اس زمانے کے تمام امرا اسراف بے جا کا شکار تھے، کہا جاتا ہے کہ جس پالکی اور ہاتھی پر سوار ہو کر روشن الدولہ[3] نکلتا تھا، اس کی سجاوٹ میں اتنی زیادہ مقدار میں سونا و چاندی صرف ہوتا تھا کہ پالکی اٹھانے والے کہار اور راستہ کے فقیر کئی کئی تولے سونا اور چاندی راستہ سے چُن چُن کر اکٹھا کر لیا کرتے تھے۔[4]

قطب الملک عبداللہ[5] خاں ہر ماہ بیس ہزار روپے خانقاہ نشینوں کی خدمت میں بھیجا کرتا تھا، یہی نہیں اس کی فضول خرچی کا یہ عالم تھا کہ اپنے مکان سے قلعۂ معلا تک جہاں سے اس کا مسکن بہت قریب ہی تھا، دو سو روپے بطور کرایہ دیا کرتا تھا۔[6] تاریخ ہندی کے مصنف کا بیان ہے کہ امیر الامرا حسین علی خاں کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ اس کے زمانے میں مفلس اور غریب لوگوں کی تعداد میں بڑی کمی ہو گئی تھی، اس کے لشکر کا کوئی بھی ایسا فرد نہ تھا جس کے پاس زرِ سفید و سُرخ نہ

(بقیہ صفحہ 108 کا) یا تاج پہنتا تو لوگ اس کے لیے تذلیل کے الفاظ استعمال کرتے، ایک امیر کے پاس شاندار مکان، باغات، غسل خانے اور آرام کے لیے خوبصورت پلنگ اور غلاموں کا نہ ہونا اس کی غربت کی پہچان تھی، وہ بہت زیادہ روپے کھانے اور لباس میں صرف کرتے تھے، حجۃ اللہ البالغہ (اردو) ص 162,163۔

---

1. خزانۂ عامرہ ص 49۔
2. دریائے لطافت (فارسی) ص 66۔
3. ماثر الامرا (فارسی) جلد دوم۔ ج دوم۔ PP.605-608
4. سیر المتاخرین (فارسی) ج 2/ ص، 228، نیز چہار گلزار شجاعی (قلمی) ص 228۔
5. برائے حالات ملاحظہ ہو۔ ماثر الامرا۔ (فارسی) جلد دوم ص 91-489۔
6. تاریخ محمد شاہی (قلمی) ص 93 ب

ہو، بلکہ اس کی سرکار کے نقیب، سپاہیوں کے ڈیروں پر جا کر اُن کو تاکید کرتے کہ وہ جا کر اپنا حصہ لے لیں، اکثر سپاہی کہتے کہ ہمارے پاس بہت ہے، اب رکھنے کو جگہ نہیں ہے۔،، اس کے ''بلغور خانہ'' میں مسکینوں کے لیے پانچ سو روپے کا کھانا پکتا اور اس کے مطبخ کا روزانہ کا خرچ دو ہزار سے زیادہ تھا۔[1]

مختلف رسوم اور دوسرے تہواروں پر دل کھول کر خرچ کیا جاتا تھا۔ روشن الدولہ نے اپنی لڑکی کی شادی میں ساٹھ لاکھ روپے صرف کیے تھے، تورانی امرا میں سے کسی نے بھی اتنی رقم شادی میں کبھی خرچ نہ کی تھی[2] صفدر جنگ[3] نے اپنے لڑکے شجاع الدولہ کی شادی میں اتنا روپیہ صرف کیا تھا کہ عہد مغلیہ کے امرا میں شاہ جہاں بادشاہ کے وزیر ظفر[4] خان کے علاوہ کوئی اس تک نہ پہنچتا تھا[5] راجا جگل کشور نے قریب چالیس لاکھ روپیہ اپنے لڑکے کنور نند کشور کی شادی میں خرچ کیے، کھانے پر دہلی کے تمام ساکنوں کو مدعو کیا گیا تھا[6] اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد جب میر تقی میر اپنی عسرت اور تنگ دستی کی بنا پر راجا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو راجا نے بہت شرمندگی کے انداز میں کہا

'' کہ من شالِ کہنہ دارم، اگر دستے می داشتم، چشمِ نمی پوشیدم،،[7]

روشن الدولہ دوازدہم ربیع الاول کی مجلس بڑی شان و شوکت سے منعقد کیا کرتا تھا، پرانی دہلی سے حضرت قطب[8] الدین بختیار کاکی کی درگاہ تک کے راستہ پر اعلیٰ پیمانے پر چراغاں اور

1۔ تاریخ ہندی (قلمی) ص 467، نیز ملاحظہ ہو مآثر الامرا (فارسی) ج۔1۔ص، 320۔

2۔ تاریخ مظفری (قلمی) ج۔ اول، ص الف 198۔

3۔ برائے حالات ملاحظہ ہو۔ مآثر الامرا (فارسی) ج۔2، حصہ 2۔ ص، 463,466۔

5۔4۔ چہار گلزار شجاعی (قلمی) ص۔ 393,394، نیز عماد السعادت۔ ص 36۔

6۔ احوال محمد شاہ تا آصف الدولہ (قلمی) آصف الدولہ (قلمی) ص۔ 807، نیز مجموعہ نغز۔

7۔ ذکر میر (فارسی) ص 78۔

8۔ خواجہ شیخ معین الدین چشتی اجمیری کے مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ کا وصال 633ھ میں ہوا تھا۔ مزار مہرولی میں ہے۔ ملاحظہ ہو، سیر الاولیا ص.48۔

570 سیر الاقطاب، گلزار ابرار (ص۔39,42) سفینۃ اولیا (اردو ترجمہ) ص 131,135۔

روشنی کی جاتی تھی۔

چراغاں گشت رشک افزای انجم زمیں ہم چشم شد با چرخ ہشتم
ہوا شد از چراغاں رشکِ گلشن وزاں پروا نہارا چشم روشن
نگہ در دیدنش در ہوش گردید ہواگری مرصع پوش گردید

مختصر یہ کہ اس روشنی اور غربا کو کھانا تقسیم کرنے میں وہ دو لاکھ روپیہ سالانہ صرف کیا کرتا تھا۔[1] علاوہ ازیں روشن الدولہ اپنے پیرو مرشد شیخ بھیک کا عرس بھی اسی شان وشوکت سے کرتا تھا۔[2]

احمد شاہ بادشاہ کا مقرب اور منظورِ نظر جاوید[3] خاں یازدہم ربیع الاول کی مجلس بڑے اعلیٰ پیمانے اور تجمل کے ساتھ منعقد کرتا تھا، بڑے پیمانے پر چراغاں ہوتا تھا، یتیموں اور غربا میں پکا ہوا کھانا تقسیم کیا جاتا، بادشاہ اور امرا ضیافت میں شرکت کرتے تھے۔[4]

نواب جعفر خاں[5]، صوبہ دار بنگال، ہر سال مکہ معظمہ ومدینہ منورہ، نجب اشرف وکربلا معلا، بغداد، خراسان، جدہ وبصرہ کے جانے والے حاجیوں کے امیر کے ساتھ نذر بھیجا کرتا اور اجمیر جیسے ہندستان کے متبرک مقامات کے لیے بھی نذور اور اوقاف مقرر کرتا تھا، دو ہزار پانچ سو قاری اس کے دربار سے منسلک تھے جو ہمہ وقت قرآن خوانی میں مصروف رہتے ان لوگوں کو دونوں وقت کھانا نواب کے مطبخ سے ملتا، غرّہ سے دوازدہم ربیع الاول تک جو حضرت رسول اللہ کی وفات کا دن ہے، ہر روز اکابر، مشائخ، علما وفقرا وصلحا کی ضیافت کرتا، ان دنوں کی ہر رات کو ماہی نگر سے لعل باغ تک دریا کے کنارے اعلیٰ پیمانے پر چراغاں کرتا، کہا جاتا ہے کہ اس کام کے لیے ایک لاکھ سے زیادہ مزدور مامور ہوتے تھے۔[6]

---

1. تاریخ مظفری، جلد اول الف 198 برائے تفصیل، مرقع دہلی ص 37,39۔
2. حدیقۃ الاقالیم ص 45۔
3. برائے حالات ملاحظہ ہو، مآثر الامرا (فارسی) ج-1۔ص 362,367۔
4. احوال محمد شاہ تا آصف الدولہ (قلمی) ص الف 5۔
5. A Narrative of the Tronsaction in Bengal.- PP124-153
6. اخبار محبت (قلمی) ص 419۔

ان فضول خرچیوں کی وجہ سے امرا کی اقتصادی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔شاہ ولی اللہ نے امرا کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

''اے امیرو! دیکھو! کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، دنیا کی لذتوں میں ڈوبے جارہے ہو، اور جن لوگوں کی نگرانی تمھارے سپرد ہوئی ہے، ان کو چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں، تمھاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو، اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمھاری توجہ کسی طرف منعطف نہیں ہوتی۔،،

بادشاہوں اور امرا کی عیاشی اور عیش و عشرت کی زندگیوں سے سپاہی اور عوام متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے اور آخر کار اقتصادی تنگ دستی کا شکار ہونا پڑا، سپاہیوں کو مخاطب کر کے شاہ ولی اللہ کہتے ہیں:

''تم اعتدال کی راہ اپنے خرچ میں اختیار کرو اور محض اتنی روزی پر قناعت کرنے کے لیے آمادہ ہو جاؤ جو بآسانی تمھیں اخروی زندگی کے نتائج تک پہنچا دے...... دیکھو اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے کم رکھا کرو، پھر جو بچ جایا کرے اس سے مسافروں کی، مسکینوں کی مدد کیا کرو، اور کچھ اتفاقی مصائب اور ضرورتوں کے لیے پس انداز بھی کیا کرو۔،،

سپاہیوں میں شراب نوشی اور بھنگ خوری کی عام وبا پھیلی ہوئی تھی[1] عام پیشہ وروں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

''یہ لوگ۔ خاص طرح کے کھانے کھاتے ہیں، ان میں جن کی آمدنی کم ہوتی ہے وہ اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتے.. ..دیکھو اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے ہمیشہ کم رکھا کرو،،

عام مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں،،

''اسی طرح اور بھی بری رسمیں تم میں جاری ہیں جس نے تم پر تمھاری زندگی تنگ کر دی ہے، مثلاً تقریبات کی دعوتوں میں تم نے حد سے زیادہ تکلف برتنا شروع کر دیا ہے[2]

1۔ تاریخ محمد شاہی (قلمی) ص ب184۔

2۔ الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر۔ (بریلی) مرتبہ۔محمد منظور نعمانی ص۔140-133۔

بہر صورت بادشاہوں، امیروں، سپاہیوں اور عوام کی عیش و عشرت، فضول خرچی اور سیاسی طاقتوں کی لوٹ مار، اور ملک میں بدامنی پھیل جانے کی وجہ سے مسلمانوں کی سوسائٹی کا ہر طبقہ اور ہر پیشہ ور اقتصادی پریشانیوں کا شکار تھا۔[1]

ذیل میں مسلمانوں کے ہر طبقہ اور پیشہ والوں کی اقتصادی حالت کا مختصراً جائزہ لیا جائے گا۔

کاشت کار

اس زمانے میں ملکی محاصل کا زیادہ دارومدار کھیتی پر تھا اور ہندستانی آبادی کا 90 فیصدی حصہ زراعت سے روزی حاصل کرتا تھا۔ کاشت کاری کے لیے آبیاری کے ذرائع بہت محدود تھے۔ اور ان کا مدار زیادہ تر بارانِ قدرتی پر تھا، اگر ملک میں امن و امان قائم رہتا تو آب پاشی کے وسائل بڑھانے کا کام بھی بآسانی ہو سکتا تھا ان کے سوا یہ تھا کہ رسد کو تباہ و برباد کرنے کے لیے فوجیں جدھر سے گزرتی تھیں تیار کھیتیوں کو آگ لگا کر ضائع کر دیتی تھیں تاکہ قحط سے تنگ آکر غنیم ہتھیار ڈال دے اور کچی کھیتوں کو روند ڈالتی تھیں، مجبوراً کسانوں کا بڑا طبقہ فاقوں سے مرتا تھا یا رہزنی کا پیشہ اختیار کر لیتا تھا۔ سودا نے کاشت کاروں کی حالت کا بھی بیان کیا ہے وہ کہتا ہے:

دو بیل کی جا کر جو کہیں کیجیے کھیتی x اور مینہ بھی موافق ہی پڑے تو تو سماں ہے
ہیں خشکی و تری کے تفکر میں شب و روز x نہ امن ہے دل کے تئیں نے جی کو اماں ہے[2]

اِن کاشت کاروں کی حالت یہ تھی کہ فصل کے تیار ہونے سے قبل ہی پیشگی قرض لے کر اُس فصل کی متوقع آمدنی سے زیادہ کھا لیتے تھے، میر نے اُس کو یوں لکھا ہے:

1۔ آرام سے کٹنے کا سنا تو نے کچھ احوال x جمعیتِ خاطر کوئی صورت کہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام x عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے
سو اُس پہ تیقّن کسی کے دل کو نہیں ہے x یہ بات بھی گویندہ کا محض گماں ہے
یاں فکرِ معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر x آسودگی حرفست نہ یاں ہے نہ واں ہے
کلیات سودا (نول کشور) ص 153۔

2۔ کلیات سودا، ص 152، تاریخ محمد شاہی کے مصنف کا بیان ہے کہ غریب رعایا سے حکام ایک روپیہ کے بجائے دو اور بعض تو ایک کے بجائے پانچ روپے تک وصول کرتے ہیں ص الف 24۔

فصل ہونے ابھی نہیں پائی x پیشگی سب نے قرض لے کھائی[1]

سوداگری

سوداگروں کی حالت کا سودا نے شاعرانہ انداز میں یوں ذکر کیا ہے:۔

سوداگری کیجیے تو ہے اس میں یہ مشقت x دکھن میں بکے وہ جو خرید اصفہاں ہے
ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجیے منزل x ہر شام بدل وسوسۂ سودوزیاں ہے
لیجا جو کسی عمدہ کی سرکار میں دے جنس x یہ درد جو سنیے تو عجب طرفہ بیاں ہے
جب مول مشخص ہوا مرضی کے موافق x پھر پیسوں کا جاگیر کے عامل پہ نشاں ہے
پروانہ لکھا کر گئے عامل کے جس وقت x کہتا ہے وہ پیسا ابھی مجھ پاس کہاں ہے
اودھر سے پھر آئے تو کہا جنس ہی لے جا x دیوان بیوتات یہ کہتے ہیں گراں ہے
آخر کو جو دیکھو تو نہ پیسے ہیں نہ وہ جنس x ہر اک متصدی سے میاں اور تیاں ہے
ناچار ہو پھر جمع ہوئے قلعہ کے آگے x جو پالکی نکلے ہے تو فریاد وفغاں ہے[2]

سوداگری کا دارومدار بنجاروں پر تھا، یہ لوگ ہندستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ضروریاتِ زندگی کے تمام سازوسامان اور غلہ وجنس پہنچاتے تھے، مگر جنگ اور آشوب کے زمانہ میں راستے خطرے سے خالی نہ رہتے تھے اور رہزنی کا قدم قدم پر خطرہ تھا، اِدھر پیداوار محدود، اُدھر راستے مسدود، پھر عوام کی قوتِ خرید کمزور، خزانے خالی، سوداگری کیا ترقی کر سکتی تھی، یہی حال صناع اور پیشہ ور لوگوں کا تھا، میر کا مشہور شعر ہے:

صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی

1۔ کلیاتِ میر (نول کشور) ص588۔

2۔ کلیاتِ سودا (نول کشور) ص152 تاریخ محمد شاہی کے مصنف کا بیان ہے کہ ہر جگہ اور ہر مقام پر جاگیردار اور منصب دار سوداگروں سے محصول راہداری وصول کرتے ہیں اور سوداگروں کو سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس وجہ سے اشیا کی قیمت زیادہ ہو جاتی ہے اور مہنگائی کی وجہ سے عوام پریشان حال ہیں، ص الف 27۔ نیز ملاحظہ ہو دیوانِ حسرت (قلمی) ص (الف) 135، کلیاتِ نظیر اکبرآبادی ص 466، کلیاتِ ہدایت (قلمی) ص 19۔ تاریخ فرخ سیر بادشاہ (قلمی) ص34۔

ہے عیب بڑا اُس میں جسے کچھ ہنر آوے

دست کار اور پیشہ ور

اس فتنے اور طوائف الملکی کے زمانے میں یہ دست کار بھی بے کار بیٹھے رہتے تھے کیونکہ ان کی سرپرستی کا مدار بھی امرا کی خوش حالی پر تھا، پیشہ وروں اور اہلِ حرفہ کی بے روزگاری کا حال اس زمانے کی شاعری میں عام طور پر ملتا ہے۔ قصبات اور شہروں میں بسنے والی بڑی آبادی اس عہد میں صناع تھی۔

بابر بادشاہ نے اپنے ہندستان کے تاثرات میں اس کی تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ جب اس نے آگرے میں پڑاؤ ڈالا تھا اور تعمیرات کا کام شروع کیا تھا تو کتنے سنگ تراش، معمار اور دوسرے ہنرمند اس کے ساتھ کام کرتے تھے، خوش حالی کے زمانے میں ان پیشہ وروں کو روزگار بھی ملتا تھا اور قدردانی بھی ہوتی تھی جس سے فن کی ترقی بھی وابستہ تھی، لوگ ہنر سیکھتے اور اس میں ریاض کرتے تھے اور اپنے کمال کی داد پاتے تھے، لیکن جب سارا نظامِ حکومت ہی کمزور ہو تو صناع اس سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں، ہندستان میں مختلف پیشہ وروں اور دست کاروں کی ترقی وخوش حالی کا بہترین زمانہ شاہ جہاں کا عہد تھا، اورنگ زیب کی زندگی سپاہیانہ رہی اور اس کی عمر کا بڑا حصہ مہماتِ جنگی کے سر کرنے میں بسر ہوا۔ اس لیے مختلف صنعتوں کی سرپرستی کا اسے موقع نہ ملا، اور بعض کی ترقی میں مثلاً (مصوری، موسیقی وغیرہ) اس کے مذہبی رجحانات حارج ہوئے اورنگ زیب کے بعد باہمی آویزش اور معاشی بحران کی وجہ سے قلعۂ معلا نے ہنرمندوں کی وہ سرپرستی نہ کی جو مغل بادشاہوں کی روایت رہی ہے، پھر فتنوں کا دروازہ باز ہو گیا اور بساط ہی الٹ گئی، پھر بھی بعض امرا جو اپنے علاقوں میں کسی قدر جمیعت کے ساتھ محفوظ تھے وہ شاہانِ مغل کی روایتوں کو زندہ رکھتے تھے، آصف الدولہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ سات سو خوش نویس اور خطاط ان سے متوسل تھے جو بڑی سے بڑی کتاب کی نقل ایک دن میں تیار کر کے شاہی کتب خانے میں داخل کر دیا کرتے تھے، نواب نجیب الدولہ کے ساتھ ڈھائی سو علما رہتے تھے اور اسی نسبت سے مختلف ہنروں اور پیشوں کی قدردانی کی جاتی تھی، جعفر خان، صوبہ دار بنگال، کے ہاں دو ہزار سے زیادہ قاری ملازم تھے، بہرصورت یہ سب ترقیاں خوش حالی سے ہوتی ہیں، جب

اقتصادی حالت ناقص ہو جائے تو آرٹ کا حسن بھی غائب ہو جاتا ہے، نظیر اکبر آبادی نے اپنے عہد (اٹھارھویں صدی کے اواخر) میں پیشہ وروں کی نسبت لکھا ہے:

ماریں ہیں ہاتھ پہ ہاتھ پہ سب یاں کے دست کار
اور جتنے پیشہ ور ہیں سو روتے ہیں زار زار
لوٹے ہے من لُہار تو پیٹے ہے سُر سنار
کچھ ایک دو کے کام کا رُونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشے والوں کا ہے کاروبار بند 1

اس زمانے میں 36 پیشوں کا ذکر ہے، ضروری نہیں ہے کہ یہ تقسیم قطعی اور صحیح ہو لیکن پُرانے زمانے کے موٴرخوں نے اس کی تحدید اسی طرح کی ہے، حالانکہ اِن پیشوں کے علاوہ بھی لوگ دوسرے پیشوں سے روزی کماتے تھے، تاریخ محمد شاہی کے مصنف، کے علاوہ میر، سودا، حاتم حسرت اور نظیر اکبر آبادی نے اپنے شہر آشوبوں میں اُن کی زبوں حالی کا دل دوز نقشہ پیش کیا ہے۔ ان میں سے چند پیشہ ور یہ ہیں جن کے بارے میں تاریخ محمد شاہی کے مصنف کا بیان اختصار ایجاز کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

جوہری، چونکہ بادشاہ اور امیر ہی جواہرات کے خریدار ہوتے تھے، بقول میر، جب بادشاہ ہی خود بھیک مانگتا پھرتا ہو اور امیر روٹی کو محتاج ہوں تو پھر جوہریوں کو کون پوچھتا، چنانچہ انھوں نے اس پیشے کو چھوڑ دیا اور روزی کی تلاش میں دردر کی ٹھوکریں کھاتے پھرنے لگے، نجار، چونکہ ان کو کام نہیں ملتا، اس لیے انھوں نے اس پیشے سے ہاتھ اٹھالیا ہے اور وہ دو وقت کی روٹی کے لیے کسی اور کام میں جدوجہد کرنے لگے ہیں اور اس فکر میں ہیں کہ کوئی اِن کی مدد کرے، دوسروں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہتے ہیں، اسی طرح قصاب اور سبزی فروش بھی بے روزگاری کے شکار تھے، گوشت اور سبزی خریدنے کے لیے کسی کے پاس پیسہ ہی نہ تھا۔

معمار

جب ملک میں امن وامان اور فارغ البالی ہوتی ہے تو بادشاہ سے لے کر پرجا تک سب کے

1 کلیات نظیر اکبر آبادی۔ ص466۔

سب اپنے لیے اپنی حیثیت کے مطابق مکانات، حویلیاں، قلعے، اور مقبرے تعمیرات کرواتے تھے، یہ وہ پُر آشوب زمانہ تھا کہ آئے دن حملے ہوتے رہتے تھے، گھر تباہ و برباد کر دیے جاتے تھے۔ لوگوں کو گھروں میں رہنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ بہادر شاہ کو اپنے پانچ سالہ دور حکومت میں ایک دن بھی کسی مکان کی چھت کے نیچے رہنے کا اتفاق نہ ہوا تھا، جب بادشاہ کی یہ حالت تھی تو عوام کا کیا کہنا، لوگوں کو ایک مقام پر قیام کا موقع نہ ملتا۔ جان و مال کو محفوظ رکھنے کے لیے دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے۔ ایسی صورت میں پھر معماروں کو کون پوچھتا، یہ بیچارے روٹی کو محتاج تھے، بہر حال یہی حالت، خیاط، علاقہ بند، بخیہ بند، رنگریز، تنبولی، حلوائی، آہنگر، نداف، بقال، کلال، گل فروش، عطار، تیلی، حجام، چھاپہ گر، کوفت گر، صیقل گر، زین ساز، مینا ساز، مرصع ساز، دبل خانے کے ملازمین کی تھی۔

سپاہی پیشہ

مسلمانوں کا پیشہ سپاہ گری تھا، اس زمانے میں سپاہیوں کی حالت اس درجے خراب تھی کہ اولاً نوکری ہی نہ ملتی اور اگر مل بھی جاتی تو تنخواہ کا نام و نشان نہ تھا اور یہاں تک کہ چھتیس چھتیس مہینے تک تنخواہ ادا نہ ہوتی تھی، دانہ دانہ کو محتاج رہتے تھے، جنگی اسلحہ و آلاتِ حرب بنیے کے ہاں گروی رکھ کر اشیائے خوردنی حاصل کرتے تھے، اور اگر ادھار کچھ سامان مل جاتا تو کھانا نصیب ہوتا ورنہ ان کے لیے سال کے بارہ مہینے رمضان سے کم نہ ہوتے تھے اور جس دن کچھ کھانے کو مل جاتا تو ان کی نظر میں وہ دن عید سے کم نہ ہوتا۔ سپاہیوں میں سے جو لوگ زبردست اور بیکڑ ہوتے تھے وہ اپنے مالکوں کے سر پر سوار ہو کر کچھ حاصل کر لیتے تھے، باقی لوگ امیروں کی پالکی کے پیچھے گریہ کناں چلتے تھے [1]

---

1 یوں بھی نہ ملا کچھ تو ہر ایک پالکی آگے
کوئی سر پر کیے خاک گریباں کسی کا چاک
ہندو و مسلمان کو پھر اس پالکی اوپر
یہ مسخرگی دیکھ کے جو صاحب ارتھی

اس جج سے رسالہ کا رسالہ ہی رواں ہے
کوئی رووے ہے منہ پیٹ کوئی نعرہ زناں ہے
ارتھی کا تو ہم ہے جنازہ کا گماں ہے
کرتے ہیں جو واں عرض تو نے پھر ہے نہ ہاں ہے

کلیاتِ سودا (نول کشور) ص 150، نیز تاریخ محمد شاہی (قلمی) ص 23 ب، چہار گلزار شجاعی (قلمی) ص 73,76، دیوان حسرت (قلمی) ص۔ 134 ب۔ کلیات نظیر اکبر آبادی۔ ص 469۔

میر نے "درحالِ لشکر" کے عنوان سے ایک مرثیہ لکھا ہے اور اس میں لشکر کی زبوں حالی اور فاقہ گری کا چشم دید مرقع پیش کیا ہے:

مشکل اپنی ہوئی جو بودوباش x آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے یہاں کی دیکھی طرفہ ماش x ہے لب نان پہ سو جگہ پر خاش
نے دمِ آب ہے نہ چمچۂ آش
مرنے کے مرتبے میں ہیں احباب x جوشناسا ملا سو بے اسباب
تنگ دستی سے سب بحال خراب x جس کے ہے پال تو نہیں ہے طناب
جس کے ہے فرش تو نہیں ہے فراش
زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال x کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ کچھ مت سپاہیوں کا حال x ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش
پیچے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر x تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر
ہیں معذب غرض صغیر وکبیر x مکھیاں سی گریں ہزاروں فقیر
دیکھیں ٹکڑا اگر برابر ماش
شور مطلق نہیں کسو سر میں x زور باقی نہ اسپ و اشتر میں
بھوک کا ذکر اقل واکثر میں x خانہ جنگی سے امن لشکر میں
نہ کوئی رند ہے نہ کوئی اوباش
یک بیک گر کسوکی موت آئی x اُس کے مردے کی پھر ہے رسوائی
کیونکہ پہنچی ہے جن کو امرائی x سب وہ اولاد حاتم طائی
کون دے کر کفن اٹھائے لاش
ہو جو اُن لوگوں میں گدا کا گزر x سہم رہ جائیں سب نہ دیکھیں اُدھر
دیر کے بعد یہ کہیں مل کر x شاہ جی لے خدا سبھوں کی خبر

سو بھی یہ بات ہے پس از کنگاش[1]

فوج میں جس کو دیکھوں سو ہے اُداس　　بھوکھ سے عقل گم نہیں ہیں حواس
بیچ کھایا ہے سب نے سازوسامان　　چیتھڑوں بن نہیں کسو کے پاس
یعنی حاضر میراق مینگے سپاہ[2]

اس تنگ دستی اور افلاس نے سرکاری ملازمین کو چوری ڈکیتی کا کام کرنے پر مجبور کر دیا تھا حالانکہ ان کا کام چوروں اور ڈکیتوں سے رعایا کو نجات دلانا تھا[3]

یہی وجہ تھی کہ شاہ ولی اللہ نے بادشاہِ وقت کو ہدایت کی کہ:

''ملازموں کی تنخواہیں بغیر تاخیر کے ان کو ملنی چاہئیں، اس لیے کہ تاخیر کی صورت میں وہ لوگ سودی قرض لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور ان کا اکثر مال ضائع ہو جاتا ہے۔''[4]

امرا اور منصب دار

امرا و منصب داروں کی آمدنی کا ذریعہ ان کی جاگیریں تھیں، اس زمانے میں مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور روہیلوں نے ملک کے زیادہ تر حصے پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا، اور وہاں سے لگان وصولی کر لیتے تھے، امیروں اور منصب داروں کے ملازمین جب لگان وصول کرنے جاتے تو ان کو ایک پھوٹی کوڑی وصول نہ ہوتی، اس طرح ان کی آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے، شاہی خزانہ خالی تھا وہاں سے کچھ ملنا ممکن نہ تھا، میر نے ان کا مرثیہ یوں لکھا ہے:

عمدے جو ہیں دنوں کو بھرتے ہیں　　سو بھی اسباب گروی دھرتے ہیں
ملکی اور سارے صاحبانِ بتول　　پھرتے ہیں مجھ سے خوار وزار وملول
کہیے حضرت سے کچھ بھی ہو جو حصول　　کوڑی دنیا انھیں نہیں ہے قبول

---

1. برائے تفصیل۔ کلیات میر (مرتبہ عبدالباری آسی، نول کشور لکھنؤ 1941) ص۔ 952-954.
2. کلیات میر (مرتبہ آسی) 806۔
3. احوال الخواقین (قلمی) ص۔ 46ب۔
4. سیاسی مکتوبات۔ ص 95۔

آپ ہی مرتے ہیں اُن کے اہل وعیال [1]

سودا:

بالفرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری x یہ شکل بھی مت سمجھو تو راحت جاں ہے
تک دیکھنا منصور علی خاں جی کا احوال x چھاتی پہ کڑک بجلی ہے اور شیروہاں ہے [2]

حاتم نے ذیل کے اشعار میں امرا کی غربت وافلاس کا یوں ذکر کیا ہے:

جن کے ہاتھی تھے سواری کوسواب ننگے پاؤں — پھرتے ہیں جوتے کو محتاج پڑے سرگرداں
نعمتیں جن کو میسر تھیں ہمیشہ ہر وقت — روز پھرتے ہیں یہاں، قوت کو اپنی حیراں
جن کے پوشاک سے معمور تھے توشک خانے — سو وہ پیوند کو پھرتے ہیں ترستے عریاں
پرچۂ نان کے رکھ ہاتھ میں کھاتے ہیں امیر — جس کو دیکھوں ہوں سوں ہے فکر میں غلطاں پیچاں
خوان الوان کہاں اور کہاں وہ دسترخوان — یعنی میروچہ مرزا وچہ نواب وچہ خاں

حسرت

امیروں کے تئیں یہ سعی اور تلاش رہے x کہ کوئی پالکی، یا نہ دور باش رہے
کسی طرح سے ملے تو یہ نان ماش رہے x نہ گو قناعت ہو، ڈیوڑھی حرم کی فاش رہے
دیوان خانے میں ہو پیکدان اور رومال [3]

امرا کے مصاحبوں کی حالت

گر ہو جیے جا کر کسی عمدہ کے مصاحب x اس کی تو اذیت ہی بڑی آفتِ جاں ہے
وہ جاگے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں دوزانو x کیسا ہی اگر اپنے تئیں خواب گراں ہے
بے وقت خورش اس کی جو ہوا پنے تئیں بھوکھ x سو کیا کہوں تجھ سے مصیبت کا بیاں ہے

1. کلیات میر (مرتبہ عبدالباری آسی) ص957,958۔

2. کلیات سودا۔ (نول کشور) ص153، نیز ملاحظہ ہو، تاریخ محمد شاہی (قلمی) ص24 الف 24، ب۔

3. دیوان زادہ (قلمی) ص87، نیز ملاحظہ ہو، دیوان حسرت (قلمی) ص134 الف کلیات نظیر اکبر آبادی ص469۔کلیات ہدایت (قلمی) ص150,151 دیوان مصحفی (مرتبہ مولانا حسرت موہانی۔ص63، دیوان تاباں، ص41, 111, 216۔ دیوان حسرت، ص34 الف۔

گھڑیال کی چپ بیٹھے ہوئے گنتے ہیں گھڑیاں x اور رنج خلا رودوں میں جو اسپ دواب ہے
خمیازہ پہ خمیازہ ہے اور جرت اوپر جرت x منہ صورت سوفار مگر شکل، وہاں ہے [1]

طبیبوں کا حال

صیغے پہ طبابت کے بھلا آدمی نوکر x سو دو سو روپے کا جو کسی عمدہ کے یہاں ہے
صحبت ہے یہاں سے کہ گر آقا کے تئیں چھینک x آوے تو وہ اس کو بخشونت نگراں ہے
دیتے ہیں منگا تیر وکماں ہاتھ میں اس کے x ٹھنڈی ہوا آنے کا اس وقت گماں ہے
اور ما حضر اوپر جو وہ نواب کو دیکھے x کھانا تو یہ کھاتے ہیں، پر اس کو خفقاں ہے
مطبوخ پہ ہے خربزہ اور خربزہ پر دودھ x ہے دود پہ مچھلی، تس اوپر گاؤ زباں ہے
یہ بھی تو نہیں ہے کہ اسی سے ہو تسلی x اس سب پہ تقنن کے لیے جینی تاں ہے
اس میں جو کہیں درد اٹھا پیٹ میں ان کے x پھر بو علی سینا ہے تو وہ ہیچ مداں ہے
رکھتے ہیں غرض مرگ سے لڑنے کو سپاہی x گر نوکری سمجھو یہ طبابت کی کہاں ہے [2]

پیشۂ وکالت

گر خان وخواقین کی لے کوئی وکالت — اور اس کا تو بیاں کیا کروں تجھ سے کہ عیاں ہے
ہر عمدہ کے دروازے پہ زیں پوش پہ بیٹھا — پوچھے ہے اجی مردھے جی، نواب کہاں ہے
ہر گھر میں وہ چاہے کہ میں فوارہ سا چھوٹوں — ہر کوچہ میں جوں آب چکا بودہ رواں ہے [3]

معلموں اور مولویوں کی حالت

معلمی کا پیشہ بڑی عزت وقدر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، بادشاہ اور امیروں کی طرف سے ان کو جاگیریں ملتی تھیں اور اس کی آمدنی سے طلبا کی مدد کی جاتی تھی، اس زمانے میں جب بادشاہ کے قبضۂ اقتدار سے ملک ہی نکل گیا تو ان کی وہ آمدنی نہ رہی کہ فراغت سے مشغلۂ معلمی جاری رکھ سکیں، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ معلموں کی جاگیریں ضبط ہو گئیں، طلبا کا روزینہ بند ہو گیا اب انھیں در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑ رہی ہیں معلموں نے

1۔ کلیات سودا۔ ص 51۔

2۔ کلیات سودا ص 151 نیز ملاحظہ ہو دیوان حسرت۔ ص 21 ب تا 2 تا ب نیز ص 154 ب۔

3۔ کلیات سودا ص۔152۔

روزی کمانے کے دوسرے ذرائع اختیار کر لیے ہیں[1] سودا نے ان کی زبوں حالی کا یوں ذکر کیا ہے:

مُلّائی اگر کیجیے مُلّا کی ہے یہ قدر — ہوں دو روپے اس کے، جو کوئی مثنوی خواں ہے
اور ماحضرا خوند کا اب کیا میں بتاؤں — یک کاسۂ دالِ عدس و جو کی دوناں ہے
دن کو تو بچارا وہ پڑھایا کرے لڑکے — شب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے
تس پر یہ ستم ہے کہ، نہالی تلے اس کے — لڑکوں کی شرارت سے، سدا خار نہاں ہے
بھاگے یہ عمل کر جو شیطان کا لشکر — دیوالے کو لے ہاتھ تعاقب میں دواں ہے
اب کیجیے انصاف کہ جس کی ہو یہ اوقات — آرام جو چاہے وہ کرے وقت کہاں ہے[2]

پیشۂ خطاطی

جس روز سے کاتب کا لکھا حال میں تب سے — ہر صفحۂ کاغذ پہ قلم، اشک فشاں ہے
وہ بیت ٹکے سیکڑے، لکھنے کو ہے محتاج — خوبی میں خط اب جس کا بہ از خطِ تباں ہے
یہ بھی میں تکلف ہی سے کہتا ہوں وگرنہ — آفاق میں ان چیزوں کی اب قدر کہاں ہے
احیا ہو جو موتی کا زمانے میں نئے سر — خطّاط کی اتنی ہی رہی قدر جو یہاں ہے
ہدیہ ہو سوا پانچ ٹکے گزری میں آکر — یا قوت پکارے جو، بکاؤ قرآں ہے
دمڑی کو کتابت لکھیں دھیلے کو قبالہ — بیٹھے ہوئے واں میر علی چوک جہاں ہے[3]
جو خط کے لکھنے میں، میر علی کے تھے ثانی — قلم کوراں کریں ہیں دن رات خون افشانی
لکھیں ہیں دمڑی کو خط خط بہشت لب کی مثال[4]

---

1. مآثر الکرام (مطبع مفید عام آگرہ 1910) وظائف وسیور غالات خانوادہائے قدیم وجدید یک قلم ضبط شد وکار شرفا نجابہ پریشانی کشید واضطرار معاش مردم آنجا را از کسب علم باز داشتہ در پیشۂ سپاہ گری انداخت ورواج تدریس تحصیل بہ آں درجہ نہ ماند ومدرسی کہ از عہد قدیم معدن علم وفضل بود یک قلم خراب افتاد وانجمن ہائے ارباب کمال بیشتر برہم خوردہ، برائے تفصیل۔ ص 221,222۔

2. کلیات سودا۔ ص 152,153۔

3. کلیات سودا، 153۔ کلیات میر ص۔ 623۔ دیوان حسرت ص 135۔ الف۔

4. دیوان حسرت ص۔ 135۔ الف۔

مشائخ اور متوکلوں کا حال

اس زمانے کے زیادہ تر مشائخ اور متوکلین کو پیری مریدی کے ذریعے روزی حاصل ہوتی تھی جب عوام ہی معاشی تنگ دستی میں مبتلا تھے تو پیروں کو نذرانے کہاں سے پیش کیے جا سکتے تھے، علاوہ ازیں اس زمانے کے مشائخ دنیادار ہو چکے تھے، ان کی قدر لوگوں کی نظر سے گر چکی تھی۔

چاہے جو کوئی شیخ بنے، بہر فراغت ۔۔۔ چھٹتے شعرا ہی کے وہ مطعون زباں ہے
دیتا ہے ڈمِ خر سے کوئی، شملے کو نسبت ۔۔۔ گنبد سے کوئی پگڑی کو، تشبیہ کناں ہے
اور اس کو جو دیکھے کوئی، وہ بہر معیشت ۔۔۔ اس فکر و تردّد ہی میں ہر ایک زماں ہے
پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہر صبح کو اٹھ کر ۔۔۔ ہے آج کدھر عرس کی شب روز کہاں ہے
تحقیق ہوا عرس تو کر ڈاڑھی کو کنگھی ۔۔۔ لے خیل مریداں کو گئے وہ بزم جہاں ہے
ڈھولک جو لگی بجنے تو وہاں سب کو ہوا وجد ۔۔۔ کوئی کودے ہے کوئی رووے کوئی نعرہ زناں ہے
بے تال ہوئے شیخ جو، تک وجد میں آ کر ۔۔۔ سرگوشیوں میں پھر بداصولی کا بیاں ہے
گر تال سے پڑتا ہے قدم تو کبھی ہنس ہنس ۔۔۔ کہتے ہیں کوئی حال ہے یہ رقص زناں ہے
اور ماحصل اس رنج و مشقت کا جو پوچھو ۔۔۔ ڈالا ہوا واں دال نخود، قلیہ و ناں ہے
سب پیشہ یہ تج کر، جو کوئی ہو متوکّل ۔۔۔ جو رو تو یہ سمجھے کہ نکھٹو یہ میاں ہے[1]
آمد نہ خادموں کے تئیں مقبروں کے بیچ ۔۔۔ باھمن بھی سر پٹکتے ہیں سب مندروں کے بیچ
عاجز ہیں علم والے بھی سب مدرسوں کے بیچ ۔۔۔ حیران پیر زادے بھی اپنے گھروں کے بیچ

نذر و نیاز ہو گئی سب ایک بار بند[2]

پیشۂ منجمی

عہدِ مغلیہ میں پیشۂ منجمی کی بڑی قدر تھی، برنیر کا بیان ہے کہ مغل بادشاہ اور امیر نجومیوں پر اتنا عقیدہ رکھتے تھے کہ بغیر ان کے مشورے کے نہ تو میدان میں جاتے اور نہ جنگ شروع کرتے اور یہاں تک کہ ان سے وقت معین کرائے بنا لباس تک نہ بدلتے تھے۔ کہا جاتا ہے

---

1. کلیات سودا۔ ص 366/ دیوان زادہ۔ ص 177۔
2. کلیات نظیر اکبرآبادی۔ ص 469، نیز کلیات قاسم (قلمی) ص 39، کلیات ہدایت (قلمی) ص 15۔

کہ اورنگ زیب نے نجومیوں کو دربار سے برطرف کر دیا تھا مگر اس کے جانشینوں کے زمانے میں اس پیشے کو پھر سے فروغ حاصل ہوا۔[1] اور بادشاہ سے لے کر ایک غریب فرد تک ان کے اثر سے خالی نہ تھا۔ مختصر یہ کہ دیگر پیشہ وروں کی طرح نجومیوں کو بھی اقتصادی زبوں حالی کا شکار ہونا پڑا۔

جنھوں نے شوق سے اپنے پڑھا تھا علم نجوم — انھوں کی اختراب اس دور میں پڑے ہیں سوم
انھوں کے نوکری ملنی رَصَد پہ ہے معلوم — مگر کہ قرعہ کو لے، اپنے فن سے ہو محروم
بیاض وحرہ کو پڑھ کر بنے ہیں وہ رمّال[2]

مرثیہ خوانی کا پیشہ

اٹھارھویں صدی میں ہندستان میں شیعی فرقہ کا غلبہ بڑھ گیا تھا، اور تعزیہ داری کا عام رواج تھا، اس وجہ سے ایامِ عاشورہ میں شہدائے کربلا کے منظوم حالات مجلسوں میں پڑھے جاتے تھے۔[3] اس سبب سے مرثیہ گوئی نے ایک فن کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔

ابتدائی زمانے میں سودا نے اور آواخر میں انیس اور دبیر نے اس فن کو نقطۂ عروج پر پہنچایا اٹھارھویں صدمیں کئی مشہور مرثیہ خواں گزرے ہیں ان میں سے لطف علی خاں، مسکین، غمگین اور حزیں، میر عبداللہ، شیخ سلطان، میر ابوتراب، مرزا ابراہیم، میر درویش حسین وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، حسرت نے مرثیہ خوانوں کی زبوں حالی یوں بیان کی ہے:

جنھوں کو مرثیہ پڑھ آیا، تھے غلامِ امام — انھوں نے چھوڑ دیا اور سب جہاں کا کام
جہاں سنا کوئی شیعہ ہوا ہے، ہوگا طعام — چلے وہ کرتے تبرّا وہیں سے نام بنام
پھریں ہیں مردہ شو مولودیوں میں با اطفال[4]

---

1. ملاحظہ ہو مرقع دہلی۔

2. دیوانِ حسرت (قلمی) ص 134۔ب

3. مرزا امانی، بڑے جوش وخروش سے مرثیہ پڑھتے تھے، ایک مرتبہ مرثیہ پڑھتے ہی ان کا انتقال ہوا، برائے تفصیل، تذکرہ شعرائے اردو میر حسن) ص 51۔

4. دیوانِ حسرت (قلمی) ص الف 135۔

پیشہ مصوری

عہدِ مغلیہ میں دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح فنِ مصوری کو بڑا فروغ حاصل ہوا، سیکڑوں مصور دربار شاہی سے وابستہ تھے، اور اپنے کمال کی داد پاتے تھے، مگر اورنگ زیب کے زمانہ سے اس فن کے زوال کا آغاز ہوتا ہے۔ اورنگ زیب کے جانشینوں کو نہ تو اتنی فرصت ہی تھی اور نہ دل چسپی کہ وہ لوگ اس فن کی سرپرستی کرتے نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے اس فن کو اپنی روزی کا ذریعہ بنایا تھا، انھیں روزی ملنی مشکل ہوگئی۔

مصور ان میں جو تھے، کھینچتے ہیں حیرانی ٹکے کی کھینچ دے تصویر، گرچہ ہو مانی [1]

پیشۂ شاعری

اٹھارھویں صدی میں پیشۂ شاعری ''فنِ شریف'' سمجھا جاتا تھا، یہی سبب ہے کہ اس دور میں جتنے شاعر نظر آتے ہیں اتنے کسی اور عہد میں نہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندستانی سماج کے ہر طبقے کے لوگوں کو شعروشاعری سے دل چسپی تھی [2] خود لوگ، اپنے گھروں پر مشاعرے منعقد کرتے، اور دوسروں کی مجلسِ مشاعرے میں شرکت کرنے جاتے شاعروں کی بادشاہِ وقت اور امرا سرپرستی کرتے، روزینہ مقرر کرتے اور ہر طرح سے ان کے کلام کی قدر کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس زمانے کے شاعر ایک ہی وقت میں کئی فنون پر ملکہ رکھتے تھے، مگر شاعری ہی ان کی روزی کا ذریعہ تھی۔

---

1. دیوان حسرت (قلمی) ص الف 135۔

2. اس عجم میں جو ہے ہندسو اس میں یہی سخن کہتے ہیں فارسی کو طور پہ دہلی کے مقیم
جب سے یہ شہر کیا شاہ جہاں نے آباد وہاں کے باشندوں نے سیکھا سخنِ ہفت اقلیم
پھر تو ایسے ہی سخن سنج ہوئے وہاں کے فصیح کہ نہ دَم مار سکے بلبلِ گلزارِ نعیم
اٹھ گیا سب ولی، ناجی، مضموں کا کلام شعر صائب کے کریں ان کے سخن کی تعظیم
پہنچے شیراز میں جیسے سخن طوطیِ ہند وہاں کے بلبل کا اٹھا فخر کیے سب تکریم
یہ فلک دیکھ سکا وہاں کی نہ جمعیت کو لوٹ گئی جوں دلِ عشاق اسے فوجِ غنیم

برائے تفصیل، دیوان حسرت (قلمی) ص 5 ب تا 16 الف۔

ہر طبقے کے لوگ اپنے پیشے کے علاوہ شاعری بھی کرتے تھے۔[1] اس کا برا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے پیشہ وروں کی طرح ان شاعروں کی بھی مٹی پلید تھی، بلند پایہ شاعروں کی کوئی قدر نہ کرتا تھا، اس زمانے کے شاعروں نے اپنی زبوں حالی خود اپنے مخصوص انداز میں بیان کی ہے۔

سودا:

شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال ‏ ‏ دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یہاں ہے
مشتاقِ ملاقات انھوں کا کس و ناکس ‏ ‏ ملنا انھیں ان سے جو فلاں ابن فلاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھیں جا کے دوگانہ ‏ ‏ نیتِ قطعۂ تہنیتِ خانِ زماں ہے
تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر ‏ ‏ گر رحم میں بیگم کے سنے نطفۂ خاں ہے
اسقاطِ حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا ‏ ‏ پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہا ہے[2]

میر کی اپنی بدحالی

سیاسی حالات میں ضمناً میر کی اقتصادی زبوں حالی کا ذکر کیا جا چکا ہے، یہاں تفصیل سے ذکر کرنا غیر مناسب نہ ہوگا، میر نے خود بڑی تفصیل سے اپنی معاشی اور اقتصادی[3] بدحالی کا ذکر مخمس در شہر کاما حسب حال خود کیا ہے، ملاحظہ ہو:

کاما سے تلخ کام اٹھایا مرے تئیں ‏ ‏ دلی میں بیدلانہ پھرایا مرے تئیں
ہم چشموں کی نظر سے گرایا مرے تئیں ‏ ‏ حاصل کہ پیس سرمہ بنایا مرے تئیں
میں مشتِ خاک مجھ سے اسے اس قدر غبار

لشکر میں مجھ کو شہر سے لایا پئے تلاش ‏ ‏ یاں آ کے گزری میری عجب طور سے معاش
پانی کسو سے مانگ پیا میں کسو سے آش ‏ ‏ اس واقعہ سے آگے اجل پہنچی ہوتی کاش
ناموس رہتی فقر کی جاتا نہ اعتبار

مدت رہا تھا ساتھ جنھوں کے خراب حال ‏ ‏ دانستہ ان سبھوں نے کیا مجھ کو پائمال
آخر کو آیا مجھ میں انھوں میں نپٹ ملال ‏ ‏ یہ زندگی سہل ہوئی جان کی وبال
اس جمع میں کسو کو میں پایا نہ دستیار

---

1. شاعری کے زوال کے لیے ملاحظہ ہو، میر کی مثنوی، تنبیہ الجہال، کلیات میر (آسی) ص 819,823۔

2. کلیات سودا۔ 1/ص 365۔ 3. ملاحظہ ہو "مثنوی در ہجو خانہ خود" کلیات میر (آسی) 810,817۔

جانا نہ تھا جہاں مجھے سو باروواں گیا ضعفِ قویٰ سے دست بدیواروواں گیا
محتاج ہو کے ناں کا طلب گاروواں گیا چارہ نہ دیکھا مضطروناچارواں گیا
اس جانِ ناتواں پہ کیا صبر اختیار

در پر ہر اک دنی کے سماجت مری گئی نالایقوں سے ملتے لیاقت مری گئی
کیا مفت ہائے شانِ شرافت مری گئی ایسا پھرایا اس نے کہ طاقت مری گئی
مشہور شہراب ہوں سبک سارو بے وقار

عرصہ تھا مجھ پہ تنگ اٹھا کے نیم جاں پوچھا نہ مجھ کو یک لبِ ناں سے کنھوں نے یاں
کم پائی پر بھی سیر کیا میں نے سب جہاں آشفتہ خاطری نے پھرایا کہاں کہاں
برسوں کا راز مجھ سے ہوا آ کے آشکار

پرداخت میری ہو نہ سکی اک امیر سے عقدہ کھلا نہ دل کا دعائے فقیر سے
رخنے ہمیشہ آتے رہے سر پہ تیر سے ہر چند التجا کی صغیر وکبیر سے
لیکن ہوا نہ رفع مرے دل کا اضطرار

کن نے کی اپنے حال پہ شفقت سے یک نگاہ نکلے ہے کس سے طور پر اپنے سخن کی راہ
بولا نہ کوئی ہم سے کہ تم کیوں ہوئے تباہ اسلوب اپنے جینے کا ہو کس طرح سے آہ
ہم ایک ناتوان وضعیف اور غم ہزار

حاجت مری روا دلِ پُر درد نے نہ کی تاثیر اشکِ سرخ ورُخِ زرد نے نہ کی
تدبیر ایک دم بھی دمِ سرد نے نہ کی دل جوئی میری حیف کسی فرد نے نہ کی
طاقت رہی نہ دل میں گیا جان سے قرار

دل سر بسر خراب ہے تعمیر کیا کروں آشفتگی حال کی تعبیر کیا کروں
خونِ ناب ہائے چشم کی تقریر کیا کروں زردیِ رنگ چہرہ کی تحریر کیا کروں
آیا جو میں چمن میں خزاں ہو گئی، بہار

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ

سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ   ہے نام مجلسوں میں میر بے دماغ
از بس کہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار[1]

عام بے روزگاری آگرہ

جب کہ بادشاہ سے لے کر عوام تک اسی اقتصادی پریشانی میں مبتلا تھے اور بقول میر بادشاہِ وقت کو آٹھ آنے بھی بھاری تھے تو میر کو ایسی حالت میں وہ روزینہ کیسے مل سکتا تھا جو انھیں بادشاہ کی طرف سے ملتا تھا۔ ایسی صورت میں بہت ممکن تھا کہ میر پھر وطنِ مالوف آگرہ واپس چلے جاتے مگر آگرہ کی حالت دہلی سے بھی بدتر تھی، جاٹوں کے ہاتھوں وہ شہر بھی برباد و تباہ ہو گیا تھا۔[2] میر نے آگرہ کی بربادی کا بڑے دلدوز انداز میں ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ:

''آہ وطن! میں صبح و شام دریا کے کنارے سیر و تماشا کرنے کے لیے جاتا تھا جو بہت اچھی جگہ واقع ہے (یعنی) اس طرف باغ ہیں، اِدھر قلعہ اور امرا کی حویلیاں گویا بہشت کی نہر ہے، میری آفرینی کا شہرہ تو عالم گیر تھا، الغرض حسین سیاہ پلکوں والے، اچھی سج دھج والے، جامہ زیب اور پاکیزہ طینت، شاعر مجھے نہیں چھوڑتے تھے اور بڑی عزت کرتے تھے۔ دو تین بار سارے شہر میں گھوما، وہاں کے عالموں، فقیروں اور شاعروں سے ملا (لیکن) کوئی ایسا مخاطب نہ ملا جس سے (بات کر کے) دلِ بیتاب کو تسلی ہو، میں نے سوچا خدا کی شان، یہ وہی شہر ہے جس کی ہر گلی میں عارف، کامل، فاضل، شاعر، منشی، دانش مند، فقیہ، متکلم، حکیم، صوفی، محدث، مدرس، درویش، متوکل، شیخ، ملا، حافظ، قاری، امام، مؤذن، مدرسہ، مسجد، خانقاہ، تکیہ، مہمان سرا، مکان اور باغ تھے۔ (اور) آج مجھے ایسی جگہ نظر نہیں آتی جہاں بیٹھ کر خوش ہو جاؤں، ایسا آدمی نہیں ملتا جس سے گفتگو کر سکوں، (شہر کو) ایک وحشت ناک ویرانہ پایا (اور) نہایت صدمہ اٹھا کر لوٹ آیا (اس طرح) چار مہینے وطن مالوف میں گزارے، رخصت ہوتے وقت آنکھیں بھر آئیں،،[3]

---

1. کلیاتِ میر (آسی) ص 950,951۔

2. برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ History of the Jats (Calcutta)
1925) PP.40,50,61) 105, 143,144,269

3. میر کی آپ بیتی / 142,143۔ 1794 میں جب تھومس ٹوئنگ کا گزر آگرہ سے ہوا تو اس نے اس عظیم

بے روزگاری

اس تباہی و بربادی کی وجہ سے آگرے کا اقتصادی نظام درہم برہم ہو گیا تھا، ہر شخص چاہے وہ ملازم پیشہ ہو یا کوئی اور پیشہ کرتا ہو، معاشی تنگی اور افلاس کا شکار تھا۔ نظیر اکبر آبادی نے تمام پیشہ وروں کی حالتِ خستہ کا نقشہ ایک پُر درد مرثیہ میں پیش کیا ہے:

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی　　کوٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی　　ہر گھر میں اس طرح سے بھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند

کڑیاں جو سال کی تھیں بکیں وہ تو اگلے سال　　لاچار قرض و دام سے چھپر لیے ہیں ڈال
پھوس اور تخمیرے اس کے ہیں جوں سر کے بکھرے بال　　اس بکھرے پھوس سے ہے یہ ان چھپروں کا حال
گویا کہ ان کے بھول گئے ہیں چمار بند

دنیا میں اب قدیم سے ہے زر کا بندوبست　　مفلس جو مفلسی میں کرے گھر کا بندوبست
مکڑی کے تار کا ہے وہ نااستوار بند

کپڑا نہ گٹھری بیچ نہ تھیلی میں زر رہا　　خطرہ نہ چور کا نہ اچکے کا ڈر رہا
رہنے کو بن کواڑ کا پھوٹا کھنڈر رہا　　کھنکھار جاگنے کا نہ مطلق اثر رہا
آنے سے بھی جو ہو گئے چور وچکار بند

اب آگرے میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ　　آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
مانگو عزیزو ایسے برے وقت سے پناہ　　وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج اب ہیں آہ
کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند

پیشہ ور دستکار

صراف، بنیے، جوہری اور سیٹھ، ساہوکار　　دیتے تھے سب کو نقد سو کھاتے ہیں اب ادھار

(بقیہ صفحہ 128 کا)　الشان شہر کو، جو اکبر اور شاہ جہاں کے عہد میں اپنی آبادی دولت اور خوبصورتی کے لیے (بقیہ صفحہ 171 پر) ہندستان کے شہروں میں سب سے زیادہ مشہور تھا، تباہ و برباد پایا تھا۔

برائے تفصیل: Travel in India A Hundred Years Ago (1794) London (1893) P.190.

بازار میں اڑے ہے پڑی خاک بے شمار   بیٹھے ہیں یوں دکانوں میں اپنے دکان دار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

سوداگر اور دلال

سوداگروں کو سود نہ بیوپاری کو فلاح   بزاز کو ہے نفع نہ پنساری کو فلاح
دلالوں کو ہے بافت نہ بازاری کو فلاح   دکھیا کو فائدہ نہ پسنہاری کو فلاح
یاں تک ہوا ہے آن کے لوگوں کا کار بند

دست کار و پیشہ ور

ماریں ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دست کار   اور جتنے پیشہ ور ہیں سو روتے ہیں زار زار
کوٹے ہیں تن لہار تو پیٹے ہے سر سنار   کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشے والوں کا ہے کاروبار بند

زرگری و تارکشی کا پیشہ

زر کے بھی جتنے کام تھے وہ سب دبک گئے   اور ریشمی قوام بھی یک سر چٹک گئے
زردار اٹھ گئے تو بٹیے سرک گئے   چلنے سے کام تارکشوں کے بھی تھک گئے
کیا بال بال کھینچے جو ہو جاوے تار بند

بساطی، نان بائی، بھڑ بھونجے، دھنیے و درائی وغیرہ

بیٹھے بساطی راہ میں تنکے سے چنتے ہیں   جلتے ہیں نان بائی تو بھڑ بھونجے بھنتے ہیں
دھنیے بھی ہاتھ ملتے ہیں اور سر کو دھنتے ہیں   روتے ہیں وہ جو مشروع و درائی بنتے ہیں
اور وہ تو مر گئے جو بنیں تھے ازار بند

کاغذی

گر کاغذی کے حال کے کاغذ کو دیکھیے   مطلق اسے خبر نہیں کاغذ کے بھاؤ سے
ردی قلم دُکان میں نہ ٹکڑے ہیں ٹاٹ کے   یاں تک کہ اپنی چٹھی کے لکھنے کے واسطے
کاغذ کا مانگتا ہے ہر اک سے اُدھار بند

ملاحی

لوٹیں ہیں گردوپیش جو قزاق راہ مار بیوپاری آتے جاتے نہیں ڈر سے زینہار
کتوال روئیں خاک اڑاتے ہیں چوکیدار ملاحوں کا بھی کام نہیں چلتا میرے یار
ناویں ہیں گھاٹ گھاٹ کی سب وار پار بند

کمان گر، صحاف، میناساز، مصورونقاش

ہر دم کمانگروں کے اوپر پیچ وتاب ہیں صحاف اپنے حال میں غم کی کتاب ہیں
مرتے ہیں مینا ساز مصور کباب ہیں نقاش ان سبھوں سے زیادہ خراب ہیں
رنگ وقلم کے ہو گئے نقش ونگار بند

پھول بیچنے والے

بیچیں تھے وہ جو گوندھ کے پھولوں کے بدھی ہار مرجھا رہی ہے دل کی کلی جی ہے داغ دار
جب آدھی رات تک نہ بکے جنس آب دار لاچار پھر وہ ٹوکری اپنی زمیں پہ مار
جاتے ہیں گرد گان کو آخر وہ ہار بند

حجامی

حجام پر بھی یاں تئیں ہے مفلسی کا زور بیسا کہاں جو سان پہ ہوا ستروں کا شور
کانپے ہے سر بھگوئے ہوئے اس کی پور پور کیا بات ایک بال کٹے یا تراشے کور
یاں تک ہے اُسترے ونہرنی کی دھار بند

زہر کے اتارنے کے پیشہ ور

ڈمرو بجا کے وہ جو اتارے ہیں زہر مار آپ ہی وہ کھیلتے ہیں ہلا سر زمیں پہ مار
منتر تو جب چلے کہ جو ہو پیٹ کا ادھار جب مفلسی کا سانپ ہو ان کے گلے کا ہار
کیا خاک پھر وہ باندھیں کہیں جا کے مار بند

مختصر یہ کہ آگرے کے تمام پیشہ ور بے روزگاری کی پریشانیوں میں مبتلا تھے اور دانہ دانہ کو محتاج تھے۔

کیا چھوٹے کام والے وکیا پیشہ ور نجیب روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب

ہوتی ہے بیٹھے بیٹھے آشام عنقریب اٹھتے ہیں سب دکان سے کہہ کر کہ یا نصیب
قسمت ہماری ہو گئی بے اختیار بند[1]

ابھی تک دلی اور آگرہ کی اقتصادی زبوں حالی کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے کیوں کہ ان ہی دونوں مقامات سے میر وابستہ تھے مگر دلی اور آگرہ ہی نہیں، شمالی ہندستان کے ہر علاقے کی ایسی ہی خراب وخستہ حالت تھی۔ ان سیاسی اور اقتصادی حالات سے تنگ آ کر جب میر نے دلی چھوڑنے اور لکھنؤ جانے کا مصمم ارادہ کر کے سفر اختیار کیا تو جن مقامات سے میر کا گزر ہوا تو وہاں کی معاشی تنگی اور اقتصادی انتشار کا تفصیل سے ذکر انھوں نے ''مثنوی ننگ نامہ'' میں کیا ہے، دلی سے روانہ ہونے کے بعد میر شاہدرہ پہنچے، وہاں کے حالات میر کی زبانی ملاحظہ ہوں:

یار کا گنج تھا جو شاہ درا سب نے رہنا وہیں کا جی میں دھرا
سونہ جاگہ تھی نہ مکان مبیت چار دوکانیں ایک چھوٹی مسیت
گھر ملا صاحبوں کو ایسا تنگ جس سے بیت الخلا کو آوے ننگ
ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے سراپائی ویسے گھر چھوٹے ویسی جاپائی
رہنا بھٹیاری کے غنیمت جان جو کہا ان نے ہم گئے سب مان
کچھ پکانے کا جب سوال کیا میں نے اظہار اپنا حال کیا
سن کے اک دل سے کھینچی ان نے آہ اور بولی کہ واہ صاحب واہ
ہم تو جانا تھا آدمی ہو بڑے چار پانچ آدمی ہیں پاس کھڑے
کچھ یہ کھاویں گے کچھ کھلاویں گے ہم کچھ ان کے سبب سے پاویں گے
سو تو نکلے ہو کورے بالم تم ہو گدا جیسے شاہ عالم تم
کھانے پینے کی کچھ نہیں ہے بات دیکھیے کس طرح سے گزرے رات

1۔ کلیات نظیر اکبرآبادی۔ ص 471-465۔

میر کا سفر = شاہ درہ سے میرٹھ تک

شاہدرہ سے کوچ کر کے یہ قافلہ میرٹھ پہنچا، وہاں کی حالت ملاحظہ ہو:

ایک گڑھی بودوباش کو پائی
کچھ نہ کھانے کو جس میں نے کھائی

پھوٹی پھاٹی سے چار دیواری
اور میدان تھی گڑھی ساری

پھر نہ میدان بھی برابر تھا
ہر قدم ایک غارو پتھر تھا

کھنڈر سے اس میں تین چار مکان
جن کا گرنے پہ سخت ہے میلان

وہ گڑھی ساری کھتے ناج کے تھے
برسوں سے تھے پڑے نہ آج کے تھے

خاک مٹی سے ان گڑھوں کو بھرا
بنگلا اک لاکے اس کے بیچ دھرا

میرٹھ کی زبوں حالی وتباہی = گڑھی کی خستہ حالی

اس گڑھی کی تباہی وخستہ حالی کے ذکر کے بعد وہاں کے لوگوں کی زبوں حالی کا یوں ذکر کرتے ہیں:

ہم کو کھانے ہی کا تردد ہے
صبح بقال کا تشدد ہے

بنیا منہ کو چھپائے جاتا ہے
روٹی کا فکر کھائے جاتا ہے

حال کب پوچھنے کے ہے قابل
ہم فقیروں کے رنگ ہیں سائل

کس کو موسیں کہاں سے کچھ لاویں
دال آٹا جو تم کو پہنچا دیں

تم کہو دال ماش کی ہے زبوں
یاں ہم پہنچے ہے جگر کا خوں

تم کہو آٹا کرکرا کھایا،
یاں کلیجہ چھنا تو ہاتھ آیا

اور دو چار روز یہ بھی ہے
ایک غمِ سینہ سوز یہ بھی ہے

فصل ہونے ابھی نہیں پائی
پیشگی سب سے قرض لے کھائی

ماش کی دال کا نہ کریے گلا
گوشت یاں ہے کبھو کسو کو ملا

بکری لینے کو پیسے ہیں کس پاس
کھاؤ دال اور پادو بے وسواس

جی اگر چاہے کوئی ترکاری
گول کدو ملے بسد خواری

بھنڈی بیگن کے ناؤں ڈھینڈس تھا   اروی توری بغیر جی بس تھا
جز کدو پادے کلو مدھو کیا   یعنی کچھ اور واں تھا کدو کیا
دارو گولی کے کچھ نہ تھے اسباب   ماش کی دال کھاتے تھے احباب
آدمی کی معاش ہو کیوں کر   کتوں میں بود و باش ہو کیوں کر
بستی دیکھی سو ایسی تھی آباد   کہ بیاباں بخت سے دے یاد
چار چھپر کہیں چماروں کے   سو بھی ٹوٹے گرے بچاروں کے
پھر چلو آگے تو نہیں ہے کچھ   ڈھنڈھ سا اور جو کہیں ہے کچھ
پھوٹی پھاٹی کوئی حویلی ہے   سو بھی میدان میں اکیلی ہے
ایک دو مردے سے پڑے ہیں واں   زرد ہو ہو گئے ہیں بے لب نان
لوگ ایسے مکان سب ایسے   ایسی جاگہ سے اچٹیں دل کیسے
اور جو چار گھر نظر آئے   ان کی خوبی کھلے وہیں جائے
وہ بھی کولی چمار تھے کوئی   فاقوں کے زیر بار تھے کوئی
صورتیں کالی سوکھے سوکھے سے   سارے کنگال اور بھوکے سے
چار دانوں کے واسطے جی دیں   جان کھا جائیں کچھ نہ جب تک لیں
اس سے آگے بڑھے تو دھنور تھے   اجڑے بچڑے انھوں کے گھر تھے

بازار

اور آگے گئے تو تھا بازار   اس میں بنیوں کی تھیں دکانیں چار
ایک کے پاس دال کچھ آٹا   تس کو بھی مکھیوں نے تھا چاٹا
ایک کے ساتواں اور تھوڑے چنے   چھپڑوں میں خاک دھول ایک کنے
جو تھا باقی رہا سو تھا کنگال   ناؤں کو کہتے تھے اسے بقال
ایک کنجڑے کے چار گٹھی پیاز   تس پر اس کو ہزار فخر و ناز

کیا کہوں مرچ تھی نہ ادرک تھی — اس پچھندر میں کچھ بھی بھدرگ تھی
ایک دوکان تھی پساری کی — ان نے ہم لوگوں سے بھی یاری کی
اس سے جاکر جو مانگیے ہلدی — زرد مٹی کو باندھ دے جلدی
دیکھ کر کچھ کہو تو وہ یہ کہے — بس تم اس بستی میں میاں جی رہے
یاں جو کچھ ہے چلن سو دیتا ہوں — میں بھی پیسے لگا کے لیتا ہوں
مانگوں اس سے جو مرچ یا دھنیا — دیوے اُنچا وہی بتا دھنیا
ان میں دو دانے اور سب کنکر — دیے کاغذ میں ہاتھ لنبا کر
لونگ چورانغر سے منگوایا — لال مرچیں کٹی ہوئی لایا
اور اشیا یہیں سے کرلے قیاس — آگے جاتا نہیں کہا مجھ پاس

عام حالت

اور دس بیس گھر گنواروں کے — اور دو چار فاقہ ماروں کے
پھوٹی مسجد خطیب تھا نہ اذاں — یہی خانہ خطیب کا تھا واں
نہ تھی قید صلوٰۃ ورسم صوم — اس پہ سید امام واں کی قوم

ایک فقیر کا حال

ایک تکیہ نہ جس میں فرش کاہ — حالِ درویش قابلِ صد آہ
ٹکڑے ٹکڑے کی احتیاج اس کو — مرضِ جوع لا علاج اس کو
برسوں چلا کے نا امید ہوا — چپکی سادھی جگر میں چھید ہوا
آتے جاتے سے ان نے جو پایا — اسی پر رہ گیا وہی کھایا

چونکہ سکھوں کے حملے میرٹھ تک ہوتے رہتے تھے اور لوٹ کھسوٹ اور مارکاٹ اُن کا پیشہ تھا۔ اس سبب سے اس علاقے کی معاشی اور اقتصادی حالت بہت خراب تھی، میر کہتے ہیں ۔

بڑی آفت خطر تھا سکھوں کا — کیونکہ وہ ملک گھر تھا سکھوں کا

اس میں آجائے تو قیامت تھی　　مال وجاں غرض سب کی رخصت تھی[1]

مختصر یہ کہ شمالی ہندستان کے سماج کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو سیاسی انتشار اور اقتصادی بدحالی اور بے روزگاری کا شکار نہ ہو، بقول قاسم شاہ سے گدا تک انھی معاشی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔

کش مکش میں ہے ہر ایک شاہ وگدا　　ہے ستم عالم پہ شاہا برملا
خلق پر یہ چرخ بے مہر ووفا　　دم بدم پہنچی ہے تازہ بلا[2]

بقول نظیر اکبرآبادی

کس کس کے دکھ کو رویئے اور کس کی کہیے بات　　روزی کے اب درخت کا ملتا نہیں ہے پات
ایسی ہوا کچھ آ کے ہوئی ایک بار بند[3]

---

1 برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مثنوی زنگ نامہ، کلیات میر (آسی) ص 967-959۔

2 کلیات قاسم (قلمی) ص 40۔

3 کلیات نظیر اکبرآبادی، ص 470۔

باب سوم

عہد میر کے سماجی حالات

دہلی کی اہمیت، تہذیبی مرکزیت اور تباہی

اٹھارھویں صدی میں بھی سیاسی اور اقتصادی انحطاط کے باوجود دہلی کو وہی مرکزیت حاصل رہی جو زمانۂ سلطنت اور عہدِ مغلیہ میں اس کا طرۂ امتیاز تھی۔ ادبی اور تہذیبی اعتبار سے دہلی ہی ہندستان کا واحد مرکز تھی، جہاں کی زبان اور کلچر کو ''مستند[1]'' سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جو شاعر دہلی کی تعریف میں رطب اللسان رہے ہیں۔ یا جنھوں نے دہلی کی تباہی و بربادی کا مرثیہ لکھا ہے، اور ان شعرا میں حاتم وسودا سے داغ وحالی تک سینکڑوں شاعر آتے ہیں۔ انھوں نے دراصل ایک تہذیبی علامت کے زوال کا مرثیہ لکھا ہے، حاتم نے دہلی کی تعریف یوں کی ہے:

نہیں ہے شہر، دہلی ہے گلستاں　　چمن سے جس کا خوشتر ہے بیاباں
جدہر دیکھو تدھر ہر کوچہ وبازار　　ہوا ہے گُل رخاں سے صحن گلزار
ہراک دوکاں پہ چشمک باز عیّار　　کہ جن کہ ہرنگہ پر سوخریدار
ہر ایک جا سبزہ سروقد دلجو　　ہر یک نازک میان وعنبریں مو
گلوں کے کان میں کہتے ہیں کہ بلبل　　یہی کشمیر ہے اور یہ ہی ہے کابل

1۔ میر نے دہلی کے شعرا اور وہاں کی زبان کی یوں تعریف کی ہے:

اس فن میں کوئی بے تہ کیا مرا معارض　　اول تو میں سند ہوں پھر یہ مری زباں ہے

وہ بے شک وقت کا شاہِ جہاں ہے   جو کوئی متوطنِ ہندستاں ہے [1]

جعفر علی حسرت لکھنوی نے دہلی کی تعریف میں لکھا ہے:

وہ باغ جس میں کہ گل رو تھے سب حسیں گُل سے   اور ان کی زلفیں فزوں ترتھیں جعدہ سنبل سے
چمن کہ رشک تھے رخسار وخط وکاکل سے   دراز اس پہ ہو دست ستم تطاول سے
دریغ مٹ گیا نقشا رہا نہ وہ خدوخال
ہر ایک سنگ تجلیِ طور جس سے عیاں   ہر ایک خشتِ عمارت تھی صاف آئینہ ساں
تمام آئینہ خانہ وہ شہر اور اُس کے مکاں   ہر ایک کوچے میں نہر اور اس میں آبِ رواں
اور اُس میں عکسِ عیاں آئینہ (میں) جوں تمثال [2]

دہلی کا ماتم کرتے ہوئے سودا نے لکھا ہے:

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا   مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا   عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول [3]

خواجہ میر درد نے شہر مبارک دہلی کی تباہی و بربادی کا یوں ماتم کیا ہے:

"شہر مبارک دہلی کہ روضۂ مقدسۂ حضرت قبلۂ کونین قدسنا اللہ بنصرۃ سرّہ دراں است وخدایش تا قیامت آباد دارد، عجب گلستاں بود وحالا پامالِ خزانِ حوادثِ زمانہ گشتہ وطرفہ انہار و اشجار آبادیہای مردمان ہر جنس داشت واکنوں تاراجِ صدماتِ دہر شد بہر وجہ در تمام روئے زمین چوں روی محبوبانِ مہوش ومانند سبزۂ خط ایشاں دل کش بود۔

دہلی کہ خراب کردہ اکنوں دہرش   چون خطِ بتاں بود سوادِ شہرش
جاری شدہ اشکہا بجای نہرش   بودست ایں شہر مثل روئے خوباں [4]

---

1. دیوان زادہ (قلمی) ص 393-394
2. "مخمس در احوال دہلی" نقوش (اکتوبر 1962) ص 245۔
3. کلیاتِ سودا (نول کشور 1932 ج 1۔ ص۔ 370,371۔
4. رسالۂ نالۂ درد، ص۔ 20۔

میر نے اپنی غزلوں میں جابجا دل اور دلی کے مرثیے لکھے ہیں، یہاں دل ان کی شخصیت کی داخلی فضا کا استعارہ Symbol ہے اور دلی گویا اٹھارہویں صدی کے اس تہذیبی ماحول کی علامت ہے جس نے ہندستان کے حکمراں مسلمانوں کا ایک خاص ہندایرانی مزاج بنایا تھا، اور ایک ایسی تہذیب وضع کی تھی جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے بہت مقبول ومعروف رہی۔ میر نے دلی کے سیاسی زوال ہی کا ماتم نہیں کیا، اس کی تہذیب اس کے باشندے اس کی زباں، یہ سب انھیں عزیز تھیں۔

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں
دلی سے بھی دیار ہوتے ہیں

جہاں اب خار زاریں ہو گئی ہیں   یہیں آگے بہاریں ہو گئی ہیں
خرابی دل کی اس حد ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا   کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا
یاہر گلی میں سیکڑوں جس جا ملیح تھے   یا زلف وخط کو دیکھتے ہیں خال خال ہم
اڑتی ہے خاک شہر کی گلیوں میں اب جہاں   سونا لیا ہے گود میں بھر کر وہیں سے ہم
اب خرابا ہوا جہان آباد   ورنہ ہر قدم پہ یہاں گھر تھا

یہاں میر کے سماجی ماحول کو سمجھنے کے لیے دہلی کے رسم ورواج، میلے ٹھیلے لباس وزیورات، محلات، مدرسوں، خانقاہوں، بازاروں، ادبی مجلسوں کا ایک اجمالی بیان کیا جائے گا جس سے یہ واضح ہو جائے کہ اس معاشرے کی ترکیب کن اجزا سے ہوئی تھی جس میں میر نے آنکھ کھولی، اور جہاں ان کے ذہن نے ابتدائی اثرات قبول کیے اُن کی شخصیت کا سانچا بنا اور ان کی فکر کو خام مواد حاصل ہوا، اس ماحول کا عکس یا تلمیحات ان کے کلام میں بھی بکثرت دستیاب ہوتی ہیں، اس طرح یہ تہذیبی مطالعہ اُن کی شاعری اور شخصیت کے مرقع کا Frame کہا جا سکتا ہے۔

رسوم ورواج

ولادت۔

مختلف رسوم ورواج انسان کی سماجی زندگی کا نظام بناتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی عیسوی

کی رسمیں مذہبی یا اخلاقی نقطۂ نظر سے خواہ قابلِ اعتراض ہوں (اور یہ واقعہ ہے کہ ان کی اصل اسلامی نہیں تھی، لیکن وہ ہندستان کے مشترک تہذیب وتمدن کی نمائندگی کرتی ہیں، یہ رسوم استقرارِ حمل سے لے کر انسان کی موت کے بعد تک جاری رہتی تھیں، چنانچہ پیدائش سے پہلے ستوانسا کی رسم، نویں مہینے میں بی بی کی صحنک اور پیدائش کے وقت رت جگا، اس دور میں ہر طبقے میں ہوتا تھا، پیدائش کے تیسرے دن، پٹی کی رسم ادا ہوتی اور اس کے بعد چھٹی،[1] ساتویں دن عقیقہ[2] کی رسم ادا ہوتی تھی، اور چودھویں دن چلہ ہوتا تھا جس میں زچہ غسل کرتی تھی۔

امرا پہلی سالگرہ خصوصاً اور ہر سال گرہ عموماً بڑے دھوم دھام سے مناتے تھے۔

اس جشن کے سلسلے میں شاہ عالم بادشاہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آج بھئی اے بھلی برس گانٹھ جہاندار شاہ پیارے کی
ساتھ سکھی مل بن بن آؤ، دیہو مبارک باد اللہ نستارے کی[3]
گاوت منگل چار ہے تیہ آپس میں مل رات جگائی
باجت تال مُچنگ پکھا وج ، گایے گنی، نوچھاور پائی
لاکھوں سال ہلاس بلاس سوں، راج کرو سکھ سوں سکھ دائی
اکبر شاہ کی سال گرہ، شاہ عالم کو سب دیت بدھائی[4]

پانچ برس کی عمر میں لڑکے اور لڑکی کی تعلیم شروع کی جاتی تھی، اسے بسم اللہ خوانی کہا جاتا تھا۔

---

1 چھٹی تک غرض تھی خوشی ہی کی بات ☆ کہ دن عید اور رات تھی شب برات:

برائے تفصیل ملاحظہ ہو، قانونِ اسلام (انگریزی) ص 23,24۔ مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی ص 26۔

نادرات شاہی، ص 122, 114۔ 95

2 ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی۔ ص 8، قانونِ اسلام (انگریزی) ص۔ 30۔ PS، 11۔

3 نادرات شاہی، ص 92۔

4 نادرات شاہی 110, 105, 104۔

برس گانٹھ جس سال اس کی ہوئی ☆ دل بست گان کی گرہ کھل گئی (مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص 26۔)

آج مہندی لگاؤن کو اکبر شاہ پیار ولایو
انھیں رنگیلی مہندی بسم اللہ کی جنیا بیگم کے گھر رچایو[1]

لڑکے کے ختنہ کی رسم عام طور پر نویں برس میں ادا کی جاتی تھی اور اس موقع پر بھی ضیافتیں ہوتی تھیں ماہِ رجب کی بائیسویں تاریخ اس کے لیے متبرک سمجھی جاتی تھی[2] نواب میر جعفر خاں، صوبہ دار بنگال کے لڑکے مبارک الدولہ نے اپنے فرزند کی تقریب ختنہ میں پینتیس ہزار روپیہ صرف کیا تھا، وہ خلعتیں جو اس موقع پر تقسیم کی گئیں اس کے علاوہ تھیں[3]

شادی بیاہ

امیر گھرانوں میں منگنی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ادا کی جاتی تھی۔[4] اس رسم کو شادی کی لگن دھرنا بھی کہا جاتا تھا[5] محرم کے مہینے میں خاص طور پر اور کچھ منحوس دنوں اور مہینوں میں مسلمان شادی کی رسومات ادا کرنے میں گریز کرتے تھے۔[6] اگر منگنی کے بعد کسی وجہ سے شادی ملتوی کرنی پڑتی تو ایسی صورت میں ایک رسم ادا کی جاتی تھی جس کو دہلیز کدوانا کہتے تھے۔[7] شادی کی آخری رسموں کے ادا ہونے میں تین دن اور تین راتیں لگتی تھیں، پہلی رسم ساچق، دوم مہندی اور سوم برات کی رسم ہوتی تھی۔[8] ساچق وہ رسم کہلاتی تھی جس میں شادی کے تحائف دولہا کی طرف سے بڑی شان وشوکت سے دلہن کے گھر بھیجے جاتے تھے[9] مہندی کی رسم میں دولھا کے گھر پسی ہوئی

---

1. نادراتِ شاہی ص 105، نیز مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی، ص 31,32 سیر المتاخرین (فارسی) ج 2 ص 635، رسالۂ نو بادہ (قلمی) ص 48 ب۔

2. دیوانِ رشید (قلمی) ص 25 (الف) 25 (ب) 26 (ب) 3. سیر المتاخرین (فارسی) ج 2 ص 822۔

4. برائے تفصیل ملاحظہ ہو، کلیاتِ سودا، (نول کشور 1932) ج 2 ص 106 واقعات اظفری۔ ص ۰81۔

5. تفصیل کے لیے، کلیاتِ سودا، ج 2۔ ص 209, 208, 190, 160, 143۔ مثنوی سحر البیان (نول کشور) 1945) ص 121 تاریخ بلدۂ نجیب آباد ص 5۔

6. مثنوی سحر البیان۔ ص 197، کلیاتِ سودا، ج 2۔ 144,191۔

7. قانونِ اسلام (انگریزی) ص 95,96۔ 8. Observations etc, IP 373

9. کلیاتِ سودا، ج 2۔ 144,160۔ نیز ملاحظہ ہو مثنوی میر عبدالجلیل واسطی بلگرامی، (بقیہ صفحہ 142 پر)

مہندی بھیجی جاتی تھی[1] برات کے دن دولھا کو گرم پانی سے منڈوا کے نیچے بٹھا کر نائن غسل کراتی تھی، اور اس موقع پر اس کے بدن پر تیل ملا جاتا تھا یہ رسم ''تیل چڑھانا'' کہلاتی تھی[2] پھر دولھا کے ہاتھ میں کنگن باندھا جاتا تھا، یہ ''شادی کا ڈورا'' کہلاتا تھا[3] بری کی رسم کے مطابق دولھا کے کپڑے (یا جوڑا) دُلھن کے گھر سے آتے تھے، کپڑے پہنانے کے بعد اس کے سر سے سہرا باندھا جاتا تھا دولھا کے سر پر پگڑی اور کاندھوں پر شال ڈالی جاتی، سہرا باندھنے والوں کو نیگ کی رسم کے مطابق کچھ انعام دیا جاتا[4]

(بقیہ صفحہ 141 کا) تذکرۂ گلزار ابراہیم (قلمی رام پور) ص 155 (الف)، چہار گلزار شجاعی (قلمی) ص 405۔

1 نادرات شاہی اے ای مائی، گائے بجائے آنند سوں رجھاؤ
اکبر شاہ کی مہندی ایک جتن سوں رچاؤ
ص۔ 108,115,119,122۔

2 کلیات سودا۔ ج 2۔ ص 143,162۔

3 باندھا کنگن تیرے سکھ کرنے کو ہاتھ
کیا میں جانے تھی کہ یوں بچھڑے گا ساتھ
کلیات سودا

4 آگے یہ آنکھیں گلے کی ہار ہی رہتی تھیں روز
اب جگر میں خوں نہیں دے سہرے سے آنسو کہاں
سہرے کہاں تک پڑیں آنسوؤں کے چہرے پر
گریہ گلے ہی کا ہار دیکھیے کب تک رہے
کلیات میر ص 299,676۔

لاکے اے مالنیاں رن کی چمن سے پھلوار
گوندھ نوشہ کے لیے آج گل زخم کے ہار
تار گھتنے کا کرو سہرا کے لوہو کے دھار
گاڈ دروازے پر تم باندھ کے یہ بندھوار کلیات سودا۔ ج 2۔ ص 197۔

نیز ملاحظہ ہو، قانون اسلام (انگریزی) ص۔ 109,110 نادرات شاہی، ص، 90,102,103,110۔

امیر الامرا حسین علی خان کی شادی میں جو سہرا تیار ہوا تھا، اس کی تیاری میں پچیس ہزار روپے صرف ہوئے تھے[1]

برات کی روانگی کے ساتھ آتش بازی کثرت سے چھوڑی جاتی تھی[2] ناصر جنگ کی شادی میں ایک ماہ تک آتش بازی کے چھوڑنے کا سلسلہ جاری رہا تھا۔[3] جب برات دلہن کے دروازے پر پہونچ جاتی تھی تو ایک رسم ادا کی جاتی تھی جو دھنگانا کہلاتی تھی۔[4] اٹھارھویں صدی کے مسلمانوں کے ہاں عام طور پر اس رسم کو ادا کیا جاتا تھا، نکاح قاضی پڑھاتا تھا اور مہر حیثیت سے زیادہ (یا اسلامی طریقہ کے خلاف) ہی طرفین کی رائے سے قرار پاتا تھا[5] شاہی گھرانے کے افراد اور امیروں کے مہر بہت بڑے ہوتے تھے، محمد شاہ بادشاہ کا مہر پچاس لاکھ روپے تھا[6] فرخ سیر بادشاہ کی شادی میں قطب الملک عبداللہ خان نے پچاس لاکھ کی لاگت کے ہیرے جواہرات کا ایک کنٹھا اور امیر الامرا حسین علی خاں نے بیس ہزار روپے نقدی اور جڑاؤ کٹار، جس کی قیمت تیس ہزار روپے تھی، بادشاہ کی خدمت میں پیش کی تھی[7] توہمات پرستی کے عمل ایسے موقع پر بالخصوص اہمیت رکھتے تھے اور لازمی سمجھے جاتے تھے، میر حسن دہلوی نے لکھا ہے:

وہ جلوے کا ہونا وہ شادی کی دھوم وہ آپس میں دولھا ودلہن کی رسوم

---

1 تذکرۂ آزدہ (قلمی) ص۔170۔

2 مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص ر 123 عماد السعادت ص 22،۔

3 احوال الخواقین (قلمی) 221 ب شہزادوں اور امیروں کی براتوں کی دھوم دھام شان وشوکت اور رقص وسرود کی مجلسوں کے مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو مثنویات میر حسن دہلوی، ص 125 - 121۔

4 منوچی، ج سوم۔ ص ر 151,152۔

5 نکاح کے بعد مہمانوں کی تواضع کی جاتی تھی۔

ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان پلا سب کو شربت دیے خاصدان

صحیفۂ اقبال (قلمی) ص 31 ب مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی، 126۔

6 صحیفۂ اقبال (قلمی) 31 ب

7 تاریخ مبارک نامہ (قلمی) ص 79 ب

کسی نے پسائی سرونج آن کر — کوئی گالیاں دے گئی جان کر
گئی کوئی واں گال سے کچھ لگا — گئی کوئی دولھن کی جوتی چھوا
چنائی نبات اس کو اس گھات سے — کہ ڈھکا دیا ہر گھڑی بات سے
عجب طرح کی رنگ رلیاں ہوئیں — کہ باتیں وہ مصری کی ڈلیاں ہوئیں
وہ سب ہو چکی جبکہ رسم ورسوم — سواری کی ہونے لگی پھر تو دھوم [1]

مصحف آرسی کی رسم

دکھا مصحف اور آرسی کو نکال — دھرا بیچ میں سر پر آنچل کو ڈال [2]

اب دلہن کے گھر کا منظر ملاحظہ ہو

اِدھر کا تو یہ رنگ تھا اور یہ راگ — محل میں اُدھر گھوڑیاں [3] اور سہاگ
وہ گہری سی شادی مبارک وہ ڈھول — وہ ٹونے [4] سلونے وہ میٹھے سے بول
اُترنے کی واں سمدھنوں کی پھبن — کھلیں پھول جیسے چمن در چمن
گلوں میں پنھانا وہ ہنس ہنس کے ہار — شاباش وہ پھولوں کی چھڑیوں کی مار
دکھانا وہ بن بن کے اپنا بناؤ — وہ آپس کی رسمیں وہ آپس کے چاؤ
قہاقے [5] ہنسی شوروغل تالیاں — سہانی سہانی نئی گالیاں [6]

دولہن کا لباس وغیرہ

عروسی وہ گہنا وہ سوہا [7] لباس — وہ مہندی سوہانی وہ پھولوں کی باس
ملا سُرخ جوڑے پہ عطر وہ سہاگ — کھلے مل کے آپس میں دونوں کے بھاگ [8]

---

1. برائے تفصیل، مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص 127۔ 2. برائے تفصیل مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی، ص 126۔

3. گھوڑیاں ایک قسم کا گیت جو عورتیں شادی و بیاہ کے موقع پر گاتی ہیں۔

4. ٹونے سلونے ایک قسم کے گیت جو مراثنیں شادی میں گاتی ہیں اور وہ فحش بھی ہوتے ہیں۔

5. قہقہے۔

6. مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص 125۔

7. سوہا یعنی سرخ۔ 8. مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص 126۔

رخصتی

رخصتی کے وقت دولھا یا دلھن کا بڑا بھائی دلھن کو اپنی گود میں اٹھا کر چنڈول پر سوار کرتا اور دولھا گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہوتا، اس کی سواری کے پیچھے پیچھے وہ چنڈول ہوتا جس پر دلھن سوار کی جاتی تھی، دولھا کے گھر والے اس چنڈول پر بطور نچھاور روپے پیسے پھینکتے اور بڑی شان وشوکت سے برات واپس آتی[1] بعد ازیں شب عروسی کے بعد دولھا کے گھر ولیمہ کا کھانا ہوتا، اس ضیافت میں[2] اہلِ ثروت دل کھول کر خرچ کرتے تھے، اپنے بیٹوں کی شادی کے موقع پر مہابت جنگ نے بہت لذیذ اور قیمتی کھانے پکوائے اور اس ضیافت کا سلسلہ ایک ماہ تک چلتا رہا۔ ایک تورہ کی لاگت پچیس روپے تھی اور اسی طرح کے ہزاروں تورے تقسیم کیے گئے تھے[3] شادی کی رسموں میں آخری رسم چوتھی کی ہوتی تھی اس دن دولہن کو سسرال سے پہلی بار میکے لایا جاتا تھا[4]

مختصر یہ کہ اس دور میں اپنے جاہ وجلال کی نمائش کے لیے امرا بہت فضول خرچی کرتے تھے۔ مثلاً شجاع الدولہ کی شادی میں ساٹھ لاکھ روپے خرچ کیے گئے تھے[5] آصف الدولہ نے اپنے متبنیٰ وزیر علی خاں کی شادی میں پچاس لاکھ روپے خرچ کیے تھے[6] اس کا اثر یہ تھا کہ متوسط اور نچلے طبقے کے لوگ بھی اسراف کی وجہ سے مقروض ہو جاتے تھے۔

لباس مردانہ

بادشاہ اور امرا کے لباس

اس دور میں طبقۂ امرا اور ''اشراف'' اپنے لباس میں بہت اہتمام کرتے تھے، عام طور سے

---

1. مجموعۂ مثنویات میر حسن دہلوی ص 128,129۔
2. صوبہ دار بنگال۔
3. سیر المتاخرین (فارسی حصہ دوم ص 552 / برائے طعام ولیمہ ملاحظہ، مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی (قلمی) 40 (الف وب)
4. مجموعۂ مثنویات میر حسن دہلوی ص 128۔
5. تاریخ مظفری (قلمی) حصہ دوم / ص، 28 ب
6. واقعات اظفری (اردو ترجمہ) ص 88۔

ریشم، مخمل اور کم خواب استعمال ہوتا تھا، اکبر بادشاہ کے عہد میں شاہانہ لباسوں میں یہ نام تاریخوں میں ملتے ہیں، نکوچیہ پیشواز، دوتاہی، شاہ اجیدہ، سوزنی قلمی قبا، کدزر، فرجی، فرگل، چکن، شلوار، ان میں سے ہر ایک جامہ مختلف شکل کا ہوتا تھا، علاوہ ازیں رومال، دستار، تہمد اور دوپٹہ وغیرہ بھی لباس میں شامل تھے[1] شاہ جہاں بادشاہ کے عہد تک یہی لباس استعمال ہوتے تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے لباس بہت قیمتی اور بھڑکیلے ہوتے تھے[2] اورنگ زیب اپنے مذہبی عقائد کی وجہ سے بھڑکیلے کپڑے نہیں پہنتا تھا۔ ایک سادی پگڑی، اور کمربند (دوپٹہ) اس کا معمولی لباس تھا اور کندھے پر ایک معمولی کشمیری شال ڈال لیتا تھا[3] شاہ جہاں اور اورنگ زیب نے موزوں اور دستانوں کا استعمال بھی ترک کردیا تھا[4]

مگر اٹھارھویں صدی میں شاہانِ مغلیہ نے پھر فضول خرچی اور عیاشی سے لباس میں بہت تکلف شروع کردیا تھا۔ اس زمانے کے بادشاہوں کے لباس میں چیرہ، دستار، جامہ، کمربند، کیکھیا، اور جوتے شامل تھے[5] یہ لباس بہت رنگین اور پُرتکلف ہوتے تھے، اُن کی آستینوں پر سنہری کام ہوتا تھا[6]

محمد شاہ بادشاہ کو زنانہ لباس زیب کرنے کا بہت شوق تھا، وہ زنانی پیشواز اور جوتیاں پہنا کرتا تھا[7] شاہی خاندان کے شہزادے بھی یہی لباس پہنتے تھے۔ یعنی پیراہن، پائجامہ، پگڑی اور جامہ، مگر اٹھارھویں صدی کے نصف آخر کے بادشاہ اور شہزادے اپنے آباواجداد کی طرح بہت

---

1. ان لباسوں کی بناوٹ وضع قطع اور ان کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، آئینِ اکبری (اردو ترجمہ) ج، اول، ص169 تا 172۔
2. Society and Culture in Mughal Age.P.4
3. منوچی، ج/4، تصویر نمبر 13/ نیز برنیر، ص98۔
4. برنیر، 98۔
5. خزانۂ عامرہ، ص355 تا 357۔ نیز مثنوی میر عبدالجلیل واسطی بلگرامی۔ حدیقۃ الاقالیم، ص44، مجمع الاخبار (قلمی) ص453 (الف)
6. خزانۂ عامرہ، ص355۔
7. تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص76۔

قیمتی اور بھڑ کیلے لباس نہیں پہن سکتے تھے 1 کیوں کہ ان کی اقتصادی زبوں حالی اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی۔

امرا کا لباس

مغل امرا اپنی طرزِ معاشرت میں بادشاہوں کے نقشِ قدم پر تھے 2 ٹیوننگ، اودھ کے نواب آصف الدولہ کے بھڑ کیلے اور قیمتی لباس کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا تھا، 3 کلاہ کے ساتھ نواب سر پر پگڑی باندھے ہوئے تھا، اور کاندھے پر شال پڑی ہوئی تھی، پیر میں جڑاؤ جوتی تھی 4 قبا، پائجامہ اور جامہ بھی امرا پہنتے تھے، آنند رام مخلص نے لکھا ہے کہ جاڑے کے موسم میں امرا نیم آستین کا استعمال کرتے تھے جس کے کالر پر لومڑی کی کھال مع بالوں کے لگی ہوتی تھی 5 اہلِ ثروت سنہری کام کی جڑاؤ جوتیاں پہنتے تھے، عام جوتیوں سے ان کا وزن بہت کم ہوتا تھا، اور اس وجہ سے صرف قالینوں پر چلنے کے کام آسکتی تھیں 6 ایک امیر کا پورا لباس، جامہ، اختئی دستار، کمر بند، پر مشتمل تھا 7

عوام کا لباس

ڈیلا ویلا پیٹر و کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عوام صاف ستھرے کپڑے پہنتے تھے 8

---

1 شاہ عالم ثانی کالڑکا اور ولی عہد اکبر ثانی پانجامہ کی بجائے جانگھیہ، کمر بند کی جگہ لنگی، سر پر ایک اونی پگڑی، اور کلاہ کے مانند ایک ٹوپی اور کندھوں پر ایک شال ڈالا کرتا تھا شہزادوں کے لباس اور زیورات کے لیے ملاحظہ ہو، مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی، ص36۔

2 اس سلسلے میں برنیر کا بیان ملاحظہ ہو۔ برنیر۔ ص/ 224۔

3 Travels in India: Twining P.167

4 P.278

5 مرآۃ الاصطلاح (قلمی) ص188 (الف)

6 Travels in India: Twining= P 231

7 حدیقۃ الاقالیم۔ ص44,45۔

8 برائے تفصیل ملاحظہ ہو، ڈیلا ویلا پیٹرو، ج اول۔ ص43,44۔

لیکن اٹھارھویں صدی میں اقتصادی بدحالی کی وجہ سے ان کے لباس میں بڑی تبدیلی واقع ہوگئی تھی۔ اس زمانے کے عوام کا لباس بہت سادہ ہوتا تھا۔ ٹیونگ دہلی کے باشندوں کے لباس کا بہت اچھا نقشہ پیش کرتا ہے۔

''زیادہ تر لوگ ٹخنوں سے ذرا نیچے تک ایک لمبا سفید لباس پہنے ہوئے اور ایک سوتی کمر بند باندھے ہوئے تھے، بہت سے لوگ روئی کے کپڑے بھی پہنے ہوئے تھے، کیوں کہ سردی کا موسم آ پہنچا تھا، حالانکہ لوگوں کے لباس اور پگڑی کا رنگ عام طور سے سفید تھا، کچھ لوگ رنگ برنگ اور طرح طرح کی چھینٹ بھی لباس کے لیے استعمال کرتے تھے'' 1

نیمہ، کرتہ، قبا بھی اس دور میں عوام کا لباس تھا، یہ بدھیوں سے باندھا جاتا تھا، یہ بدھیاں ہندستان میں دائیں طرف سے باندھی جاتی تھیں جاڑوں میں مرزائی پہنی جاتی تھی 2

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے مسلمان عام طور پر نوکری کرتے اور سپاہی پیشہ ہوتے تھے اور علاوہ ازیں اٹھارھویں صدی میں نظامِ سلطنت کے درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے ہر وقت جان و مال کا خطرہ رہتا تھا، جیسا کہ سودا نے لکھا ہے:

بزم میں شب ہر ایک پیرو جواں بیٹھے ہیں کر کے رزم کا ساماں 3

ٹیونگ نے دہلی کے لوگوں کو عام طور پر ہتھیار لے کر باہر نکلتے دیکھا تھا، اور وہ لکھتا ہے کہ یہی فوجی منظر شمالی ہندستان کے دوسرے شہروں میں بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ 4 رومال کا

---

1 Travels in India. Twinning : P. 241

2 نکات الشعرا ص 6 تذکرۂ گلزار ابراہیم (ق) ص 164 (الف)، کارنامۂ عشق (قلمی) ص 11 (الف)

3 کلیاتِ سودا (نول کشور) ص، 380۔ میر نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔

بانوں پر سے اپنے میرا سر اٹھانے مت جھکو
تیغ باندھی ہے میاں تم نے کمر میں خوش غلاف

4 Travels In India. Twining: P. 242

استعمال بہت عام تھا۔[1]

مسلمان اپنے لباس کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے، آنندرام مخلص نے ایک مسلمان کا حلیہ اس طرح پیش کیا ہے:

"کپڑے ایسے تنگ اور بدن سے چپکے ہوئے کہ کمر چین سینے کے قریب تک چڑھ جاتی تھی اس پر ایک ایک بیچ کا چیرہ، کمر بند اتنا طویل کہ لپٹتے لپٹتے بغل تک پہنچتا ہے، اس میں حکیم خانی کٹارا، وہ بھی اتنا لمبا کہ اس کی نوک ٹھوڑی سے جا ملے، ہاتھ میں سادہ رنگین یا منقوش چھڑی بھی ہوتی تھی، نادر شاہ کے حملے کے بعد ایرانیوں کی تقلید میں "چوب مختصر بشکلِ چماق" (ڈنڈا) جس کا سرا چوگان کی طرح خمدار ہوتا تھا، عوام وخواص سب کے ہاتھ میں نظر آنے لگی، اس زمانے میں یہ "کھنڈی" کے نام سے مشہور تھی، اس کی تزئین میں بھی لوگ کافی نفاست برتتے اور اس پر بہت روپیہ صرف کرتے تھے، چنانچہ دولت مندوں کی 'کھنڈی' سونے چاندی سے لدی ہوتی تھی۔[2]"

میر جس لباس میں لکھنؤ پہنچے تھے، اس لباس سے دہلی والوں کا حلیہ سامنے آجاتا ہے۔ اُن کی وضع قدیمانہ، کھڑکی دار پگڑی، پچاس گز کے گھیر کا جامہ ایک پورا تھان پستولیے کا کمر سے بندھا ایک رومال پٹڑی دار تہِ کیا ہوا، اس میں آویزاں، مشروع کا جامہ، جس کی عرض کے پائینچے، ناگ پھنی کی انی دار جوتی، جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک، کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار، دوسری طرف کٹار، ہاتھ میں جریب[3]

سپاہیوں کا لباس

سپاہیوں کا لباس، انگرکھا، سفید پاجامہ اور ایک اونچی ٹوپی (کلاہ) تھا، وہ جُبہ بھی پہنتے تھے۔[4]

1۔ کلیات سودا،ص 164۔ کلیات انشا،ص 46۔

2۔ مراۃ الاصطلاح۔ سفرنامہ آنندرام مخلص۔ص 19۔

3۔ آب حیات (لکھنؤ ایڈیشن) ص 251۔

4۔ نالۂ عندلیب،ص 411۔

میر کے ذیل کے اشعار میں اسی زمانے کے مردانے لباس پر روشنی پڑتی ہے، ملاحظہ ہوں:

شال

سرد مہری کی بسکہ گلرو نے   اوڑھی ابرِ بہار نے شال

رومال

دیدۂ تر پہ شب رکھا تھا میر   لکۂ ابر ہے میرا رومال

جب رونے بیٹھتا ہوں تب کیا کسر رہے ہے
رومال دو دو دن تک جوں ابرِ تر رہے ہے
میر یہ کیا رونا ہے جس سے آنکھوں پر رومال رکھا
دامن کے ہر پاٹ کو اپنے گریہ وزاری سے دریا کیا

جامہ

کیا تجھ کو بھی جنوں تھا کہ جامے میں تیرے میر   سب کچھ بچا ہے ایک گریبان ہی نہیں
آلودہ کر نہ مستی سے جامہ کو جسم کے   ہشیار رہ یہ عاریتی ہے لباس پاس
کیا لطف تن چھپا ہے مرے تنگ پوش کا   اُگلا پڑے ہے جامے سے اس کا بدن تمام

پگڑی یا دستار

یار کے بالوں کا بندھنا قہر ہے پگڑی کے ساتھ   ایک عالم دوستاں اس پیچ میں مارا گیا
اگلے کیا پیچ تمھارے نہ تھے بس عاشق کو   بال جو اور کھرسنے لگے دستار کے پیچ
کیوں سر چڑھے ہے ناحق ہم بخت سیاہوں کے   مت پیچ میں پگڑی کے بالوں کو گھرس ظالم

قبا

سو عقدے فرطِ شوق سے پیش آئے دل کو یاں   واں بند اس قبا کے نہیں ہوتے واہنوز
گل پیرہن نہ چاک کریں کیوں کہ رشک سے   کس مرتبے میں شوخ ہے اس کی قبا کا رنگ

کلاہ

سرِ گل نے اٹھایا تھا اس باغ میں سو دیکھا   کیا ناز سے یاں کوئی کج کر کے کلہ بیٹھے

لباس زنانہ

اٹھارھویں صدی کی عورتیں سر کو دوپٹہ یا اوڑھنی سے ڈھکا کرتی تھیں [1] مگر متمول اور شاہی گھرانے کی عورتیں ٹوپی بھی پہنا کرتی تھیں [2] جسم کے درمیانی حصے کے لیے کرتی [3] چولی [4] انگیا [5] یا سینہ بند ہوتا تھا اس کے ساتھ پشواز، جو مردوں کے جامہ کی طرح ہوتا تھا، بس یہ فرق تھا کہ یہ رنگین ململ کا ہوتا تھا اور ٹخنوں کے نیچے تک پہنا جاتا تھا اس کے دونوں پلوؤں کو جگہ جگہ پر ڈوریوں سے باندھ دیا جاتا تھا [6] شرفا اور امرا کی عورتیں قبا بھی پہنتی تھیں، منوچی نے لکھا ہے کہ یہ سردیوں کا لباس تھا [7]

قبا کے سامنے کے دونوں پلوؤں کو قیمتی اور بیش بہا پتھروں کے بٹنوں سے جوڑا جاتا تھا، نیمہ، یا نیم آستین جاکٹ کی شکل کا لباس ہوتا تھا، اور جسم کے درمیانی حصے میں پہنا جاتا تھا غالباً اس کی شکل موجودہ زمانہ کے بلوز کی سی ہوگی، عورتوں کے شلواریں [8] اور پائجامے مردوں کی طرح ہوتے تھے

---

1. سترھویں صدی کی عورتوں کے لباس کے لیے ملاحظہ ہو، ویلا پیٹرو، ج 1 ص 46 ,44۔ اٹھارھویں صدی کی عورتوں کے لباس کے لیے مثنوی سحر البیان (نول کشور 1947)

ص 194 ,158 ,144 ,143 ,131 ,130 ,106 ,101 دریائے لطافت (فارسی) ص 54,55۔

2. Mandelso Albert's. Travel P. 50

3. قانونِ اسلام (انگریزی) مثنوی سحر البیان، ص 15,55۔

4. اس کی بناوٹ وضع قطع کے لیے، قانونِ اسلام ص X V

5. میر حسن دہلوی نے چولی کی تفصیل یوں بیان کی ہے۔ "در ہندستان رسم است کہ برائے پوشیدن پستان اکثر زنان دامن بگریبان می کشد" تذکرۂ شعرا اردو، ص 84، نیز مجموعۂ مثنویات میر حسن دہلوی ص 55, 56,68

6. قانونِ اسلام (انگریزی) ص xv مجموعۂ مثنویات میر حسن دہلوی، ص 154۔

7. برائے تفصیل۔ منوچی، ج 2 ص 341۔

8. مجموعۂ مثنویات میر حسن دہلوی۔

وہ پائجامے کا ایڑی تک ڈھلکنا　　مغرق کفش کا چلتے چمکنا۔ ص 156

مغرق زری کا وہ شلوار بند　　ثریا سے تابندگی میں دوچند۔ ص 68

لیکن ان کی نسبت زیادہ رنگین اور قدرے مختلف ہوتے تھے۔ منوچی کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان عورتیں بھی ساڑھی پہننے لگی تھیں [1] دریائے لطافت اور دیوانِ فائز میں بھی ایسے اشارے ملتے ہیں کہ اس زمانے میں مسلمان عورتیں بھی ساڑھی پہننے لگی تھیں [2] لہنگا خادمائیں اور نچلے طبقے کی عورتیں پہنا کرتی تھیں [3]

پردے کی بہت سخت پابندی تھی، صرف اہلِ حرفہ اور نچلے طبقے کی مستورات پردہ نہیں کرتی تھیں ورنہ مسلمانوں کے تمام طبقوں میں پردہ بہت سختی سے رائج تھا، اور اس کا اثر بعض ہندو خاندانوں نے بھی قبول کرلیا تھا، عورتیں گھروں سے باہر بہت کم نکلتی تھیں، اگر باہر نکلنا ہی ہوتا تو صاحب استطاعت برقع [4] اور کم مقدرت کی عورتیں چادر استعمال کرتی تھیں۔

پاپوش یا جوتی عورتوں کے پیروں کا لباس ہوتا تھا، ہندستان کی مسلمان عورتیں دستانے یا موزے کا استعمال نہیں کرتی تھیں، عورتوں کی جوتیاں بہت خوبصورت اور منقش ہوتی تھیں۔ جوتیوں کی تعریف میر حسن دہلوی نے یوں کی ہے:

مغرق جواہر سے ایک جفت کفش نہ وہ مفت پا بلکہ مفت کفش [5]

کبھی کبھی بادشاہِ وقت کی اجازت سے شہزادیاں سر پر پگڑیاں بھی باندھ لیا کرتی تھیں، لیکن صرف کسی جشن کے موقع پر [6] خادمائیں اور کنیزیں سر پر پگڑی اور کمر پر پٹکا باندھتی تھیں [7]

عورتیں موسموں کے لحاظ سے رنگین لباس زیب تن کرتی تھیں، بسنت کے زمانے میں زرد

---

1. منوچی، ج 2 ص 341۔
2. دریائے لطافت (فارسی) ص 138، دیوان فائز۔ ص 202۔
3. مثنوی سحر البیان (نول کشور 1947ء) ص 168، نیز ملاحظہ ہو قانونِ اسلام (انگریزی) ص xv آئین اکبری (اردو ترجمہ) ج 2/283۔
4. برائے تفصیل قانونِ اسلام ص XV I
5. مثنوی سحر البیان ص 133۔
6. منوچی، ج 2 ص 341۔
7. دیوان مصحفی (قلمی) ج 6 ص 54 ب نیز مثنوی سحر البیان۔ ص 134۔

رنگ کے کپڑے ہوتے تھے[1] چنانچہ میر نے کہا ہے:

بسنتی قبا پر تری مرگیا ہے   کفن میر کو دیجیو زعفرانی

رقاص زنانے لباس پہن کر محفلِ رقص وسرود میں اپنے کرتب دکھاتے تھے، یعنی دوپٹہ، چولی، انگرکھا، شلوار اور مغرق اور مزین جوتیاں[2]

اٹھارھویں صدی کے خوبصورت اور حسین لونڈے زنانہ لباسوں کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ سودا نے ایک لونڈے کی اپنے والد سے خواہش کا یوں ذکر کیا ہے:

موٹے جامے سے مجھ کو ذوق نہیں   چھوٹے چیرے کا دل کو شوق نہیں
پٹکا گاڑھے کا کب تلک باندھوں   موٹی شلوار تا کجا پہروں
جوتی چمڑے کی مجھ کو نہیں بھاتی   سوکھ کر پاؤں میں نہیں آتی
نیمۂ تن زیب کا بنا دو تم   کئی محمودیاں دلا دو تم
تو میں جامہ بھی اس کا بنواؤں   اونچی چولی کا تنگ سلواؤں
پٹکا بل دار تین تھان کا ہو   تب کمر پتلی میری ہو جون ہو
چیرا میں تیس گز کا باندھوں گا   سرخ ہی باندھنوں کا پہرلوں گا
ایک توڑا بھی دے تو منگوا کر   پر کنارے میں اس کے سلوا کر
اور کم خواب ہو ایک پُر زر   پھولے گلزار جس سے ٹانگوں پر
جفت پاپوش ایک ستارہ دار   سُرخ باناتِ کا منقش کار[3]

اسی زمانے میں گھاگھرا پہننے کا رواج تھا[4]

مستورات کے لباس کے سلسلے میں میر کے ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

---

1. کلیاتِ انشا، ص 46۔
2. دریائے لطافت (فارسی) ص 53,54۔
3. کلیاتِ سودا، ص 198 - 197۔
4. برائے تفصیل ملاحظہ ہو:

The Costumes and Textiles of India: P.P. 37-38

دوپٹہ

جلوۂ ماہ تہِ ابر تنک بھول گیا — ان نے سوتے میں دوپٹے سے جو منھ کو ڈھانکا

چولی

چولی جہاں سے مسکی پھر آنکھیں وہیں چپکیں — جب پیرہنِ گل بھی اس چولی سے چس جاوے

گوندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے — رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں

موتھے چلے ہیں چولی چسپی ہے مہری پھنسی ہے بند کسے — اس اوباش نے پہناوے کی ایسی نرالی نکالی طرح

تنگ چولی سو جگہ سے کسمساتے ہی چلی — تنگ ورزی سے کبھی ملتا نہیں وہ تنگ پوش

برقع

یہ چاند کے سے ٹکڑے چھپتے نہیں چھپائے — ہر چند اپنے مجھ کو برقع میں تم چھپاؤ

کاش کہ برقع رہے اس رُخ پہ میر — مُنھ کھلے اُس کے چُھپا جاتا ہے جی

سرکا ہے جب وہ برقع تب آپ سے گئے ہیں — مُنھ کھولنے سے اس کے اب جی چھپا کرے ہے

پردے کے متعلق میر کے شعر ملاحظہ ہوں:

کوئی بیگانہ گر نہیں موجود — مُنھ چھپانا یہ کیا ہے پھر ہم سے

وجہ پردے کی پوچھیے ورنہ — ملیے اس کے کسو جو محرم سے

ہم سے تکلف اُس کا چلا جائے ہے وہی — کل راہ میں ملا تھا سو منھ ڈھانپ کر چلا

عورتوں کے زیورات و جواہرات

ہندستانی عورتیں ہمیشہ سے مختلف بیش بہا سونے اور چاندی کے زیورات سے سنگار کرتی چلی آرہی ہیں۔ [1] ابولفضل نے عہدِ اکبری کے 37 زیورات کا ذکر کیا ہے [2] جہانگیر بادشاہ کے عہد میں ایک زیور "جہانگیری" کے نام سے ایجاد ہوا[3]۔ اٹھارہویں صدی میں 145 قسم کے زیورات کے نام ملتے ہیں جو

---

1. برائے تفصیل ملاحظہ ہو، برنیر، ص 224، منوچی، ج،3۔ ص 40 او وٹگنن۔ ص/ 320۔ آئینِ اکبری (اردو ترجمہ) ج 2/ ص/ 283 تا 286۔
2. برائے تفصیل، آئینِ اکبری (اردو ترجمہ) ج 2/ ص/ 282، 286۔
3. برائے تفصیل Wrrect in Jewellery, Omaments etcP. 78

عورتیں زیب وزینت کے لیے پہنتی تھیں، ان میں سے بعض یہ ہیں، ٹیکا، مانگ ٹیکا، کرن پھول، فیروزی، جھمکا، چمپاکلی، دولڑی، پنج لڑا، کان کا موتی، لونگ، بُلاق، نتھ، دولڑی، طوق، زنجیر، تعویذ، گلوبند، دھمدھکی، حمائل، چندن ہار، بازوبند، نورتن، کڑا، چھڑا، چھرنی، چوڑیاں، پچھیاں، دست بند، جوشن، گوکھرو، کنگن، توڑا، انگوٹھی، آرسی، چھلا بدمی کمر، ہیکل کمر، توڑے، کڑے، پائے زیب، لچھے، پیجن وغیرہ۔[1]

میر کے کلام میں زیورات

میر کے کلام میں ذیل کے زیورات کا ذکر ملتا ہے:

آرسی

دیکھ آرسی کو یار ہوا محو ناز کا — خانہ خراب ہو جیو آئینہ ساز کا
ابر ساروتا جو میں نکلا تو بولا طنز سے — آرسی جا دیکھ گھر بر سے ہے منہ پر نور کیا
داغ مجوبی ہوں اس کا میں کہ میرے روبرو — عکس اپنا آرسی میں دیکھ کر شرما گیا

ہار

ہار کر شب گلے پڑے اس کے — ہم بھی پھولوں کے ہار کے مانند
تیری چھاتی سے لگنا ہار کا اچھا نہیں لگتا — مبادا اس وجہ سے گل رو گلے کا ہار عاشق ہو

کان کا موتی

دیکھی تھی ترے کان کے موتی کی اک جھپک — جاتی نہیں ہے اشک کے رخسار کی ڈھلک

موتی کی لڑی

جاتے ہیں چلے متصل آنسو جو ہمارے — ہر تار نگہ آنکھوں میں موتی کی لڑی ہے

زنجیر اور توڑا

ہو کے دیوانے ہم ہوئے زنجیر — دیکھ کر اُس کے پاؤں کا توڑا

کڑے

آکڑوں کی پاؤں میں بیڑی ہوئی — ہاتھ میں سونے کی وہ زنجیر یار

1۔ ان زیورات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، فرہنگ زیورات، از سید محمد، اس کا ایک قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو کی علی گڑھ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

بلاق

دم ناک میں بقولِ زناں عاشقوں کے ہے   ہلتا بلا ہے موتی کا اس کے بلاق میں

بالیاں

حیزوں نے ریختہ کو دوں ریختہ بنایا
جوں ان دنوں میں بالے لڑکوں کی بالیاں ہیں

کان کا گوہر

گر پڑیں گے ٹوٹ کر اکثر ستارے چرخ سے   ہل گیا جو صبح کو گوہر کسی کے کان کا

بالا

لگنے ندے بس ہوتو اس کے گوہر گوش کو بالے تک   اس فلک چشم، مہ و خور کی پتلی کیا تارا جانے ہے [1]

سنگار اور آرائش

ابوالفضل کا بیان ہے کہ عورت کے سنگار سولہ ہیں۔ غسل کرنا، تیل ملنا، چوٹی گوندھنا، تالو کو زیور سے آراستہ کرنا، چندن کا لیپ کرنا، لباس پہننا، (اور یہ لباس طرح طرح کا ہوتا ہے، بعض کی آستین انگلیوں تک اور بعض کہنیوں تک ہوتی ہیں۔ قشقہ لگانا، کاجل کو سُرمہ کی طرح استعمال کرنا، بندے پہننا، ناک میں سونا اور موتی پہننا، گلے میں زیور، پھول یا موتی کا مالا پہننا، ہاتھوں میں مہندی ملنا، کمر بند، پاؤں میں سونا پہننا، پان کھانا، ناز و ادا کے حرکات [2]

ہندو عورتوں کی طرح مسلمان عورتیں بھی سنگار کی بہت شائق تھیں اکثر وہ اپنے ہاتھوں اور پیروں کو مہندی لگاتی تھیں [3]۔ آنکھوں میں کاجل یا سُرمہ اور دانتوں میں مسی لگاتی تھیں، کاجل اور مسی کا رواج مردوں میں بھی تھا، ہونٹوں کو سرخ کرنے کی خواہش کی وجہ سے عورتوں میں پان کھانے کا عام رواج تھا [4]

---

1. مندرجہ ذیل بالا زیورات کے علاوہ دیگر اقسام کے زیورات کے لیے ملاحظہ ہو،
مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی ص۔ 158 ,155 ,82 ,69 ,68 ,56 ,31 ,26 ,24۔

2. آئین اکبری (اردو ترجمہ) ج 2، ص ر 282 تا 283۔

3. برائے تفصیل، منوچی، ج 2 ر ص 340,341۔

4. اٹھارھویں صدی کے لٹریچر میں اس سلسلے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ حیزوں = ہیجڑوں۔

چہرے پر ملنے کے لیے غازہ کا استعمال کیا جاتا تھا۔[1]

بالوں کے سنوارنے کا مسلمان عورتیں بالخصوص اہتمام کرتی تھیں، بالوں کو چوٹی یا جوڑے کی شکل میں گوندھا جاتا تھا، جوڑے کے ساتھ وہ ایک سنہری پٹی باندھتی تھیں جسے موباف کہتے تھے۔[2] پھولوں کے ہار بھی گلے میں ڈالنے کا رواج تھا، عطر اور پھول سماجی حیثیت کے موافق ضرور استعمال کیے جاتے تھے، آنند رام مخلص نے لکھا ہے کہ عورتیں ایک قسم کی چیز بناتی تھیں جس سے اپنے ماتھے اور بھنویں مزیّن کرتی تھیں۔

خوشبوؤں میں ارگجا عام طور سے استعمال ہوتا تھا اور یہ ایک قسم کی مرکب خوشبو تھی، جس سے استقبال بھی کیا جاتا تھا، مخلص کا شعر ہے:

دھوم آنے کی کس کی گلزار میں پڑی ہے
ہاتھ ارگجے کا پیالہ نرگس لیے کھڑی ہے

میر نے لوازماتِ حسن اور سنگار کے حسب ذیل طریقوں کا ذکر کیا ہے:

پان

غنچہ ہی وہ دہان ہے گویا ہونٹھ پر رنگ پان ہے گویا
کیا کہیے ایک عمر میں وے لب ہلے تھے کچھ سو بات پان کھاتے ہوئے وہ چبا گیا
دیکھا نہ ہم نے چھوٹ میں یاقوت کی کبھو تھا جو سماں لبوں کے ترے رنگِ پان پر
لب سُرخ کرنگ دکھاتے نہیں طرح پان کھانے کی تھی کچھ جب اور

سُرمہ

شکوہ سیاہ چشمی کا سن ہم سے یہ کہا سُرمہ نہیں لگانے کا میں تم خفا نہ ہو
دم رُکتے ہیں سیاہیِ مژگاں ہی دیکھ سُرمہ لگا کے اور ہمیں مت خفا کرو
سُرمہ آلودہ مت رکھا کر چشم دیکھ اس وضع سے خفا ہیں ہم

1۔ کلیاتِ قاسم۔

وہاں غازہ ملنا ہے یا ہے شانہ کرنا ☆ بناوٹ کے ایسے بہانے بہت ہیں۔ ص 289۔

2۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی ص 61, 64۔

سُرمہ سے ایسی آنکھیں تمھاری نہیں لگیں   احوال پر ہمارے تمھیں کب نگاہ ہے

حنا یا مہندی

دے حنائے پا مری آنکھوں میں پھرتی ہے میر   یعنی ہر دم اس کی زیر پا ہے چشم گریہ ناک
حنا لگی تیرے ہاتھوں سے میں گیا پیسا   جگر تمام ہے خوں مجھ کو تیرے پا کی قسم
مت حنائی پانوں سے چل کر کہیں جایا کرو   دلی ہے آخر نہ ہنگامہ کہیں برپا ہو میاں
حنا سے یار کا پنجہ نہیں ہے گل کے رنگ   ہمارے ان نے کلیجوں میں ہاتھ ڈالا ہے

شانہ، آئینہ

ہر سحر آئینہ رہتا ہے ترا منھ تکتا   دل کی تقلید نہ کرتا تو نہ حیراں ہوتا

اس صورت کا ناز نہ تھا کچھ دب چلتا تھا ہم سے بھی
جب تک دیکھا ان نے نہ تھا مُنھ خوب اپنا آئینے میں

یاد ایام کہ خوبی سے خبر تجھ کو نہ تھی   سُرمہ و آئینہ کی اور نظر تجھ کو نہ تھی
فکر آرائشِ شام و سحر تجھ کو نہ تھی   زلفِ آشفتہ کی سدھ دو دو پہر تجھ کو نہ تھی
شانہ تھا نا بلدِ کوچۂ گیسو تیرا
آئینہ کاہے کو تھا حیرتیِ رو تیرا

ہمیشہ مائلِ آئینہ ہی تجھے پایا   جو دیکھیں ہم نے یہی خود نمائیاں دیکھیں

مِسّی

نہیں دیکھے مسّی ملے دنداں   برقِ ابرِ سیہ ہے تب خنداں
پان سے شوق نہ تھا کیسا مسّی کا مذکور   غصے ہو جاتے تھے ایسی کسی کا مذکور
شانہ اب ہاتھ میں ہے زلف بنا کرتی ہے   مسّی دانتوں میں کئی بار لگا کرتی ہے
پاس سرمے کی سلائی بھی رہا کرتی ہے   آنکھ رعنائی پہ اپنی ہی پڑا کرتی ہے [1]

ماکولات و مشروبات

بقول انشاء اللہ خان انشا، اٹھارھویں صدی کے امرا آدھ سیر پلاؤ کی تیاری میں بیس روپے

1 برائے تفصیل مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی 127۔

تک صرف کر دیا کرتے تھے 1 محمد شاہ بادشاہ کے باورچی خانے میں مختلف طریقوں سے گوشت تیار کیا جاتا تھا، مثلاً قلیہ سادہ، قلیہ چاشنی دار، قلیہ دو پیازہ، قلیہ ماہی، قلیہ ساموسہ، قلیہ بادام اور کباب 2 اور کباب کی دو قسمیں ۔ کباب شامی اور کباب ہندی، ہوتی تھیں 3 یہ عمدہ اور مرغن کھانے زیادہ امیروں اور متمول لوگوں میں پسندیدہ خاطر تھے، استعمال اور تیاری میں خرچ اُن کی مالی حیثیت پر منحصر تھا۔

بادشاہوں، امیروں اور عوام سب کو چاول مرغوب تھا، محمد شاہ بادشاہ کے مطبخ میں ترپن (53) طریقوں سے چاول پکایا جاتا تھا۔ 4

اسی طرح کئی قسم کی روٹیاں تیار کی جاتی تھیں، باقر خانی سخت، باقر خانی نرم نان شیر مال، نان بادام، نان بیسنی، نان واتی، نان بید حوال، نان وارمی، نان جوار، دولت مند اور متمول لوگ کھاتے تھے، ہندستانی کھانوں میں پوری، کھچڑی بہت مرغوب تھیں، شاہ جہاں بادشاہ اور اس کے جانشین ان دونوں اشیائے خوردنی کو اپنے شوق اور چاؤ سے کھاتے تھے۔

مختلف طریقے کے حلوے، حلوا کباہ، حلوا ادرک، حلوا بادام اور پستہ، حلوا تخم، حلوا شیر، حلوا نا خد، حلوا نشاستہ، فالودہ، فرنی، کھجور، گل گولا شیر، گل گولائے جوار، گل گولائے انبہ، مغل کھانوں میں داخل تھے۔

عوام کی غذا دال روٹی تھی۔ 5

میر حسن دہلوی نے اپنی مثنوی گلزار ارم میں تفصیل سے ان کھانوں کا ذکر کیا ہے، پکا ہوا کھانا

---

1 دریائے لطافت (فارسی) ص 65۔

2 ان کھانوں کی تیاری کے طریقوں کے مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو، رسالہ در تحسین اطعمہ در مطبخ محمد شاہ (قلمی) ص 6 (الف) تا 13 (ب)

3 مراۃ الاصطلاح (قلمی) ص 180 الف۔

4 برائے تفصیل ملاحظہ ہو، رسالہ در تحسین اطعمہ در مطبخ محمد شاہ بنگال کے باشندوں کے کھانے کی اشیا کے لیے ملاحظہ ہو، ریاض السلاطین (انگریزی ترجمہ) ص 21۔

5 کلیات سودا۔ ص 198، نیز Foster's Travel-1, P.230

بازاروں میں ملتا تھا۔[1] میر نے کبود جامہ کے سیرابہ پُز کا ذکر کیا ہے جوان کے والد سے ملنے کے لیے آیا تھا، وہ ان کے بیان کے مطابق کھانے ہی کی دوکان کرتا تھا۔[2]

آم ہندستان کا بہت مرغوب پھل رہا ہے۔ اس کے علاوہ خربوزے باہر سے آتے تھے، سردہ، سیب اور انگور بھی ولایت سے منگوائے جاتے تھے، باہر سے آئے ہوئے ایک خربوزہ کی قیمت ڈیڑھ روپیہ تک ہوتی تھی۔ جسے صرف دولت مند لوگ کھا سکتے تھے۔[3] دہلی کے ایک بازار کا ذکر کرتے ہوئے برنیر لکھتا ہے:

> ''وہاں کی دوکانوں میں میوہ کھلا رکھا رہتا ہے، اور اس میں بہت سی دوکانیں ہیں جو گرمی کے موسم میں ایران، بلخ، بخارا، اور سمرقند کے خشک میووں، بادام، پستہ، فندق، کشمش، بیر، اور زرد آلو اور جاڑوں میں سیاہ اور سفید نہایت عمدہ تازے انگوروں سے جو روئی کی تہ میں لگائے ہوئے ان ملکوں سے آتے ہیں، اور ناشپاتی اور تین چار قسم کے سیب اور نہایت عمدہ سردوں سے جو جاڑے بھر بکتے رہتے ہیں، بھری رہتی ہیں۔''[4] شمالی ہندستان کے تقریباً ہر شہر میں پھلوں کا الگ بازار ہوتا تھا۔[5] میر کے کلام میں ذیل کے ماکولات کا ذکر ملتا ہے:۔

کباب

بھنتے ہیں دل اک جانب سکتے ہیں جگر یک سو ہے مجلسِ مشتاقاں دکان کبابی کی

حلوا

میں جوزی کی تو دونا سر چڑھا وہ بدمعاش کھانے ہی کو دوڑتا ہے اب مجھے حلوا سمجھ

---

1. مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی، ص150۔ Foster's Travel-1, P.19
2. میر کی آپ بیتی ص76۔
3. وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر، ج2 ص263۔ مرقع دہلی۔ ص16، خلاصۃ التواریخ، ص،30۔
4. نکلے بازار میں وہ جب جُربوز ☆ سر ہی پھوڑے ہے دیکھ کر تربوز، کلیات میر۔ ص34۔
5. خلاصۃ التواریخ۔ ص ر30۔

قند

قند کا کون اس قدر مائل ہے میاں جو ہے ان ہونٹوں ہی کا قائل ہے میاں

دوپیازہ

کیا وہ دو پیازہ کھا کے ہوتازہ ایک نوالا ملا ہے دو پیازہ

پلاؤ

نہ ٹلے دیکھ کر وہ قاب پلاؤ منہ ہے منہ بیٹھا گرچہ کھاوے گاؤ

روٹی

شکل مت پوچھ کھانے کا ہے ملی منہ سے جھیپوں سے جیسے روٹی جلی

دلیہ اور گاجروں کا قلیہ

چار من گاجروں کا قلیہ تھا دہ منی دیگ بیچ دلیہ تھا

منشیات

بالعموم مغل بادشاہ شراب نوشی اور دیگر منشیات کے استعمال کے عادی تھے، اورنگ زیب کے جانشینوں میں بہادر شاہ[1] اور عالمگیر[2] ثانی کے سوا باقی سب بادشاہ شراب یا بھنگ اور افیون کھانے کے شائق تھے، یہی حال عوام کا تھا۔ بھنگ، چرس گانجہ، مدک، کوکین، چانڈو اور افیون کا اکثر رواج تھا، قہوے خانے بھی کھلے ہوئے تھے، عوام دیسی شراب پیتے تھے، اور اس کے گھروں میں بنانے کا بھی انتظام تھا[3]

اعتمادالدولہ قمرالدین خان[4]، ہر وقت شراب کے نشہ میں دھت رہتا تھا، کہا جاتا ہے ایک رات اس نے اتنی پی لی تھی کہ وہ اپنے مکان کی دوسری منزل سے گر پڑا اور اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ [5] غلام قادر روہیلہ شراب کے علاوہ بھنگ کھانے اور چرس اور گانجا پینے کا بھی عادی تھا۔

---

1. لیٹر مغلس (انگریزی) ج 1، ص 136۔
2. مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی) ج ح، ص 1۔
3. شراب بنانے کی ترکیب کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ Asiatic Researches V-/-PP 309-312
4. سوانح کے لیے ملاحظہ ہو۔ مآثر الامرا (فارسی) جلد اول حصہ اول ص۔ 358-361۔
5. تذکرۃ الشعرا، ص 97۔

پٹنہ کے صوبہ دار میر جملہ کے سپاہیوں کے متعلق شیوداس لکھنوی لکھتا ہے:

"مغلیہ چوں مایہ بسیار داشتند، ہر لحہ بہ عیش و عشرت پرداختند، در کوچہ و بازار و شارع عام از شراب مست و شیشہ و پیالہ در دست"[1]

عام مسلمان شراب نوشی کے اتنے عادی تھے کہ ان میں سے بعض تو اپنی تمام دولت اس کی نذر کر دیتے تھے اور گداگری کے شکار ہو جاتے تھے۔ جارج فاسٹر نے ایک افغان رئیس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ افغان لکھنؤ سے اپنے وطن واپس ہو رہا تھا، لکھنؤ کے دوران قیام میں اس نے اپنی تمام دولت اور منقولہ جائداد عورتوں کی صحبت اور شراب نوشی میں تباہ و برباد کر دی تھی، شراب کا بے حد دھتی تھا اور ڈھائی گھنٹے میں اس نے ڈیڑھ بوتل پی لی تھی، آخر کار جب جیب میں پھوٹی کوڑی بھی باقی نہ رہی تو اس نے اپنے گھر کے برتن تک بیچ ڈالے اور جتنے پیسے ملے تھے شام تک اس کی شراب لے کر پی ڈالی[2]

بازاروں میں کھلے عام شراب، بھنگ، چرس اور افیون بکتی تھی۔[3]

قہوہ اور قہوہ خانے

شمالی ہندستان میں قہوہ[4] پینے کا بہت چلن تھا، عوام بڑے شوق سے قہوہ پیتے تھے۔ قہوہ کی ہر دل عزیزی کے متعلق شاہ حاتم کا بیانِ ذیل بہت اہم اور دلچسپ ہے۔

جہاں دیکھو تہاں ہر آن قہوہ   ہے بزم عیش کا سامان قہوہ
قبولِ بارگاہ بادشاہاں   شکوہِ دست صاحب دست گاہاں
جہاں میں زندگی حاتم دو دم ہے   اِدھر قہوہ اُدھر حُقّہ کا دم ہے۔[5]

1۔ تاریخ فرخ سیر بادشاہ (قلمی) ص 11۔

2۔ جارج فارسٹر (انگریزی) ج 1۔ ص 104۔

3۔ تذکرۃ الملوک (قلمی) ص 134۔

4۔ قہوہ سے متعلقہ تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو، مراۃ الاصطلاح، آنند رام مخلص (ق) ص 176۔ ب

5۔ دیوان زادہ (قلمی) ص 387، نیز ملاحظہ ہو، دیوان تاباں، ص 200، وقائع آنند رام مخلص (ق) حصہ دوم ص 62 (الف)

ہندستان کے اکثر بڑے شہروں کے بازاروں میں قہوہ کی دکانیں ہوتی تھیں، جہاں صاحب ذوق لوگوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ دہلی کے مشہور بازار چاندنی چوک میں بھی قہوہ کی دو تین دکانیں تھیں۔ عوام کے علاوہ ان قہوہ خانوں میں شعرا کا بھی اژدہام ہوتا تھا، وہاں وہ لوگ بیٹھ کر اپنا تازہ کلام سناتے اور داد و تحسین حاصل کرتے 1

آنند رام مخلص نے یہ رباعی قہوہ کی تعریف میں کہی ہے۔

ہر چند شراب انبساط افزاید لیکن اقسامِ فتنہ زاں می زاید
میلم ما قہوہ زیں جہت ہست کزد بوی جگر برشتہ می آید 2

مجلسوں اور جشنوں کے موقعوں پر مہمانوں کی تواضع قہوہ سے کی جاتی تھی۔ دہلی میں سرائے عرب کے رہنے والے عرب بڑی دھوم دھام سے دوازدھم ربیع الاول کی مجلس منعقد کرتے اور قہوہ سے مہمانوں کی تواضع کرتے۔ درگاہ قلی خاں نے چشم دید منظر یوں بیان کیا ہے:

"و پیالہ ہائے کلاں قہوہ خوری گاہے شیرینی ہم داخل می کنند علی الاتصال بمردم تکلف می نمایند، چوں تہوع آور است مہمان در وقبول سخت اذیت می کشند، فقیر برفاقت خاں صاحب سر دفتر اشفاق کیشان سید حشمت خان وارد گردیدہ بود، معنی ایں شعر را دریں محل صادق یافتہ بود، بیت:

روزے بخانۂ عربی مہمان شدم چنداں خوراند قہوہ کہ من قہوہ داں شدم 3

قہوہ صرف مہمانوں کی تواضع ہی کے لیے نہیں بلکہ دور دراز مسافت کے بعد تھکن رفع کرنے کی غرض سے بھی پی جاتی تھی 4

مخلص بیان کرتا ہے:

قہوہ حمام سفراش خمار تریاک برطاؤس نظر افشر تنباکو 5

---

1 مرقع دہلی / ص 18، مراۃ الاصطلاح / ص 177 الف۔

2 مراۃ الاصطلاح / ص 177 الف۔

3 مرقع دہلی / ص 36، نیز ملاحظہ ہو دیوان زادہ (ق) ص. 378-379

4 وقائع آنند رام مخلص / ج ح ص 61 (الف)

5 مراۃ الاصطلاح (ق) ص 176 (ب) چہار چمن (آنند رام مخلص) ص 29 (ب)

سواریاں

اٹھارھویں صدی میں گھوڑے، خچر، اونٹ، ہاتھی، گدھے، پالکی، بہل، چھکڑا، رتھ، چوپالہ، اور بیل گاڑی برائے سواری کام آتے تھے، بادشاہ عام طور پر تخت رواں، ہاتھی اور گھوڑے پر سفر کرتے تھے۔[1] مستورات ڈولی، اور رتھ پر مسافت طے کرتی تھیں۔[2]

مسلم جشن، تہوار اور تقریبات

عیدالفطر

عید کے چاند کا اعلان توپ داغ کر کیا جاتا تھا۔ لوگ صبح سویرے غسل کر کے رنگا رنگ، زرد، سنہری، سفید اور سترلاطی لباسوں میں ملبوس ہو کر عیدگاہ، جو عام طور پر شہر کے باہر ہوتی تھی، نماز پڑھنے جاتے تھے۔ نماز کے بعد ایک دوسرے سے گلے مل کر اظہار خلوص و محبت کرتے۔ خود بادشاہ عیدگاہ تک[3] تجمل شاہی کے ساتھ جاتا، اور اسی شان و شوکت سے واپس آتا، پھر دربار عام منعقد

1۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہوں کلیات نظیر اکبرآبادی (حصہ دوم) ص 325,327، سیاحت نامہ برنیر، ص 370، منوچی، ج 2/ ص 363۔ تاریخ شاکر خانی (ق) 20، واقعات عالم شاہی (ق) ص 160 الف، Twinning's Travel, P.186، معیار الشعرا ص 83 الف، مخزن نکات ص 63، سیر المتاخرین (فارسی) ص 504 ,435 ,417 ,398 ,378 عمادالسعادت (ق) ص 36 ب، چہار گلزار شجاعی، ص 140 کلیات میر، ص 564 کلیات سودا ص 430 153 ,152 ,43 مآثر الامرا، ج اول۔ ص 308۔

2۔ Hodges's Travel P.5

3۔ نظیر اکبرآبادی نے عیدگاہ کا منظر ذیل کے اشعار میں پیش کیا ہے جو قابل مطالعہ ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہے دھوم آج مدرسہ و خانقاہ میں تانتے بندھے ہیں مسجدِ جامع کی راہ میں
گلشن سے کھل رہے ہیں ہر اک کج کلاہ میں سو سو چمن جھمکتے ہیں اک اک نگاہ میں
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عیدگاہ میں

جھمکا ہے ہر طرف کو جو آباد لازری پوشاک میں جھمکتے ہیں سب تن زری زری
گرد چمکتے پھرتے ہیں جوں ماہ و مشتری ہے سب کے عید عید کی دل میں خوشی بھری
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عیدگاہ میں

(بقیہ صفحہ نمبر 165 پر)

ہوتا تھا۔درباری امرا اور دیگر عہدہ دارانِ شاہی اس دن کی مبارک باد پیش کرتے اور اس موقع پر روزہ ونماز کی مقبولیت اور فضیلت کا ذکر ہوتا،نذریں پیش کی جاتیں،اور بادشاہ پر دھن وارا جاتا، شعرا تہنیت نامے لکھ کر حاضر ہوتے اور بھرے دربار میں بڑے جوش وخروش سے انھیں سنا کر

(بقیہ صفحہ نمبر 164 کا)

آتے ہیں گھر سے اپنے جو بن بن کے کج کلاہ　　صحنِ چمن ہے جتنی ہے سب صحنِ عید گاہ
چھاتی سے لپٹے جاتے ہیں ہنس ہنس کے خواہ مخواہ　　دل باغ سب کے ہوتے ہیں فرحت سے واہ واہ
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عیدگاہ میں

کچھ بھیڑ سی ہے بھیڑ کہ بے حد و بے شمار　　خلقت کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ ہیں بندھے ہر طرف ہزار
ہاتھی وگھوڑے بیل و رتھ واونٹ کی قطار　　غل شور بالے بھولے کھلونوں کی ہے پکار
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عیدگاہ میں

پہنے پھرے ہیں شوخ کڑے اور ہنسلیاں　　پھولوں کی پگڑیوں میں ہیں شاخیں اڑس لیاں
کمریں سبھوں نے ملنے کی خاطر ہیں کسلیاں،　　ملتے ہیں یوں کہ چھاتی کی کڑکے ہیں پسلیاں
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عیدگاہ میں

آتے ہیں ملتے ملتے جو عاجز پری رُخاں　　دیتے ہیں ملنے والوں کو گھبرا کے گالیاں
تس پر بھی لپٹے جاتے ہیں جوں گڑ پہ مکھیاں　　دامن کے ٹکڑے اڑتے ہیں پھٹتی ہیں چولیاں
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عیدگاہ میں

ہیں ملتے ملتے تن جو پسینوں میں تربتر　　ملنے کے ڈر سے پھرتے ہیں چُھپتے ادھر اُدھر
چھپتے پھریں ہیں لوگ بھی جاتے ہیں وہ جدھر　　ٹھٹھا ہنسی و سیر تماشے جدھر تدھر
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عیدگاہ میں

ہیں کرتے وصل شہر کے سب خورد اور کبیر　　ادنیٰ غریب امیر سے لے شاہ تا وزیر
ہر دم گلے لپٹ کے مرے یار دل پذیر　　ہنس ہنس کے مجھ سے کہتا ہے یوں کیوں میاں نظیر
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عیدگاہ میں

کلیاتِ نظیر اکبرآبادی۔ص 421،423۔

انعام واکرام حاصل کرتے، رقص وسرود کی محفل سجتی، گھروں میں عورتیں بناؤ سنگار کرتیں، آنے والوں کی تواضع سویوں سے کی جاتی تھی 1

اس دن شہر میں جگہ جگہ اور خاص طور پر عیدگاہوں میں میلے لگتے۔ شاہ جہاں پور میں اسی موقع پر جو میلہ لگتا تھا وہ میلہ چنار (چنور) کہلاتا تھا۔ 2

عیدالاضحیٰ

اس دن بادشاہ عیدگاہ کی سیڑھیوں کے نیچے اونٹ کی قربانی کرتا تھا۔ عیدالفطر کی طرح اس دن بھی لوگ سج دھج کر عیدگاہ نماز ادا کرنے کے لیے جاتے تھے۔ نماز کے بعد گلے ملتے اور واپس آکر گھروں میں قربانیاں کرتے۔ بادشاہ کا دربار ہوتا، رقص وسرود کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، نذریں پیش کی جاتیں، تہنیت نامے پڑھے جاتے اور مبارک باد دی جاتی۔ 3

عیدین کے متعلق میر کے ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

عید آئندہ تک رہے گا گلا
ہو چکی عید تو گلے نہ ملا

گلے مل عید قرباں کو سبھوں کے
ہمارا آہ! تم کاٹو گلا مت

اب عید بھی بغیر ملے اس کے ہے دیا
رہتا تھا جو ہمارے گلے ہی لگا ہمنشیں

کرتے ہیں پس از سالے دل شاہ گلے لگ کر
سو تیر وہ ملنا بھی اب ترک ہے عیدوں کا

گئے روزے اب دید و دید ہے
گلے سے ہمارے ملو عید ہے

محرم

مسلمانوں کا سال نو محرم کی پہلی تاریخ سے شروع ہوتا ہے، لہٰذا یہ خوشی کا موقع ہونا چاہیے تھا۔ مگر واقعۂ کربلا نے اس ماہ کو عام طور پر مسلمانوں کے لیے اور بالخصوص شیعہ حضرات کے لیے غم

---

1 برائے تفصیل ملاحظہ ہو، نادرات شاہی ص 76, 77, 80, 81,84, 85۔
کلیات نظیر اکبرآبادی، ص 418, 421 دیوان مصحفی (قلمی) حصہ ششم، ص 64 ب۔

2 اخبار محبت (قلمی) ص 528۔

3 برائے تفصیل ملاحظہ ہو، نادرات شاہی۔ ص 77,79,82,88 وغیرہ منوچی 2/ص 349,350۔
اسلامی تہوار۔ ص 78، دیوان مصحفی (ق) ج 6/ص 15 ب، کلیات سودا، 2/ص 4,7,8,19۔

واندوہ کے مہینہ میں مبدل کر دیا۔ بقول ڈونالڈسن ''شیعوں کے تمام رسوم ورواج میں محرم اپنی نمایاں اہمیت رکھتا ہے''۔1

باوجودیکہ مغل بادشاہ سنی عقاید کے پیروکار تھے مگر انھوں نے اس رسم کی ادائیگی پر کسی قسم کی پابندی کبھی عائد نہیں کی2 اپنے سخت مذہبی رجحانات کے تحت اورنگ زیب نے حالاں کہ اپنے تمام ممالک محروسہ میں محرم کے سوگ پر پابندی لگادی تھی3 مگر اس کی وفات کے بعد شمالی ہندستان میں عام طور پر اور دربار مغلیہ میں خاص طور پر اہلِ تشیع کا اقتدار بڑھ جانے کی وجہ سے ہر سال محرم کا جشن بڑے جوش وخروش سے منایا جاتا تھا4

1947 تک اسی دھوم دھام سے ہندستان میں محرم کا سوگ منایا جاتا تھا مگر اب اس میں پہلے سی بات باقی نہیں رہی۔ چوں کہ حالات سازگار نہیں رہے۔ لکھنؤ کی معاشرت کے ضمن میں تعزیہ داری کا تفصیلی ذکر آئے گا۔

محرم اور اس سے متعلقہ رسموں سے شیعہ حضرات کی والہانہ عقیدت مندی اور وابستگی کا بخوبی اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے جو حضرات مرزا مظہر جان جاناں شہید کے ساتھ پیش آیا۔

ساتویں محرم کو شدّے نکالے جاتے تھے، خاص وعام ان کا احترام کرتے تھے، اور چونکہ مرزا مظہر نے اس احترام کا خیال نہ کیا، لہٰذا ان کو شہید کر دیا گیا۔5

مجالسِ مرثیہ خوانی

ماہِ محرم کے پہلے دس دنوں میں امام باڑوں میں مجلسیں منعقد ہوتی تھیں اور مرثیے پڑھے جاتے تھے جن میں شہدائے کربلا کا ذکر و مذکور ہوتا تھا۔ دہلی میں کئی ایسے امام باڑوں کا ذکر ملتا ہے۔

---

1 Donaldson: The Shiite Religion: P277

2 اسلامی تہوار ص40۔

3 خافی خان 2/ص214۔

4 مجمع الاخبار ص476 ب۔ ہدایت المومنین (ق) ص20۔

5 برائے تفصیل، گلشنِ ہند (لاہور) ص160, 159۔ نیز ملاحظہ ہوں، مقامات مظہری۔ ص/61۔ معمولات مظہری ص140، نتائج الافکار ص675، عقد ثریا ص56۔ سفینہ ہندی، 188۔

اکبر شاہ ثانی نے شاہِ مرداں کے مزار کے قریب دہلی میں ایک امام باڑہ تعمیر کروایا تھا، جہاں ہر سال ماہِ محرم میں مسلمان جمع ہوتے اور مرثیہ خوانی کرتے تھے[1] اس زمانے میں بھی شیعہ حضرات وہاں مجلسیں منعقد کرتے ہیں، ان امام باڑوں کے علاوہ دہلی کے بازاروں میں بھی کچھ مخصوص مقام تھے جہاں مقرر لوگ منبروں پر کھڑے ہوکر مناقب شہدائے کربلا بیان کرتے تھے۔ درگاہ قلی خاں ان الفاظ میں چوک سعداللہ خاں کی مجلسوں کا منظر پیش کرتا ہے۔

''راویانِ معتبر مثل اربابِ عمائم چندیں جا کرسی ہائے چوبین از قبیل منابر نصب کردہ مناسب ہر ماہ و ہر روز مثلاً در ماہِ رمضان المبارک فضائل سوم و در ذی الحجہ الحرام مناسِک حج و عمرہ و در ماہِ محرم مقدمات روضۃ الشہدا باداۓ فصیح کردہ ذہن نشین عوام می کنند و ایں جماعت را بہ رقت می آرند و مبلغ معتد بہ بایں تقریب تحصیل می نمایند[2]

اٹھارھویں صدی میں مرثیہ خوانی کا اتنا رواج ہوگیا تھا کہ اس نے ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس زمانے میں سرزمینِ دہلی میں کئی مشہور و نامور مرثیہ خواں پیدا ہوئے اور انھوں نے فنِ مرثیہ خوانی کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا، مثلاً مسکین، غمگین، حزیں، میر عبداللہ، شیخ سلطانی، ابوتراب، مرزا ابراہیم، مرزا درویش، حسین خاں، جانی حجام اور محمد نعیم وغیرہ[3]

سنی مسلمان بھی مرثیہ خوانی کی مجلسیں کرتے تھے، خواجہ میر درد کے ہاں بھی مجلس ہوتی تھی[4]

اس زمانے میں اردو شاعری کے دیگر اصنافِ سخن کے علاوہ جن کا ذکر بعد میں کیا جائے گا، مرثیہ نویسی کی صنف درجۂ کمال پر پہنچ گئی تھی۔ حالانکہ میر نے بھی مرثیے لکھے مگر سودا نے اس صنف کو جامعیت کے درجے تک پہنچا دیا۔

1۔ مفتاح التواریخ ص276۔

2۔ مرقع دہلی ص15۔

3۔ مرقع دہلی ص51،54۔ دیگر مرثیہ خوانوں کے لیے اس عہد کے تذکرے دیکھیے۔

4۔ تذکرہ طبقات الشعرا ہند ص81۔

بقول اظفری، حسن نامی ایک شخص ایران سے ہندستان وارد ہوا تھا، وہ مجلس[1] سے مرثیے پڑھا کرتا تھا، میر امانی کے بارے میں تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ وہ اتنے جوش وخروش اور رقت آمیز لہجے میں مرثیے پڑھا کرتے تھے، کہ مرثیے پڑھتے پڑھتے ہی منبر پران کی روح پرواز کر گئی[2]۔

تعزیوں کے سامنے شربت، ریوڑی، الا ئچی دانہ اور ملیدہ رکھ کر فاتحہ ہوتی تھی۔ شہادت کی شب کو کونڈوں میں حلوا بھر کر علموں کے سامنے رکھتے تھے، اور دوسری صبح کو غربا ومساکین میں وہ تقسیم کیا جاتا تھا۔ عشرۂ محرم میں پکا ہوا کھانا مسکینوں اور غریبوں میں تقسیم ہوتا تھا[3]۔ ان رسومات کی ادائیگی میں سُنی مسلمان اپنے شیعہ بھائیوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہ رہتے تھے۔ حافظ رحمت خاں عشرۂ محرم کا بہت احترام کرتا تھا[4]۔

چونکہ اٹھارھویں صدی اخلاقی اور مذہبی دونوں نقطۂ نظر سے انحطاطی دور تھا اس لیے اس تہوار کے زمانے میں بھی اخلاقی بدعنوانیاں ہونے لگیں۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ بڑی آزادی سے عورتیں امام باڑوں میں جاتی تھیں اور رسومات کی ادائیگی میں مردوں کے ساتھ شریک ہوتی تھیں۔ مولوی سید حسن قنوجی کا بیان ملاحظہ ہو۔

''تعزیہ کے سبب سے بڑے بڑے گناہ ہونے لگے۔ اور شیطان کا بازار گرم ہوا بڑا گناہ زنا ہے جس کا یہ حال ہے کی جتنے حرام کار سال بھر میں اپنی مرادیں پاتے ہیں اس قدر تعزیہ کی بدولت میں رات میں کماتے ہیں۔ وہی بی بیاں تعزیہ کے دنوں میں دس راتوں بھر ہزاروں آدمیوں کے روبرو جہاں ہر طرف سے روشنی ہو رہی ہے اور جہاں سب لوگ اچھے برے موجود تمھاری بہویں بیٹیاں سینہ سے سینہ رگڑتی اور کندھے سے کندھے پکڑتی کھلے

---

1. یہ کتاب اس زمانے میں لکھی گئی تھی، اور زمانہ تصنیف 1146ھ ہے اس کا ایک قلمی نسخہ ٹیوبن گن جرمنی میں ہے اسپرنگر نے کتب خانہ شاہانِ اودھ کی فہرست میں اس کا ذکر کیا ہے۔

2. تذکرۂ شعرائے اردو۔ ص 51۔

3. رسالہ تعزیہ داری (ق) ص 22، 1 نیز چہار گلزار شجاعی ص 525، واقعات شاہ عالم ص 24، کاشف الاستار ص 368

4. حیات حافظ رحمت، ص 335۔

خزانوں زیارت کے بہانے پھرتی ہیں۔[1]

''جس طرح کسی مسلمان کے انتقال'' کے بعد، تیجا، دسواں اور چالیسواں کی رسم ادا ہوتی ہیں، اسی طرح حضرت امام حسین علیہ السلام کے چالیسواں وغیرہ کی رسمیں ہوتی تھیں۔

شب برات

اس تہوار کی سب سے اہم رسم یہ تھی کہ اس رات حلوے اور چپاتیوں پر مردوں کی فاتحہ ہوتی تھی اور مفلسوں میں یہ کھانا تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ تفریحی مشاغل میں، آتشبازی اور چراغاں اس کی مخصوص خصوصیات تھیں۔

شاہ عالم ثانی نے شب برات کے مضمون پر بہت سے اشعار کہے ہیں، مثلاً

ایسی نیکی شبرات تامیں آتشبازی اور چھوٹت ہت پھول ہات۔

جاہی، جوہی، پھلجھڑی، مہتاب، ستارے اور ایسی ہی پھول رہی چاندنی سب من سہات ہاتی دبوٹ روشن کر آنند سوی پھر پھر جری سرپاو لیتے بھی ابھوکھن کی جوت جگمگات چرچر شاہ عالم کُنم سبھت تاکے دیکھے تیں انکھیاں سب کی سہات[2]

اس موقع پر بادشاہ کا دربار ہوتا، اس کو مبارک باد دی جاتی، اور رقص وسرود کی محفل بجتی تھی[3] لیکن پرہیزگار اور متقی حضرات یہ رات شب بیداری میں بسر کرتے اور گناہوں سے توبہ کرتے[4]

دوازدہم ربیع الاول

باوجود اختلاف رائے بالعموم مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت 12 ویں ربیع الاول کو ہوئی تھی۔ اس وجہ سے ماہ ربیع الاول کے پہلے بارہ دنوں میں جشن منائے جاتے تھے۔ درگاہ قلی خاں نے دہلی کی دوازدہم ربیع الاول کے دو جلسوں کا

1. ہدایت المسلمین (ق) ص 16,29۔
2. نادرات شاہی ص 106, 108, 109, 121۔
3. برائے تفصیل نادرات شاہی، کلیات نظیر اکبرآبادی ص 416,418۔
ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی۔ ص 47,74، دیوان بہشتی، (ق) ص 103,104۔ دیوان مصحفی 6/الف 147۔
4. رسالہ نوبادہ ص 35 الف۔

خاص طور پر ذکر کیا ہے، سرائے[1] عرب کے جلسے کے بارے میں وہ لکھتا ہے:

''تمام ماہ ربیع الاول میں اور خاص طور پر بارہ ربیع الاول کو یہاں عجیب بہار ہوتی ہے اور بڑا ہجوم ہوتا ہے۔ تقریباً دو ہزار عرب مسجد میں جمع ہوتے ہیں...... سب عرب اور تمام مہمان ساری رات بڑی خوش الحانی سے مولود خوانی کرتے ہیں اور حضرت سرور کائنات کی مدح میں عربی قصائد پڑھے جاتے ہیں۔ یہ قصائد بہت پر اثر اور شعرا عرب کے منتخب ہوتے ہیں۔ ان عربوں کی آواز بہت دل کش ہوتی ہے۔ جب عرب قصائد پڑھتے ہیں اور مولود خوانی کرتے ہیں تو صوفی لوگ وجد و حال میں آتے ہیں اور تمام مسجد میں ہر طرف درود کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور ہر جانب تسبیح اور تہلیل کا شور ہوتا ہے ساری رات مولود خوانی اور قصائد پڑھنے میں گزرتی ہے اور صبح کے آثار نمودار ہوتے ہیں تو سب عرب اور حاضرین ختم قرآن میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ تمام عرب حافظ اور قواعد تجوید کے بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ اس لیے جب وہ قرآن پاک کو عربی لب و لہجے میں پڑھتے ہیں تو سننے والوں پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے...... اہل شہر اور صلحا اور علما اس مسجد میں مجلس کے وقت دعائیں مانگتے ہیں رات کے وقت انواع و اقسام کے کھانوں سے مہمانوں کی ضیافت ہوتی ہے، اور ان کی خدمت میں قہوے کے بڑے بڑے پیالے پیش کیے جاتے ہیں،،[2]

یازدہم پیر دست گیر عبد القادر جیلانی

بالعموم مسلمان اور بالخصوص قادری سلسلے کے لوگ حضرت عبد القادر جیلانی کی وفات کے دن مجلسیں منعقد کرتے تھے[3] دلی کے میرن نامی ایک صاحب ثروت کے جلسے کی شان و شوکت کا درگاہ قلی خاں نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

''اس کے ہاں ہر ماہ کی گیارہویں تاریخ کو ایک شان دار مجلس منعقد ہوتی ہے جوق در جوق ناچنے اور گانے والیاں شرکت کرتی ہیں، صبح سے لوگوں کی آمد کا تانتا بندھ جاتا ہے اور قوال و نقال بھی اپنے کمال فن کی نمائش کے لیے کثیر تعداد میں آتے ہیں، میرن مہمانوں کے لیے بڑے بڑے

---

1. برائے تفصیل، واقعات دار الحکومت دہلی 2/ 690,691 آثار الصنادید (1965) ص 248۔

2. مرقع دہلی، ص 37,38۔

3. برائے تفصیل، قانون اسلام (انگریزی) ص 237, 241۔

اور اعلیٰ اور قیمتی خیمے نصب کرتے ہیں اور دو دن تک عمدہ قالین اور رنگین فرش بچھواتے ہیں اور تمام شہر کے لوگوں کے لیے شرکت کی عام اجازت ہوتی ہے۔ میرن کی طرف سے تمام حاضرین کے لیے عمدہ عمدہ مدارات اور سامان طرب اور لطف وتماشہ بالکل مفت ہے، جب محفل شروع ہوتی ہے تو ہر ایک بڑے سلیقہ سے بیٹھ جاتا ہے اور رقص وسرود اور ناچ ورنگ کو اطمینان سے دیکھتا اور سنتا ہے۔ میرن ہر مہمان کی خدمت میں عمدہ کھانے میوے اور عطریات پیش کرتا ہے اور جو لوگ شراب پیتے ہیں ان کو اس کی بھی آزادی ہوتی ہے۔،، [1]

شاہانِ مغلیہ کے دربار میں یہ جشن منایا جاتا تھا اور متعلقہ رسومات ادا ہوتی تھیں [2]

جشنِ نوروز

اورنگ زیب نے مذہبی نقطۂ نظر کی وجہ سے یہ جشن ممنوع قرار دے دیا تھا اور اس کی بجائے رمضان کے مہینے بھر ایک جشن جاری کیا تھا جس کو نشاط افروز کہتے تھے [3] اس کے جانشینوں نے جشنِ نوروز کو دوبارہ رائج کیا۔ فرخ سیر نامہ کے مصنف نے عہد فرخ سیری، میں اس جشن کی شان وشوکت کا بہت دل چسپ منظر پیش کیا ہے [4] 1857 تک دربار مغلیہ اور عوام میں یہ جشن جاری وساری تھا۔ بڑے شہروں اور قصبوں میں یہ جشن بڑے کروفر سے منایا جاتا تھا۔ اس دن بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوتا، اس کو سالِ نو کی مبارک باد دی جاتی اور نوروز کے دستور کے مطابق اس دن کپڑے پہنے جاتے اور رقص وسرود کی محفلیں سجتی تھیں [5]

---

1. مرقع دہلی، ص 33,34۔

2. ملاحظہ ہو نادرات شاہی، امیر الامرا حسین علی خاں کا حکم تھا کہ ہر ماہ کی گیارہویں کو ایک جلسہ منعقد ہو اور ایک ہزار، ایک سو ایک روپیہ کی لاگت کا کھانا تیار کرا کر غربا مساکین میں تقسیم ہو، مشائخ علما اور صلحا کو اس موقع پر مدعو کیا جاتا تھا، اور بڑے ادب واحترام سے ان کی ضیافت کی جاتی تھی، تاریخ ہندی (ق) ص 465,466۔
نیز مآثر الامرا۔ 1/638۔ آثار الصنادید ص 199۔

3. خافی خان۔ 2/ص 79,80۔ مآثر عالم گیری (1۔ت) ص 42,43 آئینِ اکبری (1۔ت) 1/410.411

4. برائے تفصیل ملاحظہ ہو فرخ سیر نامہ (ق) ص 123,124۔

5. دیوان قائم چاند پوری ص 150، الف، رسالۂ نوبادہ 170 الف وب،
دیوان حسرت ص 19 الف مرأۃ الاصطلاح ص 44 ب، نادرات شاہی، بزم آخر

میلے ٹھیلے اور بزرگانِ دین کے عرس

میلہ بسنت

دہلی اور شمالی ہندستان میں بسنت کا میلہ بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اس دن لوگ پیلے لباس زیب تن کرتے تھے۔ سات دن تک یہ میلہ جاری رہتا تھا۔ درگاہ قلی خان نے اس میلے کا بالتفصیل ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے، بسنت کے مہینے کی پہلی تاریخ کو تمام دہلی والے حضرت سرور کائنات کے قدم شریف پر حاضر ہوتے تھے اور صبح سے شام تک وہاں قیام کرتے تھے۔

قدم شریف کے قرب وجوار کے باغات اور میدان ومکانات آدمیوں سے بھر جاتے ہیں۔ تمام لوگ زرق برق پوشاکوں میں ملبوس بڑے اہتمام سے آراستہ پیراستہ آتے تھے۔ قدم شریف کے صحن اور اردگرد کے تمام مقامات پر ڈیرے ڈال کر رہتے تھے۔ اپنے ساتھ خورد ونوش کا سامان بھی لاتے تھے، اور اعلیٰ اور قیمتی فرش بچھاتے تھے جس کے سبب سے ہزاروں رنگارنگ کے فرش میدانوں، باغوں اور قدم شریف کے صحن میں نظر آتے تھے۔ جن پر لوگ ٹولیوں میں بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے اور تفریح میں منہمک رہتے تھے۔ قدم شریف کے اندر اور باہر تمام دن قوالیاں ہوتی رہتی تھیں، ہزاروں قوال اور ہزاروں مجرا کرنے والے جگہ جگہ نظر آتے تھے۔

زائرین پھولوں کے گلدستے اور خوشبوئیں اور مٹھائیاں قدم شریف پر چڑھاتے تھے اور بہت ایسے بھی خوش اعتقاد لوگ ہوتے تھے جو مجمع پر گلاب پاش سے عرق گلاب، عرق بید مشک، عرق بہار، اور عطریات چھڑکتے تھے اور لوگوں کے کپڑوں پر عطر لگاتے تھے، جب خوب صورت لڑکیاں اپنے ہاتھوں میں گلاب پاش اور پھولوں کے گلدستے اور نذر ونیاز کی مٹھائیاں لے کر قدم مبارک پر آتی تھیں تو مجمع میں اچھی خاصی ہلچل مچ جاتی تھی۔

"ہر طرف شور وغل سنائی پڑتا، کیونکہ ہر جانب حسینوں کے جمگھٹ، قوالوں کا شور، مطربوں کا رقص وسرود، نقالوں کی نقل بازیاں، ایک ایسا سماں ہوتا تھا جس کی کیفیت الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتی، صبح کو نماز کے بعد سے عصر تک یہی حال رہتا تھا، اس کے بعد لوگ

فاتحہ پڑھ کر اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے تھے۔اسی طرح دوسرے دن خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، تیسرے دن حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی، چوتھے دن حضرت شاہ رسول نما پانچویں دن حضرت شاہ ترکمان شاہ کے مزاروں پر نشاط وانبساط کی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ چھٹے دن لوگ حضرت بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور بسنت کی مبارکباد دیتے تھے، ساتویں دن اہلِ دہلی حضرت عزیزی کے مزار پر حاضر ہوتے تھے، بحیثیت مجموعی بسنت کا یہ پورا ہفتہ بہت دل چسپ ہوتا تھا، اس میں سیر وتفریح وحسن پرستی کے سارے سامان موجود تھے۔[1]

میلہ ناگل

ہر ماہ کی 27 رویں کو ناگل کا میلہ ہوتا تھا، جہاں دہلی کے تماشہ بین اور آوارہ عورتیں خوب بن سنور کر جوق در جوق ناگل نامی بزرگ کی زیارت کو آتی تھیں اور نوجوان زرق برق پوشاک پہن کر اپنے آپ کو خوب صورت اور دل کش بنا کر آتے تھے، یہ جوان مرد وعورت ہر قسم کی عیاشیوں میں ملوث ہوتے تھے۔[2]

اعراس

اٹھارھویں صدی کے بزرگوں میں شاید ہی کوئی ایسا بزرگ ہو جس کے مزار پر سالانہ عرس کی رسمیں ادا نہ ہوتی ہوں۔

درگاہ قلی خان اور دوسرے ہم عصر مصنفوں نے ان عرسوں کی محفلوں اور اس زمانے کے میلوں ٹھیلوں اور وہاں کے ماحول کے بہت دل کش مناظر پیش کیے ہیں جیسا کہ ہم بعد میں لکھیں گے۔

اس عہد میں مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں اور مزاروں پر لوگوں کے ہجوم نظر آتے تھے، مذہب سے دوری اور قبر پرستی اور افعالِ شرک سے قربت اس زمانے کی خصوصیات تھیں۔

---

1. مرقع دہلی، ص 31,32، نیز دیکھیے، نادرات شاہی، بزم آخر۔
2. مرقع دہلی 34۔

قدم شریف[1]

یہ وہ مقام تھا جہاں حضرت سرور کائنات کے قدم مبارک کا نشان بتایا جاتا تھا۔ یہ مقام نہ صرف دہلی کے باشندوں کے لیے متبرک تھا بلکہ ہندستان کے تمام مسلمانوں کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مرکز تھا۔ جمعرات کے دن دہلی اور گرد و نواح اور دور دور کے باشندے ''قدم شریف'' کی زیارت کے لیے آتے تھے، درگاہ کا صحن خلقت سے بھر جاتا تھا۔ اتنا بڑا مجمع ہوتا تھا کہ لوگوں کو قدم شریف کی زیارت کرنا دوبھر ہو جاتا تھا۔ تمام سال ہر جمعرات کو خلقت کا یہی حال ہوتا تھا۔ ربیع الاول کے مہینے میں بالخصوص اطراف و اکناف ہی کے نہیں بلکہ سارے ہندستان سے مشتاقانِ زیارت آتے تھے اور اس کثرت سے آتے تھے کہ قدم شریف کے آس پاس کے میدانوں میں آدمی ہی آدمی دکھائی پڑتے تھے۔[2]

قدم گاہ حضرت علیؓ[3]

12 محرم کو جو کہ حضرت خامسِ آلِ عبا کی زیارت کا دن تھا۔ اہلِ عزا اور راسخ الاعتقاد حضرات کا وہاں بڑا ہجوم ہوتا تھا اور زائرین اور حاجت مندوں کی کثرت ہوتی تھی۔ تمام چھوٹے بڑے راستے اور آس پاس کے سب مقامات سواریوں اور پاپیادہ آنے والوں سے بھر جاتے تھے۔ اور ایک زبردست میلہ لگ جاتا تھا۔ اہلِ حرفہ اپنی دکانوں کی خوب آرائش کرتے تھے۔

ہر قسم کا سامان وہاں مہیا ہوتا تھا۔ اور دکان دار بہت منافع کماتے تھے۔ قدم گاہ کے متصل ایک چوکی خانہ تھا جہاں اہلِ ذوق اور صاحبان وجد و حال جمع ہوتے تھے اور بلند آواز سے منقبت اہل بیت کرتے تھے اور مرثیہ خوانی کرتے تھے۔[4]

---

1. برائے تفصیل، واقعات دار الحکومت دہلی 2 / ص 110، یہ مقام اسی نام سے اب بھی موجود ہے مگر بڑی کس مپرسی کے حالت میں ہے۔
2. مرقع دہلی ص 1،2۔
3. تفصیلی نوٹ کی لیے دیکھیے مرقع دہلی (اردو ترجمہ) ص 8۔
4. مرقع دہلی ص 3،4۔

درگاہ حضرت قطب الاقطاب" بختیار کاکی کا[1] ربیع الاول کے مہینہ میں عرس ہوتا تھا۔ اس زمانے میں تقریباً تمام دہلی کے باشندے دو دن کے لیے درگاہ شریف میں چلے آتے تھے، زیارتیں کرتے، مرادیں مانگتے، نذریں چڑھاتے اور بعد میں خوب سیر وتفریح کرتے تھے۔ ہر زمانے میں اور بالخصوص عرس کے زمانے میں دور دور سے قوالوں کی چوکیاں آتی تھیں جو دور سے مزار مبارک کی جانب رُخ کر کے کبھی کھڑے ہو کر اور کبھی بیٹھ کر گاتے اور لوگوں پر وجد وحال کی کیفیت طاری کرتے تھے[2]

اسی طرز پر حضرت سلطان المشائخ [3]محبوب الٰہیؒ، حضرت امیر خسروؒ، [4] حضرت نصیر الدین[5] چراغ دہلوی، حضرت ترکمان شاہ بیابانیؒ[6] حضرت خواجہ[7] باقی باللہؒ، حضرت شاہ رسول نما[8] شاہ بایزید اللہ شاہ عزیز اللہ، مرزا بیدل[9] خلد منزل، میر مشرف وغیرہ بزرگوں کے مزاروں پر عرس ہوتے تھے اور دور دور کا سفر طے کر کے زائرین وہاں حاضر ہو کر مجلس سماع کا حظ اٹھاتے، نذریں چڑھاتے مرادیں مانگتے اور سیر وتفریح کر کے اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاتے تھے۔[10]

---

1 برائے سوانح عمری، سیر لاولیا، سیر العارفین، فوائد الفواد

2 مرقع دہلی ص 4,5۔

3 متوفی۔1325ء برائے حالات ملاحظہ ہو، سیر الاولیا فوائد الفواد افضل الفوائد، تاریخ فرشتہ، (ا۔ت) 2/ص 597, 612۔

4 Wahid Mirza: Life and Times of Hazrat Amir Khusru

5 خیر المجالس، از حمید قلندر، تاریخ فرشتہ (ا۔ت) 2/ص 614-612۔

6 دہلی کا ترکمان دروازہ انھی کے نام پر ہے۔

7 خزینۃ الاصفیا، 1/ص 605,607

8 سفینۂ خوشگو ص 147, 103، سفینۂ ہندی ص 28,29۔ مخزن نکات ص 10۔ نکات الشعرا ص 302۔

9 ان بزرگوں کے مزاروں پر عرس کے جلسوں اور وہاں کے مناظر کی تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو مرقع دہلی ص 7,15۔

10 بہارستان غائبی (انگریزی ترجمہ) 2/ص 637 دیوان حسرت، ص 100 ب، دیوان مصحفی (ق) 6/ص 150، الف کلیات نظیر (اکبرآبادی) ص 1946 کلیات انشا ص 211۔

کھیل تماشے

شطرنج و چوپڑ

قدیم کھیلوں میں مسلمانوں کو بالخصوص شطرنج کھیلنے میں دل چسپی تھی۔[1] تمام شاہان مغلیہ کو اس کھیل سے شغف تھا۔ امرا بھی اپنے حاکموں کی تقلید میں کھیلتے تھے۔ دیگر کارخانہ جات کی طرح شطرنج کا بھی ایک علاحدہ شعبہ تھا جس کا فرض اس کھیل کے متعلق انتظامات کرنا تھا۔ شاہ عالم ثانی اور محمد شاہ رات کے وقت اپنے حرم کی مستورات کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتے تھے۔[2]

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں چوپڑ دربار کے مرغوب ترین کھیلوں میں تھا۔ زیب النسا (اورنگ زیب کی بڑی بیٹی) اپنا بہت سا وقت چوپڑ بازی میں صرف کرتی تھی۔[3] عشا کی نماز کے بعد محمد شاہ چوپڑ کھیلا کرتا تھا۔[4]

پتنگ بازی

اس زمانے میں پتنگ بازی عوام وخواص میں دفع الوقتی کا سب سے زیادہ پسندیدہ ذریعہ تھی۔ آنندرام مخلص "کاغذ باد" کے زیر عنوان لکھتا ہے:

"شاہ جہاں آباد میں اس کھیل کا عام رواج ہے۔ ہر روز صاحب جمال معشوق صفت لوگ اپنے مکانوں کی چھتوں پر آتے ہیں اور رنگ برنگے پتنگ ہوا میں اڑا کر ایک دوسرے سے لڑاتے ہیں۔[5]

آگرے میں کنکوے اور پتنگ بازی کے عام شوق کا اندازہ اس نظم سے بخوبی ہوسکتا ہے جو نظیر اکبر آبادی نے اس بازی کی تعریف میں لکھی ہے۔

---

1. منوچی 2/460۔
2. وقائع عالم شاہی ص 146۔
3. Sarkar: Studies in Mughal India- P.82 کلیات سودا 2/ص 29۔
4. صحیفۂ اقبال (ق) ص 34ب
5. ملاحظہ ہو، میراۃ الاصطلاح ص 178 اب، نیز سفرنامہ آنندرام مخلص ص 54، چمنستان، 26ب سیر المتاخرین (ق) 2/654۔

اس آگرے میں یہ بھی تماشا ہے دل پذیر ہوتے ہیں دیکھ شاد جسے خُرد اور کبیر
کیوں کر نہ دل پتنگ کی ہو ڈور میں اسیر خوباں کے دیکھنے کے لیے کیا میاں نظیر
ہے یہ بھی ایک طرفہ بہانا پتنگ کا[1]

مختلف عہد میں شعراے اُردو نے پتنگ کے مضامین خیالی کا موضوع بنایا ہے۔

کبوتر بازی

کبوتر بازی بھی تفریحِ طبع کا دل چسپ ذریعہ تھا۔ امرا و عوام دونوں کو اس بازی سے دل چسپی تھی۔ آگرے کے لوگوں میں اس شوق اور وہاں کی کبوتر بازی کی نظیر اکبر آبادی نے تعریف کی ہے[2] جوشش نے ایک کبوتر باز کا یوں ذکر کیا ہے

ایک محلے میں تھے کبوتر باز اپنے فن میں سبھوں سے تھے ممتاز
ٹھاٹ ان کے کبوتر کا گھر نہ تھا ان تکیہ تھا پر کا
چپٹیاں رہتی جعفری کے ساتھ ماریں تھیں نت کبوتر پر ہاتھ[3]

درگاہ قلی خان کا بیان ہے کہ چاندنی چوک کے بازار میں کبوتروں کی خرید و فروخت ہوتی تھی اور ''روز بازار''[4] لگتا تھا۔ جامع مسجد دہلی کے شمالی دروازے پر بھی کبوتر بکتے تھے[5] غالب نے بھی اپنے ایک قطعہ میں اس کا ذکر کیا ہے آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ شعراے اردو میں مصحفی نے اپنے ایک پورے قصیدے کا پسِ منظر کبوتر بازی اور اس کی اصطلاحوں پر رکھا ہے۔ ''دلگیر ہوا پر'' تاثیر ہوا پر''[6] اس کے ردیف قوافی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مصحفی کو بھی کبوتروں سے اور اس کی فنی اصطلاحوں سے خاصی واقفیت تھی۔ کبوتر بھی اردو شاعری کی رمزیہ علامات میں سے ایک

1۔ برائے تفصیل کلیات نظیر اکبر آبادی ص 464، 462۔

2۔ کلیات نظیر اکبر آبادی ص 473، 472۔ نیز دیکھیے، معدن جواہر، 25 ب، 27 الف

3۔ دیوان جوشش ص 236۔

4۔ بازار کا دن: جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے ☆ روز بازار جاں سپاری ہے، دیوانِ غالب ص 624۔ عرشی

5۔ مرقع دہلی ص 17۔

6۔ دیوان قصائد مصحفی (نسخہ رام پور)

ممتاز علامت رہی ہے۔

مرغ اور بٹیر بازی

مرغ اور بٹیر بازی بھی عام تھی۔[1] مگر دہلی سے متعلق اس کی مثالیں کم ملتی ہیں مگر چوں کہ یہ بازی عام تھی لہٰذا قابلِ ذکر نہ سمجھی گئی۔ بہر حال امیر خاں عمدۃ الملک انجام (محمد شاہی امیر) کو مرغ بازی کا شوق تھا۔ اس کے ہاں مرغ بازی کا تماشا ہوتا تھا۔ لوگ اپنے اپنے مرغ لے کر آتے تھے۔ اور بازی پر مرغ لڑائے جاتے تھے[2] اس فن نے بعد میں لکھنؤ میں بہت ترقی کی جس پر ایک مثنوی کلیات میر میں بھی ملتی ہے۔

کشتی

عہد مغلیہ میں کشتی، صرف تفریح کا سامان نہیں تھی بلکہ جسمانی ورزش کی غرض سے بھی لوگ کشتی لڑتے تھے۔ بادشاہ امرا اور عوام سب کو اس سے دل چسپی تھی۔ بادشاہوں کی سر پرستی میں کشتی کے دنگل ہوتے تھے۔ اور بازی جیتنے والوں کو انعام ملتے تھے[3]

زیر مطالعہ زمانے میں کشتی کے ماہرین فن کو بادشاہوں کی سر پرستی حاصل نہ رہی لہٰذا شوقین لوگوں نے خود اپنے یہاں اکھاڑے قائم کیے[4] فاضل خاں کے مکان پر ایک اکھاڑہ تھا جہاں پہلوان جمع ہوتے اور پکڑیں ہوتی تھیں۔ فاضل خاں کے لڑکوں کو اس فن کی مشق کرائی جاتی تھی[5] درگاہ قلی خاں نے مہابت خاں کے اکھاڑے کا دل چسپ بیان کیا ہے۔

''ایک وسیع میدان ہے یہاں کشتی کے شوقین نوجوان اور فیل تن

---

1. تاریخ بے خزاں، از فضل علی (ق) ص 74، نیز دیکھیے، ملفوظات شاہ عبد العزیز ص 34۔
2. جانوروں کی کشتی لڑنے اور اس پر شرط لگانے کا تفصیلی مطالعہ کیجیے، آئین اکبری (ا۔ت) ج1۔ح۔1 ص 332,333۔
3. برائے تفصیل، آئین اکبری (ا۔ت) جلد اول، ص 372,373۔ منوچی 1 ص 191 کلیات جرأت (ق) ص 433
P.N Chopra. Society and Culture In Mughal Ages: P.62
4. برائے تفصیل، کلیات سودا 1 ص 386,389، سفر نامہ آنند رام مخلص ص 46، دریائے لطافت ص 79۔
5. انفاس العارفین ص 57۔

پہلوان اور رنگین مزاج تماشہ بین کثرت سے جمع ہوتے ہیں اور آپس میں زور آزمائی اور کشتی گیری کا مقابلہ کرتے ہیں اور اس طرح لڑتے ہیں کہ تماشائیوں کو حیرت ہوتی ہے۔ یہ نظارہ بھی دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ کیوں کہ پہلوانوں کی سیکڑوں جوڑیاں اِدھر اور کچھ لوگ ان کی کشتی دیکھنے میں مشغول ہوتے ہیں اور جب سب کشتیاں ختم ہو جاتی ہیں تو حاضرین کی ضیافت مٹھائیوں سے کی جاتی ہے۔ ہر یک شنبہ کو یہ دنگل ہوا کرتا ہے اہلِ دہلی دنگل دیکھنے کے بہت شوقین ہیں اور اکثر اس لیے بھی آتے ہیں کہ حسینوں سے نظارہ بازی کریں، جو یہاں کثرت سے جمع ہوتے ہیں۔[1]

گھوڑ دوڑ

شہزادوں اور امیر زادوں کو گھوڑ دوڑ کا فن خاص طور پر سکھلایا جاتا تھا[2] اور انھیں گھوڑے اور ہاتھی کی سواری کی مشق کرائی جاتی تھی کیوں کہ اس عہد میں ان دونوں جانوروں کو میدانِ جنگ میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس کی وجہ سے اسپ شناسی اور شہسواری باقاعدہ ایک فن بن گیا تھا۔ اور اس کے جاننے والوں کی طبقۂ امرا میں بڑی قدر ہوتی تھی۔

پٹے بازی اور تیر اندازی

بادشاہوں، امیروں اور عوام کے لیے پٹے بازی اور تیر اندازی ورزش اور تفریحِ طبع کے مرغوب ترین ذریعہ تھے۔ ان طبقوں کے افراد کو بالخصوص اس فن کی مشق کرائی جاتی تھی۔[3]

شکار

شاہانِ مغلیہ اور ان کے امرا شکار کے بہت شوقین تھے۔ بادشاہوں کے شکار کھیلنے کے لیے

---

1. مرقعِ دہلی ص40۔ ان اکھاڑوں میں جو بدافعالیاں ہوتی تھیں، ان کے لیے ملاحظہ ہو۔
کلیاتِ سودا 1 / ص 389، 386۔

2. مآثر الامرا 3 / ص 874، دریائے لطافت ص 65۔

3. دریائے لطافت ص 37۔

محفوظ شکارگاہیں ہوتی تھیں۔ باز اور کتوں کو شکار کی مشق کرائی جاتی تھی [1] شاہانِ مغلیہ کے مختلف جانوروں کے شکار کھیلنے کے طریقوں کا برنیر نے بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے [2]

سیاسی اور انتظامی کاموں کی مصروفیات کے باوجود بہادر شاہ شکار کھیلنے کے لیے وقت نکال ہی لیتا تھا۔ اسی طرح اس کے جانشین جہاں دار شاہ، فرخ سیر اور محمد شاہ بھی شکار کھیلنے کے بڑے شائق تھے [3] محمد شاہ کے عہد میں تال کٹورہ اور رمنہ بدلی اور پالم بہت اہم شکارگاہیں تھیں۔ عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ثانی نے بھی اپنے آباواجداد کی تقلید میں شکار کھیلنے کا شوق جاری رکھا۔ شاہ عالم ثانی کو کلنگ کے شکار کا بہت شوق تھا [4]

امرا کا بھی یہی حال تھا۔ عمدۃ الملک امیر خاں اور دیانت خاں اپنا زیادہ تر وقت ہرنوں اور بارہ سنگوں کے شکار میں صرف کرتے تھے [5] جعفر خاں، نواب بنگال، کے متعلق طباطبائی نے لکھا ہے کہ جب وہ شکار کھیلنے کے لیے روانہ ہوتا تھا تو اس کے ساتھ اربابِ طرب اور سازندے بھی ہوتے تھے [6] ہندستان میں شکار کھیلنے کے کئی طریقے تھے۔ آنند رام مخلص نے ان میں سے بالخصوص منہاچوری، شکار جرگہ، اور شکار کنسہاری کا تفصیلی ذکر کیا ہے [7] سودا نے اپنے شہر آشوب میں امرا کے ذوق شکار کا بھی حوالہ دیا ہے۔

---

1. وقائع سیر و سیاحت (ا۔ت) 2/ص 35,42 منوچی 1/ص 191,192۔
2. وقائع سیر و سیاحت (ا۔ت) 2/ص 35,42 منوچی 1/ص 191,192۔
3. سیر المتاخرین (ق) 2/ص 413 ,377، تذکرۃ الملوک (ق) ص 113 میرآۃ الاصطلاح ص 57 ب فرخ سیر نامہ ص 72 ب
4. برائے تفصیل ملاحظہ ہو، سیر المتاخرین 2/ص 599 ,432 ,426 ,413، تاریخ مبارک نامہ ص 169 الف، تاریخ مظفری 1/ص 174 الف، احوال محمد شاہی (ق) ص 29 ,6 سفرنامہ آنند رام مخلص ص 2، منشیات مادھورام، صحیفۂ اقبال ص 34، ب میرآۃ الاصطلاح ص 158 ب
5. ماثر الامرا 2/ص 278 ,78۔
6. سیر المتاخرین (فارسی) 11/ص 651۔
7. برائے تفصیل، مرآۃ الاصطلاح ص 158 ب، 149 الف و ب، 35، ب چمنستان ص 21 (الف)

تک دیکھنا منصور علی خاں جن کا احوال
چھاتی پہ کڑک بجلی ہے اور شیروہاں ہے[1]

غبارہ بازی

احوال ''کرم شب چراغ'' کے تحت آنند رام مخلص نے بیان کیا ہے کہ شمالی ہندستان کے لوگ کاغذ کے غبارے بنا کر ہوا میں اڑاتے تھے۔ کبھی کبھی ان میں زندہ جانور رکھ کر بھی اڑاتے تھے[2] 'اسے کرم شب چراغ'' کہتے تھے[3]

قصہ خوانی

تعلیم یافتہ مرد اور عورتیں وقتاً فوقتاً قصص، سوانح عمریاں، حکایات، اور نثر و نظم کی ادبی کتابیں سن کر وقت گزارتی تھیں۔ فارسی کتابوں میں گلستاں اور بوستان اور فارسی شعرا کے اشعار سننے میں خاص طور پر دلچسپی تھی[4]

علی وردی خاں (نواب بنگال) جب تمام امورِ ملکی سے فارغ ہو کر اپنی خواب گاہ میں پہنچتا تو اس کی خدمت میں قصہ خوانوں کی منڈلیاں حاضر ہوتی تھیں اور وہ مختلف قصے سنا سنا کر اس کا دل بہلایا کرتے تھے[5] دہلی کے بازار چاندنی چوک میں کھلے عام بہت سے قصہ خواں لوگوں کو قصے سنا کر محظوظ کرتے تھے[6] اور یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ بادشاہ کے دربار میں بھی قصہ خواں ملازم تھے۔ شاہ عالم ثانی کے دربار سے حسن علی آغا وابستہ تھا[7] ان قصہ خواں یا داستان گویوں کو عموماً خلوت خانے یا حمام میں باریابی ملتی تھی، یہ اپنی چرب زبانی اور شیوا بیانی سے

---

1. کلیات سودا/1 ص267۔
2. مراۃ الاصطلاح ص181 ب
3. منوچی۔2/ص331
4. منوچی۔2/ص331
5. سیر المتاخرین (ف) 2/ص69،619۔
6. برائے تفصیل مرقع دہلی ص16۔
7. مجموعہ نغز/ص41

خواب آور قصے سنا کر بادشاہ اور امرا کے ذہن کو سکون پہنچاتے تھے۔ قصہ گوئی کا یہ رواج بہت پرانے زمانے سے ہے اور سماج کے ساتھ ساتھ اس میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ ابتدا میں بہادروں اور اولوالعزم بادشاہوں کے قصے پسند کیے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ عشقیہ داستانیں اور جذبات حیوانی برانگیختہ کرنے والے قصے پسند کیے جانے لگے۔ آخر میں میر باقر علی داستان گو اس فن کے خاتم تھے۔ ان کا تفصیلی خاکہ اشرف صبوحی نے ''دلی کی چند ہستیاں'' میں پیش کیا ہے۔ اب یہ فن بالکل ناپید ہو چکا ہے۔ ان داستاں گویوں کو ہر فن اور ہر علم کی مصطلحات اس کثرت سے یاد ہوتی تھیں اور انھیں اپنی داستانوں میں اتنی تفصیل سے اور ایسے دل چسپ پیرائے میں پیش کرتے تھے کہ چاہتے تو ایک داستان کو مہینوں تک طول دے سکتے تھے۔ کہتے ہیں کہ عربی کی مشہور داستاں الف لیلا کلیلہ و دمنہ بھی اسی طرح وجود میں آئی تھی کہ بادشاہ کو ایک کنیز شہزادی نے ایک ہزار ایک راتوں تک مسلسل یہ داستان سنائی تھی۔ یہ واقعہ تو نہیں ہے لیکن داستان گویوں کے فن کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن تھا۔

حقہ اور پان

اسی زمانے میں حقہ پینے اور پان کھانے کا عام رواج تھا[1]۔ ہندستان میں طرح طرح کے پان کے پودے پیدا کیے جاتے تھے۔ بھنڈاری نے پان کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے۔

''از نعمت ہائے بے بدل برگ تنبول سبزہ ایست سرسبز ساز
انجمن سبز بختاں برگی است، برگ بخش دلہای برگ طلبان
رنگ آرائے مجلس ارباب دول، نکہت پیرائے شام اہل
محفل مرغوب طبع غنی وفقیر، عزیز دلہائے صغیر وکبیر فیض بخش
طبیعت پیر و جوان گوارائے مزاج ہر تندرست وناتواں
بدرقہ ہاضمہ طعام ازالہ علل اقسام سازگار جمیع امزجہ مددگار
تمامی ادویہ سیماب کشتہ کہ دم مساوات باب زندگی می زند،
اعانت از وی می خواہد سبزان ہند از وسرخروئی حاصل نمودہ

1۔ آئین اکبری (ا۔ت) 2، ص 283۔

خوں ریزی و عاشق کشی می نمائید۔[1]

تقریبات اور شادی بیاہ کے موقعوں پر بڑے اہتمام کے ساتھ مہمانوں کو پان پیش کیے جاتے تھے۔ پان کے بیڑوں پر سونے چاندی کے ورق لگائے جاتے تھے[2] شاہان مغلیہ کے ہاں ''برگ تنبول'' ''یا تنبول خانہ'' نام کا ایک الگ شعبہ تھا جشنوں اور دوسری تقریبات کے ایام میں یہ شعبہ پان کا انتظام کرتا تھا۔ بادشاہ سلامت بذاتِ خود اپنے دستِ مبارک سے امرا کی تواضع کرتے تھے اور ان کو پان پیش کرتے تھے[3] نادر شاہ کے حملے کے بعد دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبہ کی زبوں حالی کا ذکر رسالہ محمد شاہ و خان دوراں میں بڑے دل دوز انداز میں بیان کیا گیا ہے[4]

پان کے لوازمات میں چھالی، کتھا، چونا شامل ہیں۔ حاتم نے ان تمام لوازمات کو ایک شعر میں بیان کر دیا ہے۔

چنگیز و پاندان و جو گھڑی سب　　گل و پان و سپاری سے بھرے سب[5]

اسد بیگ (عہد اکبری کا ایک امیر) کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر بادشاہ کے عہد سے پہلے شمالی ہندستان میں حقہ پینے کا رواج نہ تھا۔ اسد بیگ جنوبی ہند سے کچھ حقے اور تمبا کو لایا۔ اس کے بعد سے حقہ کا پینا عام ہو گیا[6] اٹھارہویں صدی میں حقہ پینا اہل دول اور غربا دونوں میں عام تھا۔ شعرا اور ادبا دونوں نے تمباکو کی بہت تعریف کی ہے، ہندو مسلمان دونوں اس کا شغل کرتے تھے اور محفلوں میں مہمانوں کی تواضع بھی حقے سے کی جاتی تھی۔ حاتم کا بیان ہے۔

ہے سب کے مذہب و مشرب سے آگاہ　　ہے ہر ایک محفل اندر اس کے تئیں راہ

---

1. خلاصہ التواریخ ص 12,13 نیز مرآۃ الاصطلاح ص 44 (الف) حدیقۃ الاقالیم ص 171 سیر المتاخرین (فارسی) 2/ص 560۔
2. مرآۃ اصطلاح ص 44 الف
3. حدیقۃ الاقالیم ص 45۔
4. برائے تفصیل، رسالہ محمد شاہ و خان دوراں خاں ص 174 الف و ب
5. دیوان زادہ ص 105 نیز ملاحظہ ہو۔ انشائے عجیب ص 124 الف
6. برائے تفصیل، رسالہ تاریخ اسد بیگ (ق) ص 36,37۔

وہ رہے گا آشنا دونوں سے یکساں طلب گار اس کے ہیں ہندو مسلماں [1]

سفر و حضر دونوں حالتوں میں امرا، شاہان اور عوام کے ساتھ حقہ ہوتا تھا۔[2]

سفر میں ہر قدم ہے یار سب کا شب تنہائی میں غم خوار سب کا
قبول خاطر شاہ وگدا ہے بہفتاد ودو ملت آشنا ہے [3]

حقے دو قسم کے ہوتے تھے۔ ایک کلی اور دوسرا جو بڑا ہوتا تھا، حقہ کہلاتا تھا۔[4] بنگال کے نواب علی وردی خان کی مجلس کے بارے میں طباطبائی نے لکھا ہے کہ نواب مذکور اپنی مسند پر جلوہ افروز ہوتا، اس کے فوراً بعد اس کے مصاحبوں مثلاً میر محمد علی فاضل، نقی قلی خاں، کلیم ہادی خاں اور مرزا حسین صفوی کے سامنے حقے لاکر رکھ دیے جاتے تھے۔[5]

عوام بھی حقے سے خاص شوق رکھتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر تقی میر خود بھی حقہ پیتے تھے۔ مرقع شعرا میں ان کی جو تصاویر دی گئی ہے۔ اس میں میر کے ساتھ حقہ بھی دکھایا گیا ہے۔[6] اگرچہ اس تصویر کے مستند ہونے کے شواہد قوی نہیں ہیں۔

چند دیگر کھیل

آہو بازی، جھولنا؟ اور گل بازی وغیرہ معمولی قسم کے تفریح طبع ذرائع تھے۔[7]

تیراکی

اٹھارھویں صدی میں دہلی اور آگرے میں تیراکی کا عام رواج تھا۔ فرصت کے دن لوگ جمنا

---

1. دیوان زادہ ص386، نیز مرقع دہلی ص29۔
2. Twining: Travels in India: P.136
3. دیوان زادہ ص387۔
4. وقائع آنند رام مخلص 2/ص61الف
5. سیر المتاخرین ج2/ص609۔
6. برائے تفصیل، خاکسار کا مضمون، مسلمانوں میں حقہ نوشی (جامعہ، دہلی، مئی 1968)
7. برائے تفصیل ملاحظہ ہو، فخر الطالبین (قلمی) ص56، مرآۃ الاصلاح۔ 194الف، چمنستان: ص29الف، دریائے لطافت (ف) ص56۔

میں تیراکی کے مقابلے کیا کرتے تھے، اشرف علی صبوحی نے لکھا ہے۔

تیراکی کا یہ حال تھا کہ پالتی مارے ہوئے پانی پر بیٹھے
ہیں جیسے مسند پر، ایک زانو پر پیچوان لگا ہوا ہے
دوسرے پر رنڈی بیٹھی ہے، دھواں اڑاتے اور ملہار
سنتے چلے جاتے ہیں، قلعہ (معلا) کی حمام والی نہر تو
دیکھی ہوگی، گز سوا گز کا پاٹ ہے اور بالشت بھر سے
زیادہ گہرائی نہیں، اس میں آج کوئی مائی کالال تیر کر
دکھائے تو جانوں،،

میر مچھلی تیراکی کے فن کے خاتم تھے[1] جمنا کے کنارے ایک بڑا شان دار میلہ لگتا تھا جس میں ہزاروں تماش بین جمع ہوتے تھے[2]

اسی طرح آگرہ میں بھی تیراکی کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ اور اس موقع پر میلہ لگتا تھا۔ نظیر اکبرآبادی نے ایک نظم اسی موضوع پر لکھی ہے، چند مناظر ملاحظہ ہوں:

جب پیرنے کی رت میں دل دار پیرتے ہیں
عاشق بھی ساتھ ان کے غم خوار پیرتے ہیں
بھولے سیانے ناداں ہوشیار پیرتے ہیں
پیروجوان ولڑکے عیار پیرتے ہیں
ادنیٰ غریب مفلس زر دار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

---

1. دلی کی چند عجیب ہستیاں۔ ص159۔
2. دلی کی چند عجیب ہستیاں۔ ص102۔

(دلی میں اب بھی "قدیمی لشکری فن تیراکی" کے نام سے ایک تیراکی کا مقابلہ ہوتا ہے، امسال 30 راگست 64 کو یہ مقابلہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کی باؤلی میں ہوا تھا۔
آج کل دلی میں خلیفہ عبدالجبار قریشی فن تیراکی کے مشہور استاد ہیں)

جھرنے سے لے کے یاروسہ جان کا تانبالہ
چھتری سے بُرج خونی وارا کا چونترا کا
مہتاب باغ سید تیلی قلعہ وروضا
غل شور کی بہاریں انبوہ سیر چرچا
ہر اک مکاں میں ہو کر ہشیار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

باغ حکیم اور جو شیوداس کا چمن ہے
اُن میں جگہ جگہ پر مجلس ہے انجمن ہے
میوہ مٹھائی کھاتے اور ناچ دل لگن ہے
کچھ پیرنے کی دھو میں کچھ عیش کا چلن ہے
ہر اک مکاں میں ہو کر ہشیار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

برسات میں جو آکر چڑھتا ہے خوب دریا
ہر جا کھڑی[1] وچادر[2] بند اور ناند چکوا[3]
مینڈا بھنور اُچالن[4] چکر سمیٹ[5] مالا مینڈا کھمیر تختہ کسی پچھاڑ کرا
واں بھی ہنر سے اپنے ہشیار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

---

1. کھڑی لگانا پیراکی کی اصطلاح ہے اس میں کھڑے ہو کر پیرتے ہیں، اسی طرح دوسرے الفاظ بھی پیراکی کی مختلف قسموں کے نام ہیں۔

2. ایضاً

3. ایضاً

4. تاج کنارہ

5. کلیات نظیر اکبرآبادی۔ص 451 ,448۔

ناؤں میں وہ گلرو ناچوں میں چھک رہے ہیں
جوڑے بدن میں رنگین گہنے بھبک رہے ہیں
تانیں ہوا میں اڑتیں طبلے کھڑک رہے ہیں
عیش وطرب کی دھومیں پانی چھپک رہے ہیں
سو ٹھاٹھ کے بنا کر اطوار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

ہر آن بولتے ہیں ''سید کبیر کی جے — پھر اس کے بعد'' اپنے استاد پیر کی جے
مورو[1] مکٹ کنھیا جمنا کے تیر کی جے — پھر غول کے سب اپنے خوردو کبیر کی جے
ہر دم یہ کر خوشی کی گفتار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

کیا کیا نظیریاں کے ہیں پیرنے کے بانی
ہے جن کے پیرنے کی ملکوں میں آن بانی
استاد اور خلیفہ شاگرد یار جانی — سب خوش رہیں ہے جب تک جمنا کے بیچ پانی
کیا کیا ہنسی خوشی سے ہر بار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں۔

میر:

گریۂ زار میں بیتابیِ دل طرفہ نہیں — سیکڑوں کرتے ہیں پیراک ہنر پانی میں

رقص وسرود

رقص وسرود بادشاہوں، امیروں اور عوام کے لیے اندرونِ خانہ تفریح تھی، تقریبات اور خوشیوں کے مواقع پر ناچنے والوں اور والیوں کو بلایا جاتا تھا۔ تقریباً سارے ہی بڑے شہروں میں پیشہ ور رقاصائیں اور امرد بآسانی مل جاتے تھے۔ درگاہ قلی خان نے چوک اسد اللہ خان میں حسین وجمیل زیورات سے مزین امردوں کے رقص کا دل چسپ منظر پیش کیا ہے۔[1] انشا اللہ خان انشا کا

1۔ مرقع دہلی۔ ''ہر طرف رقصِ امارد خوش رو قیامت آباد'' ص-15۔

بیان ہے کہ خواجہ قطب الدین[1] بختیار کاکی کے عرس کے موقع پر وہاں املی کے درختوں کے نیچے لونڈوں کے ناچ کی محفلیں جما کرتی تھیں۔ وہ لکھتا ہے:

> ''لونڈے بھی ایسے کتھک کے کہ جن کو دیکھے پری بھی بھچک رہ جائے سارے سر میں بال۔ کسی کے گلے میں فاختائی جوڑا کسی کے گلے میں طوطلی اور کسی کے گلے میں لال۔ قطب صاحب کی املیوں کے چھاؤں تلے جہاں دس بیٹھ کر اس کو بلایا اور ناچ شروع ہوا، تہاں ہر ایک طرف ناچتے ناچتے سین بتا کے روبرو آ کر بیٹھ گیا۔ ہر ایک نے ڈب میں سے پیسے نکال کر دینا شروع کیے مثلاً چار فلوس جو تم نے دیے تو پانچ فلوس میں نے بھی، اسی طرح سے ہر ایک پھیرے بارہ ٹکے بلکہ پندرہ ٹکے کما لیے اور بیٹھے بیٹھے اُسی عالم بیچ دو ٹکے تم نے ڈب میں سے نکالے تو تین ٹکے میں نے بھی نکالے اور کسی یار نے چھ پیسے، کسی یار نے تین پیسے، آٹھ نو ٹکے تلشکری دمڑی ٹکے کی پاؤ سیر کے حساب سے لے کے آدھی اس لونڈے کے حوالے کی، اور آدھی میں ٹکڑا ٹکڑا سب یاروں نے کھایا۔''

---

1. قطب صاحب قصبہ اوش جو ماوراء النہر کے پرگنے میں واقع ہے، میں بتاریخ 24/ ماہ رمضان المبارک 548ھ بروز پنج شنبہ بعد نماز عصر تولد ہوئے، والد کے انتقال کے وقت ان کی عمر پانچ سال کی تھی، والدہ نے پرورش کی، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اصفہان میں جا کر خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مرید ہوئے، اپنے پیر کے حکم کے مطابق دہلی تشریف لائے۔ اور ''بہدایت خلق اللہ مشغول شد'' آپ کا وصال 14 / ربیع الاول 633ھ کو ہوا۔ مزار مبارک مہرولی میں ہے جہاں ہر سال عرس کی رسم ادا ہوتی ہے اور ہندستان کے دور دراز علاقوں سے زائرین آ کر نذر عقیدت پیش کرتے ہیں۔ خاص طور پر ان دنوں میں جب خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے عرس کا زمانہ ہوتا ہے، عوام کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ خواجہ اجمیری کے مزار پر حاضر ہونے سے پہلے ان کے خلیفہ خواجہ قطب صاحب کے مزار پر حاضری دینا لازمی ہے۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ سیر الاولیا ص 48،57 سفینۃ الاولیا (اردو ترجمہ) ص 130،131۔ اخبار الاخیار (اردو ترجمہ) ص 55،58۔

اورنگ زیب کے جانشین تمام شاہانِ مغلیہ ناچنے والے رقاصاؤں اور گویوں کی سرپرستی کرتے تھے، انھیں دربار میں ملازم رکھا جاتا تھا اور عمدہ مناصب بھی دیے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارہویں صدی میں رقص وسرود کا فن نقطۂ کمال پر پہنچ گیا تھا۔ جس کا کچھ اندازہ مرقع دہلی کے مطالعہ سے بھی ہوسکتا ہے۔ درگاہ قلی خاں نے دہلی کے اربابِ طرب کی ایک طویل فہرست دی ہے جن میں یہ نام شامل ہیں:

نعمت خاں بین نواز، نعمت خاں کا بھائی، تاج خاں جانی وغلام رسول، باقر طنبورچی، حسن خاں ربابی، غلام محمد سارنگی نواز، رحیم وتان سین، قاسم علی بین نواز، معین الدین قوال، برہانی قوال، برہانی امیر خان، رحیم خاں جہانی، شجاعت خان، ابراہیم خاں، سواد خاں، گھانسی رام پکھاوجی، حسین خاں ڈھولک نواز، تہنا، شہباز دھمدمی نواز، شاہ درویش سبوچہ نواز، نابینائے شکم نواز، تقی، شاہ دانیال، خواصی اور انوٹھا، سبزہ ومزہ، یاری نقال، جنا قوال، معشوقۂ ابوالحسن، رحیم خاں، گیان خان، دولت خاں اور بڈو۔

رقاصائیں اور امرد رقاص

اللہ بندی، رجی امرد، بینگا امرد، سلطانہ امرد، درگاہی، رنگولہ نواز، چنگ نواز، سروپ روپ، نور بائی، چمنی، امر بیگم، رام رجنی، چلمگ، دمانی، کالی گنگا، زینت وبجی، گلاب، رمضانی، رحمانی بائی، پنا بائی، کمال بائی، اومابائی، کنور، پناوتنو وغیرہم[1]

محمد شاہ بادشاہ کے دربار میں 22 رقاصائیں اور 24 گویے ملازم تھے۔[2] نور بائی بھی اسی کے دربار سے منسلک تھی۔ کہتے ہیں کہ اس نے حسن وجمال کی دولت کے علاوہ بڑا رسیلا گلا بھی پایا تھا۔ اور اپنی اس خوبی کے باعث امرائے دربار کے دلوں پر قابض تھی۔ ایک دن نواب روشن الدولہ طرہ باز خاں کے ہاں وہ بیٹھی تھی کہ ان کے پیرومرشد میران سید بھیک بھی آگئے۔ نواب صاحب نے انھیں دیکھ کر نور بائی کو کمرے میں چھپا دیا۔ دروازے پر چلمن ڈلوادی، میران صاحب دیر تک بیٹھے رہے۔ نور بائی نے کچھ دیر تک تو برداشت کیا لیکن پھر تنہائی کی سنگینی سے

1. برائے تفصیل۔ مرقع دہلی ص 74، 82۔

2. تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص 114 الف

تنگ آکر باہر آگئی اور میران صاحب کے حضور میں جھک کر مجرا پیش کیا۔

"حضور کی اجازت ہو تو لونڈی کچھ سنائے"؟

نور بائی کی درخواست پر شیخ خاموش رہے، نور بائی نے اس کو "الخاموشی نیم رضا" سمجھا اور یہ رباعی بڑے پرسوز لہجے میں شروع کی:

شیخے بہ زنِ فاحشہ گفتا مستی کز خیر گسستی و بشر پیوستی
زن گفت چناں کہ می نمایم ہستم تو نیز چناں کہ می نمائی ہستی

شیخ کی حالت یہ رباعی سُن کر متغیر ہوگئی۔ وہ زمین پر مرغ بسمل کی طرح لوٹنے لگے اور انھیں بڑی مشکل سے ہوش میں لایا گیا۔

نادر شاہ کی آمد پر قلعۂ معلا دہلی میں محمد شاہ بادشاہ نے ایک مجلسِ رقص منعقد کرائی اور بادشاہ نے اپنی منظورِ نظر نور بائی کو اس محفل میں بلوایا۔ نادر شاہ اس کے حسن و جمال اور مظاہرۂ کمال سے اتنا متاثر ہوا کہ اسے اپنے ساتھ ایران لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یہ سن کر نور بائی بے ہوش ہوگئی اور محمد شاہ بادشاہ کے چہرے کا رنگ بھی اڑ گیا۔ کیوں کہ وہ نور بائی کی جدائی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ مرزا مہدی کے بیان کے مطابق نادر شاہ نور بائی[1] اور حکیم علوی خاں[2] کو اپنے ساتھ ایران لے گیا تھا۔

امرا کے درباروں کا بھی یہی حال تھا۔ چوں کہ جنگ وجدل سے وہ منھ موڑ چکے تھے اور اپنا بیشتر وقت انھی تفریحی لہو و لعب کے مشاغل میں صرف کرتے تھے، وہ نور بائی اور دیگر طوائفوں کے مکانوں کے چکر لگایا کرتے تھے انھیں ہزاروں روپے صرف کر کے اپنے ہاں مدعو کیا کرتے تھے۔ درگاہ قلی خاں رقمطراز ہے:

"رفعت شانش (نور بائی) بمرتبہ کہ امرا بدیدنش التجا دارند و بر خے بخانۂ اش می روند خانہ اش چوں خانہ ارباب دول سامان ہزار رنگ تجمل در بار... در خانہ عمدہ ہا کہ وارد می شود یک رقم جواہر رونما تواضع

1۔ سوانحات سلاطین اودھ 1/ص 42۔

2۔ سفینۂ ہندی، ص 138,139۔

می کنند و مبلغ معتد بہ بخانہ اش می فرستند کہ قبول دعوت می کند، رخصتانہ
رااز ہمیں قیاس باید کرد،"[1]

رقص وسرود اور طوائفوں کی ہم جلیسی کا یہ شوق اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ جب امرا برائے شکار یا کسی مہم کے لیے جاتے تو ان کے ساتھ گویوں اور طوائفوں کی منڈلیاں بھی ہوتی تھیں[2]

ایک محمد شاہی امیر، عمدۃ الملک امیر خان انجام کی محفلِ رقص وسرود کا منظر ملاحظہ ہو:

سدا صحن میں اس کے رہتا تھا رنگ — سدا تھی نوائے دف ونے وچنگ
کلاونت وقوال سب مل کے وہاں — بموسیقی استاد تھے بے گماں
جو قوال قول وغزل خواں تھا وہاں — عرب محو مدہوش اسرار تھا وہاں
کوئی بیہ دھرپت کو گاتا تھا وہاں — ترانے سے دل کو لبھاتا تھا وہاں
عجب مل کے سازوں سے ہوتا تھا رنگ — کہ تھی واں فلاطوں کی بھی عقل دنگ
کہیں باجتے تھے ستارو منہ چنگ — کہیں خنجری اور کہیں جل ترنگ
کہیں نے کہیں تھا جلا جل کا شور — بجاتا تھا قانون کو کوئی زور
غرض راگ، سازوں کا یہاں تک تھا شور — کہ پہنچے ہے کب شور یوم النشور
کہیں رقص کرتے تھے مہ طلعتاں — کہیں دید کرتے تھے ساغر کشاں
یہ سب خوبرویانِ ہندی نژاد — نمک سار زاد نمک سار ساز
خوشی ہو کے آتے تھے جب رقص میں — انھیں دیکھ آتے تھے سب رقص میں
غرض کیا کہوں بزم میں اس کی بات — کہ اِندر کا بھی وہاں اکھاڑہ تھا مات[3]

اس عہد کے ادب اور مرقع دہلی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارھویں صدی میں مذہبی اور غیر مذہبی کوئی ایسی تقریب نہ تھی جس میں رقص وسرود کو لازمی قرار نہ دیا جاتا ہو، میلے ٹھیلوں میں ناچ گانے کا خاص طور پر انتظام کیا جاتا تھا۔ بادشاہ سے لے کر پرجا تک ہر شخص اس رنگ میں رنگا ہوا نظر

1. مرقع دہلی ص 73۔

2. برائے تفصیل ملاحظہ ہو، چہار گلزار شجاعی (قلمی) ص ر 201 ب نیز سیر المتاخرین (فارسی) ج 2۔ ص 651

3. دیوانِ تاباں۔ ص 266، 264۔

آتا تھا۔ اکثر بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ شاہ وارث الدین، وارث کے دولت کدہ پر اکثر وبیشتر ناچ ورنگ کی محفل منعقد ہوا کرتی تھی۔[1]

قوالی

قوالی کا بھی بہت رواج تھا۔ چشتی سلسلہ کے صوفیا قوالی کو روحانی غذا سمجھتے تھے اور قوالوں کی سرپرستی کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ عوام میں بھی اس کا ذوق سرایت کر گیا۔ حالانکہ صوفیا کے نزدیک عوام کے لیے قوالی ممنوع تھی۔[2] مختصر یہ کہ اٹھارھویں صدی میں عرسوں کی مجلسوں[3] کے علاوہ شاہانِ مغلیہ سے لے کر عوام تک ہر طرح کے لوگ یا تو اپنے ہاں مجلسِ قوالی منعقد کرتے تھے یا دوسروں کے ہاں جا کر سنتے تھے۔

شاہ عالم ثانی (1756-1806) قوالی کا اتنا دل دادہ تھا کہ شاہی آداب کے خلاف وہ خواجہ میر درد کے تکیہ میں جا کر قوالی کی محفل میں شریک ہوا کرتا تھا۔ خواجہ صاحب کے ہاں ہر ماہ کی دوسری تاریخ کو محفلِ سماع ہوتی تھی، اور شہر کے عوام وخواص حاضر ہوتے تھے۔ مصحفی نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عالم بادشاہ علالت کی حالت میں بھی محفلِ قوالی سے محروم رہنا نہیں چاہتا تھا اور محفلِ سماع میں شرکت ضرور کرتا تھا۔ ایک دن وہ حالت علالت میں خواجہ صاحب کی محفل میں شریک ہوا کافی دیر دوزانو بیٹھنے کے بعد اسے کچھ کمزوری محسوس ہوئی اور اس نے اپنے پیر دراز کر دیے۔ خواجہ صاحب کو بادشاہ کی یہ حرکت محفلِ سماع کے آداب کے خلاف معلوم ہوئی۔ ان کو غصہ آ گیا اور انھوں نے بھی بادشاہ کی طرف پیر پھیلا دیے، بادشاہ نے خواجہ صاحب کے اس طرزِ عمل سے ناراضگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ دو زانو بیٹھ گیا۔[4]

شاہ بھیک کے مرید وخلیفہ اور محمد شاہی امیر، روشن الدولہ کو بھی قوالی کا شغف تھ۔ وہ قوالی کی

---

1. برائے تفصیل، مجموعۂ نغز۔ ص ج،2۔ ص291۔
2. سیر الاولیا ص491،534۔
3. مرقع دہلی۔ ص19،1۔
4. تذکرۂ ہندی۔ ص92،93۔

مجلسیں کرتا اور قوالوں کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا۔[1] جتا قوال، نواب صمصام الدولہ کی سرکار سے وابستہ تھا۔ برہانی امیر خان اور رحیم خاں جانی، نواب عمدۃ الملک امیر خان انجام کی سرکار سے منسلک تھے۔[2]

تاج خان قوال دہلی کے نامی گرامی قوالوں میں سے تھا۔ وہ شاہ بھیک کا مرید تھا۔ ہر ماہ کی ساتویں کو اپنے مکان پر قوالی کی محفل کرتا۔ برہانی قوال کے ہاں ہر سوموار کو قوالی ہوتی تھی، ان محفلوں میں چھوٹے بڑے، امیر و غریب، تاجر اور پیشہ ور ہر طبقے کے لوگ شریک ہوتے تھے۔[3]

یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ جہاں اٹھارھویں صدی میں سیاسی بدامنی، معاشرتی انحطاط، فقر و فاقہ، اقتصادی زبوں حالی اور بے روزگاری کا دور دورہ تھا وہاں فنِ موسیقی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ مثالیں اس زمانے کے فارسی تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں کثرت سے ملتی ہیں۔

صوفیا کے ہاں مجلس قوالی سے متعلق میر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو　　مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو
پھرتے ہیں چنانچہ لیے خدام بہلاتے　　درویشوں کے پیراہنِ صد چاک قصب کو

اس غزل پر شام سے تو صوفیوں کو وجد تھا۔

پھر نہیں معلوم کچھ مجلس کی کیا حالت ہوئی

شب بازی[4]

یہ عوام کے لیے تفریحِ طبع کا بہت مروج ذریعہ تھا۔ اٹاوہ اور دہلی کے شب باز اپنے فن میں مشہور معروف تھے۔ اپنے سفر کے دوران میں محمد شاہ کا جب گذر اٹاوہ شہر کے قریب سے ہوا تو

---

1. چہار گلزار شجاع۔ ص 227۔
2. مرقع دہلی۔ ص 62۔
3. مرقع دہلی، ص 58،60۔
4. فارسی میں شب بازی سوانگ اور کٹھ پتلی کے تماشے کے معنی میں مستعمل ہے۔

روز و شب دقیعہ صورت بازی آئینہ است　　ہست غیبی در ہنر آنرا کہ شب بازی کند

بحوالۂ سفرنامہ آنند رام مخلص (مطبوعہ) (فٹ نوٹ۔2) ص 36۔

وہاں کے شب باز بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اپنے کرتب دکھائے، بطور انعام بادشاہ نے پانچ روپے دیے۔[1]

بھگت بازی

شمالی ہندستان میں بھگت باز نامی ایک پیشہ ور طبقہ پایا جاتا تھا۔ اور اس فن سے اپنی روزی کماتا تھا۔ ان تماشوں میں ہندو مسلماں دونوں برابر شرکت کرتے تھے، اپنے ڈراموں میں یہ لوگ مہابھارت کے مناظر پیش کرتے تھے۔ ان سے ایک شخص مردانہ لباس زیب تن کر کے کرشن (کنہیا) کا کردار پیش کرتا تھا، اور دوسرے لوگ زنانہ لباس سے ملبوس اور زیورات سے مزین گوپیوں کا کردار ادا کرتے تھے۔ سوانگ کے دوران میں نقال (Actors) کبیر داس کے کلام سے موقع کی مناسبت سے گیت بھی گاتے جاتے تھے[2] یہ سوانگ ہندستان میں فن ڈرامہ کے ارتقا کا پیش خیمہ تھے۔ اور رفتہ رفتہ فن ڈرامہ مغربی ڈرامہ نگاری سے متاثر ہوا اور اب ہندستان میں یہ فن کافی ترقی کر چکا ہے۔

دہلی کے مشہور ترین بھگت بازوں میں تقی نامی شخص کا شمار ہوتا تھا، اور وہ محمد شاہ کا منظور نظر بھی تھا۔ بڑے بڑے امرا اسے اپنے مکان پر مدعو کرتے اور بڑے شوق سے اس کی کرامات دیکھتے[3]

قاسم نے ذیل کے شعر میں دہلی کے بھگت بازوں کی تعریف کی ہے:

باندازِ بھگت بازانِ دہلی　　　بھگت کا سانگ لایا کو بکن بھی[4]

نقال

مغل بادشاہوں کے دربار سے نقالوں اور لطیفہ گویوں کی منڈلیاں بھی وابستہ ہوتی تھیں[5]

---

1. سفرنامہ آنند رام مخلص۔ ص 26۔
2. ملفوظ رزاقی، ص 49.74۔
3. مرقع دہلی ص 65.66۔ تاریخِ فرخ سیر بادشاہ (ق) ص 266۔
4. کلیات قاسم (ق) ص 128۔
5. حدیقۃ الاقالیم۔ 44، حافظ چندا، خواصی، مزا، یار ولذت، سبزہ اور بادل محمد شاہ کے درباری نقال تھے، تاریخ شاکر خانی (ق) ص 114 الف۔

عمدۃ الملک امیر خان انجام نے لطیفہ گوئی ہی کے فن کے ذریعہ محمد شاہ بادشاہ کے دربار تک رسائی پیدا کی تھی اور نمایاں ترقی بھی کی تھی۔ آخر میں الہٰ آبا کا صوبہ دار بھی مقرر ہوا تھا۔[1] امیر زادہ لطیف خان کے دولت کدہ پر نقالوں کی ایک محفل منعقد ہوا کرتی تھی۔ شہر کے نامی گرامی نقال شرکت کرتے تھے۔ اس مجلس میں عوام وخواص کا جمِ غفیر حاضر ہوتا تھا۔[2]

دہلی کے بازاروں اور بالخصوص چاندنی چوک میں شہر کے منتخب نقال اور مسخرے جمع ہوتے اور جگہ جگہ پر اپنی دکان سجا کر ناظرین کو محظوظ کرتے تھے۔[3] عرسوں میں بھی وہ لوگ موجود ہوتے تھے۔ اٹھارھویں صدی کے نقالوں میں شاہ دانیال، انوٹھا اور یاری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔[4]

دوسرے کھیل اور تماشے

انشا اللہ خان انشا نے چند کھیلوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں بچے اور بوڑھے دونوں دل چسپی لیتے تھے۔ مثلاً چنڈول گداگر بول، کاٹھ کتول بانسلی بھنبیری میرانانو، کالی پیلی ڈلو، چدر چھپول، گھور کھنڈے چوہے لنڈے، مونگ چناڈ گڈوٹی ڈو، چھلا چھپول، کالے پیلے دیو شیر بکری باگھ ایڑن کبڈی، وزیر بادشاہ، آنکھ مچولی، کڑوا تیل بلی پادے وہی پھلیل چھائیں مائیں گول گھمائیں راجہ گھر بیٹا ہوا، دوڑے آئیو کوئی ایسا بھی داتا ہو، چڑیا کے بند چھڑادے، لوڑھی ٹیسو رائے وغیرہ، لوہڑی کا کھیل، دہلی سے کابل تک مروج تھا، اس کی تفصیل یوں ہے: ہولی کے تہوار سے کچھ دنوں پہلے بچے کچھ جوانوں کو اپنے ساتھ لے کر محلّہ محلّہ گشت لگاتے پھرتے تھے۔ اور ہر گھر سے نقدی زر یا ایندھن حاصل کرتے تھے اور ہولی کی مقررہ شب کو اس ایندھن کے انبار میں آگ لگاتے تھے، ان ٹولیوں میں مسلمان بچے بھی ہوتے تھے۔[5]

---

1. سفینۂ ہندی۔ص 7، برائے چند لطائف ملاحظہ ہو۔
تذکرہ طبقات الشعرا۔ص 69,71۔
2. مرقع دہلی۔ص 29۔
3. مرقع دہلی۔ص 17۔
4. مرقع دہلی۔ص 65 تا 68۔
5. دریائے لطافت (اردو ترجمہ) ص 132 ,131 ,21۔

آنکھ مچولی

کم سن لڑکے اور لڑکیاں آنکھ مچولی کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔ اور آج بھی دیہاتوں اور قصبوں کے لڑکے اور لڑکیاں یہ کھیل کھیلتے ہیں، حسرت کے اشعار ہیں۔

اگر شوق تجھے آنکھ مچولی سے ہے　　مجھ کو بھی کھیلنا تجھ اچپل سے ہے
کر بند میری آنکھ اور تو چھپ جا　　میں ڈھونڈوں تجھے یہ کھیل اول سے ہو[1]

گلی ڈنڈا

یہ بھی ہندستاں کے مشہور کھیلوں میں سے ہے۔ شہر اور دیہات وقصبات میں یکساں مقبول تھا۔[2]

آہو بازی

آہو بازی[3] اور گل بازی[4] امرا اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے تفریحی مشاغل تھے۔

جھولا

قدیم زمانے سے ہندستان کی عورتوں میں جھولے کا رواج تھا۔ ساون کے مہینے میں آج بھی یہ نظر آجاتا ہے۔ عام طور پر لڑکیاں گھروں کی کڑیوں میں رسّی ڈال کر جھولا بنالیا کرتی ہیں۔ اٹھارھویں صدی میں تہواروں اور عرسوں کے مواقع کے میلوں میں بچے اور جوان سبھی جھولا جھول کر اپنا دل بہلایا کرتے تھے۔ انشا اللہ خان انشا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے عرس کے موقع پر درگاہ کے قرب وجوار کی املیوں پر جھولے ڈالے جاتے تھے۔ اور وہاں پری زادوں کا جمِ غفیر ہوتا تھا۔[5]

---

1. دیوان حسرت (ق) ص169 (الف)
2. برائے تفصیل دریائے لطاف (فارسی) ص77۔
3. ہرنوں کی لڑائی۔
4. پھولوں سے کھیل۔
5. دریائے لطافت (اردو ترجمہ۔ ص،100۔

محلاتِ شاہی

نادراتِ شاہی، جو شاہ عالم ثانی کے کلام کا مجموعہ ہے، اور بزمِ آخر جس میں منشی فیاض الدین نے دہلی کے دو آخری بادشاہوں یعنی اکبر ثانی (1839-1806) اور بہادر شاہ ظفر (1857-1839) کے طرزِ معاشرت کی تصویر پیش کی ہے۔ان دونوں کتابوں کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی محلات کی زندگی میں عیش وعشرت، آرام وآسائش اور دفع الوقتی کے سوا کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا، دن رات جشن میں گزرتے تھے، آخری چہار شنبہ، بسم اللہ خوانی، سال گرہ بسنت، بکرید، جلوس کا جشن چھٹی، دوالی، رتجگا، ساچق، عید، گودھن پوجن مہندی، شب برات، سرتی پوجن، عرس (پیر دستگیر عبدالقادر جیلانی) ہدیے کی شادی، ہولی کا جشن، بیاہ کی مہندی، نوروز کا جشن، پیروں کی نیاز کا جشن خواجہ صاحب کی چھڑیاں، سلونو، پھول والوں کی سیر[1] دن عید اور رات شب برات ہوتی تھی گویا بزم ہی بزم تھی، رزم کا نام تک نہ تھا۔

دہلی کے بازار

دہلی کے بازاروں کے بارے میں میر کے علاوہ دوسرے شعرا نے بھی بہت کچھ لکھا ہے:

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ہفت اقلیم ہر گلی ہے، کہیں دلی سے بھی دیار ہوتے ہیں

دہلی کے دو بازار، چاندنی چوک اور چوک سعد اللہ خان، گویا سارے شہر کی جان تھے اور دہلی کی طرزِ معاشرت کا اصلی نمونہ ان بازاروں میں دیکھا جا سکتا تھا۔چوک سعد اللہ خان کی رونق کا یہ عالم تھا کہ اس کو دیکھ کر مرغِ نظر حیرت کا شکار ہو جاتا تھا، درگاہ قلی خان رقمطراز ہے:

نظر از ملاحظہ محسوسات رنگارنگ دست و پاگم می کند، و نگاہ بمشاہدۂ تجدد امثال در تماشا و تعداد تمثال مواد تمنا در آئینہ خانہ حیرت می نشیند[2] ایک طرف: رقص مارو خوش رو قیامت آباد،،

---

[1] وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے گزشتہ سال اس جشن کا احیا کیا تھا کیونکہ اسے ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا ذریعہ سمجھا گیا۔امسال (1964)28 ستمبر کو یہ جشن منایا گیا۔صدر جمہوریہ ہند اور وزیر اعظم اور شہر کے دوسرے ہندو مسلمانوں نے اس میں شرکت کی۔

[2] مرقع دہلی ص ر 14.15۔

تھا تو دوسری طرف "کرسی ہائے چوبیں از قبیل منابرِ نصب کردہ" جن پر کھڑے ہو کر پیشہ ور اور شیریں مقال واعظ ہر ماہ اور موقع کی مناسبت سے مضامیں پر وعظ کہتے نظر آتے تھے۔ مثلاً ماہ رمضان المبارک میں اس ماہ کے فضائل اور روزہ کے فوائد، حج کے مہینے میں حج کے مناسک۔ محرم الحرام میں ذکر شہادت اس طرح یہ واعظ عقیدت مندوں سے کافی دولت کما لیتے تھے، یہ رواج غدر سے پہلے تک تھا، غدر سے پہلے فوارے پر عیسائی مبلغ بھی وعظ کہا کرتے تھے، کسی گوشے میں اہل تنجیم اور رمال اپنی دکان جمائے دکھائی دیتے، تو کسی کونے میں آتشک اور سوزاک کی دوا کی دکان بھی نظر آتی، جہاں لوگوں کا اجتماع لگا ہوتا، ایک جانب اسلحہ فروشوں کی دوکانیں تھیں تو دوسری طرف میوہ فروشوں کی۔[1]

میر حسن دہلوی نے چاندنی چوک کی یوں تعریف کی ہے:

یہ دل چسپ بازار تھا چوک کا کہ ٹھہرے جہاں پر وہیں دل لگا
جہاں تک رہتے تھے بازار کے کہے تو کہ تختے تھے گلزار کے[2]

مختصر یہ کہ چاندنی چوک دہلی میں سب سے زیادہ دل فریب اور دل کش مقام تھا۔ اس بازار کے وسط میں ایک نہر بہتی تھی جس کے دونوں طرف، کپڑے، جواہرات، عطریات، ظروف، سامانِ آرائش، آلاتِ حرب اور حقوں وغیرہ کی دکانیں تھیں جن پر لوگوں کا جمگھٹا رہتا تھا، درگاہ قلی خاں لکھتا ہے کہ ایک موقع پر ایک یتیم، امیر زادہ چاندنی چوک کی سیر کو جانا چاہتا تھا۔ بیوہ ماں نے اپنے لڑکے کی خواہش پورا کرنے کی غرض سے تہ دستی کے عذر کے ساتھ ایک لاکھ روپے اسے دیے اور اس سے کہا:

"ہر چند ازیں مبلغ نفائس ونوادر ایں چوک تحصیل نمی تواں کرد لیکن
چوں طبیعت عزیز القدر مصروف ایں معنی است ایں وجہ محقرے
راصرف ضروریات پسندِ خاطر باید نمود۔"[3]

اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ چاندنی چوک کی دوکانوں میں لاکھوں روپے کا ایسا نفیس اور نادر سامان مہیا رہتا تھا کہ ایک لاکھ روپیہ بھی وہاں کچھ معنی نہیں رکھتا تھا۔

---

1. برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مرقع دہلی۔ ص 19-17۔
2. مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص 15۔
3. مرقع دہلی ص 26۔

قہوہ خانے

اس بازار میں قہوہ خانے بھی تھے، جہاں دہلی کے شعرا جمع ہوتے تھے۔
چنڈو خانے بھی تھے جن میں بے فکرے بیٹھ کر عالم بالا کی سیر کرتے تھے اور یہاں سے پھر افواہیں پھیلتی تھیں جن کے نتائج نادر شاہ کے قتلِ عام کی صورت میں بھی ظاہر ہوئے۔

مدرسے

مغل بادشاہوں کو علم و ادب سے بڑی دل چسپی تھی۔ اور انھوں نے اس کو فروغ دینے میں حتی الوسع کوششیں بھی کی تھیں جس کے تفصیل سے ذکر کی گنجائش نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ اورنگ زیب نے سارے ملک میں مدرسے قائم کیے تھے۔

سجان رائے بھنڈاری کا بیان ہے:

''در کوچہ بازار و ہر صحن و برزن مساجد و معابد و خوانق و مدارس کہ عالمیان ازاں بہرہ دنیا و عقبٰی و فائدہ صورت و معانی حاصل نمایند تعمیر یافتہ''[1]

اساتذہ اور طلبا کو ماہانہ وظائف سرکار کی طرف سے دیے جاتے تھے۔ اس طرح بطور امداد سرکار اچھی خاصی رقم علم و ادب کو فروغ دینے پر صرف کرتی تھی[2] لیکن اٹھارھویں صدی کے سیاسی انحطاط اور اقتصادی زبوں حالی و بدامنی کے سبب سے بقول مصنف تاریخ محمد شاہی:

''نہ مدرس را شغلِ کتاب و نہ مدرسہ طالب علم و ذکر نبی و اصحاب خانقا ویران و درویشان خراب، از مسجد موذن و خطیب را بنا بر فکر روزی احتساب،،[3]

مگر ان تمام نامساعد حالات کے باوجود دہلی میں چند مدرسے قائم تھے۔ کچھ تو ایسے تھے جو خانقاہوں اور مسجدوں سے منسلک تھے، اور کچھ علاحدہ تعلیم گاہوں کی شکل میں تھے۔ شمالی ہندستان

---

1. خلاصۃ التواریخ۔ ص 31۔

2. برائے تفصیل، تاریخ عالم گیری (ی) ص 70 ب۔

3. تاریخ محمد شاہی (ق) 158 الف۔

کے تقریباً ہر بڑے شہر اور قصبے میں علاحدہ مدرسے تھے ویسے تو ہر مسجد سے مکتب منسلک تھا چاہے وہ مسجد دیہات ہی میں کیوں نہ ہو۔

مدرسہ رحیمیہ

اس کے بانی شاہ ولی اللہؒ کے والدِ بزرگوار شاہ عبدالرحیم تھے۔ یہ محلّہ "مہندیان" کے قریب تھا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں اب مولانا آزاد میڈیکل کالج کی عمارت ہے۔ شاہ عبدالرحیم نے اس مدرسے میں حدیث کی تعلیم دینا شروع کی۔ دور دور سے طالب علم اس مدرسے میں تحصیلِ علم کے لیے آتے تھے۔ مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد شاہ ولی اللہؒ نے اس مدرسہ کی نگرانی شروع کی اور ان کی حیات میں یہ مدرسہ تعلیمِ حدیث کا شمالی ہندستان میں واحد مرکز بن گیا تھا۔ طالب علموں کی کثرت کی وجہ سے محمد شاہ بادشاہ نے شاہ صاحب کو ایک حویلی مدرسہ کے لیے عنایت کی تھی۔ 1857 تک یہ مدرسہ قائم رہا، غدر میں برباد ہوگیا۔ ترکمان دروازہ اور چتلی قبر کے درمیان یہ محلّہ آج بھی مدرسہ شاہ عبدالعزیز کے نام سے مشہور ہے[1]۔

اس مدرسہ کے سیکڑوں طلبا کو حافظ رحمت[2] خان کی سرکار سے وظائف ملتے تھے[3]۔ نجیب الدولہ[4] علم وعلما کی بہت سرپرستی کرتا تھا۔ شاہ عبدالعزیز کا بیان ہے کہ اس کے دربار سے نوسو (900) علما وابستہ تھے، اور ان کے وظائف پانچ روپے سے پانچ سو روپے تک مقرر تھے[5]۔

مدرسہ بازار خانم

حضرت شاہ کلیم اللہ[6] دہلوی کی خانقاہ دہلی کے مشہور بازار خانم[7] میں تھی، جس سے منسلک

---

1. برائے تفصیل، واقعات دارالحکومت دہلی۔ ج6 ص286، نیز حیاتِ ولی، ص231۔
2. برائے سوانح حیات ملاحظہ ہو، حیات حافظ رحمت خان، مولفہ سید الطاف علی۔
3. گلستانِ رحمت ص231 الف وب
4. برائے سوانح ملاحظہ ہو، نجیب الدولہ (انگریزی) مولفہ پروفیسر شیخ عبدالرشید (علی گڑھ)
5. ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی۔ ص81، نیز مجموعۂ نغز (مقدمہ) ص کسط۔
6. برائے سوانح ملاحظہ ہو تاریخ مشائخ چشت۔ مولفہ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ ص366،422۔
7. بازار خانم لال قلعہ کے برابر تھا، برائے تفصیل واقعات دارالحکومت دہلی۔ ج2 ص111 ۔

ایک مدرسہ بھی تھا جو علم وادب اور روحانی احیا کا بہت بڑا مرکز تھا۔ دہلی کے گردونواح میں شاہ صاحب کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔

اور بڑی تعداد میں وہاں طلبا آتے تھے۔ اس مدرسہ کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہوتیں شجرۃ الانوار کے ایک بیان سے اس مدرسہ کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ:

''بسیار طلبۂ علم آمدہ سکونت می نمودند وسبق کتب ہائے خواندونان دپارچہ نیز از سرکار یافتند،،[1]

یہ مدرسہ ملکہ پورا علاقہ غدر کے بعد منہدم کر دیا گیا، اور وہاں کی آبادی تباہ و برباد ہوئی، مناقب المحبوبین مین لکھا ہے:

''درسال غدر چوں نصارا براہل اسلام دہلی فتح یافتند مکانہائے کہ قریب لال قلعہ بودند ہمہ را منہدم کردند،،[2]

غالب ایک خط میں سید احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں:

''شیخ کلیم اللہ جہان آبادی مقبرہ اجڑ گیا، ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی، ان کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے، اب یک جنگل ہے، اور میدان میں قبر، اس کے سوا کچھ نہیں، وہاں کے رہنے والے گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں،،[3]

اب یہ علاقہ پریڈ گراونڈ کہلاتا ہے۔ اور اب وہاں مولانا آزاد کا مقبرہ تعمیر ہوا ہے، اس علاقے کے منہدم ہونے کا بین ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ کچھ دنوں پہلے دہلی کارپوریشن نے اس علاقے کی کھدائی کروائی تو وہاں مکانوں کی دیواریں اور مضبوط بنیادیں ملیں علاوہ ازیں دو مزار بھی مٹی میں دبے ہوئے نکلے۔ چونکہ لوحِ

---

1. شجرۃ الانوار (قلمی) مملوکہ پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ)

2. مناقب المحبوبین۔ ص450۔

3. اردوے معلی حصۂ اول۔ ص184 ,183۔

مزار کو فوراً لال قلعہ میں محفوظ کر دیا گیا تھا، اس وجہ سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ مزارات کن بزرگوں کے تھے۔

مدرسہ غازی الدین خان

نواب غازی الدین خان فیروز جنگ نے یہ مدرسہ اجمیری دروازہ کے متصل تعمیر کروایا تھا۔[1] جب شاہ فخر الدین، اورنگ آباد (دکن) سے دہلی آئے تھے تو انھوں نے اسی مدرسہ میں قیام فرمایا تھا۔ اور درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا تھا۔[2]

شجرۃ الانوار کے مصنف کا بیان ہے:

''مدرسہ خورد غیاض (غازی) الدین خان مرحوم کو بیرونِ اجمیری دروازہ واقع است سکونت درزیدند وارشاد وتدریس اشتغال نمودند مرجع خاص وعام شدند،،[3]

مندرجہ بالا مشہور مدرسوں کے علاوہ ہم عصر ادب میں دوسرے مدرسوں کے صرف حوالے ملتے ہیں، دہلی کی جامع مسجد سے بھی ایک مدرسہ وابستہ تھا۔ نادر شاہ کے قتلِ عام میں جامع مسجد کو بہت نقصان پہنچا تھا[3]

ہزاروں کی تعداد میں علما، صوفیا اور طلبا شہید کر دیے گئے تھے۔ مرزا محمد کام بخش کہتا ہے:

> ''بالکل سکنۂ آن کہ اکثر از آنہا اولیاء اللہ وعلما وفضلای ملت اسلام بودند وہر کدامی در رکنِ از ارکان مسجد مقام طاعت وعباداتِ الٰہی وصلواۃ ودرود حضرتِ رسولؐ پناہ ومدرسہ تدریس علومِ شرعی از تلاوتِ قرآن واحادیث شریف وفقہ مذہب حنیف ساختہ شب وروز تبلیغ خلق اللہ درآں زاویہ عزلت مشغول . بودند، صغیر وکبیر شاگرد واستاد

1. تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن دہلوی) ص 81۔
2. برائے سوانح حیات ملاحظہ ہو، تاریخ مشائخ چشت۔ ص 529,460۔
3. چہار گلزار شجاعی (ق) ص۔ 130،

ومرید ومرشد را بقتل رسانیدہ وشہید ساختند [1]

مدرسہ اعتماد الدولہ محمد امین خاں، اجمیری دروازہ کے باہر اسی مقام پر تھا، جہاں اس کی قبر ہے [2]

مدرسہ کوچہ بلاقی بیگم

کوچہ بلاقی بیگم میں ایک مدرسہ تھا جو اس کوچہ کے نام سے مشہور تھا۔[3] مدرسہ محمد غیاث الدین خاں، دہلی کے محلہ مغل پورہ میں 1148ھ میں قائم کیا گیا تھا[4] اس کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔

خانقاہیں

ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے بعد سے دہلی روحانی تعلیم وتربیت کا بہت بڑا مرکز تھی۔ اور ہر سلسلے کے بلند مرتبہ بزرگ اور مشائخ، یہاں جلوہ افروز تھے۔ رشد وہدایت کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ شاہ عبدالعزیز کا یہ قول بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ:

> "درعہد محمد شاہ بادشاہ بست ودو بزرگ صاحب ارشاد از بہر خانوادہ
> در دہلی بودند ایں چنیں اتفاق کم می شود"[5]

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی، شاہ فخر الدین دہلوی، مرزا مظہرِ جانِ جاناں، خواجہ میر درد، سعد اللہ گلشن وغیرہ کی ایسی خانقاہیں تھیں جہاں سے رشد وہدایت کے چشمے جاری تھے۔ غدر سے کچھ زمانے پہلے تک یہ خانقاہیں بارونق رہیں، اِن خانقاہوں کے بارے میں پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ ان میں:

> "تزکیۂ باطن وتہذیب نفس کے درس دیے جاتے تھے، اور باطنی
> زندگی کو سنوارنے کے لیے رات دن کوششیں جاری رہتی تھیں۔"[6]

---

1. تاریخ شہادت (ب) فرخ سیر وجلوس محمد شاہ بادشاہ (ق) ج2/ص272۔
2. تاریخ ہندی (ق) ص493۔
3. کلیات عزیزی (ق) حصہ اول ص7 الف وب
4. مآثر الامرا (فارسی) ج3 ص770۔
5. ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی۔ ص34۔
6. تاریخ چشت، ص/345۔

ادبی مجلسیں اور مشاعرے وغیرہ

اٹھارھویں صدی، شمالی ہندستان میں اردو زبان کی ترقی اور فروغ کا نہایت سنہری اور اہم دور تھا۔ اگرچہ فارسی سرکاری زبان تھی اس کا عام رواج تھا۔ مکتبوں اور مدرسوں میں فارسی کی تعلیم برابر جاری تھی۔ فارسی پڑھنا لکھنا، علم وفضل ہی کے لیے نہیں، تہذیب وشائستگی کے لیے بھی لازمی خیال کیا جاتا تھا۔ لوگ فارسی شعر وسخن کے کتنے دل دادہ تھے، اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ اردو شعرا کے تذکرے اور تمام کتابیں فارسی زباں ہی میں لکھی گئیں، لیکن اردو زباں رفتہ رفتہ فارسی کا مقام حاصل کرتی جارہی تھی اور فارسی میں کہنے والے شعرا کو بھی بالآخر اس زبان کی طرف مائل ہونا پڑا۔ حالانکہ ابتدا میں انھوں نے اس زباں میں شعر کہنا اپنے لیے کسر شان سمجھا اور اس زبان میں شعر کہنے کو فنِ بے اعتبار جانا۔ مصحفی نے ایک جگہ اپنے متعلق لکھا ہے کہ:

''بمقتضائے رواج زمانہ آخر کار خود را مصروف بہ ریختہ گوئی داشتہ برائے ایں کہ رواج شعر فارسی در ہندستان بہ نسبت ریختہ کم است و ریختہ ہم فی زمانہ بہ پایہ اعلیٰ فارسی رسیدہ بلکہ از بہتر گردیدہ[1]''

خان آرزو کے بارے میں میر تقی میر نے لکھا ہے:

'' گاہے برائے تفننِ طبع دوسہ شعر ریختہ فرمودہ'' ایں فن بے اعتبار' را کہ ما اختیار کردہ ایم اعتبار دادہ اند''[2]

انعام اللہ خان یقین کا قول ہے:

کہا نہیں مجھے ریختہ کا خیال ہوا واجب امر کا امسال
بخت نے مجھ کو کیا لاجواب وگرنہ میں اور ریختہ کیا حساب[3]

بہر حال رواجِ زمانہ سے مجبور ہوکر شعرا نے اس زبان کو اپنا لیا اور شعر کہنا شروع کردیا۔ میر نے اپنے تذکرہ '' نکات الشعرا'' میں اُن 103 شاعروں کا ذکر کیا ہے جو اردو زبان میں شعر کہتے تھے۔ مصحفی کے تذکرۂ ہندی'' (مصنفہ 1209ھ) میں 278 شعرا اور 5 شاعرات کا ذکر ہے۔ اس

---

1. تذکرۂ ہندی، ص248 عقدِ ثریا ص2۔

2. نکات اشعرا ص3 تذکرہ ریختہ گویان (گردیزی) ص7۔ 3. دیوان یقین ص7۔

سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اردو شاعری کو کتنا فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ مصحفی نے اپنے فارسی تذکرہ ''عقدِ ثریا'' (مصنفہ 1764 1199 ھ میں کل 119 شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی میں شعر کہنے والوں کی تعداد دن بدن کم ہوتی جارہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں کئی اردو، شعرا کے تذکرے، تصنیف ہوئے مثلاً نکات الشعرا'' تذکرۂ گردیزی۔ مخزنِ نکات، تزکرۂ شورش، تذکرۂ مسرت افزا، تذکرۂ ہندی، ریاض الفصحا، گلزارِ ابراہیم، تذکرۂ عشق، تذکرۂ طبقات الشعرہ، تذکرۂ شعرا اردو (میر حسن دہلوی) مجموعۂ نغز وغیرہ۔

دلی دکھنی کی تقلید میں دہلی کے شعرا مثلاً: آبرو، آرزو، شاکر ناجی، مضمون، میر، سودا، حاتم، خواجہ میر درد، مرزا مظہر جان جاناں نے پہلے تو تفنن طبع کی غرض سے اردو میں شاعری کی لیکن جب عوام کو اس زبان سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اور اردو شاعری کو قبول عام حاصل ہوا تو ان بزرگوں نے اردو زبان کو صاف ستھرا بنانے کی کوشش کی۔ چونکہ اردو زبان ہندستان میں پیدا ہوئی تھی۔ لہٰذا اس پر ہندی الفاظ غالب تھے۔ شاہ حاتم کو اپنے ابتدائی کلام پر نظر ثانی کرنی پڑی کیوں کہ اس پر ہندی الفاظ کی کثرت تھی، جس کی وجہ سے کلام میں ایہام غالب تھا۔ مختصر یہ ہے کہ خواجہ میر درد، مرزا مظہر جان جاناں اور شاہ حاتم نے اردو زبان میں ہندی الفاظ کے بجائے فارسی الفاظ ومحاورے داخل کیے، طبقۂ سوم کے شعرا کا ذکر کرتے ہوئے شیخ محمد قیام الدین قائم نے لکھا ہے کہ:

> ''طرز کلام اینہا مانا بروبہ فارسی است چنانچہ جمیع صنائع شعرے کہ قرار دادہ اساتذہ اسلاف است بکار می برند واکثرے از ترکیبات فرس کہ موافق اردوئے معلا مانوس گوش می یابند منجملہ جواز الابیان می دانند،،[1]

مختصر یہ کہ ان بزرگوں نے اردو زباں کو پروان چڑھایا اور اس لائق بنایا کہ شرفا بھی اس زبان میں شعر کہہ سکیں کیوں کہ دکھنی زباں ایسی نہ تھی کہ اس میں شعر کہے جاسکتے۔ بقول قائم:

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
ایک بات لچری بزبان دکنی تھی

1۔ مخزن نکات۔ ص/ 33۔

اردو زبان کی دل فریبی اور ہر دل عزیزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستانی سماج کے ہر فرد "ہندو مسلمان" نے اس زبان میں شعر کہنا طرۂ امتیاز سمجھا۔ لہٰذا اس زمانے کے شعرا میں ہر پیشے اور طبقے کے لوگ شاعروں کی فہرست میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً میر آثر خوش اوقات و نیک سیرت دور دیشے است موقر و صاحب سخنے است مؤثر، عاصی، در علم تاریخ و شمشیر شناشی و لطیفہ گوئی دستے بہم رسانیدہ، رائے "پریم ناتھ" "خطاط بے نظیر" آگاہ، بوسیلۂ قصہ خوانی بسری برد، "میر شیر علی افسوس" داروغۂ توپ خانہ عالی جاہ "حشمت سپاہی پیشہ" رنگین سپاہی پیشہ جوان محمد شاہی، خط نستعلیق خوب می نویسد، مہربانِ خان رند "مجلسے رنگیں و بزم ارم تزئیں داشت" "سجاد" در لطیفہ گویان طاق، در ہر امور کہ دخل کردہ بکمال رسانیدہ، علم طلب ہم حاصل نمودہ۔ طلسمات وانشا، وخوش نویسی و شعر فہمی بمراطبِ اعلیٰ رسانیدہ شوق مرد سپاہی پیشہ صاحب دیوان، مدتے در سرکار نواب عماد الملک غازی الدین خان بہادر بوسیلۂ سپہ گری بسر بردہ" شاعر، بزرگ و بزرگ زادہ، نواب عماد الملک غازی الدین خان" بر جمیع علوم قادر دور فنون سخن ماہر ہفت اقلیم و ہفت زباں فغان لطائف و ظرائفِ او مشہور است، اگریاں، سپاہی پیشہ، وحشت، وصف دارد درفن سپہ گری استوار، [1]

جوشش نے اپنے ایک شعر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہر شخص شعر و شاعری کے میدان میں نظر آتا تھا۔

شاعری کا فن بھی جوشش زور فن ہے کچھ نہ پوچھ

ہر کس و نا کس نظر آتا ہے اس فن کا حریف [2]

شعر و شاعری کا چرچا اتنا عام ہو گیا تھا کہ طفلانِ مکتب بھی بازار سے جا کر شاعروں کا کلام خرید لاتے، اور بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے، کم ترین، اپنی غزلیں فروخت کر کے گزر اوقات کرتے ہیں۔

قدرت اللہ قاسم کا بیان ہے کہ:

---

1. برائے تفصیل۔ تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن دہلوی۔

2. دیوان جوشش۔ ص/81۔

''اطفال مکتب نشین و نو جوان فرحت قرین باشتیاق تمام بہ بہائے تام خرید می کردند،،[1]

چونکہ ہندستانی سماج کے ہر طبقے کے لوگوں نے شعر گوئی شروع کردی تھی۔ لہٰذا ہر شخص نے اپنی طبیعت اور رجحان کے مطابق تخلص بھی اختیار کیے تھے، مثلاً اوباش، عیاش، عشاق، کافر، پنجھا، نکھو، آرام، آزاد، افسوس، امید، پروانہ، بیدار، دیوانہ، بے ہوش، بے قرار، بیخود، تاباں، پیام وغیرہ[2]

اردو زبان کے فروغ میں بادشاہوں اور امیروں کا حصہ

حالانکہ اٹھارہویں صدی کا سیاسی ماحول ادبی کارناموں اور دل چسپیوں کے منافی تھا۔ پھر بھی شاہانِ مغلیہ اور امرا نے ادبی سرگرمیوں میں پوری دل چسپی لی۔ عہدِ محمد شاہی کا ذکر کرتے ہوئے شاکر خان نے لکھا ہے کہ اس دور میں شیخ علی حزیں، سراج الدین خان آرزو، مرزا مظہر جان جاناں، قزلباش خاں، امید، عمدۃ الملک امیر خان انجام، نعمت خان عالی، حکیم شیخ حسین شہرت، میمنت خاں، فصاحت خاں، معزز خاں واجد، علی قلی خاں والہ محمد پناہ قابل، مرزا گرامی، صلابت جنگ، غیرت، محمد افضل ثابت، سید شمس الدین فقیر، میاں فقیہ، مرزا رفیع سودا، میاں حاتم، میاں آبرو[3] اور علی عظیم پسر ناصر علی مرحوم ادبی مجلسوں کی زینت تھے۔

فردوس آرام گاہ محمد شاہ[4] بادشاہ اور شاہِ عالم ثانی، اردو، فارسی اور ہندی زبان میں شعر کہتے تھے۔ شاہِ عالم ثانی، آفتاب تخلص کرتے تھے، ان کا ہندی اور اردو زبان کا کلام نادراتِ شاہی کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ قدرت اللہ قاسم نے شاہِ عالم ثانی کے بارے میں لکھا ہے:

''برین شغل شریف کہ عبارت ازین کار شاعری است، فارسی باشد یا ریختہ، سنسکرت بودہ خواہ بھاکا اوقات صرف می شود،،[5]

---

1. مجموعۂ نغز ج 1۔ ص 144۔
2. مجموعۂ نغز۔
3. تاریخ شاکر خانی۔ (قلمی) ص 111۔ الف 112۔ الف۔
4. سفینۂ ہندی ص 180۔
5. برائے تفصیل۔ مجموعۂ نغز، ج 1 ص / 19۔ تذکرہ ہندی۔ ص 14 تذکرۂ شعرا اردو (میر حسن دہلوی) ص۔ 4

وہ شاعروں کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔ مصحفی کا بیان ہے کہ:

درآں وقت اکثرے از کہتران وریختہ گویان پایۂ تخت حاضری باشند ووقتِ خواندن خوشخوان غلغلۂ تحسین وآفرین بلندمی سازند،،[1]

سفر وحضر دونوں حالتوں میں بادشاہ کے ہمراہ درباری شعرا ہوتے تھے اور ہروقت شعروشاعری کا بازار گرم رہتا تھا۔ اس کے عہد کا ''ملک الشعرا'' ہونے کا فخر سید الشعرا میر منشی غالب علی خاں سید کو حاصل تھا۔[2] شاہ عالم ثانی نے ایک شاعر کو، جس کا تخلص ''شہوت'' (پسر شاہ معصوم) تھا۔ مسخر الدولہ فرمساق خاں بہادر پھکڑ جنگ کے خطاب سے سرفراز کیا تھا[3] خواجہ میر درد نے اس بادشاہ کی شعرا پروری اور فنِ شاعری کی قدردانی کی تعریف میں ذیل کا شعر کہا ہے۔

قدردان ہنر ہے ذات اس کی تفصیل سے بھری ہے بات اس کی[4]

شاہ عالم ثانی کا ولی عہد مرزا جوان بخت، متخلص ''جہاں دار'' خود بھی شاعر تھا اور شاعروں کی سرپرستی کرتا تھا۔ مہینے میں دو مرتبہ اس کے یہاں مشاعرہ ہوتا تھا اور دہلی کے نامی گرامی شاعر مدعو کیے جاتے تھے[5] مرشد زادۂ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ تخلص، سلیمان، دہلی سے فرار ہو کر لکھنؤ پہنچا اور وہاں شعروشاعری کی بساط بچھائی، اس کے دربار سے انشا، جرأت، سوز اور مصحفی وغیرہ وابستہ تھے، اور انعام واکرام سے سرفراز ہوتے تھے۔ مشاعرہ منعقد ہوتا تھا اور نامی گرامی شعرا بلائے جاتے تھے۔[6]

---

1. تذکرۂ ہندی۔ ص4۔
2. برائے تفصیل وقائع عالم شاہی، ص60،61۔
3. مجموعۂ نغز ج1۔ ص334۔
4. سنگاسن بتیسی (ق) ص8، شاہ عالم ثانی کے دربار میں شعروشاعری کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے فراقی نے لکھا ہے کہ ،الحمد للہ کہ ہم چو مذکور شعروشاعری کہ در ہیچ وقتی نشدہ وفہم خاقانی دانوری بداں نرسیدہ، سہلا در محفل معلی مذکور می شود،، وقائع عالم شاہی۔ ص61۔
5. مجموعۂ نغز، ج1 ص72۔ تذکرۂ ہندی، ص61۔ گلشنِ ہند، ص72۔
6. تذکرۂ ہندی۔ ص120،121۔

دہلی کی مرکزی حکومت کے کمزور ہونے کے بعد فرخ آباد، اودھ، مرشدآباد، رام پور، اور ٹانڈہ وغیرہ میں خودمختار صوبائی حکومتیں قائم ہوئیں۔ دہلی تباہ و برباد ہو چکی تھی، بے روزگاری، طوائف الملوکی اور معاشی تنگی کا بازار گرم تھا، فقر و فاقہ کا دور دورہ تھا، بادشاہ اور امیر دونوں تنگ حال تھے، خود انھیں اپنا پیٹ بھرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ان میں اب سکت کہاں تھی کہ شعرا کی پرورش کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا ہنروروں کی کوئی قدر باقی نہ رہی تھی۔ میر نے شعرا کی بےقدری کی بار بار شکایت کی ہے۔

صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے،

کیا قدر ہے ریختہ کی گو میں   اس فن میں نظیری کا بدل تھا

بدیں سبب دہلی کے شعرا نے تلاشِ معاش اور سرپرستی اور قدردانی کی امید میں ان صوبائی حکومتوں کی طرف رُخ کیا جہاں ان کی امید برآئی اور ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ حسب استعداد ان کی قدردانی ہوئی۔ فرخ آباد کے دربار میں انشا۔ مصحفی، عظیم بیگ عظیم، فاخر مکیں، اور محبت علی محبت جا کر جمع ہوئے[1] ٹانڈہ کے نواب نے مصحفی اور قائم چاندپوری کو پناہ دی۔ رام پور کے نواب فیض اللہ خان نے اپنے عہد کے شعرا کے سوا قائم چاندپوری کی بھی سرپرستی کی[2] لکھنؤ کی سرکار میں سودا، میر اور خان آرزو کے علاوہ دوسرے بہت سے شاعروں کو ملازمت کا شرف حاصل ہوا۔

مختصر یہ کہ بادشاہوں اور امیروں کی سرپرستی اور ہنرپروری اردو زبان کی ترقی و فروغ میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔ بہت سے امیر فارسی زبان کے علاوہ اردو زبان میں بھی شعر کہتے تھے، مثلاً قزلباش خاں امید، اشرف علی خاں[3] فغاں نواب عمدۃ الملک امیر خان[4] انجام، نواب وزیر

1. مجموعہ نغزج 1۔ ص 82,86۔
2. مخزن نکات (مقدمہ) ص 3۔
3. نکات الشعرا۔ ص 7,8۔ تذکرۂ شعرائے اردو۔ ص 46۔
4. نکات الشعرا۔ ص 74۔ تذکرہ ہندی ص۔ 160-159۔ مخزن نکات۔ ص 42۔

الممالک آصف الدولہ، آصف تخلص، نواب یار محمد خاں[1] خلف نواب علی محمد خاں روہیلہ، نواب عمدۃ الملک غازی الدین خاں[2]

دہلی کے مشاعرے[3] یا مراختے

سیاسی انتشار، طوائف الملوکی اور تنگ حالی کے ہوتے ہوئے بھی ادبی سرگرمیاں برابر جاری رہیں، بقول قدرت اللہ قاسم:

"از حال ایں زمانہ چہ برطرازم و از قال و مقال ایں دوراں چہ برنگارم کہ دریں ماتم خانہ سینۂ چاک نمودہ سیاہ می کند و کاغذ جگر پارہ فرمودہ شکن بر پیشانی می افگند"[4]

لیکن اس پر بھی شہر کے گوشہ گوشہ میں شعر و ادب کے چرچے تھے، قدرت اللہ قاسم لکھتا ہے:

"بہر سو کہ می نگرم شاعرے می بینم و بہر (طرف) کہ گوش فرامی کنم، زمزمہ شعری شنوم، وطرفہ این ست کہ باہمہ نا اہلیا ہر اک دم از ملک الشعرامی زند و خود را ہمسر بلکہ برتر از دانایان می شمرد"[5]

میر نے اپنے تذکرہ میں مجلس مشاعرہ کے لیے مراختہ یا مجلس ریختہ کا لفظ استعمال کیا ہے[6]

اٹھارھویں صدی کی ادبی سرگرمیوں کی مشاعرے جان تھے۔ خاص طرح سے اہتمام کیا جاتا تھا۔ اور آدابِ مجلس کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ ان مشاعروں میں بوڑھے، جوان، بچے اور پیشہ ور لوگ شریک ہوتے تھے۔ اور اچھا کلام سن کر دل کھول کر تحسین و آفریں اور مکرر مکرر کے نعرے بلند

---

1. تذکرۂ ہندی۔ ص 13،14۔ تذکرۂ شعرائے اردو، ص 106۔
2. تذکرہ شعرائے اردو، ص 137۔
3. دہلی میں اردو شاعری کے فروغ وارتقا کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو، دلی کا دبستانِ شاعری، از ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔
4. مجموعۂ نغز۔ ج 1۔ ص 14۔
5. مجموعۂ نغز، ج 1۔ ص 14۔ نیز ملاحظہ ہو، دستور الفصاحت (یکتا) ص 124۔
6. نکات الشعرا ص 142، 112۔

کیے جاتے تھے، قدرت اللہ قاسم نے مرزا محمد تقی خاں ترقی کے مشاعرہ کا نقشہ اِن الفاظ میں پیش کیا ہے:

"روزے در مجلس شعرا کہ بخانہ..........انعقاد یافت، با بسیارے
از تلامذہ خود رسیدہ (جرأت) غزلہا برخواندہ بحدے موردِ تحسین
وآفرین خاص وعام گشت کہ شنیدن شعر مشکل شد تا فہمیدن خود چہ
رسد، ہہ"[1]

نکات الشعرا میں میر نے چھ ایسے اشخاص کا ذکر کیا ہے جن کے ہاں مجلس مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ میر سجاد[2]، میاں صلاح الدین[3] (ان کی ہاں ہر ماہ کی پندرہویں کو مشاعرہ ہوتا تھا) میاں کمترین[4]، میاں علی نقی[5]، حافظ حلیم[6]۔ میر تقی میر خود بھی ہر ماہ کی پندرہویں کو اپنے مکان پر مشاعرہ کیا کرتے تھے[7] خواجہ میر درد ہر ماہ کی 23 ر تاریخ کو مشاعرہ کا اہتمام کیا کرتے تھے اور اس میں دہلی کے مشہور و معروف اور مستند شاعر شرکت کرتے تھے۔ یہ مشاعرہ بعد میں میر کے ہاں ہونے لگا تھا[8]

مرزا عبدالقادر بیدل کے عرس کے دن اُن کے مزار پر ایک مشاعرہ ہوتا تھا۔ بیدل کے تمام شاگرد، دہلی کے باذوق اشخاص اور شعرا جمع ہوتے تھے۔ فاتحہ کے بعد، ان کے شاگرد اور شعرا دہلی مزار کے اردگرد حلقہ بنا کر بیٹھتے اور یہ رباعی پڑھ کر مشاعرہ کا افتتاح کرتے تھے۔

---

1 مجموعہ نغز ج 1۔ ص 155,156۔

2 نکات الشعرا۔ ص 62۔

3 نکات الشعرا۔ ص 83۔

4 نکات الشعرا۔ ص 145۔

5 نکات الشعرا۔ ص 158۔

6 نکات الشعرا۔ ص 158۔

7 نکات الشعرا۔ ص 50,51,79,80,128۔

8 نکات الشعرا۔ ص 50,51۔

اے آئینۂ طبع توار شاد پذیر درکسب فوائد نموائے تقصیر
مجموعہ فکر ما صلائے عام است سیری کن وبرست تسلی برگیر[1]

نکات الشعرا کے بعد لکھے گئے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری ترقی کی طرف گامزن تھی، کیونکہ مشاعروں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ قدرت اللہ قاسم نے مجموعۂ نغز میں بہت سے مشاعروں کا ذکر کیا ہے۔

درحقیقت یہ مشاعرے اپنی موزونی طبع اور استعداد کے مظاہرہ کے اکھاڑے تھے اوران کی وجہ سے اردو شاعری کی ترقی اور فروغ میں بہت مدد ملی۔ ان مشاعروں کے افادی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے مولوی عبدالحق مرحوم لکھتے ہیں:

> "اس زمانے کی سب سے بڑی علمی اور مہذب مجلس مشاعرے تھے۔ جن کے لیے بڑے بڑے اہتمام کیے جاتے تھے، اس کے خاص خاص آداب تھے، بڑے بوڑھے، نوجوان بچے سب ہی شریک ہوتے تھے، باکمال سخنوروں کی دل کھول کے داد دی جاتی تھی، کبھی کبھی بحث مباحثے ہوتے ہوتے لڑائی جھگڑے ہو جاتے اور تھکا فضیحتی تک نوبت پہنچ جاتی تھی، نوجوان اِن مشاعروں میں شریک ہوتے، اور اپنے کانوں سے تحسین وآفرین کے نعرے سنتے تھے، جو شعرا کے لیے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا۔ تو اُن کے دل میں امنگ پیدا ہوتی تھی، کسی استاد کے پاس حاضر ہوئے، شاگرد ہو گئے، اور شعر کہنا شروع کر دیا، گویا شعر کہنے کے لیے صرف کسی استاد کا شاگرد ہونا کافی ہے، یہ مشاعرے درحقیقت شاعر گر تھے۔،،[2]

میر کی ایک رباعی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لکھنؤ کے لیے رخصت ہونے سے قبل ہی دہلی

---

1. مرقع دہلی۔ ص 11,12 کلیات سودا۔ ص۔13، خزانۂ عامرہ، ص 153۔ سفینۂ خوش گو۔ ص 121۔
2. گلشن ہند (مقدمہ) ص 17۔

کی علمی اور ادبی مجلسوں پر جمودی کیفیت طاری ہونے لگی تھی فکر معاش و تنگ حالی نے لوگوں کے ذہن کو علمی وادبی مشاغل سے تحصیل معاش کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ مشاعروں میں اب وہ پہلی سی رونق باقی نہیں رہی تھی۔

کیا رہا ہے مشاعروں میں اب　　لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں
میر و مرزا رفیع و خواجۂ میر　　کتنے یہ اک جوان ہوتے ہیں۔[1]

دہلی میں میر کے احباب

میر نے نکات الشعرا میں بہت سے ایسے شاعروں کا تذکرہ کیا ہے جن سے ان کے براہِ راست تعلقات تھے، یا کسی مشاعرہ میں اُن سے ملاقات ہوئی اور رفتہ رفتہ تعلقات بڑھ گئے۔

قزلباش خان امید[2]

ایک دن میر اپنے دوستوں کے اصرار پر حضرت سید حسن رسول نما کے عرس میں شرکت کرنے گئے وہاں امید بھی موجود تھے۔ اس پہلی ملاقات کے موقع پر امید نے ریختہ کے دو تازہ کہے ہوئے شعر میر کو سنائے۔[3]

میاں شرف الدین مضمون

اکبر آباد کے نواح میں واقع قصبہ جاج مئو کے باشندہ، اور سپہ گری پیشہ تھا، حریف و ظریف، ہشاش و بشاش اور مجلسوں کو گرما دینے والے، حالانکہ شعر بہت کم کہتے تھے، مگر جو شعر کہتے تھے اس میں بلند پروازی اور جدّت لفظی بدرجۂ اتم ہوتی تھی۔[4] یہ مضمون کی ضعیفی کا زمانہ تھا، جب میر کی ان سے ملاقات ہوئی۔[5]

---

1. کلیات میر (آسی ایڈیشن) ص110۔

2. اصلی نام مرزا محمد رضا تھا، ہمدان وطن تھا، اورنگ زیب کے عہد میں وارد ہندستان ہوئے، بہادر شاہ نے قزلباش کے خطاب کے ساتھ ہفت ہزاری منصب عنایت کیا۔ 1159ھ میں وفات پائی، برائے تفصیل گلشنِ ہند۔ ص17،22۔ سفینۂ خوش گو۔ ص250۔

3. نکات الشعرا۔ ص7۔

4. نکات الشعرا ص21 گلشنِ ہند، ص160،161۔

5. نکات الشعرا ص15۔

محمد شاکر ناجی[1]

شاہ جہاں آباد وطن، عہد محمد شاہی میں سپہ گری پیشہ کرتے تھے۔ شعرائے ایہام گو میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کا دیوان مصحفی کے زمانے تک دہلی میں موجود تھا۔ اشعار دل فریب ہوتے تھے، طبیعت ہزل گوئی کی طرف مائل تھی، میر کی ان سے ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی، ہزل کہہ کر سامعین کو ہنساتے تھے لیکن خود کبھی نہیں ہنستے تھے۔[2]

اشرف علی خاں پیام

اکبر آباد کے رہنے والے تھے[3]۔ اپنے عہد کے مستند شعرا میں شمار ہوتا تھا۔ ریختہ میں صاحب دیوان تھے۔ میر کی اکثر و بیشتر اُن سے ملاقات رہتی تھی۔ اس موقع پر شعر خوانی اور گپ بھی ہوتی تھی۔[4]

محمد حسین کلیم

شاہ جہاں آباد کے باشندے اور سپاہی پیشہ تھے[5]۔ ریختہ کے مستند شاعر تھے، قصائد، مخمس اور رباعیات پر مشتمل ایک دیوان ترتیب دیا تھا۔ میر کی اُن سے قرابت داری بھی تھی مگر اس کے قطع نظر وہ میر سے دلی خلوص اور اُنس بھی رکھتے تھے، اور ان کے ساتھ شفقت و مہربانی سے پیش آتے تھے۔[6]

خواجہ میر درد

نالۂ عندلیب کے مصنف شاہ محمد ناصر کے بیٹے تھے۔ ابتدا میں سپاہی پیشہ تھے۔ آخر میں مستغنی ہو کر سجادۂ درویشی پر جلوہ افروز ہوئے اور رشد و ہدایت کا شغل اختیار کیا۔ علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے۔ حالانکہ اس زمانے میں دہلی پر آئے دن بلائے ناگہانی اور فتنہ ہائے آسمانی نازل ہوتے

---

1. برائے تفصیل۔ نکات الشعرا ص 23 مخزن نکات ص 19 تذکرۂ ہندی 258۔ گلشن ہند 173۔

2. نکات الشعرا ص 23 ڈاکٹر فضل الحق نے شاکر ناجی کا دیوان، دیوان شاکر ناجی کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

3. برائے تفصیل مخزن نکات 22، ریاض الفصحا ص 52۔ نکات الشعرا۔ ص 26۔

4. نکات الشعرا۔ ص 106۔

5. مخزن نکات۔ ص 43,44۔ تذکرۂ ہندی۔ ص 197 گلشن ہند، ص 145۔

6. نکات الشعرا۔ ص 42۔

رہتے تھے۔ مگر خواجہ درد ہی دہلی کی بزرگ ہستیوں میں منفرد تھے جنھوں نے ایک دن کے لیے بھی دہلی سے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ چونکہ فنِ موسیقی میں پوری قدرت رکھتے تھے، اس فن کے اکثر استادان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ان کا نقشبندیہ سلسلے سے تعلق تھا لیکن انھوں نے اپنا علاحدہ سلسلۂ محمدیہ مروج کیا۔ تصوف میں کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی مشہور تصنیف علم الکتاب ہے۔ ہر ماہ کی دوسری تاریخ کو ان کے والد کے مزار پر محفلِ سماع منعقد ہوتی تھی، اور دہلی کی بیشتر گویئے وہاں حاضر ہوتے تھے۔[1] میر کو خواجہ درد سے بے حد عقیدت تھی، ان کے ارشاد پر میر نے اپنے ہاں مشاعرہ شروع کیا تھا۔ چونکہ نا مساعد حالات کی وجہ سے درد نے اپنے ہاں مشاعرہ بند کر دیا تھا۔[2]

میاں سعادت علی سعادت

امروہہ (ضلع مراد آباد) کے سیدوں میں سے تھے[3] سلیم الطبع، کم سخن اور متواضع تھے ان میں درویشی کی چاشنی بھی پائی جاتی تھی، اشعار لطیف ہوتے تھے، میر سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔[4]

میر سجاد

اکبر آباد کے باشندے تھے[5] تحصیلِ علم سے شغف تھا، اور ریختہ کے اچھے شاعر تھے، میاں آبرو[6] کے شاگرد اور شاکر ناجی اور میاں شرف الدین مضمون کے ہم عصر تھے ان کے کلام میں ایہام پایا جاتا تھا۔ اپنے مکان پر مشاعرہ کا اہتمام کرتے تھے۔ میر ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ اور یہ ربط و ضبط بہت دنوں تک قائم رہا۔[7]

---

1. برائے تفصیل میر کی آپ بیتی (فٹ نوٹ) ص 97۔
2. نکات الشعرا ص 27۔
3. برائے تفصیل تذکرۂ ہندی۔ ص 92,93۔ مخزن نکات۔ ص 38، گلشن ہند، ص 98,99۔
4. نکات الشعرا ص 128 ,51 ,49۔
5. مخزن نکات۔ ص 29۔ گلشن ہند ص 119۔
6. نکات الشعرا۔ ص 9، تذکرہ ریختہ گویان (گردیزی) ص 8، مخزن نکات، ص 14۔
7. نکات الشعرا ص 60,61۔

میر محتشم علی خاں حشمت

شاہ جہاں آباد کے باشندے اور میر باقر کے بیٹے تھے۔ دہلی کے محلہ مغل پورہ میں ان کا مسکن تھا۔ پیشہ سپہ گری تھا۔ آخری زمانے میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ کبھی کبھی کچھ اشعار کہہ لیتے تھے [1]

میر کے ساتھ شفقت اور مہربانی سے پیش آتے تھے [2]

کرم اللہ خاں درد

نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام کے بھانجے تھے۔ کلام درد سے لبریز ہوتا تھا، طبیعت میں بے حد شوخی تھی، میر کی ان سے ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی۔ [3]

میر کے بقیہ احباب

میر کے بقیہ احباب کے یہاں صرف نام درج کیے جاتے ہیں۔

اشرف علی خاں فغاں، انعام اللہ خاں یقین، یکرو، شاگرد میاں آبرو، میاں صلاح الدین عرف مکھن، محمد اسماعیل بیتاب، میاں ثاقب، سید عبدالولی عزلت، میر عبدالحی تاباں، میاں حسن علی شوق محمد قائم، فضل علی دانا، محمد عارف، ہدایت اللہ ہدایت، میاں نجم الدین علی، سلام، لالہ ٹیک چند بہار، میر عبدالرسول نثار، میر حسن حسن، میاں جگن، محمد حسن سلمہ اللہ محسن، بندرا بن راقم، میاں ضیاء الدین ضیا، میر علی تقی کافر، میر گھاسی، جیون مل عشاق اور شاغل وغیرہ۔

دہلی کے دبستانِ شاعری کا زوال

نادر شاہ (1739) کے حملے کے بعد سے مغلیہ سلطنت کے زوال اور اختلال کی رفتار تیز ہو گئی اور دہلی سے امن دامان اور فارغ البالی مفقود ہو چکی تھی۔ ان حالات میں روزی کی تنگی نے ان با کمال سخنوروں کو بھی دہلی کو خیر باد کہنے پر مجبور کر دیا۔ جن کے دم سے دہلی، دہلی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایک کر کے اعلیٰ پایہ کے شاعر اور ادیب وہاں سے رخصت ہو گئے۔ وہ صحبتیں جو شعر و شاعری کی جان تھیں، درہم برہم ہو گئیں۔

مرزا جعفر علی حسرت نے دلی کے دبستان شاعری پر ایک مرثیہ لکھا ہے جس کے مطالعہ سے ہماری

---

1. مخزن نکات۔ ص 27۔ تذکرۂ ہندی ص 82۔

2. نکات الشعرا ص 83۔

3. نکات الشعرا ص 73,74۔ مخزن نکات۔ ص 45۔

آنکھوں کے سامنے دہلی کی شاعری اور اس کے زوال کا نقشہ آجاتا ہے:

اس عجم میں جو ہے ہندسواس میں یہی سخن
کہتے ہیں فارسی کے طور پہ دہلی کے مقیم
جب سے وہ شہر کیا شاہ جہاں نے آباد
وہاں کے باشندوں نے سیکھا سخنِ ہفت اقلیم
پھر تو ایسے ہی سخن سنج ہوئے دہاں کے فصیح
کہ نہ دم مار سکے بلبلِ گلزار نعیم
اٹھ گیا سب ولی، ناجی، مضموں کا کلام
شعر صائب کے کریں ان کے سخن کی تعظیم
پہنچے شیراز میں جیسے سخنِ طوطیِ ہند
واں کے بلبل کا اوٹھا فخر کیے سب تکریم
یہ فلک دیکھ سکا دہاں کی نہ جمعیت کو
لوٹ گئی جوں دلِ عشاق اسے فوج غنیم
جاپڑے وہاں کے سبھی لوگ بیابانوں میں
ہوئے ہر قصبے میں چھوڑ اپنا وطن وہاں کے مقیم
اب سخن ان کے ہر شخص کو لگتے ہیں عجیب
اہلِ رضواں کے سمجھتے ہیں سخن اہلِ جحیم
شعر جب ان کا پڑھا جاوے تو مانگیں وہ قند
گفتگو اپنی نہ سمجھیں کہ وہ کتنی ہے سقیم
لفظ نکلے نہ مزاج ان سے کبھی غیر مجاز
زے کا مخرج ہو جہاں بولیں وہ اس جا پر جیم
صبح کو بولیں صبح عقل ہے حیران اس جا
نور عرفان کے ایجاد کو سمجھیں نہ ذحیم
چار دو چار کہیں بحر وہ جو سُن پاویں
لفظ، ثابت (ہ) جو نہ بیٹھے کریں اس کو ترخیم
جانے کیا عیب قوافی کے وہ ایطا اکفا
غیم قافیہ پوچھو تو وہ بتلادیں میم
معنے صدمہ رکھیں کر کے وہ مشتق سو کبھی
مولوی جامی سے بھی حل نہ ہو معنی صدیم
اور کا شعر پڑھا جائے تو تحسین نہ کریں
اور کہیں پھر پڑھو جیسے کہ سنے کوئی صمیم
باری آوے جو انھوں کو تو وہ ہیں کھینچ کر آہ
شعر پڑھنے لگیں روتا ہو کوئی جیسے یتیم[1]

دہلی کے دبستان شاعری کے زوال کے دو اہم وجوہ تھے۔

پہلی وجہ تو سیاسی زبوں حالی، عام طور پر شعرا در بار شاہی یا کسی امیر کی سرکار سے وابستہ تھے۔ اٹھارھویں صدی میں بادشاہ اور امیر دونوں اقتصادی تنگی اور افلاس کے شکار تھے۔ اس بنا پر اب وہ شعرا کی قدر دانی کہاں سے کرتے، لہٰذا انھیں مجبوراً ایسے مقامات کی طرف رُخ کرنا پڑا جہاں ان کو

1. دیوان حسرت (ق) رام پور۔ ص 5 ب تا 6 الف۔ اردو کی ارتقا کے بارے میں قائم، کا مخمس ملاحظہ ہو۔ کلیات قائم (ق) ص 407۔

قدر دانی کے ساتھ مفلسی اور تنگ دستی سے بھی آزادی حاصل ہو سکتی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ ابتدائی زمانے میں شاعری کو "فن شریف" سمجھا جاتا تھا، عوام کو اس میدان میں قدم رکھنے کی مجال نہ تھی۔ لیکن سلطنتِ مغلیہ کے آخری زمانے میں بقول جوشش ہر طبقہ اور پیشہ کے افراد نے اس میدان میں داخلہ حاصل کر لیا۔ بدیں سبب شاعری کا معیار گر گیا، اہلِ علم و فن کی قدر جاتی رہی۔ میر اور دیگر شعرا نے اہلِ فن کی خواری کا گلہ کیا ہے۔ شاہ فقیر اللہ آفریں کا ذیل شعر ملاحظہ ہو:

عزتے نیست ہنر مند حوادث زدہ را
ہست بے قدر چو آں نسخہ کہ ابتر باشد[1]

---

1 تذکرۂ مردم دیدہ۔ ص/28۔

باب چہارم

مذہب اور اخلاق

اٹھارھویں صدی کی دنیائے اسلام میں مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت پستی اور زوال کے آخری حدوں تک پہنچ گئی تھی۔ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی:

> "فکر و عمل، اخلاق و عادات، کردار و اطوار سب پر انحطاطی رنگ چھایا ہوا تھا، زندگی سُکرِ دوام، میں تبدیل ہو رہی تھی، اور ہر قوم کو سیاسی زوال سے پہلے اور اُس کے بعد جو اخلاقی زوال کی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں، وہ نہایت سرعت کے ساتھ طے کی جا رہی تھیں، اخلاقی قدروں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی اور سماجی نظام کا سارا ڈھانچہ بگڑ رہا تھا، عالمگیر (اورنگ زیب) نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کرا کر جس گرتے ہوئے اخلاقی اور سماجی نظام کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی وہ اس کے کمزور اور نااہلِ جانشینوں کے عہد میں منہدم ہو رہا تھا[1]۔"

1۔ تاریخ مشائخ چشت۔ ص 354۔ اسنوڈرز نے لکھا ہے کہ "مذہب بھی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح زوال پذیر تھا، حضرت محمدؐ کا بتایا ہوا توحید محض کا تصور، توہمات اور طفلانہ تصوف کی وجہ سے مسخ ہو گیا تھا، مسجدیں ویراں اور برباد پڑی تھیں، جہلا جادو، ٹونوں اور تعویذ گنڈوں پر زیادہ اعتقاد رکھتے تھے، بزرگوں کے مزارات کی زیارت کو حج کے برابر سمجھتے تھے ان کو اپنا شفیع جان کر ان سے استمداد کرتے تھے چونکہ (باقی صفحہ 264 پر)

اخلاقی قدروں کے انحطاط کا ذکر کرتے ہوئے اسٹوڈرڈ لکھتا ہے کہ:

''قرآن کے اخلاقی احکام کی خلاف ورزی ہی نہیں کی جاتی تھی بلکہ ان کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ شراب نوشی اور افیون خوری عام تھی، فحش کا بازار گرم تھا، بدترین افعال بڑی بے شرمی سے اور کھلے بندوں عمل میں آتے تھے۔''[1]

بادشاہوں اور امرا کی اخلاقی اور مذہبی زندگی

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے صحیح کہا ہے کہ:

''سلطان روح کے مانند ہے اور رعایا جسم کی طرح اگر روح صالح ہوتی ہے تو جسم بھی صالح رہتا ہے، اگر روح فاسد ہو جاتی ہے تو بدن میں بھی فساد پڑ جاتا ہے۔''[2]

اگر اس قول کی روشنی میں اورنگ زیب کے جانشینوں کی اخلاقی اور مذہبی حالت کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت اچھی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ مغل بادشاہوں کی ہر بے راہ روی سے عوام اثر پذیر ہوتے تھے، اور دربار مغلیہ میں عیش و عشرت کی جو مجلسیں سجتی تھیں ان کے مہلک جراثیم دور دراز واقع جھونپڑوں تک اپنا کام کرتے تھے۔[3]

بہادر شاہ اول (1707-1712) اورنگ زیب کا بیٹا اور جانشیں تھا۔ اس کی ابتدائی تعلیم رواجِ زمانہ کے مطابق اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی۔ ایامِ اسیری میں اس کا تمام وقت عبادت اور ریاضت میں گزرتا تھا۔[4] لیکن تخت نشینی کے بعد اس کے مذہبی عقائد متزلزل ہو گئے اور شیعہ عقائد کی طرف قوی تر رجحان ہو گیا تھا، اس کی بے راہ روی اور آزاد خیالی کے سبب سے ملک

بقیہ صفحہ 263 کا حاشیہ) (ان کے خیالات کے مطابق) اللہ ان سے دور اور بزرگوں سے قریب تھا۔''

The New World of Islam (Newyork, 192) P.26

---

1. The New World of Islam P.26
2. مکتوبات امام ربانی۔ ج2۔ ص135۔
3. Fall of the Mughal Empire,1, PB.
4. تاریخ ہندی (قلمی) ص423,424۔

میں متعدد بلوے ہوئے 1۔

طباطبائی، جو خود بھی شیعہ تھا، بڑے فخر کے ساتھ لکھتا ہے کہ:

بہادر شاہ در ترویج وتقویت مذہب شیعہ می کوشید، 2

حضرتِ علیؓ کے نام کے ساتھ خطبوں میں ''وصی مصطفیٰ'' کا اضافہ کروادیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاہور، احمد آباد، گجرات اور دوسرے مقامات پر مذہبی نزاع کے باعث فسادات بھی ہوئے، حاجی یار محمد نے بڑی جرأت اور ہمت کے ساتھ بادشاہ کو اس بے راہ روی پر ٹوکا 3۔

بہادر شاہ کے بعد جہاں دار شاہ (1712-1713) تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ وہ ایک ڈومنی لال کنور پر ایسا فریفتہ ہوا کہ خود ہر وقت نشے میں دُھت رہتا تھا۔ اور حکومت کی باگ ڈور اس رقاصہ کے ہاتھ میں دے رکھی تھی 4۔

غرض کوئی ایسی بداخلاقی اور سماجی گناہ نہ تھا جو اس عورت کے اثر میں نہ کیا گیا ہو، حضرت ظلِ سبحانی لال کنور کے ساتھ بازاروں اور باغوں میں سیر وتفریح کرتے پھرتے تھے، شراب خانوں میں جاتے تھے، بزرگوں کی خانقاہوں اور مزاروں پر اولادِ نرینہ کی تمنا لے کر حاضر ہوتے تھے۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے مزار سے ملحق جھرنے میں لال کنور کے ساتھ، ایک ہی چادر میں ملبوس غسل کرتا تھا 5۔

اس کے حکم سے ایک مینا بازار کا انتظام کیا گیا جہاں اہلِ حرفہ کی لڑکیاں جمع ہوتی تھیں اور

---

1. سیر المتاخرین (نول کشور) ج 2 ص 381۔ یحییٰ خان کا بیان ہے کہ: ''در ابتدائے سال پنجم بسبب بعضے مصاحبان طبع بادشاہ از عقیدہ طریق سنت و جماعت در ظاہر برگشت وبعضے امور خلافت شرعی را خواست کہ شائع کند،، تذکرۃ الملوک (ق) 116 الف، تاریخ ہندی، (ق) ص 423,424۔ تاریخ مظفری (قلمی) ص 95 الف

2. سیر المتاخرین (فارسی) ج 2 ص 381۔

3. برائے تفصیل منتخب اللباب (فارسی) ج 2 ص 603,663,665۔ تذکرۃ الملوک۔ ص 116 الف و ب سیر المتاخرین (فارسی) ج 2 ص 381۔

4. تاریخ چہار گلشن (ق) ص 20 الف۔ 21 ب، سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج 2 ص 13۔

5. تذکرۃ الملوک (ق) ص 119 الف۔ تاریخ مبارک نامہ (ق) ص 61 ب۔

بادشاہ انھیں اپنی ہوسناکیوں سے آلودہ کرتا تھا۔[1]

اس بے راہ روی کا عوام و خواص پر جو اثر ہوا اس کا ذکر خافی خاں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"در عہدِ ناپائیدار جہاندار شاہ کہ بناے ظلم و فسق را استحکام تمام شد،
چنانچہ بازار رود و سرود قوالان و کلاونت و ڈھاری گرم شد کہ نزدیک
بود کہ قاضی قرابہ کش و مفتی پیالہ نوش گردد۔"[2]

جہاں دار شاہ کے بعد فرخ سیر (1713-1719) تخت نشین ہوا وہ انتظامی امور میں بہت کمزور تھا۔[3] یہ حضرت شاہ عبدالرحیم کا روحانی اثر تھا کہ وہ اتنی مدت تک تختِ حکومت پر متمکن رہ سکا۔[4]

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ:

"شاہ صاحب نے صرف اس غرض سے کہ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار
کہیں ان آئے دن کی تبدیلیوں کی نذر نہ ہو جائے، اس کو قائم رکھنے
کی کوشش کی تھی لیکن کمزوری ایک ایسا مرض تھا جس نے اسے کبھی
حالات پر قابو نہ پانے دیا۔"[5]

اس عہد میں ایک بڑا مذہبی فتنہ بھی برپا ہوا یعنی میر محمد حسین مشہدی نے جو عمدۃ الملک امیر خاں عالم گیری صوبہ دار کابل کا داروغۂ خوشبو خانہ اور اس کی لے پالک کا شوہر تھا۔ بہادر شاہ اول کے عہد میں اپنا نام "نمود وا نمود" رکھا اور ایک نئے مذہب کی بنیاد گزاری کا دعویٰ کر دیا۔ اس کے مرید "فربود" کہلاتے تھے۔ اور ان کے نام کے ساتھ 'نمود' کا لفظ لگا ہوتا تھا۔[6]

---

1. تاریخ مبارک نامہ (ق) ص 61ب۔
2. خافی خان (فارسی) ج 2/ص 689۔
3. لیٹر مغلس (انگریزی) ج 1۔ ص، 396۔
4. برائے سوانح ملاحظہ ہو، انفاس العارفین۔
5. انفاس العارفین۔ ص 62۔
6. تاریخ مشائخ چشت۔ ص 35۔

فرخ سیر اس ریاکار[1] کا استغناد دیکھ کر اس کا معتقد ہو گیا تھا۔ وہ ایک دن چھپ کر اس کے حجرے میں آیا اور قدم بوس ہو کر نذر پیش کی۔[2] ہادی علی خان بن امیر علی خان جو اس عہد کے امیروں میں تھا، اور نواب قمر الدین خاں وزیر کا باپ محمد امین خاں بھی اس کے دامِ فریب کا شکار تھا۔[3]

اس کے "فربودوں" کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن اپنے خلیفۂ اول "دوجی بار" سے اختلاف ہو جانے کی وجہ سے اس کے فریب کا بھانڈا پھوٹ گیا اور محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں یہ تحریک ختم ہو گئی۔[4]

فرخ سیر کی عقیدت کی وجہ سے "نمود و انمود" کا اثر عوام پر اس قدر بڑھ گیا کہ ہزاروں کی تعداد میں اس کے مرید ہو گئے، بقول طباطبائی:

"یہ حرکت (بادشاہ کی) زیادہ تر موجب اعتقاد ہوئی اور عموماً لوگوں پر اس کی مکاری نے اثر بہم پہنچایا۔"[5]

فرخ سیر کے بعد محمد شاہ (1719-1748) کا دور آیا تو اسے عیش و عشرت کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ اپنے 28 سالہ دورِ حکومت میں اگر کبھی وہ محل سے باہر نکلتا تھا تو لونی پارک میں سیر و تفریح

---

1 برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج 2 ص 70,73۔ غالباً اس فرقے کے کسی شخص سے مناظرہ کرنے کے لیے میر تقی میر کے والد محمد علی عرف علی متقی نے لاہور کا سفر کیا تھا۔ "وہ خفشاں نمود کے نام سے مشہور تھا، اس نے فارسی کے کچھ فقرے یاد کر رکھے تھے، نا سمجھ لوگ جو اس کی ریاکاری کو پرکھ نہیں سکتے تھے، اس کے سامنے ناک سے لکیریں کھینچتے تھے۔" ملاحظہ ہو، میر کی آپ بیتی۔ ص 36 تا 39۔

2 برائے تفصیل سیر لامتاخرین (اردو ترجمہ) ج 2۔ ص 70,72۔

3 برائے تفصیل سیر لامتاخرین (اردو ترجمہ) ج 2۔ ص 72۔

4 برائے تفصیل سیر لامتاخرین (اردو ترجمہ) ج 2۔ ص 73,74۔ آخر میں اس گروہ کے کچھ افراد مرشد آباد چلے گئے تھے، جہاں اُن کو نواب کی سرپرستی حاصل تھی، اور سرکار کی طرف سے بسر اوقات کے لیے وظیفے ملتے تھے۔ وہ لوگ علاحدہ ایک محلے میں سکونت رکھتے تھے۔ برائے تفصیل وقائع عبد القادر خانی 1 / ص 155۔

5 سیر المتاخرین۔ (اردو ترجمہ) ج 2۔ ص 72۔

کے لیے یا گڑھ کا میلہ دیکھنے کے لیے[1]۔ شاکر خان کا بیان ہے کہ اس دور میں فسق و فجور اور لہو ولعب کا یہ عالم تھا کہ اسے قلم بند کرتے ہوئے قلم کی زبان شق ہوتی ہے، اور اس کے بیان سے زبان کے دو ٹکڑے ہوتے ہیں۔ اخلاقی زبوں حالی کا یہ حال تھا کہ تمام فرقے اور رسالے لال قلعہ کے دروازے پر ایک گدھے کا بچہ اور ایک کتیا باندھ کر دربار میں جانے والے امیروں سے کہتے تھے کہ وہ ان جانوروں کو سلام کریں کیوں کہ ان میں سے گدھا نواب بہادر تھا اور کتیا نواب قدسیہ (والدہ محمد شاہ)[2]۔

تاریخ محمد شاہی کے مصنف نے اس دور کی مذہبی اور اخلاقی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسجدیں برباد اور خطیب بے حال تھے۔ علما اور فضلا پژمردہ، خانقاہیں ویران تھیں اور شریعت زوال کی طرف مائل تھی[3]۔ آخر میں یہ مصنف لکھتا ہے

''بنیادِ اسلام سست شد و عمارات کفر استحکام پذیرفت[4]۔''

محمد شاہ کے دور میں شاہ جمال نامی درویش نے مہدی ہونے کا دعوا کیا وہ کھلے بندوں شراب پیتا تھا، ہزاروں آدمی اس کے معتقد ہو گئے تھے۔[5]

محمد شاہی دربار کا ذکر کرتے ہوئے حیرت دہلوی نے لکھا ہے کہ:

اب ہم محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں آتے ہیں جو انتہائی درجے کا ملکی

1۔ مغلیہ سلطنت کا زوال (انگریزی) ج 1۔ ص 6۔ اس کی وجہ اظفری نے یوں بیان کی ہے کہ محمد شاہ نزول الماء کے مرض میں مبتلا تھا جس کی وجہ سے وہ گھوڑے کی سواری نہیں کر سکتا تھا۔ لکھنؤ کے ایک زین ساز نے ایک مخصوص زین بنائی تھی، اسے بادشاہ نے بہت انعام دیا تھا، اس زین کے تیار ہونے کے بعد وہ کبھی کبھار گھوڑے کی سواری کرنے لگا تھا، ورنہ عام طور پر پالکی میں سوار ہوتا تھا، واقعات اظفری۔ ص/155۔

2۔ تاریخ شاکر خانی (ق) ص 36۔ ب۔ 37۔ الف۔

3۔ تاریخ محمد شاہی (ق) ص 19 الف و ب 25 الف و ب

4۔ تاریخ محمد شاہی۔ (ق) 28 الف۔

5۔ تاریخ ہندی۔ ص/494,495۔

اور مذہبی پہلو سے تاریک تر اور ناپاک تھا۔ شریعتِ محمدیؐ پر مضحکہ خیز نکتہ چینیاں عین دربار میں ہوتی تھیں اور مے نوشی کی لذتوں اور سرخوشانہ اور بے خودانہ حالتوں کے آگے احادیث نبوی پر قہقہے اڑائے جاتے تھے...... وہ ڈوم ڈھاری جو محمد شاہ کے ارکانِ دولت تھے اور مذہبی نقلیں کرتے تھے، اور ان نقلوں میں خدا اور اس کے پاک نبی کی توہین کی جاتی تھی۔،،[1]

چنانچہ ایک بار محمد شاہ کے دربار میں گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ جمنا ندی جو پہلے قلعے کی دیوار سے متصل بہتی تھی، اب دور کیوں ہٹتی جا رہی ہے؟ ایک عالمِ دین نے کہا کہ ''جہاں پناہ یہ فسق و فجور اور گناہوں کا اثر ہے جو قلعہ میں کیے جاتے ہیں'' تو بادشاہ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو ہم یہ حرکتیں جمنا کے اس پار جا کر کریں تا کہ ندی پھر اس طرف کو بہنے لگے۔

محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ (1754-1048) تخت پر بیٹھا، ایک میل لمبا چوڑا اس کا زنانہ محل تھا، ہفتوں تک وہ اس محل سے باہر نہ نکلتا تھا، تاریخ احمد شاہی کا مصنف کہتا ہے کہ:

''چوں احمد شاہ...... از طفولیت تا این وقت کہ سنِ عمرش بہ بست و یک سالہ رسیدہ بود درمیانِ عورات حرم می گزرانید و علاوہ آں فراہم آمدن اسباب انتعاش در ہنگام جوانی چوں ہر یکی ازیں فریق برائے گرمی بازار بحضور آن نونہال گلشن خلافت و جہاں داری آمدہ بکسب کار خود مشغول شدند، مزاج بادشاہ بلہو ولعب مائل شد،،[2]

احمد شاہ کو فنِ موسیقی میں پوری دسترس حاصل تھی۔ خلوت کی رقص و سرود کی محفلوں کا اختتام خود وہ اپنا گانا سنا کر کرتا تھا۔

بقول اظفری

''(آہ) مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب کہ دلی کے باکمال

---

1. حیات طیبہ۔ مرزا حیرت دہلوی۔ (مطبع فاروقی دہلی) ص 70۔

2. تاریخ احمد شاہی (قلمی) ص 13 ب۔

استادوں سے کیسے کیسے گانے سننے میں آتے تھے، خاص کر ایک بار خلوت میں احمد شاہ بن محمد شاہ فردوس آرام گاہ اور شاہ جہاں ثانی یعنی محی الملۃ ابن کام بخش اور شاہزادہ محمد جام بخش بن شہزادہ محمد کام بخش، موصوف سے ایسے ایسے گانے سُنے ہیں کہ پھر ان کی جیسی رس بھری اور دل گداز آوازیں آج تک ہمارے کانوں کو سننے میں نہیں آئیں'' 1

شاہ عالم ثانی 2 (1759-1806) بن عالمگیر ثانی نے اپنی زندگی کا لُب لباب اپنی اس رباعی میں پیش کیا ہے:

صبح تو جام سے گزرتی ہے   شب دل آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے   اب تو آرام سے گزرتی ہے 3

بادشاہ کے حرم کا ذکر کرتے ہوئے پولیر رقم طراز ہے کہ اس کے محل میں پانچ سو 500 سے زائد عورتیں تھیں اور اسے عورتوں سے بے حد رغبت تھی۔ 4

کنور پریم کشور فراقی نے شاہ عالم کے بڑھاپے کے زمانے میں عزیزن نامی کنچنی سے اس کے عشق کا ذکر کیا ہے، اس کا بیان ہے کہ بادشاہ اس حد تک اس کا گرویدہ تھا کہ اگر وہ کبھی روٹھ جاتی

1 واقعات اظفری۔ص 186،187۔

2 ایک مصنف نے شاہ عالم بادشاہ کو اس وجہ سے دین دار بتایا ہے کہ وہ خواجہ میر درد کی مجلسِ سماع میں بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوتا تھا۔ حالانکہ مجلسِ سماع میں شرکت کرنا ایک فیشن تھا، کسی شخص کے دین دار ہونے یا نہ ہونے سے اس بات کا کوئی تعلق نہ تھا۔ مرقع دہلی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں بلا تفریق مذہب وملت ہندستانی سماج کا ہر فرد محفل سماع میں شرکت کرتا تھا۔ لہٰذا ایسے اعمال کے حوالے دے کر بادشاہوں کی دین داری ثابت کرنے کی کوشش پر تعجب ہوتا ہے۔

3 تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن دہلوی) ص، 4۔ وقائع عالم شاہی، ص 72۔

4 Shah Alam II and His Court: P70

تو اس کے منانے میں ہر طرح کی ذلت ورسوائی برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔

''شب تب، سبب کوفت و رنجش کہ از خفگی با عزیزن ملکۂ عالم کہ معشوقۂ خلیفۂ روزگار است و جہان پناہ را بوی عشقی پیدا گردیدہ، وسالی چند است کہ او بوضع لولیاں اوقات بسر کردی، واز یاری بخت منظور نظر گردید، و بمشکوی اقدس جا یافتہ، بوجود مقدس شد، مجرائیاں باریاب گشتند، از بے قراری و غلبۂ عشق قلق بمزاج وہاج بود گاہی بحرم سرا رفتہ، اگر چہ تکلم از طرفین نمی شد، بدیداری تسلی خاطر فاتر می نمودند گہی بیروں خرامیدہ بابر اور انش بامید وبیم مخاطب می شدند و بعملہ و فعلۂ اوی فرمودند باد فہماتند کہ براہ آید''

اس مایوسی اور یاس کے عالم میں بادشاہ ذیل کے شعر پڑھا کرتا تھا۔

مُردم از حسرت، بہ پیغامے دلم را شاد کن۔

ای کہ می گفتی: (فراموشت نسازم) یاد کن

ان منتوں اور سماجتوں کے بعد بھی اگر وہ مغرور وطناز راہ راست پر نہ آتی تو بدرجۂ مجبوری بادشاہ سلامت یہ شعر لکھ کر اس کی خدمت میں بھجواتے:

دیکھیے پھر کبھو ادھر کو جو کرتا ہو نظر

دیدہ بازوں کے ''یہاں سر کو جدا کرتے ہیں[1]

دہلی کے بازاروں، قہوہ خانوں اور چنڈو خانوں میں قلعۂ معلا کی ان داستانوں کا چرچا ہوتا تھا، لوگوں کی نظروں سے بادشاہی وقار تو گرتا ہی تھا، عوام کے اخلاق پر بھی اس کا برا اثر پڑتا تھا۔

اخلاقی کمزوریوں نے بادشاہ کو دروغ گو اور دروغ پسند بھی بنا دیا تھا۔ خود بھی بڑھا چڑھا کر بات کرتے تھے، اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے۔ فراقی کا بیان غور طلب ہے:

''سبحان اللہ سخنانی کہ از صدق معرا باشد و در صد یکی راست نبود،

---

1. وقائع عالم شاہی۔ ص 166,117۔

در بزم شاہی بل بر زبان ظلِ الٰہی بگورد، حق این است کہ بادشاہ عالم
پناہ خود از کذب دروغ اجتناب ندارد، مردم مجبور اند، الناس علی دین
ملوکہم، اگر دروغ گوئی دہرزہ درائی راگیرندو بسز ارسانند،
کرا باراست کہ سخن ناراست بر زبان آرد،، 1

شاہ عالم ثانی ہندستانی تہواروں میں بڑی دل چسپی لیتا تھا، دیوالی دسہرہ، ہولی اور بسنت کے تہواروں کا بڑے جوش وخروش سے اہتمام کرتا۔ اور سرتی اور گودھن پوجن کے مراسم بھی بڑی خوش اعتقادی کے ساتھ ادا کرتا تھا 2 مختصر یہ کہ کوئی دن اور رات ایسی نہ گزرتی تھی جب دربار معلی میں کوئی جشن منعقد نہ ہوتا ہو 3

طبقۂ امرا کی حالت

یہی حال اٹھارھویں صدی کے امیروں کا تھا۔ یہ طبقہ فیاضی اور عیاشی کے مشاغل میں بادشاہوں کے نقش قدم پر چلنے کی حتی الامکان کوشش کرتا تھا۔ ہوجج (Hodges) کا بیان ہے کہ مغلیہ سلطنت کے عروج کے زمانے میں امرا کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد قیدی عورتوں کو اپنی حرم سراؤں میں جمع کرنا سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ملک کے گوشے گوشے اور بالخصوص وادیٔ کشمیر سے سیکڑوں کی تعداد میں عورتیں حاصل کی جاتی تھیں۔ کیونکہ کشمیری عورتوں کا حسن مشہور تھا 4

میر نے بھی اپنے عہد کے امیروں کی عیاشی اور اعمالِ خبیثہ کا ذکر کیا ہے۔

لال خیمہ جو ہے سپہر اساس   پالیں ہیں رنڈیوں کی اس کے پاس
ہے زنا وشراب بے وسواس   رعب کر لیجیے یہیں سے قیاس
قصہ کو تہ رئیس ہے عیاش 5

---

1. وقائع عالم شاہی۔ ص 92,93۔ نیز ص 88۔
2. برائے تفصیل نادرات شاہی۔
3. برائے تفصیل۔ بزم آخر، نیز روز نامچہ شاہ عالم
4. Hodges's Travel -PP 21-22
5. کلیات میر۔ ص 496۔

قزلباش خاں امید، ایرانی نژاد، عہدِ محمد شاہی میں ہندستان میں وارد ہوا۔ رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے پنج ہزاری کے منصب پر فائز ہوگیا اس کی عیش وعشرت نے رکاکت کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ عبدالحی تاباں کے ذکر میں قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے:

"آخر ہائے روز امردانِ شیرین ادا دو سادہ رویانِ ملاحت (آما)
درخانہ وے بزرد زیور آراستہ و پیراستہ می شدند وحسب الطلب
امرائے قزلباش درمحافہانشستہ بشب مہمان می رفتند" [1]

قطب الملک عبداللہ خان کی طبیعت عیاشی اور جنسی تلذذ کی طرف بے حد مائل تھی۔ اس کے محل سرا میں بے شمار عورتیں تھیں۔ خافی خاں کا بیان ہے کہ سید عبداللہ خاں نے لاتعداد عورتیں جمع کر رکھی تھیں۔ اس پر بھی اس کو تشفی نہ ہوتی تھی۔ اور ایک موقع پر شاہی حرم سرا کی دو عورتیں اس نے اپنے حرم میں داخل کر لی تھیں [2]

درگاہ قلی خان نے میرن (جو نواب وزیر الممالک قمر الدین خاں کی سرکار میں داروغۂ ارباب طرب تھا) کی مجلسِ یازدہم کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

چوں وزیر الممالک بہ تجمع میلے دارند وبا اہلِ حسن وجمال واصحاب غنج ودلال (رابطے) از آنجا کہ توجہ خاطر این عزیز بتقدیم حسن خدمات معزز ومحترم است، وور تلاش مردم حسین طرفے دستے دارد وہر روز پیکرے تازہ فسوں تسخیر می کند، از دیگر مصاحبانش مکرم، خانہ اش از ہجوم جلوۂ گل رخان گلشن آباد است، وکاشانہ اش از ورود مہ جبیناں آشیانہ پری زاد ہر جا کہ گل رخساریست مائلِ صحبت اوست وہر کس کہ نشہ حُسنے دارد شیفتہ بزم سراپا کیفیت او"۔ [3]

امیر الامرا حسین علی خاں رقص سرود میں بے حد روپے صرف کرتا تھا۔ اور بعض مرتبہ تو اس

---

1. مجموعہ نغز۔ ج 1۔ ص 132۔
2. خافی خاں (فارسی) ج 2 ص 821,822۔
3. مرقع دہلی۔ ص۔ 33,34۔

کی آمدنی سے زیادہ اخراجات کا تخمینہ ہو جاتا تھا[1]۔ ایک مرتبہ روشن الدولہ طرہ باز خاں نے امیر الامرا خاندوراں، سربلند خاں اور سید سعادت خاں کو اپنے گھر مدعو کیا۔ اور اپنے مہمانوں کی تواضع کے لیے محفلِ رقص و سرود کا بھی اہتمام کیا۔ اس محفل کا ذکر کرتے ہوئے قاضی مرتضیٰ حسین نے لکھا ہے:

> ''انداز جشنِ طوائفاں آں چہ نویسد، گوئی خیل پری بودہ یا حورانِ بہشتی، برائے ربودن ہوش مردم از آسمان فرود آمدہ بودند وخوبی نغمہ در رقص از تحریر بیرون بود[2]''

مختصر یہ کہ اس عہد کے امیروں کی اخلاقی اور مذہبی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ شاہ ولی اللہ اس گروہ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

> ''اے امیرو! کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو، اور جن لوگوں کی نگرانی تمھارے سپرد ہے اُن کو تم نے چھوڑ دیا ہے تا کہ اُن میں بعض بعض کو کھاتے، اور نگلتے رہیں، تمھاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو، اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمھاری توجہ کسی طرف منعطف نہیں ہوتی۔''[3]

صوفیا خام اور علما سو کی حالت

چونکہ اس زمانے میں حالات کے زیر اثر لوگ تصوف کے دامن میں سکون ڈھونڈتے تھے اور خارج کے ہوش ربا حالات سے پناہ لینے کے لیے خانقاہوں کی طرف بھاگتے تھے۔ اس لیے

1۔ مآثر الامرا (فارسی) 1 ص 320۔

2۔ حدیقۃ الاقالیم ص 45۔

3۔ الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر) ص 135-134, 84 نیز دیکھیے سیاسی مکتوبات۔ ص 43۔ حجۃ اللہ البالغہ سیر المتاخرین (فارسی) ج 2۔ 260۔

تصوف کو بھی بڑی حد تک لوگوں نے "کاروبار" بنا رکھا تھا۔ اٹھارھویں صدی میں جہاں حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی، شاہ فخر الدین دہلوی، حضرت مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد جیسی اہم شخصیات تھیں وہیں کچھ عقبیٰ فروش اور دنیا دار صوفی بھی اپنی "دکانِ تصوف" کھولے بیٹھے تھے۔

چنانچہ نالۂ عندلیب کے مصنف نے ایک صوفی کا حال کسی رقاصہ کی زبانی بیان کیا ہے:

> "میں ایک بڑی مدت سے مفلس بوالہوس کے حالات سے بخوبی واقف ہوں۔ اُس کی تمام باتیں ابلہ فریب ہیں، میں نے سنا ہے کہ وہ شراب نوشی، بدکاری کے علاوہ شہوت پرستی کا بھی شکار ہے اور لذّتِ نفسانی وزبان کا مرتکب ہوتا ہے، چونکہ اُس نے بہت سی بازاروعورتوں سے بدکاری کی ہے لہٰذا وہ مرضِ آتشک میں گرفتار ہے" [1]

میر نے ذیل کے اشعار میں صوفیائے دنیادار کی عیاشی وہوس پرستی کا نقشہ پیش کیا ہے:

شیخ کو اس بھی سن میں ہیکی ہوس — تنگ پوشی سے چولی جاوے چس
ہوئے گا سن شریف ساٹھ برس — دانت ٹوٹے گیا ہے کلہ دھنس
دیکھ رنڈی کو یہ چلے ہے چال

جامے کو خوب ساچناتے ہیں — خال رخسار پر بناتے ہیں
مہندی بھی تپلی سی لگاتے ہیں — ناز کرتے قدم اٹھاتے ہیں
دیکھا کرتے ہیں آرسی میں جمال

دل میں دُھن ہے جو عیش وعشرت کی — پوچھتے ہیں دوائی شہوت کی
باتیں ہیں رنڈیوں کی صحبت کی — دیکھیے ہے کوئی کتاب حکمت کی
کرتے ہیں بھمنیں کا استعمال

محوِ رعنائی کتنے ہیں اللہ — مسی سے کرتے ہیں مسوڑے سیاہ

1۔ نالۂ عندلیب۔ ص/315۔

رکھتے ہیں سر پہ اب ہمیشہ کلاہ　　شانہ سے کام ہے کبھو دبے گاہ

کپڑے نارنجی سر پہ اودی شال

چہرہ چرکیں لباس تنگ معاش　　ساتھ رکھتے ہیں ایک ہوئے تراش

قینچی لیتے ہیں گاہ وگہہ منقاش　　ہر سرِ مو پہ اس سے ہے پُر خاش

لوگ کہتے ہیں شیخ ہیں چنڈال[1]

اس زمانے کے دنیادار مشائخ نے کشف وکرامات کو وسیلۂ روزی بنا رکھا تھا۔ اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کو طرح طرح سے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کرتے تھے، خواجہ میر درد نے رسالۂ نالۂ درد میں ایسے صوفیا کو مخاطب کر کے ان کی مذمت کی ہے:

"دکانِ کشف وکرامات مکشا، وچوں اہلِ دعوت ہمت را بریں امور صرف منما کہ این کار پیشۂ مزدورانِ دنیا طلب است نہ شعار مشتاقانِ لقای رب عجائب نمائی، این ہمہ عاملانِ دغاباز محض شعبدہ بازی است وفلیہ سوختن وحاضرات کردن صرف فریب سازی خدارا اندکہ حیا ہم باید وایں ہمہ ذوفنونی نشاید، بے چارہ اہلِ غرض مجنوں می بودند و برچنین صنایع مفتوں می شوند۔"[2]

انھی باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے شاہ ولی اللہ نے عوام کو ایسے مشائخ کے جال میں پھنسنے سے متنبہ کیا تھا۔ انھوں نے عوام کو مخاطب کر کے کہا:

"اس زمانے کے مشائخ کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا چاہیے۔ اور کبھی ان کا مرید نہ ہونا چاہیے، کیوں کہ آج کل یہ لوگ طرح طرح کی بدعات ورسومات میں مبتلا ہیں، شہرت، رجوع خلق اور مریدوں کی کثرت دیکھ کر دھوکا نہ کھانا چاہیے، اور نہ اُن کی کرامتوں سے دھوکا کھانا چاہیے۔"[3]

---

1. کلیاتِ میر۔ ص 954,955،

2. رسالۂ درد (مطبع شاہ جہانی، بھوپال ص 36۔

3. وصیت نامہ شاہ ولی اللہ (اردو ترجمہ) ص 65 نیز ملاحظہ ہو الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر 7 ص / 136,137۔

اس زمانے کے علما کا حال تو صوفیوں سے بھی زیادہ بدتر تھا۔ انھوں نے اسلام کی بنیادی تعلیمات کو فراموش کر دیا تھا۔ جاہ وحشمت، دولت وثروت کی تحصیل کا بہت آسان ذریعہ تھے، لہٰذا انھوں نے طرح طرح سے رشوت خوری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

مآثر الامرا کے مصنف نے لکھا ہے:

"این امرا جلیل القدر دین بدنیا فروشاں سخت آسان گرفتہ اند، زرہا بر رشوت خروج می کنند کہ تا بابطال حقوق مردم صد چنداں ستانند، نکاحانہ ومہرانہ را حلال تر از شیرِ مادر می دانند از قضات ارثی قضات چہ تواں گفت، کہ مسِ علم ایشاں نصیب اعدا است وکفۂ ولیسپاندیہ وکفۂ زمینداران، کتاب وشرع آنہا است۔ ہرگاہ در شان قضات باعلم وعمل حدیثے وارد شدہ (کہ از سہ قاضی یکے بہشتی است) وخواجہ محمد پارسا (قدس سرہٗ) در فصل الخطاب گوید کہ آن قاضی بہشتی ہم مگر قاضی بہشت باشد) اندازۂ گمراہی وضلالت ایں قوم کہ کمتر از جہانی اند کہ تواند گرفت۔"[1]

طباطبائی نے اِن رشوت خور اور گمراہ کن قاضیوں کی بڑی مذمت کی ہے۔ حالت یہ تھی کہ اگر کوئی غریب ومفلس مسلمان مر جاتا اور نائب قاضی نہ آتا تو لوگوں کا، عام کا عقیدہ تھا کہ ایسی صورت میں میت کی روح گھر سے باہر نہ جائے گی اور اگر اس شخص کے ورثہ سے وجہ معینہ باعث کم مقدوری کے ادا نہ ہو سکے تو مع اہل وعیال کے اس قدر نجس اور ناپاک سمجھا جاتا تھا کہ اس کے ہم پیشہ وروں کو اس کا خورد ونوش گوارا نہ ہوتا، اور حد یہ تھی کہ اسے آگ اور پانی تک نہ دیتے تھے، تب وہ مجبوراً چوری ڈکیتی یا قرض وغیرہ سے زر حاصل کر کے قاضی کی خدمت کرتا۔ اور بڑی مشکل سے ذلت سے نجات پاتا یہی حال ختنۂ پسر اور نکاحِ دختر میں تھا کہ سنِ بلوغ کو پہنچ کر بھی برسوں نکاح اور ختنہ سے انھیں محروم رکھا جاتا تھا۔ یہ رسومات اُس وقت تک عمل میں نہ آسکتی تھیں جب تک پہلے قاضی کے نذرانہ کا انتظام نہ ہو جاتا۔ اسی طرح مقدمات میں بھی قاضی رشوت لے کر حق

1. مآثر الامرا (فارسی) ج1/ص239۔

کو باطل اور باطل کو حق کر دیتا تھا۔[1]

یہی حال صدر الصدور کا بھی تھا۔ رشوت خوری اس کی زندگی کا ایک واحد مقصد بن گیا تھا۔[2]

شاہ ولی اللہ نے علما سو کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ انھیں یونانیوں کے علوم میں اپنا وقت ضائع نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ قرآن وحدیث کا علم حاصل کرنا چاہیے اور مسلمانوں میں اس تعلیم کا پرچار کرنا چاہیے، انھوں نے اُن کو مخاطب کر کے کہا:

> ''جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع اور آلات کی ہے (مثلاً صرف ونحو وغیرہ) تو ان کی حیثیت آلہ اور ذریعہ ہی رہنے دو، نہ کہ خود ان ہی کو مستقل علم بنا بیٹھو، علم کا پڑھنا تو اسی لیے واجب ہے کہ اس کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعائر کو رواج دو، لیکن تم نے دینی شعار اور اس کے احکام کو تو پھیلایا نہیں، اور لوگوں کو زائد از ضرورت باتوں کا مشورہ دے رہے ہو۔''[3]

عام مسلمانوں کی دینی حالت

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ بادشاہوں، امیروں، عالموں اور صوفیوں کی ہر بے راہ روی سے عوام بڑی حد تک اثر پذیر ہوتے تھے اور ان کی عیش وعشرت کے مہلک جراثیم جھونپڑوں تک اپنا کام کرتے تھے۔ چوں کہ اقتصادی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ اور عوام اقتصادی زبوں حالی کے شکار تھے لہٰذا ان کی حالت کسی ''معیاری'' عیاشی کی انھیں اجازت نہ دیتی تھی تو اس کا اظہار امرد پرستی، نشہ بازی، میلے ٹھیلے، عرس اور سطحی قسم کے لہو ولعب کی شکل میں ہوتا تھا جن میں مبتلا ہو کر وہ کچھ دیر کے لیے دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے۔

امرد پرستی

زیرِ نظر عہد کے عوام وخواص میں امرد پرستی پورے عروج پر تھی۔ کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی

---

1. سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج۔2، ص/ 523-522۔
2. سیر المتاخرین (اردو ترجمہ) ج۔2، ص/ 524-523۔
3. الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر) ص 137۔

جہاں ''امارد نوخطاں توبہ شکن زہاد،، موجود نہ ہوتے ہوں۔ دہلی کی سوسائٹی میں امرد پرستی ایک فیشن سمجھا جاتا تھا۔ میر کی شاعری پر بھی اس کا اثر نمایاں ہے۔ لیکن یہ عیب اس دور میں اتنا راسخ ہو گیا تھا کہ اسے معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ میر تقی میر نے اپنے والد محمد علی کی امرد پرستی اور اپنے چچا سید امان اللہ کے ایک پسر روغن فروش پر عاشق ہو جانے کا ذکر بڑی بے تکلفی سے کیا ہے۔1 سب سے زیادہ حیرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ملفوظات میں یہ عبارت دیکھ کر ہوتی ہے کہ

''درذکر امرد پرستی حضرتِ مرزا مظہر جان جاناں ارشاد شد کہ حالا دار الضرب امارد خانقاہ فخر الدین شد'' ہم تو ڈھل گئے'' یعنی ماازکار رفتیم''۔

اس ذہن کا اثر اردو، شاعری پر بھی بہت گہرا ہوا۔ اور وہ آج اس کے لیے بدنام ہے۔

میر جیسا باکمال شاعر یہ کتھا بھی کہتا تھا:

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب   اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں 2

آنولہ شہر میں یہ وبائری طرح سے پھیل چکی تھی۔ لوگ لونڈوں سے عقد کرنے لگے تھے۔

قاضی مرتضیٰ حسین بلگرامی کا بیان ہے کہ:

''حتیٰ کہ باامردانِ نوخیز خوش شکل میل بنکاح می کردند ورسمِ امتِ لوطؑ تازہ شد،، 3

مرقع دہلی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی کا کوئی میلا ٹھیلا، بزرگانِ دین کے اعراس، بازار اور تفریحی مقامات ایسے نہ تھے جہاں تفریح اور عیاشی کے سوا کوئی دوسرا شغل ہوتا ہو۔

مجنوں نانک شاہ کا تکیہ جمنا ندی کے کنارے ایک بہترین تفریح گاہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ مقام آج بھی مجنوں کا ٹیلا نام سے مشہور ہے، دہلی کے عوام وخواص وہاں برائے تفریح جایا کرتے تھے، دگاہ قلی خان کا بیان ہے:

---

1 میری کی آپ بیتی۔ ص40 تا44 نیز 47,59۔

2 میر کی شاعری میں امرد پرستی کے لیے ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کا مضمون مشمولہ'' تحقیقات''۔

3 حدیقۃ الاقالیم۔ ص139۔ مرشد آباد میں امرد پرستی کے متعلق تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو۔ سیر المتاخرین (اردو) ج-3 ص800

"ہرروز وہاں ایک عجیب وغریب مجمع ہوتا ہے، بے شمار تفریح باز عورتیں میانہ میں سوار ہو کر اس مقام پر آتی ہیں۔ اور کسی درخت کے چھایہ تلے سواری چھوڑ کر تفریح میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ اور تنہائی میں اپنے عاشقوں سے ملاقات کرتی ہیں، مقاصد مستورات اظہار کر کے اپنی جنسی خواہش رفع کرتی ہیں[1]۔"

کسل سنگھ نامی ایک امیر نے ایک محلہ آباد کیا تھا جو کسل پورہ کے نام سے موسوم تھا۔ درگاہ قلی خان نے اس مقام کا بیان یوں کیا ہے:

"پورہ در نہایت تقطیع وتکلف احداث کردہ واز ہر قسم طوائف وفواحشِ بازاری کہ عبارت از مال زاد بہا باشد آمادہ نمودہ وار بابِ مناہی ومسکرات را بحمایت خود جادادہ۔ کثرتِ جمعیت محتسب در جوالیش راہ ندارد وقدرتِ احتساب در خود نمی یابد در ہر راستہائش، زنہا۔ بلباس رنگارنگ خود را بمردم عرض می کنند ودر جسم ہر کوچہ بوساطت میانجی اشخاص را تکلیف می نمایند ہوالیش شہوت آمیز است وفضائیش باہ انگیز، بہ تخصیص در حوالی شام طرفہ مجمعے می شود وعجب ہنگامہ۔ در ہر مکانے رقص است ودر ہر جای سردو۔ ارباب فسق بے ممانعت ومزاحمت سری دراں کارخانہ کشیدو بگل چینی خیارک دسوزاک دامنِ شہوت لبریز می کنند وچندے بخمیازۂ حسرت گزرانیدہ مشغول می شوند، غرض طرفہ کارگاہے وعجب تماشا گاہے است۔"[2]

عرس[3]

اس زمانے کی معاشرت میں اجتماعی تفریح کا سب سے اہم موقع "عرس" تھا، درگاہ

1۔ مرقع دہلی۔ص 12۔

2۔ مرقع دہلی۔ص 24۔

3۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو، مرقع دہلی، ص 19-1۔

قلی خان نے مرقع دہلی میں ان عرسوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔میر نے نکات الشعرا میں سید حسن رسول نما کے عرس کا ذکر کیا ہے[1] قزلباش خان امید کے بارے میں لکھا ہے۔

''داخل ذیل امرا بود ودر ہر سیر وتماشامی رفت وصحبتہا داشت چنانچہ یک روز در عرسِ حسن رسول نما صاحب قدس سرہ العزیز بندہ نیز بہ تحریکِ یارانِ موافق رفتہ بود واد ہم تشریف می داشت چوں مرااز دور دید، گفت کہ خوش باشد کہ من ہم درین ایام دو شعر ریختہ موزوں کردہ ام، بشنوید،،[2]

عرس خلد منزل کی کیفیت درگاہ قلی خان نے اِن الفاظ میں پیش کی ہے۔

''ومعاشران بامحبوبانِ خود در گوشہ وکنار دست بغل وعیاشان در کوچہ وبازار بہول مشتہیات نفسانی در رقص جمل مے خواران بے اندیشہ محتسب در تلاش سیہ مستی وشہوت طلبان بے واہمہ مزاحمت سرگرم شاہد پرستی،،[3]

جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ مرزا عبدالقادر بیدل کا عرس بڑی دھوم دھام سے ہوتا تھا۔اور اس میں شعر خوانی کی محفل بھی منعقد ہوتی تھی۔ان عرسوں میں قوالیاں، طوائفوں کے مجرے اور لنگر کی تقسیم ہوتی تھی۔خرچ زیادہ تر امرا برداشت کرتے تھے، غرض اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی۔

چھڑیاں

مزار پرستی کے سلسلے میں مسلمانوں نے چھڑیوں کی رسم بھی اختراع کی تھی کچھ بزرگ ایسے تھے کہ ان کے عرس کے دن پہلے عقیدت مندان کے نام کے جھنڈے نکالتے اور شہر کی گلیوں میں پھرتے اور آخر میں ان چھڑیوں یا جھنڈیوں کو لے کر ان بزرگوں کے مزاروں پر حاضری دیتے تھے، ان میں خاص طور پر خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، غازی میاں (سالار مسعود بہرائچی)

---

1. خافی خان (فارسی) ج 2، ص 553-552۔
2. نکات الشعرا (طبع ثانی) ص 7۔
3. مرقع دہلی۔ص 12۔

سرور سلطان، اور شاہ مدار کی چھڑیاں مشہور ہیں۔[1]

میر حسن دہلوی نے جب دہلی سے لکھنؤ کو کوچ کیا تو اتفاق سے وہ زمانہ شاہ مدار کے عرس کا تھا۔ اور عقیدت مندوں کے گروہ دہلی سے مع چھڑیوں کے روانہ ہو رہے تھے۔ میر حسن بھی ان کے ہم سفر ہوئے۔ اس نے اس قافلہ کا تفصیلی ذکر مثنوی گلزار ارم میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

مکن پور کی چھڑی چلتی تھی واں سے — اٹھے ہم ساتھ اس کے اس مکاں سے
مدار اس قافلہ کا تھا چھڑی پر — چلے ہم وہاں سے چھڑیوں ساتھ مل کر
زبس میوات کا اکثر تھا عالم — عجائب مہو شاں تھیں اس میں باہم

چونکہ ان میلے ٹھیلوں میں مستورات بھی برابر کی شریک تھیں۔ لہٰذا مردوں کے لیے یہ مواقع تفریحی مشاغل کے سامان بہم پہنچاتے تھے۔

کوئی پردے سے تھی چہرہ دکھاتی — کوئی آواز کچھ گا کر سناتی
کوئی چلتی اُتر انکھیلیوں سے — کوئی بیٹھی ہی جی لیتی دلوں سے
جہاں ملتا کہیں پانی کا منبع — وہاں ہوتا پری زادوں کا مجمع
کنوئیں پر یوں نظر آتا ہر اک ماہ — کہ جوں یوسف کھڑا ہو برسرِ چاہ
کوئی لیتا مٹھائی اور کوئی پان — کوئی جاتا کسی کے پاس انجان
کوئی آنچل سے اپنا منہ چھپاتی — کوئی پردہ اٹھاتی اور گراتی[2]

مجملاً قبر پرستی کا بازار گرم تھا۔ نذر و نیاز، حاجت روائی کی منت مشکل کشائی کے لیے نذر و نیاز ماننا، قربانیاں پیش کرنا، چڑھاوے چڑھانا، نہایت تضرع اور آزاری کے ساتھ ان کو حاجت روا سمجھ کر حاجتیں مانگنا، طواف کرنا، قدم بوسی، عرضیاں لکھ کر لٹکانا، شیرینی، پھول، اور خوشبوئیں چڑھانا وغیرہ رسومات ادا کی جاتی تھیں۔[3]

---

1 تاریخ چہار گلشن محمد شاہی (ق) ص 36 ب۔ الف، البلاغ المبین (اردو ترجمہ) ص 110 نیز ارشاد الطالبین۔ ثناء اللہ پانی پتی، ص 2-1۔

2 مثنویات میر حسن دہلوی (نول کشور 1945ء) ص 136,139۔

3 برائے تفصیل۔ البلاغ المبین۔ ص 31 ,25 ,5۔

توہم پرستی

اس دور کے مسلمانوں میں توہم پرستی کو مذہبی درجہ حاصل تھا۔ راجا سے پرجا تک ہر شخص اس مرض کا شکار تھا۔ خواجہ میر درد کا بیان ہے کہ:

''ایجا ہر کس بتوہم خاص گرفتار است،''[1]

نجومیوں اور رمالوں پر لوگوں کو بہت عقیدت تھی۔ ہر بڑے آدمی کے خاندان سے کوئی نہ کوئی نجومی وابستہ ہوتا تھا۔ دہلی، آگرہ اور دوسرے بڑے شہروں کے بازاروں میں سڑکوں کے کنارے یہ لوگ اپنی دکان لگا کر بیٹھتے تھے، اور ان کے گرد لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ محمد شاہ بادشاہ کے دربار سے مبشر خان اور منجم خان منسلک تھے[2] لاولد اشخاص رمالوں، نجومیوں اور برہمنوں کی خدمت میں حاضر ہو کر اولاد ہونے یا نہ ہونے کے سلسلے میں معلومات حاصل کرتے تھے۔[3] تخت نشینی اور جنگ کا وقت بھی نجومی متعین کرتے تھے۔[4] جب بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوتا تو بید مشک جلایا جاتا کہ اس پر جادو ٹونے کا اثر کارگر نہ ہو۔[5] جب کبھی بادشاہ سفر سے واپس آتا تو محل سرا کے دروازے پر نظر اُتاری جاتی نثار کے روپے غربا میں تقسیم ہوتے تھے۔[6] شادی بیاہ کے موقع پر نہ جانے کتنی ایسی رسمیں ادا ہوتی تھیں جن کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ صرف توہم پرستی سے تھا۔ لڑکے اور لڑکی کے مکانات کے دروازے پر تیل اور چونے کے نشانات بنائے جاتے۔[7] ماہِ صفر کے 13 دن منحوس مانے جاتے تھے۔ عام طور پر منگل اور جمعرات کو بھی منحوس دن تصور کیا جاتا تھا۔[8]

---

1. رسالہ دردِ دل۔ ص 160۔
2. تاریخ شاکر خانی (ق) ص 112۔ ب
3. مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص ر 17,19۔
4. سیر المتاخرین (فارسی) ج 2 ص 243۔
5. مرأۃ الاصطلاح (ق) ص ر 44 ب، 45۔ الف۔
6. سیر المتاخرین (فارسی) ج 2۔ ص ر 443۔
7. تقویت الایمان۔ ص 77۔ مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص 204-203۔
8. تقویت الایمان، ص 77,178۔

عورتیں بالخصوص توہم پرست تھیں۔ جس زمانے میں چیچک کی وبا پھیلتی تو مالن کو پھول لے کر بلایا جاتا، دروازے پر آم کے پتے لٹکائے جاتے[1] اس موقع پر ستیلا دیوی کی پوجا ہوتی تھی۔
معمولات مظہر میں لکھا ہے:

"اکثر زنان بواسطۂ کمال جہال کہ دارند بایں استمداد ممنوع مبتلا اند وطلب دفع بلیہ از یں اسمائے مسمیٰ می نمایند و بادای مراسم شرک واہل شرک گرفتار اند و علی الخصوص ایں معنی از نیک و بد ایشاں در وقت عروض مرض جدری کہ در زبان ہندی ستیلہ معروفست ومشہود ومحسوست، کم زنی باشد کہ از دقائق ایں شرک خالی بود و برکمی از رسوم آں اقدام نہ نماید"[2]

لڑکوں کے سر پر شاہ مدار اور دوسرے صاحب کرامات بزرگوں کے نام کی چوٹیاں رکھی جاتی تھیں تاکہ اس کی برکت سے وہ بچہ باحیات رہے اور ہر بلا و مصیبت سے محفوظ رہے۔ جب متعینہ مدت پوری ہو جاتی تو اس بچے کو لے کر اس مزار پر حاضری دیتے اور وہیں اس کی چوٹی ترشوائی جاتی[3] بُرے وقت سے محفوظ رکھنے کے لیے بچوں کے گلے اور پیروں میں سونے چاندی کی زنجیریں اور تانبے کے طوق ڈالتے تھے[4]

سودا نے لکھا ہے کہ اس کام کے لیے شیر کے ناخنوں کا بھی استعمال ہوتا تھا۔

شیر کے ناخن تک میں ڈالا جینے کو تجھ ہیکل میں
موت کے روبہ سے نہ بچا، پر آن کے تو اس جنگل میں[5]

یہی حال عورتوں کا شگون لینے کے سلسلے میں تھا، ایسی رسمیں عام طور پر روزمرّہ کی زندگی میں داخل تھیں۔ میر تقی میر کے والد جب لاہور کے سفر پر نکلتے تھے تو ان کی ماما نے آئینے پر

1۔ احوال محمد شاہ تا آصف الدولہ (ق) ص78۔

2۔ معمولات مظہری ص38۔

3۔ نصیحت المسلمین 70 (ق) ص43، تقویت الایمان۔ ص5۔

4۔ Mrs Mir Hasan Ali: Observations. Etc11, P373

5۔ کلیات سودا۔ 2/ص 166,167۔

پانی بہا کر رخصتی کا شگون پورا کیا تھا۔[1]

اس سلسلے میں میر کے ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

لگ جاوے دل کہیں تو اُسے جی میں اپنے رکھ
رکھتا نہیں شگون کچھ اظہار عشق کا

جی میں تھا خوب جا کے خرابے میں رویئے
سیلاب آیا ، آکے چلا، کیا شگوں ہوا

سیلاب آگے آیا چلا جائے دشت میں
بے اختیارونے کا میر سے (شگوں) ہوا

نحس تھے کیاوے وقت وساعت جن میں لگا تھا دل اپنا
سال پہر ہے اب تو ہم کو ماہ برابر ہیں گھڑیاں

جب سے عشق کیا ہے میں نے سر پر میرے قیامت ہے
ساعت دل لگنے کی شاید نحس ترین ساعت تھی

کب نظر میری پڑے گی اس روے خوب پر
ہم نشین ٹک تو بھی مصحف کھول کر تو فال دیکھ

سودا[2]

جڑی نہ جانے کس ساعت میں　　　بڑھئی نے اس پلنگ کی پاٹی
پاؤں کے رکھتے اس پر تیری　　　اب جو قضا نے گردن کاٹی

ارواح خبیثہ پر اعتقاد

جہلا مسلمانوں کا اس بات پر پورا عقیدہ تھا کہ کچھ بزرگ ایسے گزرے ہیں جن کی روح عورتوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مثلاً شیخ سدو، ایسی صورت میں اس آسیب زدہ عورت کو خلاصی دلانے کے لیے مٹھائیاں تقسیم کی جاتیں یا بکرے کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔ سودا نے مخمس در ہجو اہلیہ میر ضاحک' میں بڑی تفصیل سے اس طرح کا ایک واقعہ پیش کیا ہے۔

---

1. میر کی آپ بیتی۔ ص 37۔　　2. کلیات سودا۔ ص 529۔

ضاحک کی اہلیہ نے جب ڈھول گھر دھرایا بے وجہ رات ساری ہمسایوں کو جگایا
بیٹھک میں بیٹھ بوڑھے چونڈے کو جب ہلایا تب شیخ سدّو اس پر اساک کھا کے آیا
بولا کہ کیوں ہے ضاحک بکرا کوئی منگایا

ضاحک یہ سن کے بولا تم نے زباں نکالی بے آج کو کہا ہے کل دو گے مجھ کو گالی
بکرے کی شکل یاں تو نے گوری ہے نہ کالی بی بی کو اور تم کو گھر کر دیا ہے خالی
بکرا وہ دے گی تم کو جن نے کہ سر چڑھایا

میراں یہ سن کے بولے پھر کہو کیا کہا جی میں اس سوا نہیں کچھ اور حرف جانتا جی
بکرا اگر نہ آیا چھوڑوں گا کر چچا جی گالی تو اک طرف ہے یہ سن رکھو بچا جی
آگے ہے ڈھول دھپا میں تم کہہ سنایا

ضاحک نے تب کہا یوں مجھ پاس کب ہیں کوڑے گڑ کے تو گلگلے ہیں اور تیل کے پکوڑے
میٹھا کرو جو منہ کو دھیلے کے ہیں گنڈورے تب شیخ سدّو بولا سنتا ہے دہی کے
بھینسا ہی کے کے چھوڑوں خاطر میں کیا تو لایا[1]

مختصر یہ کہ عوام کا عقیدہ تھا کہ میاں شیخ سدد، میاں زین خاں، میاں صدر جہاں، ننھے میاں، چہل تن، میاں شاہ دریا، اور میاں شاہ سکندر کی ارواح عورتوں میں حلول ہو کر انھیں پریشاں کرتی ہیں[2] اور نذر و نیاز اور بھینٹ کے بنا ان اثرات سے خلاصی ممکن نہیں۔

اسی طرح کچھ اختراعی اور مصنوعی عورتوں کی خبیث روحوں پر بھی عقیدہ عام تھا۔ مثلاً لال پری، سبز پری، زرد پری، سیاہ پری، آسماں پری، دریا پری، اور نور پری۔ عورتوں کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ میاں شاہ دریا اور میاں شاہ سکندر اور یہ ساتوں پریاں بھائی بہن ہیں" یہ بھی عقیدہ تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حضرت زہرا علیہا السلام کی خدمت کرنے اور ان کے ساتھ کھیلنے کے لیے بھیجا تھا۔ یہ سب ان کے غلام اور کنیزیں ہیں[3] ان مصنوعی پریوں کے نام کے روزے رکھے جاتے اور ان

1۔ کلیات سودا ج 1 ص 340,341۔

2۔ دریائے لطافت (ا۔ت) ص 183۔

3۔ دریائے لطافت (ا۔ت) ص 183۔

موقعوں پر افطار کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔

مرزا مظہر جان جاناں نے ان عقائد باطل کی بیخ کنی کے لیے ایک زبردست تحریک چلائی تھی۔ ان عقائد کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بیان کیا

''صیام نساء کہ بہ نیت پیران و بیبیان نگاہدارند و اکثر تا مہائی ایشاں را از نزد خود تراشیدہ روزہائے خود را بنام آنہا نیت کنند و در وقت افطار را از برائے ہر روز طعام خاص بوضع مخصوص یقین می نمایند و تعین ایام نیز از برائے صیام می کنند و مطالب و مقاصد خود را باین روزہا مربوط می سازند و بتوسل ایں روزہا از آنہا حوائج خود می خواہند در دان حاجت خود را از آنہا می دانند۔1

شاہی حرم سے لے کر ادنیٰ درجے کے مسلمان تک ہر طبقے میں تعویذ، گنڈے، اور ٹونے ٹوٹکوں کا رواج تھا۔ اظفری، شاہی حرم کی مستورات کے عقائد کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ ''جیو بیگم کے شوہر مرزا جواں بخت ولی عہد بہادر شاہ، بادشاہ کی بلا اجازت قلعۂ معلی سے فرار ہو گئے تھے۔ جیو بیگم ان سے ملنے کے لیے ہمہ وقت بے قرار رہتی تھیں لہٰذا ''عورتوں کے مذہب کے موافق وہ ہر وقت تعویذ گنڈوں کی تلاش وطلب میں پیرزادوں کی طرف متوجہ رہتی تھیں''۔2

مقامات مظہری اور معمولات مظہری کے بغور مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ عوام کا تعویذ گنڈوں پر اعتقاد اس درجہ بڑھ چکا تھا کہ امراضِ جسمانی کے مداوا کے لیے بھی انکا سہارا لیا جاتا تھا۔ مثلاً تعویذ برائے دفع تپ لرزہ، برائے دفع درد چشم، برائے دفع جدری۔ اور برائے محافظت زراعت وغیرہ۔3

اس عہد کے شعرا کے کلام میں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے ان عقائد کی نشان دہی ہوتی ہے۔

1۔ معمولات مظہری ص39۔

2۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو، واقعات اظفری ص24,25۔

3۔ برائے تفصیل، مقامات مظہری ص116,118۔

بیداد
حرز و تعویذ و فسوں کر کے تھکے سب لیکن
اس پری شکل کا سر سے مرے سایہ نہ گیا[1]

میر
کر کے تعویذ رکھیں اس کو بہت بھاتی ہے
وہ نظر پاؤں پہ وہ بات دوالی اس کی

ہندستانی جشن اور تہوار

صدیوں سے ہندو مسلمان کے اختلاط اور ہم سائیگی، کا سب سے بڑا دور رس نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہم آہنگ اور متحدہ تہذیب وجود میں آئی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندو تہذیب نے مسلمانوں کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ اس کے نقوش آج بھی مسلمانوں کی تہذیب میں ملتے ہیں حالانکہ ہندو اور مسلمان دونوں اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کی برابر کوشش کرتے رہتے ہیں۔[2]

مجملاً ہولی، دسہرہ، بسنت وغیرہ حالانکہ خالص ہندستانی تہوار ہیں۔ لیکن اکبر بادشاہ کے عہد سے قلعۂ معلی میں ان کا رواج ہوا اور رفتہ رفتہ عام مسلمانوں نے بھی ان کو اپنایا۔ اورنگ زیب کے عہد میں قلعۂ معلی میں ان تہواروں کو موقوف کر دیا گیا تھا لیکن عوام میں یہ جاری رہے، اور اس کے عیش پرست جانشینوں نے پھر ان کا احیا کر دیا۔[3] ان تہواروں کے موقع پر شعرا نظمیں لکھتے تھے، میر اور قائم چاند پوری اور نظیر اکبر آبادی کی ان موضوعات پر نظمیں بالخصوص اہم ہیں۔ افسوس نے، آصف الدولہ کے جشنِ ہولی پر ایک نظم لکھی تھی۔ اس زمانے کے اکثر شعرا کے ہاں ان تہواروں پر اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً

داغ بر دل جو ترا چاہنے والا نکلا — شب چراغانِ دوالی کا دوالا نکلا

مرزا مظہر جان جاناں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مسلمان عورتیں رسوماتِ کفر پر عمل کرتی ہیں، اور ان کو اپنی عید اور خوشیوں کا موقع سمجھتی ہیں اور اپنے ہم سایہ ہندوؤں کی طرح اپنی لڑکیوں کے

1۔ دیوانِ بیدار۔ ص 10۔

2۔ خاکسار کا مضمون۔ ہندو تہذیب اور مسلمان' ملاحظہ ہو۔

3۔ معمولاتِ مظہری۔ 38۔

گھر تحفے بھیجتی ہیں۔ ایام ہولی میں اپنے برتنوں کو گونا گوں رنگوں سے مزین کرتی ہیں، اور ان گھڑوں میں سرخ چاول بھر کر اپنی لڑکیوں کی سسرال بھیجتی ہیں 1۔

مختصر یہ کہ اٹھارھویں صدی میں مسلمانوں کی مذہبی اور دینی حالت اچھی نہیں تھی اور اسلام کی اصلی صورت مسخ ہو چکی تھی۔ ہندستانی ماحول نے اس کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس دور کے مسلمان اپنے عقائد اور اعمال کے لحاظ سے مسلمان نہیں تھے، بلکہ چونکہ وہ ان گھروں میں پیدا ہوئے تھے، جو غیر مسلمانوں کی نظر میں مسلمان گھرانے سمجھے جاتے تھے اور اسی بنا پر وہ مسلمان کہے اور سمجھے جاتے تھے۔

آخر میں اُن برائیوں اور بدعتوں کی طرف مجملاً اشارہ کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا، جن کا شاہ ولی اللہ نے ذکر کر کے ان کے ازالے کی کوشش کی تھی۔ ان کے بعد بھی یہ کوششیں شاہ عبدالعزیز دہلوی اور سید احمد بریلوی کی قیادت میں ہوتی رہیں۔ مگر انگریزی تسلط کے قیام نے ان کو بار آور نہ ہونے دیا۔ ان کے بعد ہندستان کی سرزمیں میں کوئی مصلح قوم وجود میں نہیں آیا جو شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ کی طرح مسلمانوں کی دینی اخلاقی اور مذہبی زبوں حالی کو روکنے کی کوشش کرتا۔ اس زمانے میں ایسی تحریکوں کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔

(1) شرک

''تم غیر اللہ کے نام کی قربانیاں کرتے ہو اور مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے ہو، یہ تمھارے بدترین افعال ہیں، تم نے یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے اولیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا رکھا ہے۔''

(2) ارکان دین سے غفلت

(الف) ''تم نمازوں سے غافل ہو   کوئی اپنے کاروبار میں اتنا مشغول ہو جاتا ہے کہ نماز کے لیے وقت نہیں نکال پاتا اور کوئی اپنی اپنی تفریحوں اور خوش گپیوں میں اتنا منہمک ہے کہ نماز فراموش ہو جاتی ہے۔

(ب) ''تم زکاۃ سے بھی غافل ہو   تم میں کوئی مال دار ایسا نہیں جس کے ساتھ بہت سے

---

1 معمولات مظہری۔ ص 38۔

کھانے والے لگے نہ ہوں، وہ ان کو کھلاتا اور پہناتا ہے، مگر زکاۃ اور عبادت کی نیت نہیں کرتا۔''

(س) ''تم رمضان کے روزے بھی ضائع کرتے ہو اور اس کے لیے طرح طرح کے بہانے بناتے ہو۔''

(3) فسق وفجور

''چاہیے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعے پورا کرو، خواہ تمھیں ایک سے زیادہ ہی نکاح کیوں نہ کرنے پڑیں...... تمھاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم وگداز اندام عورتوں سے لطف اندوز ہوتے رہو۔''

(4) بُری رسومات

''اے بنی آدم! تم نے ایسی فاسد رسمیں اختیار کر لی ہیں جن سے دین متغیر ہو گیا ہے، مثلاً یوم عاشورہ کو تم باطل حرکات کرتے ہو، ایک جماعت نے اس دن کو ماتم کا دن بنا رکھا ہے، کچھ لوگوں نے اس دن کو کھیل تماشوں کا دن بنا لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اسے مذہبی مناسک کا دن بنا رکھا ہے۔ پھر تم شب برأت میں جاہل قوموں کی طرح کھیل تماشے کرتے ہو، اور تم میں سے ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ اس روز مردوں کو کثرت سے کھانا بھیجنا چاہیے۔''

(5) غیر شرعی حرکات

''پھر تم نے ایسی رسمیں بنا رکھی ہیں، جن سے تمھاری زندگی تنگ ہو رہی ہے۔ مثلاً شادیوں میں فضول خرچی'' طلاق کا ممنوع بنا لینا، بیوہ عورتوں کو بٹھا رکھنا، تم نے موت اور غم کو عید بنا رکھا ہے۔[1]

1۔ الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر) ص138,140۔

حصہ دوم

میر لکھنؤ میں

1196ھ/1781 تا 1225ھ/1810

باب پنجم

سیاسی حالات

میر نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ پہنچے۔ یہ عہد سلطنت اودھ کی تاریخ کے انحطاط اور زوال کا دور تھا۔ لہٰذا یہاں یہ مناسب ہوگا کہ اودھ کی ریاست کے عروج کی تاریخ کا مجمل جائزہ لے لیا جائے تاکہ وہاں کے سیاسی اقتصادی، اخلاقی، و مذہبی اور سماجی حالات کے مطالعہ میں آسانی ہو۔

نواب سعادت علی خان

سید شمس الدین، ساکن نجف اشرف ایک اعلیٰ سید خاندان کے فرد اور صاحب علم شخص تھے۔ ایران میں ان کا ہم عصر بادشاہ اسماعیل صفوی تھا۔ شاہ اسماعیل نے ان کو بلا کر قاضی القضات کے عہدے پر مقرر کیا۔ اور نیشاپور میں بہت سی املاک بطور جاگیر عطا کیں۔[1] ان کے کئی بیٹے تھے، اور سب سے بڑے بیٹے کا نام، سید محمد جعفر تھا، آخر الذکر کے دو بیٹے تھے۔ میر محمد امین اور سید محمد، سید محمد امین کے بیٹے کا نام سید یوسف تھا۔ اور سید محمد کے بیٹے کا نام محمد نصیر تھا، یہ دونوں شاہ عباس ثانی کے عہد میں تھے۔ ایک موقع پر بادشاہ شکار کیلئے جنگل میں گیا ہوا تھا، ایک شیر اچانک اس پر حملہ آور

---

1. سید کمال الدین حیدر الحسینی، سوانحات سلاطین اودھ (منشی نول کشور لکھنؤ 1896) 1، ص 19۔

Memoirs of Delhi and Faizabad: (PP) 1, p.1

نیز ملاحظہ ہو۔ عماد السعادت، ص 30۔

ہوا، سید محمد یوسف نے بڑی بہادری اور جرأت سے اس شیر پر حملہ کیا اور اپنے خنجر سے اس کو مار ڈالا، اس کارنمایاں سے خوش ہوکر بادشاہ نے انھیں اپنا وزیر بنانا چاہا لیکن انہوں نے اس عہدے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ میر نصیر کی شادی اپنے وزیر، رضا قلی بیگ کی لڑکی سے کرادیں۔ یہ شادی عمل میں آئی اور ان کے دولڑکیاں اور دو لڑکے پیدا ہوئے۔ میر محمد باقر اور میر محمد امین[1] اور میر یوسف کو نیشاپور میں بہت سی جاگیر اور املاک عطا ہوئی۔ میر محمد امین ہندستان آکر برہان الملک سعادت خان کے لقب سے موسوم ہوئے، اور وہی اودھ کے حکمران خاندان کے بانی ہوئے[2]

(ہندستان میں آمد۔1708۔1709)

سترھویں صدی کے نصف کے اواخر میں ایران کے حکمراں صفوی خاندان کا انحطاط شروع ہوا، اس زوال کے ذمہ دار آخری عہد کے عیش پرست اور غفلت شعار، شاہان تھے، حسین شاہ (1722۔1694) کے زمانے میں بدین وجہ سید شمس الدین کے خاندان کے افراد کا بھی زوال ہوا اور ان کو تنگ دستی اور افلاس کا شکار ہونا پڑا۔

لہٰذا میر محمد امین کے والد میر محمد نصیر نے ہندستان میں آکر اپنی قسمت آزمانے کا ارادہ کیا۔ یہ زمانہ ایران کے مہاجرین کے لیے بہت ہی سازگار تھا۔ کیوں کہ ضعیف العمر اورنگ زیب کی وفات ہوچکی تھی اور ان کا جانشین بہادر شاہ، شیعی عقائد کی طرف مائل تھا، وہ سید ہونے کا دعویٰ کرتا تھا، اور سید کا لقب بھی اختیار کرلیا تھا۔ عقائد شیعی کی ترویج وتبلیغ میں نمایاں کوشش بھی کرتا تھا۔[3]

اپنے بڑے بیٹے، میر محمد باقر کو ہمراہ لے کر، میر محمد نصیر ایران سے 1707 میں ہندستان کے

---

1. رسالہ محمد شاہ وخاندوران خان میں "مرزا سعادت" نام لکھا ہے۔ ص 96ب۔

2. برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ خزانہ عامرہ 74، اخبار محبت ص 446, 444 محمد قدرت اللہ گوپاموی: تذکرہ نتائج الافکار ص 51، رسالہ محمد شاہ وخاندوراں خاں ص/96ب، سوانحات سلاطین اودھ 1/ص 19۔

3. سیر المتاخرین (ا۔ت) 2/ص 8، تذکرۃ الملوک ص 116 الف و 116 ب مہاراجہ کلیانی سنگھ۔ خلاصۃ التواریخ ص/163 , 166 , 61۔

Memoirs of Delhi and Faizabad (APP) 1,P.1.

لیے روانہ ہوئے۔ پانی کے جہاز کے ذریعے بنگال آئے۔ وہاں سے بہار پہنچے اور پٹنہ عظیم آباد میں سکونت اختیار کر لی۔[1] یہاں مرشد قلی خان نے ان کو مدد معاش اپنے داماد شجاع خان کی سفارش پر عطا کی۔ جو غربا پروری کے لیے بڑی شہرت کا حامل تھا۔ اور بالخصوص ان لوگوں کے ساتھ بڑی ہمدردی سے پیش آتا تھا، جو ایران سے وارد ہوتے تھے۔[2] میر محمد نصیر نے اپنے دوسرے بیٹے میر محمد امین کو نیشاپور ہی میں چھوڑ دیا تھا جس کی قسمت میں عظمت لکھی تھی، اور اسی کو اودھ کے حکمراں خاندان کا بانی ہونا تھا۔ وہ اپنے چچا اور خسر میر محمد یوسف کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے والد اور بڑے بھائی کے ساتھ ہندستان نہ آیا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن اس کی بیوی نے طعنہ دیا کہ وہ لوگ صاحب غیرت تھے وطن چھوڑ کر روانہ ہندستان ہوئے لیکن تم اتنے بے غیرت ہو کہ یہاں سے ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔[3] اس کے برعکس غلام نقوی، کا بیان ہے کہ میر محمد امین اپنے والد سے ملاقات کرنے کی غرض سے 1120ھ (1708-1709) عظیم آباد پٹنہ آیا۔[4]

لیکن اس کے ہندستان آنے کے کچھ ماہ قبل اس کے معمر والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور پٹنہ سے تھوڑے فاصلے پر ان کو دفن کیا گیا۔[5] اس لیے کچھ دنوں پٹنہ میں قیام کے بعد دونوں بھائی تلاش

---

1. اخبار محبت ص 444 عماد/ص 5۔

2. سیر المتاخرین (ا۔ت) 2/ص 259-258۔

3. سوانحات سلاطین اودھ 1/ص 20۔ سید کمال الدین حیدر نے یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ نیشاپور میں میر محمد امین نے ایک ٹھیکا لیا تھا، خسارہ ہوا میرزا یوسف کور کی ماں کا زیور فروخت کر کے اسے ادا کیا۔ اس غیرت و حجاب سے ہندستان آیا ایضاً ص 20۔

4. خافی خاں 2/ص 902۔ حدیقۃ الاقالیم ص 384۔ مآثر الامرا 1/ص 463۔ عماد/ص 5۔ کچھ مورخوں کا بیان ہے کہ وہ بہادر شاہ کے عہد حکومت میں ہندستان وارد ہوا اور کچھ کہتے ہیں کہ فرخ سیر کی تخت نشینی سے قبل وہ ہندستان میں موجود تھا، خزانۂ عامرہ ص 74 اخبار محبت ص 444۔ تاریخ مظفری 1/ص 236 ب۔ 237 الف۔ رسالہ محمد شاہ و خاندوراں میں لکھا ہے "بارادہ نوکری و ملازمت عازم ہندستان شد" ص 96 ب۔

5. 1744ء میں جب صفدر جنگ، علی وردی خاں کی مدد کے لیے گیا تھا، تو وہ ان کے مزار پر فاتحہ پڑھنے جایا کرتا تھا۔ سیر المتاخرین (ا۔ت) 2/ص 150 نیز ملاحظہ ہو۔ اخبار محبت ص 444۔

Memoirs of Delhi and Faizabad (APP) 1,P.1

معاش کی غرض سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے، یہ واقعہ غالباً 1121ھ/1709 کا تھا[1]

ابتدا میں میر محمد امین نے معمولی عاملوں کے ہاں نوکری کی[2] اور بڑی تنگ دستی کی زندگی گزاری۔ اس کے بعد دونوں بھائی سر بلند خاں کے یہاں ملازم ہوئے جو کڑا مانک پور کا فوجدار تھا[3] یہ علاقہ صوبہ الہ آباد کا تھا۔ یہ واقعہ جولائی 1710 کا تھا[4] سر بلند خاں نے میر محمد امین کو میر منزل کا عہدہ دیا[5] چونکہ سر بلند خاں نے تخت نشینی کی جنگ میں جہاں دار شاہ کا ساتھ دیا تھا۔ بدین وجہ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے اول الذکر کی خدمت کے بدلے میں اسے گجرات کا نائب گورنر مقرر کیا تھا[6] میر محمد امین اپنے آقا کے ہمراہ 1712 میں گجرات پہنچا۔ دہلی کے قیام اور بعد میں بھی میر محمد امین نے بڑے غور سے دہلی کے دربار کی سیاسی گٹھ بندیوں، سازشوں اور زوال پذیر عیش دوست تغافل شعار امرا کی شاطرانہ چالوں کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ لہذا اس نے اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے حالات کے مطابق طرزِ عمل اختیار کیا۔

سر بلند خان کے ہاں ملازم ہونے کے تقریباً دو سال بعد تک میر محمد امین کے حالات میں کوئی قابل ذکر تغیر ظہور میں نہ آیا اور آقا اور خادم کے تعلقات بڑے خوشگوار رہے۔ لیکن 1713 کے اواخر میں میر محمد امین اور سر بلند خاں کے تعلقات میں یک بارگی شکر رنجی اور کشیدگی پیدا ہوگئی اور

---

1. اخبار محبت ص 444 عماد ص 5۔

2. خزانہ عامرہ "در آں عہد (بہادر شاہ) زمانہ باد موافقت نکرد" ص 74۔

3. محبت خاں کا بیان ہے کہ اس زمانے میں سر بلند خاں گجرات کا صوبہ دار تھا، اور دونوں بھائیوں نے گجرات جا کر اس کے ہاں ملازمت کی تھی اور میر محمد امین کو میر منزل کا عہدہ ملا تھا، اخبار محبت ص 444 حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔

4. حدیقۃ الاقالیم ص 383، اخبار محبت ص 444، عماد ص 5۔

5. سوانحات سلاطین اودھ 1 / ص 20۔

6. خافی خاں 2 / ص 693 میں لکھا ہے کہ جہاں دار شاہ نے سر بلند خاں کو گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا تھا یہ بات صریحاً غلط ہے۔ میرأت احمدی میں لکھا ہے کہ اس کا تقرر نائب صوبہ داری کی حیثیت سے ہوا تھا اور اسد خان وہاں کا گورنر تھا۔

طیش میں آکر اول الذکر نے استعفیٰ دے دیا۔ اس کشیدگی کی وجہ ایک معمولی سا واقعہ بیان کیا جاتا ہے، صوبے میں دورے کے زمانے میں ایک مرتبہ ایک خیمہ نشیب زمین پر نصب ہو گیا تھا، رات کو اتنی شدت کی بارش ہوئی کہ پانی خیمے داخل ہو گیا، اور تمام سامان بھیگ گیا، اور نواب کو سرما کی پوری رات ایک رتھ کے نیچے گزارنی پڑی۔ دوسرے دن صبح کو نواب نے اپنے میر منزل کو طلب کیا اور اپنی خدمات کو حسن اسلوبی سے انجام نہ دینے کی بنا پر اس کا سخت احتساب کیا اور اظہار خفگی کیا۔ میر اس بات سے کبیدہ خاطر ہوا اور اس کا اظہار بھی کر دیا۔ اس بات پر نواب نے غصہ میں آکر کہا "تمھارے دماغ میں بوئے ہفت ہزاری پائی جاتی ہے۔ کس طرح تم اس معمولی خدمت کو انجام دے سکتے ہو[1]" یہ طنزیہ فقرہ ایران کے ایک حساس اور صاحب عزت نوجوان کو بڑا ناگوار گزرا۔ حالانکہ نواب نے بعد کو اس کی بڑی دل جوئی کی کوشش کی مگر وہ مستعفی ہو گیا، اور اس نے بڑے سخت لہجے میں جواب دیا "میں آپ کے اس کہنے کو اپنے لیے فالِ نیک سمجھتا ہوں، میں ہفت ہزاری کا منصب حاصل کرنے دہلی جا رہا ہوں اور اس کے بعد دوبارہ آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔"[2]

درحقیقت سربلند خاں کے الفاظ نے میر محمد امین کی زندگی کے لیے پیشین گوئی کا کام دیا جو بعد میں حقیقت کی صورت میں ظہور پزیر ہوئی۔

رسالہ محمد شاہ و خاندوراں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر محمد امین نے سربلند خاں کے ہاں ملازم ہونے سے پہلے بھی دوسرے امرا کے ہاں ملازمت کی تھی، جیسے صمصام الدولہ خاندوراں خاں، نواب تقرب خاں میر خاں سامان، اس کے بعد بادشاہی ملازمت میں داخل ہوا تھا، متذکرہ کتاب کے مصنفِ کا بیان ہے۔

"اولاً بتعارف بعضے مشغول ملازمت نواب صمصام الدولہ خاندوراں فرقہ سپاہیان، ملازمان سربلند بلندی افراخت و جہد برتری بنوکری دورو پیہ برافراخت، ثانیاً بخدمت نواب تقرب خان، خان سامان،

---

1. سوانحات سلاطین اودھ 1 / ص20، اخبار محبت ص444-446۔

2. حدیقۃ الاقالیم ص383، عماد/ص5۔

بعد ازاں بملازمتِ بادشاہی،،[1]

میر محمد امین (1713-1719) فرخ سیر کی خدمت میں

بہادر شاہ کی وفات کے بعد جہاں دار شاہ دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس نے عیش پرستی اور لعل کنور کے عشق میں جاہ و جلال سب کچھ کھو دیا، اور پورا سال بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ فرخ سیر کے ہاتھوں شکست کھائی، اور اسے پھانسی کے تخت پر لٹکا دیا گیا۔ جیسا کہ تفصیل سے پہلے حصے میں لکھا جا چکا ہے۔ مختصر یہ کہ فرخ سیر نے سادات بارہ کے فوجی اور سیاسی اقتدار کو توڑنے کے لیے اور ان کے شکنجے سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے اپنے حامیوں کی ایک پارٹی بنائی اس زمانے میں شاہی دربار سازشوں اور دغا بازیوں سے آلودہ تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ میر محمد امین دہلی پہنچا اور شاہی ملازمت میں داخل ہوا اور رفتہ رفتہ ہفت ہزاری منصب کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ پہلے ''والا شاہی'' نامی فوجی دستے کا کمانڈر مقرر ہوا[2] یہ کامیابی بادشاہ کے منظور نظر محمد جعفر کی سرپرستی کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی[3] اس زمانے میں محمد جعفر (جس کا لقب تقرب خاں والا شاہی تھا) دہلی کے گنج کا کروڑی تھا۔ لہٰذا اس نے میر محمد امین کو نائب کروڑی کا عہدہ دیا[4] 1716 میں محمد جعفر نے وفات پائی۔ اس حادثے کی وجہ سے میر محمد امین ایک ایسے شخص کی سرپرستی سے محروم ہو گیا جو دربار شاہی میں اپنا اچھا خاصا اثر رکھتا تھا۔ لہٰذا ساڑھے تین سال تک اسے کسی قسم کی ترقی نصیب نہیں ہوئی۔

بیانہ اور ہنڈون کی فوجداری[5]

اس زمانے میں طاقتور سادات بارہہ اور بزدل بادشاہ کے درمیان تنازعہ اپنے نقطۂ کمال

1۔ رسالہ محمد شاہ و خاندوراں خاں ص 96 ب۔

2۔ خافی خان 2/ص 902۔ ماثر الامرا 1/ 463 سیر المتاخرین (ا۔ت) 2 ص 59، احوال الخواقین۔ فرخ سیر کے عہد کے ہفت ہزاری منصب داروں کی فہرست میں اس کا نام موجود ہے ص 62 الف

3۔ ماثر الامرا 1/ص 463۔

4۔ ماثر الامرا 1/ص 463۔

5۔ رسالہ محمد شاہ و خاندوراں خاں میں لکھا ہے کہ بادشاہی ملازمت میں داخل ہونے . . (باقی صفحہ 257 پر)

پر پہنچ چکا تھا۔ آخر میں فرخ سیر کو معزول کر دیا گیا، اندھا کیا گیا اور بڑی بے دردی اور درندانہ انداز اور ذلت کے ساتھ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہندستان میں بلا کسی مدِ مقابل کے "بادشاہ ساخت" سادات بارہہ نے یکے بعد دیگرے رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کو تختِ شاہی پر بٹھایا۔ ان کے بعد انھوں نے روشن اختر، کو تخت نشین کیا۔ جس نے محمد شاہ کا لقب اختیار کیا، اب سادات بارہہ اپنے عروج کے نصف النہار پر پہنچ چکے تھے اور تورانی پارٹی کا کوئی منظم گروہ ان کی مخالفت کے لیے موجود نہ تھا۔

اس کشمکش کے زمانے میں میر محمد امین حالانکہ خاموشی سے تماشا دیکھتا رہا مگر موقع کی تلاش میں ضرور رہا۔ لہٰذا تقرب خان کی وفات کے بعد وہ سادات بارہہ کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ سید اور شیعہ ہونے کی وجہ سے میر محمد امین کو ان کا تقرب حاصل کرنے میں کسی طرح کی زحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور ان کی داخلی مجالس میں بآسانی شامل ہو سکتا تھا، جس موقع پر سید عبداللہ خاں مع رفیع الدولہ کے راجہ جے سنگھ کے خلاف جنگ کرنے گیا تھا، میر محمد امین بھی اس کے ہمراہ تھا، حسن اخلاق اور خداداد جنگی خصائص کی بنا پر اسے سید حسین علی خاں کی سرپرستی حاصل ہو گئی، جو میر بخشی تھا۔ لہٰذا اس نے میر محمد امین کو ہنڈون اور بیانہ کی فوجداری کا عہدہ دلوا دیا۔ یہ علاقے صوبہ آگرہ کے مضافات میں داخل تھے۔[1]

بقیہ صفحہ 256 کا حاشیہ) کے بعد اسے منصب اور خانی کا خطاب ملا۔ اور 22 پرگنوں کی جس میں بساور بھی شامل تھا فوجداری کا عہدہ ملا۔ اس نے اپنے نئے علاقے میں امن و امان قائم کرنے میں بڑی چابک دستی اور بہادری سے کام لیا اور ستائش کا حامل ہوا اور روزانہ وہ ایک ہزار سپاہی لے کر امن و امان قائم کرنے اور باغیوں کے قتل کرنے کے لیے نکلتا تھا۔ ص 96 ب۔ 97 الف

---

1 قاضی مرتضیٰ بلگرامی کا بیان ہے کہ میر محمد امین کو یہ عہدہ سید حسین علی خان کی سفارش پر ملا تھا۔ حدیقۃ الاقالیم ص 384، اخبار محبت میں لکھا ہے، در عہد سلطنت رفیع الدرجات پسر رفیع الشان پیش رائی رتن چند، دیوان قطب الملک حاضر شدہ، سوال و جواب نمودہ 1128ھ بجمع ہجدہ لک روپیہ پرگنہ ہنڈون و بیانہ اجارہ گرفت ص 444-446۔ نیز ملاحظہ ہو۔ عماد ص/6۔ سیر المتاخرین 2/ص 59، تاریخ مظفری 1/ص 236 ب 237 الف۔ حسن پور کی جنگ کے موقع پر عبداللہ خاں نے ان علاقوں پر اسے اپنی طرف سے مقرر کر دیا اور اجارہ داری کی شرط ختم کر دی۔ اخبار محبت ص 446-444۔

اس زمانے میں چونکہ میر محمد امین کی بیوی نے وفات پائی تو اس نے آگرہ کے صوبے دار محمد تقی خان کی دختر سے عقد کر لیا۔[1]

ابھی اس عہدے پر زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ سادات بارہہ نے اس کی عزت افزائی کی اور اس شاہی فوج کا کمانڈر مقرر کیا جو باغی راجہ گردھر، صوبہ دار الہٰ آباد، کی سرکوبی کے لیے روانہ کی جانے والی تھی۔ اسی دوران میں میر محمد امین سے ایک غلطی سرزد ہو گئی، اور وہ یہ تھی کہ اس نے سید حسین علی خان سے اس بات کی شکایت کی کہ راجہ رتن چند، جو سید عبداللہ خان دیوان تھا، میر جملہ کو صدر الصدور کے تقرری کا فرمان جاری نہیں کرتا۔ اس بات سے خفا ہو کر راجہ رتن چند نے میر محمد امین کے نئے عہدے کی تقرری منسوخ کر دی اور حیدر قلی خاں کو شاہی ہراول دستے کا سردار مقرر کیا گیا۔

چونکہ ہنڈون اور بیانہ کا علاقہ راجستھان کی سرحدوں سے ملتا تھا۔ اور جاٹوں اور راجپوتوں کی طاقت اس زمانے میں مائل بہ عروج تھی۔ لہٰذا ان علاقوں میں امورِ حکومت کو منظم طریقے پر چلانا اور نظم و نسق قائم کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس وجہ سے میر محمد امین نے اپنی فوج کا اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ اس نے وزیر الممالک سے بھی درخواست کی کہ وہ شاہی فوج کا ایک دستہ اس علاقے میں تعینات کر دیں، شاہی فوج کی امداد سے میر محمد امین نے اس علاقے میں امن و امان، نظم و نسق قائم کیا، اور سرکش زمین داروں کی بڑی کامیابی سے سرکوبی کی۔ ان خدمات کے صلے میں اسے صد ذات کے منصب پر ترقی دی گئی۔[2]

1719 کا وہ زمانہ تھا کہ سادات بارہہ اپنی سیاسی ترقی کے نقطۂ کمال پر پہنچ چکے تھے اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کا زوال خاتمے کی صورت میں رونما ہوا۔ جیسا کہ پہلے حصہ میں لکھا جا چکا ہے، سادات بارہہ نظام الملک سے دلی عناد رکھتے تھے، اور اس کی طاقت کے قلع قمع کرنے کے درپے تھے۔ اس وجہ سے وہ امیر جنوبی ہندستان چلا گیا تھا، اور وہاں سید حسین علی خان کے

1۔ رسالہ محمد شاہ و خاندوراں خاں" درانجا مصدر تردادات شایستہ شدہ مورد ہزار تحسین و آفرین شد و قریب ہزار سوار جرار کہ ہر روز برائی تہور جدال و قتال آراستہ" ص 97 الف

2۔ خافی خان 2/ص 902 نیز سیر المتاخرین 2/ص 59۔

نائب صوبہ دار دلاور علی خاں کو شکست دی اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس خبر کو سن کر سادات بارہہ بے حد پریشان ہوئے اور اس کی سرکوبی کے لیے سید حسین علی خاں نے مع بادشاہ محمد شاہ کے جنوبی ہند کے لیے کوچ کیا۔

کچھ منزلیں طے کرنے کے بعد محمد شاہ، بہادر پور کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ اکتوبر/1720 کے کچھ دنوں ماقبل میر محمد امین شاہی لشکر میں وارد ہوا اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر آداب بجا لایا۔ اس کی وفاداری اور ہم مشربی پر اعتماد کرتے ہوئے سید حسین علی خاں نے حکم دیا کہ وہ شاہی لشکر میں قیام کرے اور اس کے ساتھ دکن چلے۔ مگر رسالہ محمد شاہ وخاندوراں میں لکھا ہے کہ سید حسین علی خاں میر محمد امین کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر حسد کرتا تھا، اس وجہ وہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا تا کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ اپنی طاقت نہ بڑھا سکے۔

”نواب بخشی الممالک حسین علی خاں بہادر در باطن ناخوش وظاہر برائے رفاقت سیر وسفر دکن طلبش نمودہ اختلاج اطوار جرات جمعیت بدل داشت،،[1]

آگرہ سے دکن کے لیے روانگی کے زمانہ ہی سے شاہی امرا، یعنی تورانی پارٹی، میں سادات بارہہ کے خلاف داخلی سازشیں عملی صورت اختیار کر رہی تھیں۔ اور سازش کرنے والوں کا سرغنہ نظام الملک کا چچا، محمد امین خاں اعتماد الدولہ تھا۔ جس کی جان لینے کی کوشش سادات بارہہ بارہا کر چکے تھے۔ محمد امین خاں نے جسے محمد شاہ بادشاہ کی سرپرستی اور اس منصوبے میں رضامندی حاصل تھی، اپنے اس منصوبہ میں میر حیدر قلی خاں (میر آتش) اور شاہ عبد الغفار کو شریک کار بنا لیا تھا۔ باوجودیکہ سادات بارہہ نے میر محمد امین کے ساتھ بڑے احسانات کیے تھے۔ پھر وہ محمد امین خاں اعتماد الدولہ کے گروہ میں شریک ہو گیا[2] مختصر یہ کہ ٹوڈا بھون[3] کے مقام پہ 8/ اکتوبر 1720 کو

1۔ رسالہ محمد شاہ وخاندوران خاں۔ ص 97 الف

2۔ خافی خاں 2/ 902۔

3۔ تاریخ ہندی میں اس مقام کا نام بھوسادر لکھا ہے۔ ص 480۔

سید حسین علی خان کو فریب دے کر حیدر بیگ خاں نے قتل کر دیا۔[1]

سعادت خان بہادر کا خطاب ملنا

9 / اکتوبر 1720 کو بادشاہ نے دربار خاص منعقد کیا اور اپنے نمک حلال سرداروں کو ان کی حالیہ خدمات کے عوض میں انعام و اکرام القاب و خطاب اور مناصب میں اضافہ کر کے سرفراز کیا۔ دوسرے امیروں کے علاوہ میر محمد امین کو سعادت خاں بہادر کا لقب دیا گیا۔ اور ایک صدی کے منصب سے اضافہ کر کے پانچ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب عطا ہوا۔[2]

آگرہ کی صوبہ داری 1720۔1722

واپسی میں گوپال پور کے مقام پر سعادت خاں کو دوبارہ ترقی دی گئی اور اس کا منصب بڑھا کر چھ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا کر دیا گیا اور آگرہ کی صوبہ داری کا عہدہ بھی عطا ہوا۔ مزید براں ایک خلعت ایک راس گھوڑا، ایک ہاتھی، علم و نقارہ بھی تفویض ہوا۔ سعادت خان نے نیل کنٹھ ناگر کو وہاں کا نائب مقرر کیا اور امور ملکی کی انجام دہی کے لیے بھیجا اور بذات خود بادشاہ

---

1. اس واقعہ کے لیے تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو۔ خافی خاں 2 /ص 906,909 تاریخ ہندی 480,483، سیر المتاخرین 2 /ص 59,60 تذکرۃ الملوک ص 128 ب 130 الف، احوال الخواقین ص 175 ب۔ 176 ب، آشوب۔ 1 /ص 7 ب 8 الف، 20 الف و ب، رسالہ محمد شاہ و خاندوراں خاں ص 97 ب، شاہ نامہ منور کلام ص 46 ب۔ 48 الف، تاریخ مظفری 142 / الف، ۔ 152 ب۔ ماثر الکرام بموسومہ سرو آزاد) ص 169,170 میر عبد الجلیل بلگرامی نے اس واقعہ کو واقعہ کربلا سے تشبیہ دی ہے اور ایک مرثیہ لکھا ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

آثار کربلاست عیاں از جبین ہند

زد جوش خون آل نبی از زمین ہند

Memoirs of Delhi and Faizabad: 1,PP248-51

ایضاً۔ ص 171,173۔

2. خافی خان 2 /ص 911، سیر المتاخرین 2 /ص 60، اخبار محبت ص 444,446 رسالہ محمد شاہ و خاندوران 98 الف۔

کے ہمراہ سید عبداللہ خاں سے مقابلے کے لیے چلا گیا۔[1]

حسن پور کا محاربہ۔1720

حسن پور کے مقام پر شاہی افواج اور وزیر الممالک سید عبداللہ خاں کے مابین ایک جنگ ہوئی۔اور سید عبداللہ خاں زخمی ہو کر گرفتار ہوا،شہزادہ محمد ابراہیم سلیم گڑھ کے قلع میں مقید کر دیا گیا۔ اور سید عبداللہ خاں کو میر حیدر بیگ خاں کے سپرد کر دیا گیا[2] اس فتح کے بعد محمد شاہ نے سعادت خاں پر نوازشوں کی بارش کی اور بہادر جنگ کا خطاب دیا اور ماہی و مراتب عطا ہوا[3] دو ماہ کے بعد محمد شاہ نے سعادت خان کو داروغۂ خاص کا عہدہ عطا کیا اور خلعت اور سر پیچ سے نوازا اور اس کے بعد اسے اپنے صوبے میں واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔

آگرہ پہنچ کر سعادت خان نے جاٹوں کی سرکوبی کے لیے اقدام اٹھائے اور بڑی کامیابی سے ان کا قلع قمع کر دیا۔اس کے بعد اس نے میواڑ کے راجہ اجیت سنگھ کے خلاف مہم کا ارادہ کیا کہ اسی زمانے میں دربار معلیٰ سے حکم صادر ہوا کہ وہ جلدی سے دہلی پہنچے[4] وہ حسب الحکم دہلی پہنچا اور اجیت سنگھ کے خلاف مہم کی سرداری کے لیے اس کا انتخاب ہوا۔مگر درباری امرا جو نسلی اور حسبی اعتبار سے اپنے کو اعلیٰ و افضل سمجھتے تھے،سعادت خاں کو نو دولتیہ سمجھتے تھے،اور اس کی سرداری میں کام کرنا اپنے لے باعثِ ذلت سمجھتے تھے۔علاوہ ازیں اس مہم میں خرچ کے لیے محمد شاہ نے رقم بھی بہت کم دی۔لہٰذا ان تمام باتوں سے بددل ہو کر سعادت خاں نے اس مہم میں جانے سے انکار کر دیا۔[5]

1۔ خزانۂ عامرہ ص 72، سیر المتاخرین 2 / ص 75، اخبار محبت ص 444,446، رسالہ محمد شاہ خاندوراں خاں 98 الف خافی خاں 2 / 911 پانچ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار۔

2۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو خافی خاں 2 / ص 922,933 سیر المتاخرین 2 / ص 63,68 / 830 سرو آزاد ص 161، آخر میں زہر پلا کر اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا،اور دہلی میں اس کی قبر زیارت گاہ خواص و عوام تھی، یہ واقعہ 1135ھ میں ظہور میں آیا۔ایضاً ص 161۔

3۔ سیر المتاخرین ص 99،Memoirs of Delhi and Faizabad (APP)P.1

4۔ سیر المتاخرین 2 / ص 69۔

5۔ سیر المتاخرین 2 / ص 76,79۔

اس اثنا میں جاٹوں نے نیل کنٹھ ناگر پر حملہ کر کے اس کو قتل کر دیا۔ اور محکم سنگھ نے شاہی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس خبر کو سن کر سعادت خان بڑی تیز گامی سے آگرہ واپس آ گیا۔ چونکہ جاٹوں میں باہمی نفاق تھا۔ اس وجہ سے چورامن جاٹ کا بیٹا بدن سنگھ سعادت خان سے مل گیا۔ اس موقع پر بدن سنگھ اور سورج مل میں جانشینی کے مسئلہ پر جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور بدن سنگھ نے سعادت خان سے مدد کی درخواست کی۔ بدن سنگھ کی قیادت میں سعادت خاں نے دوبارہ جاٹوں پر حملہ کیا مگر اُسے کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ ہو سکی، اور زیادہ دن تک جنگ جاری نہ رکھ سکا۔[1]

چونکہ جاٹوں کو مطیع کرنے میں سعادت خان ناکام رہا۔ لہٰذا بدین وجہ آگرہ کا صوبہ راجہ جے سنگھ کو عطا ہوا اور سعادت خان کو معزول کر دیا گیا۔[2] اس کے بعد سعادت خاں دہلی کے لیے روانہ ہوا۔ چونکہ محمد شاہ اس سے خفا تھا، اس لیے اسے بادشاہ کے حضور میں حاضر ہونے کی اجازت نہ ملی اور حکم دیا گیا وہ صوبہ اودھ چلا جائے اس صوبے میں گورکھ پور کی فوج داری بھی شامل تھی۔ مختصر یہ کہ اودھ کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ اور سند تقرری اور خلعت اُسے بھیج دیا گیا۔[3]

اودھ کی صوبہ داری

گردھر ناگر کو جو صوبہ اودھ کا گورنر تھا، صوبہ مالوہ کی صوبہ داری عطا ہوئی۔[4] یہ واقعہ 9 ستمبر 1722 کو پیش آیا۔ اور اس طرح سعادت خاں کو صوبہ اودھ کی صوبہ داری ملی۔ اس زمانے تک صوبہ اودھ سلطنتِ مغلیہ کا اٹوٹ انگ تھا۔ سعادت خاں نے وہاں پہنچ کر ایک ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی جس نے ایک آزاد حکومت کی صورت اختیار کی۔[5]

1۔ خافی خان 2 /ص 944,945، مآثر الامرا 1 /ص 464-465، سیر المتاخرین 2 /ص 80۔

2۔ سیر المتاخرین 2 /ص 80 خزانہ عامرہ ص 74۔

3۔ سیر المتاخرین 2 /ص 80 خزانہ عامرہ ص 80,91، خزانہ عامرہ ص 74۔

4۔ عماد /ص 17 خزانہ عامرہ 2 /ص 80۔

5۔ جام جہاں نما ص 498، پہلے اودھ کا دارالحکومت (مستقر) فیض آباد تھا، سعادت خاں کے پوتے نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اپنا مستقر بنایا 1819ء میں غازی الدین حیدر نے لورڈ ہیسٹنگ کے اکسانے پر بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا تھا، اور آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ Memoirs of Delhi and Faizabad, (APP)1,P 1.

کچھ دنوں کے بعد سعادت خان نے لکھنؤ کے شیخ زادوں کو زیر کیا۔ اس کا فی الفور نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے باغی اور سرکش سرداروں نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ سعادت خاں نے اپنی سیاسی بصیرت سے کام لے کر ان سرداروں کو ان کے علاقوں پر بدستور سابق قابض رہنے کی اجازت دے دی۔ اس وجہ سے اس کے اقتدار اور قوت میں اضافہ ہو گیا اور اس کے نام سے باغیوں کا دل دہل گیا[1]۔

مگر کچھ ایسے بھی سرکش زمین دار تھے جو کسی بھی حالت میں صوبہ دار کے مطیع ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان میں سے تیلوئی کا زمین دار موہن سنگھ بھی تھا۔ آخر کار ان دونوں میں جنگ کی نوبت پہنچ گئی اور موہن سنگھ دورانِ جنگ میں کام آیا۔

(1723)[2] سعادت خان نے اپنے علاقہ کا دوبارہ بندوبست کیا جس کی وجہ سے آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔ ان خدمات کے صلے میں محمد شاہ نے سعادت خان کو برہان الملک کا خطاب دیا[3]۔

دربار مغلیہ کی سیاست اور گروہ بندیوں کی کشمکش میں اہم رول ادا کرنے کی غرض سے برہان الملک دہلی کے لیے رخصت ہوا اور صوبے کے نظم و نسق پر نگرانی کا کام اس نے اپنے نائب پر چھوڑ دیا۔ دہلی میں اس کا ٹکراؤ میر بخشی صمصام الدولہ خاندوراں خاں کے بھائی مظفر جنگ سے ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نیشاپور کا ایک باشندہ مظفر جنگ کے ہاں ملازم تھا۔ مظفر جنگ نے اس پر غبن کا الزام عائد کر کے اسے مقید کر دیا تھا۔ چونکہ مجرم سعادت خاں برہاں الملک کا ہم وطن تھا اس لیے اس نے مظفر جنگ سے اسے رہا کرنے کی بار بار درخواست کی اور ایک مرتبہ اس اصرار کا نتیجہ سخت کلامی کی

1۔ چہار گلزار شجاعی ص232ب۔

2۔ خزانہ عامرہ۔ ص74 آزاد بلگرامی کا بیان ہے۔ زمینداران صوبۂ اودھ شیوۂ سرکشی علم روزگار اند و شاید از ابتدا ایجاد عالم ہیچ حاکم را اطاعت قرار واقع نکردہ باشند، برہان الملک ہمہ را بضرب شمشیر مطیع و باجگزار ساخت و نقش عمل کو در ہیچ عصر نشان نمی دہند در آن صوبہ نشاند و اکثر بلاد عمدہ صوبہ الہ آباد، مثل جونپور، و بنارس، غازی پور، و کنڑہ مانک پور و کوڑہ جہاں آباد وغیرہ بزور بازو گرفت و از حضور بادشاہی سند حاصل کرد، نیز عماد/ص8۔

3۔ عماد/ص8۔

صورت میں نمودار ہوا۔ آخر میں یہ جھگڑا بہت بڑھ گیا اور جنگ کی نوبت آگئی۔ مظفر جنگ اور خاندوراں خاں نے محمد خان بنگش سے اور سعادت خاں نے اپنے دوست روشن الدولہ سے مدد لی۔ اس نازک موقع پر قمر الدین خاں وزیر الممالک نے بیچ میں پڑ کر جھگڑا رفع دفع کرا دیا۔ مگر بادشاہ سعادت خاں سے بے حد ناراض ہو گیا اور اسے اودھ واپس جانا پڑا اور مظفر جنگ کو اجمیر بھیج دیا۔[1]

صفدر جنگ کا اودھ کا نائب صوبہ دار ہونا 1132ھ/1724

ابھی برہان الملک دہلی ہی میں تھا کہ اس کا بھانجا مرزا محمد مقیم نیشاپور سے فیض آباد پہنچا جسے اول الذکر نے بلایا تھا۔ مرزا محمد مقیم، جعفر بیگ خان، دوسرا لڑکا تھا، اور سعادت خاں کی بڑی بہن کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ ابھی نومولود چھ ماہ کی عمر کا ہی تھا کہ اس کی ماں نے وفات پائی اور اس کی سگی خالہ نے اس کی پرورش کی۔ اودھ میں تقرری کے بعد ہی سعادت خاں نے اپنے بھانجے کو نیشاپور سے بلایا تھا۔ فیض آباد آنے کے بعد سعادت خاں نے اپنی بیٹی صدر جہاں عرف صدر النساء کا اس سے عقد کر دیا۔[2] کچھ دنوں کے بعد سعادت خاں نے اپنے بھانجے اور داماد کو اودھ کا نائب مقرر کر دیا۔ اور دربار مغلیہ سے اسے منصور خاں کا خطاب دلوا دیا۔[3] ان کے ایک لڑکا پیدا ہوا (144 /1732-1731) جس کا نام جلیل الدین حیدر تھا۔ اور تاریخ میں شجاع الدولہ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ سعادت خاں نے اودھ کے حدود کی توسیع کی اور بنارس، جون پور، اور چنار کو اپنے علاقوں میں ملا لیا، اور ساچندی کے قلعہ پر قبضہ بھی کر لیا۔

سعادت خاں اور مرہٹہ (1738-1732)

تاریخ کے طالب علموں کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے دور حکومت

1۔ تاریخ ہندی میں لکھا ہے کہ اس قضیہ نے طول پکڑا اور آخر کار اس بات پر فیصلہ ہوا کہ صوبہ داری اودھ مظفر جنگ کو اور صوبہ داری مالوہ سعادت خاں کو عطا ہو۔ اس پر عمل ہوا۔ ص 508، آشوب 1 ص 81 ب۔ 82 ب مگر اس بات کا حوالہ کسی ہم عصر کتاب میں نہیں ملتا کہ سعادت اجمیر کی صوبہ داری پر گیا ہو۔

2۔ سوانحات سلاطین اودھ 1 /ص 21 عماد/ 8 اخبار محبت ص 446-444۔

3۔ سوانحات سلاطین اودھ 1 /ص 21 عماد ص 9-8۔

کے آخری 26 سال مرہٹوں کے قلع قمع کرنے میں صرف کیے اور بڑی حد تک ان کی مرکزی طاقت کو پاش پاش کر دیا تھا۔ مگر یہ بات ان کے حق میں مفید ثابت ہوئی۔ اب مغلیہ بادشاہ کو ایک متحد حکومت کے خلاف جنگ نہیں کرنا تھا، بلکہ اب کئی سرداروں سے بدیں وجہ اورنگ زیب مرہٹوں کو یک قلم ختم کرنے میں ناکام رہا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد تخت نشینی کی خانہ جنگیوں، بادشاہوں کی عیش پرستیوں [1] ہندستانی اور تورانی پارٹیوں کے باہمی تنازعوں، جاٹوں، راجپوتوں اور بندیلوں کی مرکزی حکومت کی اطاعت کا جوا اتار پھینکنے کی کشمکش نے مرہٹوں کو اپنے علاقوں کی توسیع کا سنہری موقع بہم پہنچایا۔ 1732 کے بعد سے مرہٹوں نے چنبل ندی پار اتر کر آگرے تک حملے کرنے شروع کر دیے تھے۔

بے جان مغلیہ دربار کے عیش پرست [2] امرا اس کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ جب مرہٹوں کے حملے کی خبر ملے تو وہ اپنی افواج لے کر باہر نکلیں اور لغو کاموں میں وقت ضائع کریں۔ درباری پارٹی کے سردار کمزور صمصام الدولہ خاندوراں اس خیال کا حامی تھا کہ مرہٹوں کو اپنا لیا جائے اور ان کی مانگوں کو قبول کر لیا جائے۔ راجہ جے سنگھ (راجہ جے پور) بھی اس رائے کا حامی تھا کیوں کہ اس کی مرہٹوں سے دوستی تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ ان پر سیاسی کامیابی تو حاصل کی جا سکتی تھی مگر فوجی کامیابی ناممکن تھی۔

برہان الملک، صمصام الدولہ اور راجہ جے سنگھ کی پالیسی کے برعکس حملہ آوروں سے فوجی مقابلے کا حامی تھا۔ وزیر قمر الدین خان حالانکہ عیش پرست تھا پھر بھی وہ سعادت خان کا ہم خیال تھا اور اس کی پالیسی کی پرزور حمایت کرتا تھا۔ مزید برآں اس کے ساتھ دوسرے سردار، جیسے محمد خان بنگش، ظفر خاں طرہ باز بلند خان وغیرہ بھی شریک تھے۔ ان کے علاوہ ابھے سنگھ بھی اسی خیال کا حامی تھا۔ سعادت خاں نے نظام الملک سے بھی اس مسئلے کے متعلق خط و کتابت کا سلسلہ جاری کیا

---

1 احوال الخواقین "بادشاہ مثل زناں در چار دیواری نشتہ است اگر از قوم سلاطین طریقہ نسوانی اختیار نما بن بند برگفتہ زن خصلتاں عمل بکند" 196 ب

2 تذکرۃ الملوک "آنکہ بسبب نارسائی وزیر و امرا تغافل و بے پروائی بادشاہ در عیش و عشرت پیوستہ در اندک معاملات جہاں چنانچہ درمیاں آمد ستم است از استیلائے ظالمان و کافران مردم آزار 136 ب

اور اس سے درخواست کی کہ وہ مرہٹوں کو دکن میں ہی اس بری طرح سے الجھادے کہ وہ شمالی ہند کی طرف رخ بھی نہ کرسکیں۔ علاوہ ازیں سعادت خاں نے محمد شاہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اودھ کے علاوہ اگر اسے آگرہ اور مالوہ کی صوبہ داری عطا ہو تو وہ شمالی ہند میں مرہٹوں کے حملوں کے دفع کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ اس نے محمد شاہ کو یہ بھی بتایا کہ راجہ جے سنگھ خفیہ طور سے مرہٹوں سے ساز باز رکھتا تھا۔ اور ان کی مدد بھی کرتا تھا، اگر بادشاہ اسے مالوہ اور آگرہ کی گورنری دے دیں تو وہ مرہٹوں سے جنگ کے لیے روپیہ بھی طلب نہ کرے گا۔ راجہ جے سنگھ نے اسی کام کے لیے شاہی خزانہ سے کروڑوں روپے لیے لیکن مجھے کچھ نہیں چاہیے کیوں کہ میرے پاس ضرورت سے زائد دولت ہے۔ اس کے علاوہ نظام الملک سے میرے ذاتی تعلقات ہیں۔ وہ مرہٹوں کے سامنے نربدا ندی اترنے میں رکاوٹیں پیدا کردے گا۔ یہ بات سن کر محمد شاہ کو طیش آگیا۔ اس نے صمصام الدولہ اور راجہ جے سنگھ سے ان کی ناکامی کا احتساب کیا۔ مگر صمصام الدولہ اور راجہ جے سنگھ کی سازشوں کے مقابلے میں سعادت خاں کی ایک نہ چلی اور اس کی تجویز مسترد کردی گئی۔ خاندوراں نے بادشاہ کو یہ بات سمجھائی کہ اس نے مرہٹوں کو صرف ان علاقوں کے دینے کا وعدہ کیا تھا، جو باغی روہیلوں اور دوسرے سرکش سرداروں کے قبضے میں تھا ویسے مرہٹہ سردار شاہی تخت کے مطیع اور فرماں بردار تھے۔ اس نے کہا مرہٹوں کو فوجی طاقت سے مطیع نہیں کیا جاسکتا۔ میں باجی راؤ کو اس بات پر رضامند کرلوں گا کہ وہ اپنے بھائی چمناجی کو بادشاہ کی خدمت میں بھیجے اگر ان مانگوں کو پورا کردیا گیا تو مستقبل میں شاہی علاقے ان کے حملوں سے محفوظ رہ جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر سعادت خاں اور نظام الملک میں سمجھوتہ ہوگیا تو وہ دوسرا بادشاہ تخت پر بیٹھادیں گے [1]۔

اس میں کوئی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں کہ اگر سعادت خاں کو مرہٹوں کی سرکوبی کا کام سونپ دیا جاتا اور بادشاہ کا اسے تعاون مل جاتا تو باجی راؤ کو اپنی مانگوں پر نظر ثانی کرنے اور ان کو کم کرنے پر مجبور ہونا پڑتا۔ مگر شاہی امرا باہمی نفاق اور سازشوں میں اپنی طاقت ضائع کررہے تھے۔ اور ہر

1. برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ سیر المتاخرین 2/ص 98 - 100 حدیقۃ الاقالیم ص 384، تاریخ چغتائی ص 192 الف تذکرۃ الملوک 33 الف - 140 الف، احوال الخواقین ص 241 الف، شاہ نامہ منور کلام (قلمی رام پور) ص 201-200۔

شخص مرہٹہ سرداروں سے علاحدہ علاحدہ مقابلہ کرتا تھا۔

1736 میں باجی راؤ کو مالوہ کی گورنری عطا کردی گئی۔ چونکہ اس کی کل مانگیں پوری نہ ہوئی تھیں۔ لہٰذا1737 میں مرہٹہ سردار دوآبہ کو تباہ و برباد کرنے کی غرض سے شمالی ہند آئے۔ اور سعادت خاں کو دوسرے مغلیہ سرداروں، وزیر اور میر بخشی کے ساتھ متحد ہونے سے باز رکھا۔ مگر سعادت خاں نے اپنے زور بازو سے مرہٹوں کو مار بھگایا۔

سعادت خاں کی اس کامیابی سے محمد شاہ بہت خوش ہوا۔ اوراس پر انعام واکرام کی بارش کی۔ کچھ دنوں آگرہ میں قیام کے بعد سعادت خاں آکر متھرا میں صمصام الدولہ اور محمد خاں بنگش سے آملا۔ اسی اثنا میں خبر ملی کہ باجی راؤ نے دہلی پر دھاوا بول دیا۔ اور وہ 7 ذی الحجہ 1149ھ کے قریب دہلی کے قریب جا پہنچا۔ یہ خبر سن کر سعادت خاں ودیگر امرا دہلی پہنچے مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی باجی راؤ راجپوتانہ کی طرف جا چکا تھا۔ اس موقع پر پھر سعادت خاں نے اپنی پرانی تجویز کہ اگر اسے آگرہ، گجرات، مالوہ اور اجمیر کی صوبہ داری عطا ہو، پیش کی اور مرہٹوں کے تہس نہس کرنے کا بیڑا اٹھانے پر تیار ہو گیا۔ چونکہ صمصام الدولہ اور راجہ جے سنگھ اس تجویز کی مخالفت کرتے تھے۔ لہٰذا بددل ہو کر وہ اودھ واپس چلا آیا۔

کرنال کا محاربہ اور سعادت خاں کا آخری زمانہ

1739 میں نادر شاہ ہندستان پر حملہ آور ہوا۔ اس خبر کو سن کر محمد شاہ مع اپنے درباری امرا کے نادر شاہ سے مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔ اور کرنال میں پہنچ کر خیمہ زن ہوا۔ شاہی حکم کے مطابق سعادت خاں برہان الملک، ابوالمنصور خان کو اپنا قائم مقام بنا کر بڑی تیز رفتاری سے کرنال کے لیے روانہ ہوا۔ جب کرنال تھوڑی دور رہ گیا تو اس نے اپنا مال واسباب اور بیشتر افواج عقب میں چھوڑ کر اور خود برق رفتاری سے شاہی خیموں میں جا پہنچا۔ جب نادر شاہ کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے اپنا ایک فوجی بھیج کر سعادت خاں کی فوج کی ناکہ بندی کر لی۔ اور ان پر حملہ کر کے جنگی مال واسباب لوٹ لیا۔ سعادت خان برائے کورنش بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ درباری امرا جنگ کے متعلق صلاح ومشورہ میں غرق تھے اور نظام الملک کی رائے تھی کہ ابھی جنگ شروع نہ کی جائے۔ اسی اثنا میں سعادت خاں کو اپنے لشکر کے لٹ جانے کی اطلاع ملی۔ اس خبر سے سعادت

خاں بے چین ہو گیا۔ اس نے بادشاہ کے روبرو رکھی اپنی تلوار اٹھالی اور جنگ کے لیے جانے کی اجازت چاہی۔ نظام الملک نے جلد بازی سے کام لینے سے منع کیا اور اس نے کہا کہ سعادت خاں کی فوج ایک ماہ کے لمبے سفر کی وجہ سے تھک چکی تھی، اور سہ پہر سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ دوسرے امرا اور بادشاہ کا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن ذی حس اور بد دماغ سعادت خاں نے کسی کی بھی بات نہ مانی اور بڑی پھرتی سے اپنے ایک ہزار سوار اور کچھ پیدل سپاہ کو لے کر غنیم کی طرف بڑھ گیا اور توپ خانے کی تیاری کا موقع بھی نہ دیا اس نے ایک نقیب کے ذریعے اپنی سپاہ کو تیاری کا حکم بھیجا لیکن تھکی ماندی سپاہ اپنے خیموں سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ انھیں اس بات کا یقین بھی نہ آیا کہ سعادت خان نے ایسا حکم صادر کیا ہوگا۔ کیونکہ وہ ان کی اطلاع کے مطابق بادشاہ کی خدمت میں گیا ہوا تھا، بڑی مشکل سے چار ہزار سوار اور ایک ہزار پیدل سپاہ اس کے ساتھ پہنچ پائی۔

اس جنگ میں سعادت خاں زخمی ہوا۔ ایرانی سپاہیوں نے گرفتار کر لیا۔ اور نادر شاہ کے خیموں میں لے جایا گیا۔[1]

عشا کی نماز کے بعد سعادت خاں کو نادر شاہ کے روبرو پیش کیا گیا۔ سعادت خان نے نادر شاہ کے سوالات کا جواب بڑی دانش مندی سے دیا جن کو سن کر وہ بہت خوش ہوا۔[2] بعد کے ایک سوال کا جواب اس نے ان الفاظ میں دیا۔

"بادشاہ کے وسائل بہت وسیع ہیں۔ ان کا صرف ایک ہی امیر
آج جنگ کرنے آیا تھا۔ اور اچانک زخمی ہو جانے کی وجہ سے واپس

---

1 برائے تفصیل جنگ ملاحظہ ہو۔ تاریخ جہاں کشائے نادری ص 235, 237 ۔ سیر المتاخرین 2 /ص 106,108 خزانہ عامرہ ص 75-74 ۔ بیاض یوسف علی خان ص 217 الف۔ 220 ب۔ چہار گلزار شجاعی 33 الف۔ 81 الف و ب 82 الف۔ 92 الف۔ تاریخ راحت افزا ص 130,132 ۔ تاریخ چغتائی ص 94 الف ۔ 195 الف اخبار محبت ص 478-477 ، میزان دانش ص 56,57 ، تاریخ ہندی ص 69, 559 ، آشوب 1 /ص 87 ب، 2 /ص 198 ب 220 الف رسالہ محمد شاہ و خاندوران خان ص 103 ب۔ 127 ب۔

2 برائے تفصیل ملاحظہ ہو، عماد /ص 25۔

لوٹ گیا۔لیکن اس کے علاوہ ابھی بہت سے امیر اور ایسے راجا ہیں
جن کے پاس بے شار فوج ہے۔"

یہ بات سن کر نادر شاہ ششدرہ گیا اور سعادت خان کے مشورہ کے مطابق وہ نظام الملک سے صلح کرنے پر راضی ہو گیا۔[1]

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ سعادت خاں برہان الملک بہت دنوں سے امیر الامرائی کے عہدے کا خواہش مند تھا۔اور نظام الملک نے ہمیشہ اسے اس بات کا یقین دلایا تھا کہ جب کبھی بھی یہ عہدہ خالی ہو گا اسی کو عطا کیا جائے گا۔مگر صمصام الدولہ کے زخمی ہونے اور فوت ہونے کے بعد محمد شاہ نے یہ عہدہ نظام الملک کو تفویض کر دیا۔اس خبر کو سن کر اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔
اس بات سے اسے بے حد غصہ آیا اور جذبۂ انتقام میں اس نے نادر شاہ سے کہا۔"

"محمد شاہ کے لشکر میں آصف جاہ کے علاوہ کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔
اس کے نزدیک دو کروڑ روپے کی کچھ حقیقت نہیں ہے اس قدر رقم تو غلام اپنے گھر سے دے سکتا ہے، باقی امرا اور خزانہ بادشاہی اور مہاجن وغیرہ کا کیا ذکر، اگر شاہ جہاں آباد تک کوچ کیا جاوے، جو تیس چالیس کوس سے زیادہ دور نہیں ہے، تو حصول مدعا ممکن ہے۔"[2]

ہرچرن داس کا بیان ہے:

"برہان الملک چوں برایں حال اطلاع یافت بمجرد ایں ماجرائش حسد در نہادش افتاد، بسبب آنکہ از مدت ارزوایں خدمت داشت و آصف جاہ بارہا

---

1. تاریخ ہندی" گفت خاندوراں یکی از بندگان شاہ ہندستان بود کہ امروز بشما جنگید و ہمین قسم وقدر ہم در لشکر دہم دراطراف وجواب این مملکت بسیاری از امرایان واکثری، از راجایان بوفور حشمت وشجاعت ممتاز انداز عہدہ کہ ام یکی اطمینان خاطر خواہند کرد، مصلحت ہمیں است کہ چیزی بطریق خرچ راہ گرفتہ مراجعت بولایت خود فرمایند"۔نادرشاہ صلح قرار یافت، ص567,568۔نیز ملاحظہ ہو، تاریخ چغتائی ص195 الف۔

2. سیر المتاخرین 12 /ص108۔تاریخ ہندی ص567-568۔

بادووعدہ ساختہ بود کہ خدمت بخشی امیر الامرائی بہ تو میدہانم، چوں برخلاف آمد
ازیں سبب فتنہ وفساد عظیم برپاشد وآتش خفیہ بیدار گردید:[1]

مجملاً نادرشاہ اور محمد شاہ کے مابین طے شدہ معاہدہ کے تحت نادرشاہ دہلی آیا۔ سعادت خان کو دونوں بادشاہوں کی طرف سے وکیل مطلق بنا کر طہماسپ جلائر کے ہاتھ قلعہ کی کلید دے کر انتظامات کے لیے بھیجا گیا۔[2]

نادرشاہ کے دہلی آنے، قتل عام اور زبردستی روپے کی تحصیل کے بارے میں تفصیلی ذکر پہلے حصہ میں کیا جاچکا ہے جس کے یہاں دوہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

سعادت خاں کی وفات

چند دنوں کے بعد مارچ 19 / 1739 کو سعادت علی خاں کا انتقال مرض سرطان کی وجہ سے ہوگیا[3] مگر چہار گلزار شجاعی میں لکھا ہے کہ زر معہود جو اس کو نادرشاہ کی خدمت میں پیش کرنا تھا کی کم یابی کی وجہ سے اپنی عزت بچانے کی غرض سے الماس کھا کر جان دے دی تھی[4]۔ والہ علی قلی خان داغستانی نے سعادت خان کی وفات پر مرثیہ لکھا تھا۔

1۔ چہار گلزار شجاعی ص 88 ب تا 90 الف تاریخ ہندی 568-567، نیز ملاحظہ ہو۔ تاریخ مظفری 1 / ص 233 الف۔ کلیان سنگھ، خلاصۃ التواریخ ص 126-125۔ میزان دانش ص 57 آشوب۔ 2 / ص 293 الف وب، 253 ب۔ 261 الف بیاض یوسف علی خاں ص 217 الف۔

2۔ سیر المتاخرین 12 ص 109، تاریخ جہاں کشائے نادری ص 242، 239، خزانہ عامرہ ص 75 بیاض یوسف علی خان ص 217 ب، میزان دانش ص 57،58۔

تاریخ ہندی ص 571، آشوب 2 / ص 260 ب۔ 261 ب، رسالہ محمد شاہ وخاندوراں خاں ص 125 ب مآثر الامرا 1 / ص 466۔

3۔ سیر المتاخرین (ا۔ ت) 2 / ص 110، خزانہ عامرہ / 75 عماد / 28 نیز دیکھیے بیاض یوسف علی خاں / 217 ب، تاریخ محمدی 2 / 107 تاریخ چغتائی / 196 الف، تاریخ ہندی / 574 رسالہ محمد شاہ وخاندوراں خاں / 128 الف، تاریخ سعادت جاوید / 313-307۔

4۔ چہار گلزار شجاعی / 90 ب، نیز آشوب 2 / ص 263 الف وب تاریخ راحت افزا میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

دور از تو سپہرداز گوں میگرید   بنگر کہ آں زمانہ بیتو چوں میگرید
رفتی زجہاں وپشت شمشیر شکست   باقامت خم ہمیشہ خوں میگرید[1]

سعادت خان صاحب کردار شجاع، سخی، سپاہ پرور، دین دار، راست گو حق شناس، روزہ ونماز وتلاوت کا پابند تھا۔ اور اثنا عشری عقائد کا پیروکار تھا[2] وہ شاعر بھی تھا[3] اور شاعروں کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔ اس سلسلے میں بعد میں تفصیلی گفتگو ہوگی۔

کیا نادر شاہ کو ہندستان پر حملہ کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا؟

ہم عصر تاریخی کتابوں اور ان کی بنیاد پر انگریزی[4] کتابوں میں بھی اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ ہندستان کے امیروں نے نادر شاہ کو ہندستان پر حملہ کرنے کے لیے مدعو کیا تھا۔

کچھ کا تو بیان ہے کہ یہ جرم نظام الملک سے سرزد ہوا تھا۔ اور کچھ کا خیال ہے کہ سعادت خاں نے نادر شاہ کو بلایا تھا۔ نظام الملک کے سلسلے میں طباطبائی کا بیان ہے کہ نظام الملک نے اپنے دشمنوں کے قلع قمع کرنے کے لیے نادر شاہ کو بلایا تھا[5] لوکہارٹ کا خیال ہے کہ اس غداری کا ارتکاب نظام الملک یا سعادت خاں نے کیا تھا۔ یا دونوں کی سازش سے نادر شاہ ہندستان آیا تھا۔" چین قلیچ خاں نظام الملک تورانی نسل کا تھا، اور سعادت خان ایرانی، لہٰذا ان دونوں میں سے کسی

(بقیہ صفحہ 270 کا) لکھا ہے کہ از زخم ہائے کاری کہ داشت روح با عالم دیگر افراختہ 133-132 لیکن تاریخ محتشم کا بیان کتب محولہٗ کے برعکس ہے۔ 1150ھ از چند ماہ (تبلی ظاہر شدہ بود آخر بہماں وجع روح مبارک او عازم بہشت بریں شد/10ب۔

1. خزانہ عامرہ/76۔

2. تاریخ سعادت جاوید/307۔

3. تذکرہ نتائج الافکار/51۔

4. FrazerJames History of Nadir Shah- PP 129-133- other , Hanway IVP. 142 Lockkhort: Nadir Shah, P. 124 fn.20 Grose: (mtw) 11, P.VI,

5. سیر المتاخرین 2/ص82

ایک میں بھی مغلیہ حکومت سے وفاداری کا جذبہ نہ پایا جاتا تھا۔ اس کے برعکس ان کے خلاف نہ تو اس جرم کے ارتکاب کا ثبوت ملا ہے۔ اور غالباً آئندہ بھی نہ مل سکے گا اور یہ صرف اسی وقت ثابت ہوگا جب وہ خطوط دستیاب ہو جائیں جو انھوں نے نادر شاہ کو بھیجے تھے۔[1]

مگر رسالہ محمد شاہ وخاندوراں[2] خاں کے کچھ اجزا کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو کسی حد تک یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سعادت خاں نے صمصام الدولہ کو زیر کرنے کی غرض سے نادر شاہ کو بلایا تھا۔ چونکہ ان دونوں امرا میں شکر رنجی تھی لہٰذا سعادت خاں:

> ''مدتی تحریس وتحریک نادر شاہ بادشاہ ایران می نمود، وتحف وتحائف لکہا می فرستاد ومدام بی نسقی وبی انتظامی سلطنت حضرت محمد شاہ واختلاف امراے نامدار کامگاری نوشت چنانچہ ایمان وارکان دیگر سر شریک مشورہ شدہ بنیاد فساد وخرابی مملکت را استحکام تمام دادند۔[3]

جس زمانے میں محمد شاہ نے سعادت خاں کو برائے جنگ نادر شاہ طلب کیا تھا۔ تو درباری امرا نے بادشاہ سے اس سلسلے میں عرض کیا تو اس نے جواب دیا۔

> ''ہر چند نواب، بخشی الممالک بدریافت، چناں خسروان مال او ممانعت می کردند کہ اوسازشی دارد واین ہمہ گرد بلا شور فتنہ وفساد وبرملا آمدہ انگیختہ اوست طلب او محض بے جاست وخرابی کار راست، می فرمودند کہ من در آئینہ دل چہرۂ زنگ آلودہ کدورت ونفاق اورا خوب وجہ معائنہ کردہ ام وایں تصویر مصدیق رسانیدہ شکلی بدیہی الابتہاج

1۔ نادر شاہ ص 124۔

2۔ اس کتاب کے مصنف کا علم نہیں ہے، لوکہارٹ نے جوہر صمصام (مصنفہ محمد محسن صدیقی) اور تاریخ ہندی (رستم علی) کے مصنفوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ صمصام الدولہ کے زبردست حامیوں میں سے تھے، لہٰذا ان کے بیانات پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

3۔ رسالہ محمد شاہ وخاندوراں خان ص 100 الف

بکرا لے خطوط اور متضمن طلبش بودند بغرض بیان جلوہ" دادہ ام"[1]

مصنف کا یہ بھی بیان ہے کہ جب صمصام الدولہ جنگ کے میدان میں اترا اور قزلباش سپاہ اس کے سامنے ٹھہر نہ سکی تو اس نے نادری سپاہ کی ہمت افزائی کی اور وہ صمصام الدولہ کی سپاہ پر ٹوٹ پڑے، علاوہ ازیں مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ سعادت خان بذات خود گرفتار ہوا تھا[2]

"سعادت خان کہ غدر و تدویر رادر پن اوز پیش بدیدہ حیلہ دیگر انگیختہ خود بہ لشکر نادر شاہ مردود اسیر میکردو بجناب حضرت ظل سبحانی خلیفہ الرزمانی عرض میکند کہ من مقیدام دو پنجاہ لک روپیہ صلح کردہ ام"[3]

مگر تاریخ ہند کے بیانات کے مطالعہ کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً اس سازش میں دونوں شامل تھے۔ دربار عام میں نادر شاہ نے نظام الملک اور سعادت خان کو بڑی بری طرح سے پھٹکارا۔

"ناسزا گفت۔ وموعود بسیاست فرمود، چوں از دربار باہر آمدند نظام الملک بکمال مکر وتزویر کہ از قدیم درسرشت اواست با برہان الملک سخنان ملائم ورقت آمیز درمیان آوردہ گفت کہ حالا از دست این ظالمی مخلصی نیست بجز آیں کہ ہمیں وقت بخانہ رفتہ جام زہر ہلاہل خوردہ طریق باید پیمود کہ جان را تصدیق آبرو باید کردو شما نیز ہمیں کنید ، پس آں سر آمد ملک مسفدت وتذویر بخانہ خود رفت واز اقربا خود حرف وصایا بیان آوردہ جام شربت نوش کردہ چادر برسر کشیدہ بخفت ، برہان الملک چوں سپاہی سخت بود واز تذاویر آں شیخ کبیر اطلاعی نداشت باصفاء انفانش فی

---

1. رسالہ محمد شاہ خاندوران خان ص 104 الف۔

2. رسالہ محمد شاہ خاندوران خان ص 114 الف۔

3. رسالہ محمد شاہ خاندوران خان ص 119 الف۔

الفور جام زہر بکار بردہ رہ نوردملک عدم شد،، [1]

اس بات سے بھی کچھ شبہ ہوتا ہے کہ سعادت خاں کسی حد تک اس سازش میں ملوث تھا۔ محمد شاہ کے تیرہویں سنِ جلوس کے زمانے میں جب علی مردان خان ایرانی سفیر دہلی آیا تو اس نے سعادت خاں کے ہاں قیام کیا اور اس کی وساطت سے محمد شاہ کی خدمت میں پیش ہوا[2] ایسی صورت میں بہت ممکن ہے کہ وہ ہندستان کے حالات ان سفیروں کے ذریعہ ایران بھیجا کرتا ہو۔ اخبار محبت کے مصنف کا بیان ہے کہ بعضے لوگ کہتے تھے کہ نادر شاہ کو آصف جاہ نظام الملک نے بلایا تھا تا کہ خاندوران خاں کا قلع قمع کر سکے۔[3]

---

1. تاریخ ہندی ص 574-573۔
2. تاریخ ہندی ص 517 آشوب 1 / ص 138 الف و ب۔ 147 ب
3. برائے تفصیل دیکھیے۔ اخبار محبت / 477۔

ابوالمنصور خان صفدر جنگ

1708 تا 1754

جیسا پہلے لکھا جا چکا ہے ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کا اصلی نام مرزا محمد مقیم تھا۔ وہ جعفر بیگ خان کا دوسرا بیٹا اور سعادت خاں برہان الملک کا ہمشیرزادہ تھا۔ جعفر بیگ خاں، قرا یوسف کی اولاد میں سے تھا جو قراقونیلو قبیلے کا ایک ترک تھا، اور ایراں کے صوبہ آذر بائیجان میں واقع تبریز نامی مقام کا حاکم تھا۔ قرا یوسف کو، جس کا سلسلۂ پدری طاؤس تک پہنچتا ہے جس کا تعلق دوسرے امام حسن کی نسل سے تھا۔ امیر تیمور نے (1369-1405) اس کے ملک سے مار بھگایا تھا۔ لیکن بعد میں شاہ تیمور کے دوسرے بیٹے، شاہ رُخ مرزا کے عہد حکومت میں جہان شاہ بن قرا یوسف نے تبریز پر دوبارہ قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ اس کے بعد قرا یوسف کی اولاد اس علاقے پر منصور مرزا کے زمانہ تک حکومت کرتی رہی جو شاہ عباس اول (1582-1627) کا ہم عصر تھا۔ شاہ عباس اول نے منصور مرزا کو بے دخل کر دیا اور اسے اپنے ساتھ لا کر نیشاپور میں آباد کر دیا۔ اور اس کے گزارے کے لیے جاگیر عطا کی۔ کہا جاتا ہے کہ مرزا محمد مقیم کے والد جعفر بیگ خان منصور مرزا کی چھٹی پیڑھی پر تھے۔[1]

1۔ عماد السعادت/ص 9-8، خزانہ عامرہ ص 76، تاریخ راحت افزا ص 392۔

ابتدائی زندگی اور طالب علمی

جعفر بیگ خان اپنی دوسری بیبیوں سے زیادہ سعادت خاں کی بہن سے محبت کرتا تھا۔ اس کے بطن سے دو لڑکے، مرزا محسن اور مرزا محمد مقیم تولد ہوئے جس وقت مرزا محمد مقیم کی عمر چھ ماہ کی اور بڑے بھائی کی عمر دو سال کی تھی کہ ان کی والدہ نے وفات پائی۔ لہٰذا ان دونوں بچوں کی پرورش سعادت خان کی دوسری بہن اور ان کی خالہ نے کی جس کی شادی سعادت خان کے چچیرے بھائی میر محمد شاہ بن میر محمد یوسف سے ہوئی تھی۔[1] اپنے وطن میں مرزا محمد مقیم ایک بہادر اور خوش عہد لڑکے کی صورت میں بڑا ہوا۔ مرزا محمد مقیم کی تعلیم عمدہ ہوئی تھی، اور وہ شائستہ اور تہذیبی اقدار سے بخوبی واقف تھا۔ اس کے ان خطوط سے جو اس نے سعادت خاں کی زندگی اور اس کے بعد لکھے تھے، اس بات کے ثبوت ملتے ہیں کہ فارسی زبان پر اس کو قدرت حاصل تھی۔[2] اس عہد کے تقاضوں کے مطابق اس نے فوجی تربیت بھی حاصل کی ہوگی۔ جیسا کہ ہندستان میں آنے کے بعد اس کی زندگی سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہندستان میں ابتدائی زمانہ اور تربیت 1724-1739

ابھی مرزا محمد مقیم کی عمر 15 سال کی ہی تھی کہ سعادت خاں نے اسے ہندستان بلا لیا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جب سعادت خاں اودھ کا گورنر تھا۔ اپریل/1723 میں مرزا محمد مقیم پانی کے جہاز سے بندر سورت میں اترا اور وہاں سے دور دراز کا بری سفر طے کر کے فیض آباد پہنچا۔ چونکہ وہ حسنِ اخلاق اور علم و ادب کے زیورات سے آراستہ تھا، اس لیے سعادت خاں نے اپنی بڑی بیٹی صدر النسا کو اس کے ساتھ منسوب کر دیا۔ اس کے بعد نواب نے اپنے داماد کو اودھ کا نائب گورنر مقرر کر دیا۔ اور محمد شاہ بادشاہ سے اس کے لیے ابو المنصور خان کا لقب دلوایا۔

نائب گورنری کے عہدہ پر رہ کر مرزا محمد مقیم نے فوجی اور سول انتظامی امور کے تجربات حاصل کیے جو بعد میں اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے۔ جب وہ اپنے خسر کے جانشین کی حیثیت سے اودھ کا گورنر ہوا۔ سعادت خاں نے مرزا محمد مقیم کو، جسے وہ اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، اپنا جانشین بنایا اور صوبے کے انتظامی امور میں اسے شریک کار کر لیا۔ اس طرح اس نے اپنے خسر اور دیوان آتما

---

1. سوانحات سلاطین اودھ 1 /ص 21

2. ملاحظہ ہو، منصور المکاتیب، نیز حدیقۃ الاقالیم ص/386,388 اور ص 31۔

رام، جو ماہر مالیات تھا، کی نگرانی میں مالی، فوجی دونوں امور میں لیاقت حاصل کرلی۔ کچھ دنوں کے بعد سعادت خان نے مرزا مقیم کی نگرانی ہی میں صوبے کا انتظام چھوڑ دیا اور خود دہلی چلا آیا۔[1]

اس تربیت کے دوران میں ابوالمنصور خان نے جنگی قیادت کرنے کی تربیت اور تجربہ بھی حاصل کیا۔ 1724 کے بعد جتنی بھی اہم جنگیں سعادت خاں نے لڑیں، ان سب میں ابوالمنصور خان بھی شریک تھا۔ 1735 میں ابوالمنصور خاں اپنے خسر کے ساتھ بھگونت سنگھ کھچی کے ساتھ جنگ کے موقع پر سعادت خاں کا ہمرکاب تھا اسی طرح دوسری جنگوں میں اس کی شرکت کا حال ہم عصر کتابوں میں ملتا ہے۔[2]

اودھ کی گورنری 1739-1754

19 ر مارچ 1739 کو سعادت خاں برہان الملک نے وفات پائی اور جانشینی کے مسئلہ پر کچھ تنازعہ ظہور میں آیا۔ شیر جنگ[3] اور ابوالمنصور خان دعویدار تھے۔ چونکہ مرحوم سے دونوں کا قریبی تعلق تھا۔ نثار محمد خاں شیر جنگ نے طہماسپ خان جالیسر کی وساطت سے نادر شاہ سے درخواست کی کہ وہ محمد شاہ سے اس کے حق میں سفارش کریں اور اس نے اپنے دعوے میں کہا کہ جب تک مرحوم کا بھتیجا موجود ہے اس وقت تک اس کے داماد کو جانشین نہیں بنانا چاہیے۔ ابوالمنصور خان کی طرف سے بچھی نرائن نے، جو سعادت خان کا وفادار خادم تھا، اور اس کے خاندان کے لوگ تواتر سے دربار مغلیہ میں اودھ کے حاکم کی طرف سے وکیل تھے۔ دربار شاہی میں عبدالباقی خان، ایرانی وزیر، کے وسیلے سے عرضی دی تھی۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ سعادت خاں کی املاک کا نہ تو اس کا بھتیجا اور نہ ہی داماد وارث ہے بلکہ سعادت خاں کے انتقال کے بعد بادشاہ اس کی املاک کا وارث ہے، وہ جسے چاہیں عطا کردیں۔ لیکن اگر ان دونوں ہی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا منظور ہو تو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ سعادت خاں، شیر جنگ سے خوش نہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے بھتیجے کو نظر انداز کر کے اپنی لڑکی کی شادی اپنے

---

1. عماد ص 9۔ .... 2. ارون 2 / ص 394۔

3. نثار محمد خاں سعادت خان کے بڑے بھائی، میر محمد باقر (سیادت خاں) کا بیٹا تھا، اور محمد شاہ کے زمانہ میں اسے شیر جنگ کا خطاب ملا تھا۔ سیادت خاں کا انتقال 1144 / 1731-1732 میں ہوا تھا۔ سوانحات سلاطین اودھ 1 / ص 21 اخبار محبت ص 444۔

بھانجے سے کی تھی۔ حالانکہ اول الذکر کا مرحوم سے گہرا رشتہ تھا۔ علاوہ ازیں ہر لحاظ سے ابوالمنصور خاں زیادہ مناسب اور تربیت یافتہ ہے۔ وہ ایماندار، قابل اعتماد اور خدا ترس ہے۔ اس میں خداداد خصائص پائے جاتے ہیں۔ اور وہ اپنے خسر کی افواج میں بہت زیادہ ہر دل عزیز بھی تھا۔ اس کے لیے اس نے نادر شاہ کی خدمت میں پیش کش کے لیے دو کروڑ روپے[1] کا بھی بندوبست کیا تھا۔[2]

چونکہ اس عہدہ پر تقرری کا انحصار مالی وسائل پر تھا۔ لہٰذا ابوالمنصور خان کے حق میں فیصلہ ہوا کیوں کہ اس کے قبضے میں اپنے خسر کی دولت تھی۔ مختصر یہ کہ نادر شاہ کے واپس جانے کے بعد محمد شاہ نے ابوالمنصور خاں سے دو کروڑ روپے وصول کیے۔ صفدر جنگ کے خطاب کے ساتھ اودھ کی گورنری عطا کی اور اس کے خسر کی جاگیر بھی اسے تفویض کی۔[3]

سعادت خاں کے انتقال کے بعد اودھ کے علاقے میں پھر سے بدنظمی اور طوائف الملوکی پھیل گئی۔ اور تیلوئی کے راجہ نے بغاوت کا علم بلند کر دیا جس کی حمایت دوسرے مسلمان زمین دار بھی کر رہے تھے۔ صفدر جنگ نے اپنی بیوی کی ہمت افزائی پر ان کا مقابلہ کرنے کا مصمم ارادہ کیا اور باغیوں کو شکستِ فاش دی[4]۔ یہ واقعہ 1741 میں ظہور میں آیا۔ صفدر جنگ کو بدرجہ مجبوری بنی نگر اور کہٹیر کے زمینداروں کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی۔ اس علاقے کا حاکم راجہ نول سنگھ تھا، جو بہت ہی جری اور دلاور تھا۔ صفدر جنگ نے اس پر حملہ کیا۔ بنی نگر کے قلعہ کا محاصرہ کر کے راجہ کا ناطقہ بند کر دیا۔ آخر کار راجہ نے فرار کا سہارا لیا۔ اس کے کافی سپاہی مارے گئے۔ آخر میں تنگ آ کر راجہ نے اطاعت قبول کر لی اور اس کا علاقہ اسے واپس دے دیا گیا۔

1739 میں نواب شجاع الدین کی وفات کے بعد اس کا نااہل لڑکا سرفراز خاں

1. تاریخ جہاں کشائے نادری میں ایک کروڑ روپیہ لکھا ہے۔ ص 242۔

2. چہار گلزار شجاعی ص 232 ب۔ خزانہ عامرہ ص 76۔

3. خزانہ عامرہ ص 76، میزان دانش نواب صفدر جنگ جریدہ از ولایت رسیدہ، بعد برہانی الملک مالک دولت آوردہ گردیدہ، ص 54۔

4. Memoirs of Delhi and Faizabad, II PP. 246/47

مشرقی صوبوں (بہار، بنگال، اور اڑیسہ) کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ اپریل 1740 میں علی وردی خاں[1] نے اس کو قتل کر دیا۔ اور خود ان علاقوں کا صوبہ دار بن بیٹھا، ایک کروڑ روپیہ اور کافی تعداد میں جواہرات بھیج کر دربار شاہی سے فرمان بھی حاصل کر لیا[2]۔

علی وردی خاں کے ایک ناراض امیر، میر حبیب نے مرہٹہ سرداروں کو اپنی امداد کے لیے طلب کیا۔ 1742 میں بھاسکر پنڈت نے، جو ناگ پور کے راگھوجی بھونسلہ کا ایک فوجی سردار تھا۔ اڑیسہ کے علاقے پر دھاوا بول دیا۔ پنچیت پر گنے کو تہس نہس کر دیا[3]۔ علی وردی خاں نے مرہٹوں سے مقابلے کی تیاریاں شروع کیں اور ساتھ ساتھ اس نے محمد شاہ کو بھی لکھا کہ وہ شاہی پیش کش کی رقم اس وقت تک ادا نہ کر سکے گا جب تک مرہٹوں کا اس کے علاقے میں قیام رہے گا۔ اور اس کے علاوہ اس نے بادشاہ سے فوجی امداد کی درخواست بھی کی۔ محمد شاہ نے صفدر جنگ کو حکم دیا کہ وہ فوراً علی وردی خاں کی مدد کے لیے کمک لے کر پہنچے اور اس سلسلے میں عمدۃ الملک امیر خاں کو جوالہ آباد کا گورنر تھا، حکم ہوا کہ وہ صفدر جنگ کو فوراً روانہ کر دے[4]۔ محمد شاہ نے پیشوا باجی راؤ کو بھی اس سلسلے میں خط لکھا جس کی رگھوجی بھونسلا سے دشمنی تھی کہ وہ ثانی الذکر کو مار بھگائے۔ اس خدمت کے عوض میں محمد شاہ نے باجی راؤ کو تینوں صوبوں سے چوتھ کی وصول یابی اور مالوہ کی گورنری کی سند جاری کرنے کا وعدہ بھی کیا[5]۔

چنار اور رہتاس کے قلعے

بنگال کی مہم پر روانہ ہونے سے قبل صفدر جنگ نے محمد شاہ بادشاہ سے درخواست کی کہ اودھ کے علاقے میں سرکش زمین دار ہیں۔ اور اس کی غیر موجودگی میں وہ لوگ بغاوت کر سکتے ہیں لہٰذا وہ بنگال جانے سے پہلے اپنے اہل وعیال کو محفوظ مقامات میں چھوڑنا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے اس کی

1۔ برائے تفصیلی حالات ملاحظہ ہو، علی وردی اور اس کا عہد (انگریزی) کے۔ کے۔ دتا۔

2۔ سیر المتاخرین (ا۔ت) 2/ص 122، 121، 115، 113۔

3۔ سیر المتاخرین 2/ص 148، 131۔

4۔ سیر المتاخرین 2/ص 150، 148 مآثر الامرا 1/ص 365 خزانہ عامرہ ص 76، تاریخ راحت افزا۔ (146)

5۔ First Two Nawabs of Oudh. P. 95.

درخواست منظور کرلی اور رہتاس اور چنار کے قلعے اسے دیدیے۔[1]

پٹنہ میں صفدر جنگ کا ورود

صفدر جنگ کے ورود کی خبر سن کر پٹنہ کے باشندوں اور نیز نائب صوبہ دار سید حیات علی خاں جو مشہور مورخ طباطبائی کے والد تھے، کے دلوں میں خوف و ہراس اور مایوسی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ کیوں کہ انھوں نے پہلے ہی سے سن رکھا تھا کہ قزلباش افواج نے دہلی کے باشندوں پر کیا کیا مظالم توڑے تھے، مختصر یہ کہ سید حیات علی خان نے شہر سے باہر نکل کر صفدر جنگ کا خیر مقدم کیا اور 17 / دسمبر 1742 کو صفدر جنگ شہر میں داخل ہوا، اور قلعہ خالی کرا کر خود مقیم ہو گیا[2] ابھی صفدر جنگ پٹنہ میں ہی مقیم تھا کہ علی وردی خان نے بھاسکر پنڈت کو اپنے علاقے سے کھدیڑ دیا۔ اس کامیابی کے بعد وہ مرشد آباد واپس آیا اور صفدر جنگ سے اپنے صوبے کو واپس جانے کی درخواست کی[3] دوسری وجہ واپسی کی یہ بھی تھی کہ بالاجی باجی راؤ، بندیل کھنڈ سے چل کر الہ آباد کے راستے سے بنارس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ لہٰذا اس خبر کو سن کر صفدر جنگ برق رفتاری سے واپس آیا۔ اور فیض آباد جانے کے بجائے اس نے بنارس کی طرف رُخ کیا۔ مگر اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی بالاجی راؤ بنارس سے آگے بڑھ چکا تھا لہٰذا وہ فیض آباد واپس آ گیا۔

صفدر جنگ کا میر آتش کا عہدہ پانا اور روہیل کھنڈ کی فتح

1744-1746 نادر شاہ کی ایران کے لیے واپسی کے بعد محمد شاہ بادشاہ نے تورانی امیروں کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ لہٰذا اس نے اب یہ سوچا کہ وہ ایرانی امرا کی سرپرستی کرے تا کہ وہ ان کو تورانیوں کی طاقت توڑنے کے لیے استعمال کر سکے۔ ان ایرانیوں میں سب سے زیادہ چہیتے امیر جن کو وہ نظام الملک اور قمر الدین خان کے مقابلے میں استعمال کرنا چاہتا تھا، عمدۃ الملک امیر خان اور اسحاق خاں موتمن الدولہ تھے۔ جن کو بخشی سوم اور دیوان کے عہدے دیے گئے۔ محمد شاہ اپنے وزیر قمر الدین خان کو معزول کرنا چاہتا تھا۔

1. سیر المتاخرین 2 / ص 149، مآثر الامرا 1 / ص 365 خزانۂ عامرہ ص 76۔
2. سیر المتاخرین 2 / ص 150۔
3. سیر المتاخرین 2 / ص 151-150، مآثر الامرا 1 / ص 365 خزانۂ عامرہ ص 76۔

عمدۃ الملک کو وزیر بنانے کا خواہش مند تھا۔ مگر اس بات کی ہمت اس وجہ سے نہ کر سکا کیوں کہ وزیر نے مستعفی ہونے کی دھمکی دے دی تھی۔ اور نظام الملک کے ساتھ شہر کے باہر شریک ہو گیا تھا۔ جہاں اول الذکر پہلے ہی سے خیمہ زن تھا اور دکن جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ قصہ کوتاہ نظام الملک کے مشورے پر بادشاہ نے عمدۃ الملک کو الہ آباد کا گورنر بنا کر دربار سے ہٹا دیا تا کہ وزیر کی شکایات رفع ہو سکیں [1]۔

عمدۃ الملک کے جانے کے بعد موتمن الدولہ محمد اسحاق خان کو عروج حاصل ہوا [2]۔ 28 اپریل 1740 کو اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے مرزا محمد اسحاق خان نجم الدولہ نے بادشاہ کو اپنے زیر اثر کر لیا۔ اسی زمانے میں نظام الملک دکن کے لیے روانہ ہوا۔ اور وزیر قمر الدین خاں عیش و عشرت کے دلدل میں پھنس گیا۔ لہٰذا ایرانی پارٹی کو درباری سیاست میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ عمدۃ الملک خاموش نہ بیٹھ سکا اور اپنی پارٹی کی طاقت بڑھانے کی کوشش کرتا رہا، اسی منصوبے کے تحت اس نے صفدر جنگ کی سرپرستی شروع کی۔

اگست 1743 / 1156ھ میں ایرانی پارٹی کو مستحکم کرنے کی غرض سے محمد شاہ نے امیر خان اور صفدر جنگ کو ان کے صوبوں سے دربار میں طلب کیا [3]۔ جب صفدر جنگ دہلی کے قرب و جوار میں پہنچا تو وزیر قمر الدین خاں نے باہر نکل کر اس کا خیر مقدم کیا۔ تھوڑی دیر اس کے ساتھ رہا اور پھر واپس چلا آیا، صفدر جنگ شہر میں داخل ہو کر حویلی دارشکوہ میں مقیم ہوا [4]۔

دہلی پہنچنے کے بعد عمدۃ الملک نے اپنی پارٹی کو مضبوط کرنے کی غرض سے بادشاہ کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ حفیظ الدین خاں، تورانی سردار، داروغۂ توپ خانہ اور وزیر قمر الدین خاں کے متوسل کو معزول کر دے اور اس عہدے پر صفدر جنگ کو مقرر کر دے۔ لہٰذا، 21 مارچ / 1744 کو صفدر جنگ کا اس عہدے پر تقرر ہو گیا۔ چونکہ اس عہدہ دار کے فرائض میں بادشاہ اور اس کے

---

1. سیر المتاخرین 2 / ص 3'110,112 / ص 2، خزانہ عامرہ ص 76۔
2. سیر المتاخرین 2 / ص 3'110,112 / ص 2 خزانہ عامرہ ص 76۔
3. سیر المتاخرین 3 / ص 6-5، چہار گلزار شجاعی ص 38 ب
4. سیر المتاخرین 3 / ص 6، چہار گلزار شجاعی ص 38 ب

خاندان کے تحفظ کا فرض بھی شامل تھا۔ لہٰذا صفدر جنگ نے قلعہ کے اندر سکونت اختیار کی [1]۔

اب صفدر جنگ کو بادشاہ کی سرپرستی حاصل کرنے میں زیادہ وقت نہ لگا اپنے عہدہ کے علاوہ اسے 14 / اکتوبر 1744 کو اسد اللہ خاں انسان تخلص کے فوت ہو جانے کے بعد کشمیر کی گورنری بھی عطا کر دی گئی۔ اس صوبے میں حکومت کرنے کے لیے اس نے اپنے خلیرے بھائی شیر جنگ کو بھیجا۔ شیر جنگ نے وہاں پہنچ کر بابر اللہ کو، جو ایک طاقت ور باغی سردار تھا۔ دھوکے سے قید کر کے وہاں نظم و نسق قائم کیا اور افراسیاب کو وہاں کا حاکم بنا کر دہلی واپس چلا آیا [2]۔

علی محمد خاں روہیلہ

بہادر شاہ (1712-1707) کے دور حکومت میں ایک اولوالعزم داؤد نامی غلام اپنے آقا شاہ عالم خان کے گھر سے، جو افغانستان میں واقع ردہ نامی علاقے کے تارو شاہمت پور کا، باشندہ تھا، بھاگ کر ہندستان چلا آیا [3] اور روہیل کھنڈ میں، جو اس زمانے میں کٹھیر کے نام سے موسوم تھا۔ ایک مقامی سردار کے ہاں ملازمت کر لی۔ مدکر کے سردار مدار شاہ کے ہاں نوکری کے زمانے میں داؤد نے بنکولی کے حاکم کے خلاف فوج کشی میں حصہ لیا، جس میں دوسری چیزوں کے علاوہ ایک خوبصورت سات یا آٹھ سالہ جاٹ کا لڑکا بھی ہاتھ لگا، داؤد نے اس بچے کو مسلمان بنا لیا اور اس کا نام علی محمد خان رکھا اور اس کو لے پالک بنا لیا۔ چونکہ وہ لاولد تھا۔ کچھ برسوں کے بعد داؤد خاں نے مدار شاہ کی ملازمت ترک کر دی اور کمایوں کے راجہ دیبی چند کے ہاں ملازم ہو گیا۔ اس کے بعد راجا اور مراد آباد کے نائب فوج دار عظمت اللہ خاں کے مابین جنگ کے موقع پر داؤد نے اپنے آقا کے ساتھ غداری کی اور جنگ کے موقع پر اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ نتیجتاً راجہ کے حکم سے اس

1۔ سیر المتاخرین 3 / ص 8، چہار گلزار شجاعی ص 38 ب، خزانہ عامرہ / 7، عماد / 34۔

2۔ سیر المتاخرین 3 / 8۔

3۔ گلستان رحمت (ایلیٹ) ص 7-5، سیر التماخرین میں اہیر زادہ لکھا ہے 3 / 9، آشوب 2 / ،، اصلش از قوم جاٹ'' برائے تفصیل دیکھیے۔ ص 318 الف و ب، نیز جام جہاں نما ص 493,497، اخبار ارضا دید نجم الغنی (1918) ص 14,80 نے اس کو سید زادہ بتایا ہے، اور اس کا نسب نامہ حضرت محمدؐ صاحب تک پہنچا دیا ہے، اس بنا پر وہ نوابین رام پور کو بھی سید ثابت کرنا چاہتا تھا۔

کی گردن زدنی کی سزا ملی۔ اب علی محمد خان داؤد کی فوج کا سردار ہو گیا۔ اور اس نے عظمت اللہ خان کے ہاں 1722 میں نوکری کر لی[1]۔

اسی زمانے میں اس نے محمد شاہ کے وزیر قمرالدین کی سرپرستی حاصل کر لی جو ایرانی پارٹی کو کچلنے اور زیر کرنے کے لیے مددگاروں کی تلاش میں تھا، 1150 / 1739-1737 میں اس نے جانسٹھ کے سید سیف الدین خاں کو میدان جنگ میں قتل کر دیا۔ اس خدمت کے صلے میں اسے نواب کا خطاب ملا اور سالانہ مال گزاری میں کمی کر دی گئی (حدیقۃ الاقالیم میں لکھا ہے کہ اسے 5000/5000 پانچ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب بھی عطا ہوا۔ ص 139) نادر شاہ کے حملے کے دوران میں علی محمد خان نے پیلی بھیت تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا، اور سالانہ مال گزاری بھی ادا نہ کی۔ اپریل 1741 میں جب قمرالدین نے راجا ہرنند اور اس کے بیٹے، موتی رام کو مالگزاری کی وصول یابی کے لیے بھیجا، تو علی محمد خان نے ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا[2] اور برق رفتاری سے مراد آباد، سنبھل شاہ آباد، شاہ جہاں پور اور بریلی کے کئی دوسرے پرگنوں پر قبضہ کر لیا[3]۔ اس طرح سے غیر متوقع انداز میں اس کی عظمت اور طاقت بڑھ گئی۔ وزیر چونکہ عیش وعشرت میں پھنسا ہوا تھا۔ اس لیے اس نے علی محمد خاں کو اس کے غاصبانہ مقبوضہ علاقے پر مستقل کر دیا اور سالانہ مال گزاری پر اس سے صلح کر لی[4]۔ اس کے بعد علی محمد خاں نے داؤد کے خون کا بدلا لینے کی غرض سے مرحوم دیبی چند کے جانشین راجہ کلیان چند پر حملہ کر دیا۔ راجہ کو شکست ہوئی۔ وہ الموڑہ کی طرف فرار ہو گیا۔ علی محمد خان نے اس کے علاقے پر قبضہ کر لیا[5]۔

علی محمد خاں کے خلاف صفدر جنگ کا بادشاہ کو اکسانا

فروری 1745، صفدر جنگ اور علی محمد خاں کے درمیان کشیدگی کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ

1. گلستان (ایلیٹ) ص 10-9۔
2. اخبار الصنادید 1 / ص 135۔
3. گلستان (ایلیٹ) / ص 17 حدیقۃ الاقالیم، 139 سیر۔ 3 / 10-9۔
4. حدیقۃ الاقالیم 140 سیر المتاخرین 3 / ص 10۔
5. حدیقۃ الاقالیم ص 140۔ گلستان (ایلیٹ) ص 18۔

ثانی الذکر کی ریاست اودھ کے سرحدوں سے ملتی تھی جس کی حفاظت کے لیے نہ تو کوئی ندی ہی تھی، اور نہ کوئی پہاڑی سلسلہ ہی تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا ایک طاقت ور اوالوالعزم اور بے باک علی محمد خاں اپنی سرحدوں کو چاروں طرف آگے بڑھا رہا تھا۔ چونکہ مغرب میں دہلی بہت قریب تھی۔ لہٰذا وہ اس جانب زیادہ آگے نہیں بڑھا سکتا تھا، اور پہاڑوں کی رکاوٹ سے وہ شمال، مشرق کی طرف نہیں بڑھ سکتا تھا۔ وہ جنوب کی طرف اس لیے نہیں بڑھ سکتا تھا کہ اس طرف ہم قبیلہ، محمد خاں بنگش کا علاقہ تھا۔ قدرتی طور سے صفدر جنگ کو یہ خوف لاحق ہوا کہ وہ دن دور نہیں ہے کہ علی محمد خان اودھ پر چڑھائی کر دے گا۔ لہٰذا صفدر جنگ روہیلوں کی بستی کو اپنے لیے خطرے سے خالی نہیں سمجھتا تھا، اور اس کا موروثی علاقہ ان کے ہاتھوں غیر محفوظ تھا۔ آشوب 2/ص 318ب

1745 کے ابتدائی زمانے میں صفدر جنگ کو محمد شاہ کو روہیلہ سرداروں کے خلاف فوج کشی کے لیے رضامندی کا سنہرا موقع ہاتھ آ گیا۔ واقعہ یوں ہے کہ داروغۂ عمارت کے زیر نگرانی اس کے کچھ ملازمین کمایوں پہاڑیوں کی ترائی میں لکڑی کاٹ رہے تھے۔ علی محمد خاں نے انھیں مار بھگایا یہ خبر سن کر صفدر جنگ غصہ سے آگ بگولہ ہو گیا۔ اور اس نے بادشاہ سے شکایت کی اور فوج کشی کی تجویز پیش کی[1] چونکہ محمد شاہ علی محمد خاں کی کھلے بندوں نافرمانی سے تنگ تھا۔ لہٰذا اس نے تجویز مان لی[2]

25 رفروری 1745 کو محمد شاہ نے دہلی سے علی محمد خان کی سرکوبی کے لیے کوچ کیا۔ اس کے ہمراہ وزیر قمر الدین خان، امیر خاں، اور دیگر امرا اور ایک بڑی فوج تھی، علی محمد خان بن گڑھ کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ آخر کار تنگ آ کر اسے فرار ہونا پڑا قلعہ پر شاہی قبضہ ہو گیا، اور حملہ آوروں کے ہاتھوں بے حد مال و اسباب لگا[3]

---

1. حدیقۃ الاقالیم میں لکھا ہے کہ صفدر جنگ نے اس جنگ کی تیاری کے لیے ایک لاکھ پچاس ہزار روپے بھی بادشاہ کو دیے۔ ص 140 اخبار محبت ص 484-483۔

2. اس زمانے میں علی محمد خاں نے ایک باغی اور بادشاہ کا طرز عمل اختیار کر لیا تھا، اس نے پیش کش کی رقم بھیجنا بند کر دی۔ لال خیمہ بنوایا جو صرف بادشاہ ہی استعمال کر سکتا تھا۔ مآثر الامرا 2/ص 843۔

3. سفرنامہ آنند رام مخلص ص 74، 1۔ سیر 3/ص 11-10۔

روہیلہ سردار کو اپنی حمایت کے لیے محفوظ رکھنے کی غرض سے قمر الدین خاں نے مداخلت کی اور بادشاہ سے اسے معاف کر دینے کی درخواست کی، درخواست قبول ہوگئی۔ اور علی محمد خاں نے شاہی اطاعت قبول کر لی۔ بادشاہ مع علی محمد خاں کے دہلی واپس چلا آیا۔[1] یہ سیاسی انتشار امرا کی آپسی نفاق، عناد اور چال بازیوں کی وجہ سے تھا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ایک دوسرے کی تذلیل کے درپے ہوتے، اور ذاتی اغراض کی تحصیل کے لیے اپنی طاقت اور وسائل کو ضائع کرتے۔[2] بڑے حیرت کی بات ہے کہ شاہانِ مغلیہ بن گڑھ کے چھوٹے سے قلعہ پر اس وقت تک قابض نہ ہو سکے جب تک کہ علی محمد خاں نے خود ہی قلعہ خالی نہ کر دیا۔

کچھ دنوں دہلی کے قیام کے بعد قمر الدین خان نے علی محمد خان کو چکلہ سرہند کا فوج دار مقرر کر کے بھیجا۔[3] جب جنوری 1748 میں احمد شاہ ابدالی نے ہندستان پر حملہ کیا اور لاہور پر قبضہ کر لیا تو علی محمد خاں، جو اس سے پہلے ہی رسل و رسائل رکھتا تھا۔ بادشاہ کی اجازت کے بنا بھاگ کر سہارن پور پہنچ گیا۔ وہاں سے مرآدآباد پہنچ کر وزیر کے نائب اور بریلی کے فوج دار سید ہدایت علی خاں کو اطاعت کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکا اور 25 ستمبر 1748-1141ھ کو مرض استسقا میں اس نے وفات پائی۔[4]

شجاع الدولہ کی شادی

محمد شاہ امیر خاں کے اس طرز عمل سے نالاں تھا۔ جو اس نے اس کی طرف خود اور

1۔ سفرنامہ آنند رام مخلص ص 75 مابعد، سیر 3 /ص 11۔ حدیقۃ الاقالیم 14۔ مآثر الامرا 1 /ص 359۔ 2 /ص 843 خزانہ عامرہ ص 77، اخبار محبت ص 484,486 تاریخ سعادت جاوید ص 298 آشوب 2 /ص 317 الف 321 ب تاریخ مظفری 1 /ص 259 ب۔ 260 ب

2۔ سیر المتاخرین 3 / 11 تاریخ فرح بخش (تاریخ رام پور) ص 12 ب 20 ب

3۔ خزانہ عامرہ ص 177 اخبار محبت۔ ص 486، مخلص۔ خلاصۃ التواریخ ب 164 -163 ب، جام جہاں نما ص 498 آشوب 2 /ص 322 الف 322 الف تاریخ فرح بخش (تاریخ رام پور) ص 30-21 ب

4۔ حدیقۃ الاقالیم ص 141، گلستان رحمت (ایلیٹ) ص 28، سیر 3 /ص 19,21۔ اخبار محبت/ 487,495, 496۔ جام جہاں نما ص 498 آشوب 2 /ص 322 الف تاریخ فرح بخش (تاریخ رام پور) ص 22 ب۔ 24 الف

نجم الدولہ اسحاق خاں کی طرف اختیار کیا تھا۔ لہٰذا ثانی الذکر کے وقار کو بڑھانے کی غرض سے اس نے نجم الدولہ کی لڑکی صفدر جنگ کے لڑکے جلال الدین حیدر (شجاع الدولہ) میں رشتہ عقد کی تجویز پیش کی۔ چونکہ بادشاہ اس لڑکی کو اپنی لڑکی کے برابر سمجھتا تھا، اور بڑی چہیتی تھی۔ یہ لڑکی بعد میں بہو بیگم کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ شادی 1745 کے اواخر میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ 1

5 رجنوری 1747 کو عمدۃ الملک امیر خان کے قتل 2 کے بعد صفدر جنگ ایرانی گروہ کا قائد بن گیا۔ وزیر قمر الدین خاں عیش و عشرت میں غرق تھا، اور دکن میں نظام الملک بہت ضعیف العمر ہو چکا تھا، اور اپنی موت کا انتظار کر رہا تھا۔ لہٰذا ایسی صورت میں امرا میں صفدر جنگ ہی ایک صاحب اقتدار اور جری امیر تھا۔ اور اوسط درجے کے امیروں میں سب سے زیادہ تجربہ کار طاقت ور اور ذہنی اعتبار سے سنجیدہ سمجھا جاتا تھا۔ محمد شاہ کی نظر میں اس کو اہم حیثیت حاصل تھی، اور نازک ملکی معاملات جیسے مرہٹوں سے سیاسی تعلقات، اسی کے ذریعہ عمل میں آئے تھے۔ 1161ھ میں صفدر جنگ کو اودھ کے علاوہ صوبہ الہ آباد بھی دے دیا گیا۔ 3

---

1. سیر 3/ص 13۔ عماد ص 36 اخبار محبت/ 486۔

2. عمدۃ الملک امیر خاں کا قتل محمد شاہ کے ایما سے عمل میں آیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ عمدۃ الملک بادشاہ سے ناراض ہو کر سلیم گڑھ میں مقید سلاطین کی ملاقات کو گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر عمدۃ الملک کے دشمنوں نے بادشاہ کے کان اس کے خلاف بھرے۔ اور بادشاہ کو اس سے بدظن کر دیا۔ ایک دوسرے موقع پر عمدۃ الملک نے بادشاہ سے کسی معاملے میں طویل گفتگو کی اور بادشاہ کے بار بار کہنے پر گفتگو کا سلسلہ بند نہ کیا چونکہ بادشاہ اس سے تنگ آ چکا تھا۔ لہٰذا اس نے روز افزوں ناظر سے کہا کہ اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ناظر نے جواہر نامی شخص کو جو عمدۃ الملک کے ہاں ملازم تھا، اور آزردہ ہو کر مستعفی ہو چکا تھا، اس کام کے لیے آمادہ کیا۔ لہٰذا (1159ھ/ 23 رذی الحجہ کی صبح کو جب وہ دربار میں آیا تو قاتل نے دیوانِ خاص کے دروازے پر اپنے خنجر سے اس کا کام تمام کر دیا۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو سیر المتاخرین 3/ ص 12,14 ''غم عمدہ'' اس کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

خزانہ عامرہ ص 78-77، چہار گلزار شجاعی ص/ 100 ب۔ 101 الف اخبار محبت ص 486 تاریخ سعادت جاویہ ص 323-321۔ تاریخ مظفری 1/ ص 267 ب

3. خزانہ عامرہ۔/ ص 78۔

ابدالی حملہ 1747

1161ھ 1747 حصہ اول میں ہم تفصیل سے ابدالی حملے کا ذکر کر چکے ہیں۔ اور یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ محمد شاہ نے جن امیروں کو ابدالی حملہ آور سے مقابلے کے لیے بھیجا تھا ان میں صفدر جنگ بھی شریک تھا۔ اس جنگ میں مغلیہ فوج کو کامیابی حاصل ہوئی اور ابدالی فوج نے فرار کی راہ لی۔ واپسی میں افواج مغلیہ راستے ہی میں تھی کہ محمد شاہ بادشاہ کا 1161ھ /1747 میں وصال ہو گیا۔ صفدر جنگ نے شہزادہ احمد شاہ کو تخت شاہی پر بیٹھا دیا اور مابعد صفدر جنگ کو وزارت کا عہدہ ملا۔ چونکہ احمد شاہ اور صفدر جنگ کے تعلقات کئی وجوہ کی بنا پر کشیدہ ہوتے چلے گئے۔ لہٰذا دونوں میں جنگ کی نوبت آ گئی اور آخر کار صفدر جنگ کو صلح کرنی پڑی اور بادشاہ نے اس کی خدمت کے صلے میں اسے اودھ کا گورنر برقرار رکھا۔[1]

صفدر جنگ کا انتقال۔ 15/ اکتوبر 1754

اودھ پہنچنے کے بعد صفدر جنگ از سر نو اپنے صوبے کی مالی اور فوجی تنظیم میں لگ گیا اور ساتھ ہی باغی زمینداروں کی سرکوبی اور مرہٹوں کے حملوں سے علاقے کے دفاعی کاموں میں غرق ہو گیا۔ اسی زمانے میں مرہٹوں نے آ کر سورج مل جاٹ کو کمبیر کے قلعے میں محصور کر لیا اور عماد الملک ان کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ احمد شاہ بادشاہ نے مرہٹوں کے مقابلے کے لیے کوچ کیا اور سکندر آباد میں خیمہ زن ہوا۔ صفدر جنگ بھی بادشاہ کی امداد کے لیے مہدی گھاٹ تک آیا اور بادشاہ کے علی گڑھ پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر اس کے برعکس احمد شاہ بادشاہ سکندر آباد کے آس پاس ہی رہا اور آگے نہ بڑھا اور آخر کار مرہٹوں نے اس کے پڑاؤ پر حملہ کر دیا۔ اور بادشاہ شاہی مستورات کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ان واقعات کا پہلے حصہ میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ مہدی گھاٹ سے واپسی کے بعد صفدر جنگ پھر اپنے ملکی امور میں منہمک ہو گیا تا کہ وہ مرہٹوں اور عماد الملک کا شکار نہ

1۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ حصہ اول، ص۔ چہار گلزار شجاعی ص 118 ب۔ 125 الف خزانہ عامرہ ص 86 ,79-78 بوساطت بقرار بحالی صوبہ اودھ والہ آباد صلح انعقاد یافت 17 / ذی الحجہ 1167 کو وہ اودھ کے لیے روانہ ہوا تاریخ راحت افزا ص 273,284۔ تواریخ الممالک ہندستان۔ 125 الف تاریخ مظفری 1 /ص 285 الف۔ 287 الف 318 ب تا 333 ب

بن سکے جو اودھ کو ہتھیانے کے خواہاں تھے۔ اسی زمانے میں اس کے پیر میں ایک دنبل نکل آیا جس نے ناسور کی صورت اختیار کر لی۔ تجربہ کار اور ہوشیار حکمانے اس کے علاج کی پوری کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اور گومتی کے کنارے پار یہ گھاٹ پر 17 رذی الحجہ 1167 ھ 15 / اکتوبر 1754 کو اس نے وفات پائی۔[1] اس کی نعش کو دہلی بھیج کر اس کو شاہ مرداں میں دفن کر دیا گیا۔ شجاع الدولہ نے اپنی صوبہ داری کے زمانے میں اس کی قبر کے اوپر ایک شاندار مقبرہ تعمیر کیا۔ جس پر تین لاکھ روپے صرف ہوئے اور ہندستان میں فن تعمیر کے نقطۂ نظر سے اعلیٰ پیانے کی عمارت ہے، اس مقبرے کے دروازے پر یہ شعر کندہ ہے جس سے اس کی وفات کی تاریخ نکلی ہے۔

چوں آں صفدر عرصہ مردی۔ زدار فنا گشت رحلت گزین
چنین سال تاریخ اوشدرقم۔ کہ بادا مقیم بہشت بریں

نواب شجاع الدولہ

ولادت اور ابتدائی زندگی

مرزا جلیل الدین حیدر جو شجاع الدولہ کے لقب سے مشہور و معروف ہیں۔ دہلی میں دارا شکوہ کی حویلی میں، 22 رجب 1144 ھ/ 19 جنوری 1732 کو پیدا ہوئے تھے۔ چون کہ برہان الملک سعادت خاں کے نواسے تھے اس وجہ سے اس موقع پر بڑے پیانے پر جشن منعقد ہوئے۔ اور موصوف نے اس خیال سے کہ یہ دن یادگار زمانہ رہے بے دریغ روپیہ صرف کیا۔ مرزا جلیل الدین حیدر بالعموم اپنے خاندان اور بالخصوص اپنے نانا کے منظور نظر تھے اور ایام طفلی کے آٹھ سال اپنے نانا کے سایہ عاطفت میں گزارے۔ چونکہ نواب سعادت خاں کے اکلوتے لڑکے کا انتقال طفلی ہی میں ہو چکا تھا۔

1. سیر المتاخرین۔3 /ص 47،48، مآثر الامرا1 /ص 363، عماد/ 65 نے 1166 ھ تاریخ وفات لکھی ہے جو غلط ہے، میر کی آپ بیتی ص 106، چہار گلزار شجاعی رص 131 الف خزانہ عامرہ ص 86۔ تاریخ راحت افزا ص 293۔ تاریخ سعادت جاوید۔ عرس ہوتا تھا۔ ص 343-342۔ تاریخ مظفری 11 /ص 27 ب 129 ب

اور جب ان کی عمر 52 سال سے تجاوز کر گئی تو وہ دوسری اولاد کی ولادت کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ اور اب اس بات کی امید بھی باقی نہیں رہی کہ ان کا کوئی لڑکا ان کا جانشین ہوگا۔ بدیں وجہ انھوں نے اپنے بھانجے اور داماد مرزا محمد مقیم کو (جو ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کے نام سے مشہور ہیں) خراسان سے بلوا لیا تھا۔ اور اپنی بیٹی صدر النسا کا اس کے ساتھ رشتہ کر دیا تھا۔ اپنے داماد کو اپنا جانشین مقرر کیا اور صوبۂ اودھ کے نائب کا عہدہ عطا کیا۔ اس کے بعد صوبے کا ملکی اور مالی نظام مرزا مقیم کی نگرانی میں چھوڑ کر وہ دہلی چلے گئے۔ اور دربار مغلیہ کی سیاست میں پوری طرح سے حصہ لینے لگے۔

بسم اللہ خوانی

ہندستان کے دستور کے مطابق مرزا جلیل الدین حیدر کی رسم بسم اللہ خوانی چوتھے سال ادا ہوئی[1] جب ان کی عمر 12 سال کی ہوئی تو ایران کے مشہور عالم شیخ محمد حسین[2] کو ان کی تعلیم کے لیے مقرر کیا گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئے معلم ان کو زیادہ دنوں تک تعلیم نہ دے سکے ہوں گے کیوں کہ کچھ ہی دنوں بعد صفدر جنگ کا انتقال ہو گیا۔ علاوہ ازیں مرزا جلال الدین حیدر کو دینی تعلیم سے قدرے دل چسپی نہ تھی اس لیے انھوں نے اپنے معلم سے کوئی رابطہ نہ رکھا ہوگا۔ ایام طفلی میں مرزا جلال الدین بلا کے شریر تھے مگر بلا کی ذہانت بھی پائی تھی۔ اور بلا شبہ ایسا یقین کیا جاتا تھا کہ جو کچھ بھی انھیں پڑھایا گیا ہوگا، وہ سب کچھ ذہن نشین ہو گیا ہوگا۔ مجملاً ان کو عربی، فارسی، ترکی اور ہندستانی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ ہر چرن داس نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ وہ ہندی، مرہٹی اور انگریزی زبان سے بھی روشناس تھے۔[3] ریاضی، خوش نویسی اور فن موسیقی میں پوری قدرت حاصل تھی[4]

مرزا جلال الدین وجیہہ، لحیم شحیم اور جری تھے۔ جسمانی طاقت بے حد تھی، فن تیراکی، کشتی گیری، پنجہ کشی، گھوڑ سواری، تیر اندازی، نیزہ بازی، تلوار بازی، بندوق اندازی، اور دیگر فنون حرب کی اچھی

1. ملاحظہ ہو۔ نور القلوب/ 167، تاریخ عندلیب 1 /ص 24۔
2. برائے تفصیل دیکھیے، سیر المتاخرین (ا۔ت) 2 / 263-264۔
3. چہار گلزار شجاعی/223 الف
4. چہار گلزار شجاعی/223 الف

خاصی مہارت رکھتے تھے[1] حالانکہ ابتدائی جوانی سے لہو ولعب میں ڈوب گئے تھے۔ تاہم انھوں نے اپنی بہادری، سیاسی بصیرت اور جفاکشی کی وجہ سے اپنے صوبے کو غاصب اور لالچی پڑوسیوں کے تسلط سے محفوظ رکھا۔ مرہٹوں کو اودھ میں گھسنے نہ دیا[2]

مرزا جلال الدین کی مشکل سے بھی آٹھ سال کی عمر ہوئی ہوگی کہ ان کے نانا نے وفات پائی۔ اور والد صفدر جنگ ان کے جانشین کی حیثیت سے والیٔ اودھ ہوئے۔ چونکہ اس زمانے میں دربار مغلیہ سے عطا ہونے والے عہدے عملی طور سے موروثی ہو چکے تھے۔ لہٰذا فی الواقع 8 سال کی عمر میں مرزا جلال الدین ایک متمول صوبے کے وارث بن گئے۔ 1743 میں صفدر جنگ حسب الحکم محمد شاہ دہلی پہنچا۔ مرزا جلال الدین کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ صفدر جنگ کو میر آتش کا عہدہ تفویض ہوا۔ اس عہدے کے ضوابط کے مطابق صفدر جنگ نے قلعہ معلیٰ میں سکونت اختیار کی۔ لہٰذا مرزا جلال الدین کو جن کی عمر ابھی بارہ سال ہی کی تھی، اکثر و بیشتر دربار میں جانے اور محمد شاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا سنہرا موقع ملا۔

ایام پیری میں محمد شاہ بادشاہ کو بچوں سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، اور بالخصوص وہ مرزا محمد سے بڑی محبت کرتا تھا۔ جو اسحاق خاں موتمن الدولہ کا بڑا بیٹا تھا۔ شاہان مغلیہ کے دستور کے برخلاف وہ مرزا محمد کو اپنے ساتھ تخت پر بھی بٹھا لیا کرتا تھا، جیسے کہ وہ شاہی خاندان کا فرد ہو۔ اور ضعیف العمر بادشاہ بعض مرتبہ یہاں تک کہہ دیتا تھا کہ ''اگر محمد اسحاق نے مرزا محمد کو نہ چھوڑا ہوتا تو میں نہیں جانتا کہ اس کے بعد میں کیوں کر زندہ رہ سکتا تھا''۔ اسی طرح محمد شاہ، محمد اسحاق خاں کے دوسرے دونوں بیٹوں مرزا علی خاں اور محمد علی سالار جنگ سے بھی بے حد محبت کرتا تھا[3]

یہ وہ زمانہ تھا کہ مرزا جلال الدین کی عمر بارہ تیرہ سال کی تھی، اور یہی سن مرزا محمد کے چھوٹے بھائیوں کا تھا۔ اور اول الذکر بھی اپنے والد کے ساتھ دربار میں جایا کرتا تھا۔ لازمی طور سے بادشاہ

1۔ چہار گلزار شجاعی/222 ب 223 الف۔

2۔ سیر المتاخرین (ا۔ت) 3/48۔

3۔ سیر المتاخرین (ا۔ت) 3/3، دریائے لطافت (ا۔ت) ص 125۔

نے دل میں مرزا جلال الدین کے لیے کشش پیدا ہوئی ہوگی۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ اس نے مرزا جلال الدین کی شادی محمد اسحاق خاں کی بیٹی سے کروائی تھی۔

شادی

چونکہ اس زمانے میں عمدۃ الملک امیر خان کا جواثر بادشاہ محمد شاہ پر تھا، بڑی تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ اس وجہ سے بادشاہ نے بقیہ دو ایرانی خاندانوں میں گہرا رابطہ پیدا کرنے کی غرض سے اس رشتے کی تجویز پیش کی تھی۔ اور اس لڑکی کو لے پالک بنا کر خود شادی کی ذمہ داری لی اور بڑی دھوم دھام سے یہ شادی 1745 میں پایہ تکمیل کو پہنچی [1]۔ دولھا کی عمر 14 سال کی تھی، اور دولھن کی عمر غالباً 12-13 سال کی تھی۔

یہ وہی زمانہ تھا کہ صفدر جنگ کی قسمت کا ستارہ عروج کی طرف مائل تھا۔ 25 / اپریل 1748 کو محمد شاہ نے رحلت کی اور پانی پت کے قریب اس کا بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہوا۔ ابدالیوں کے محاربہ کے موقع پر وزیر الممالک قمر الدین خاں شہادت پا چکے تھے۔ اس لیے نئے بادشاہ نے صفدر جنگ کو وزیر کا عہدہ عطا کیا۔ اور اس کے منصب میں اضافہ کر کے آٹھ ہزار ذات اور آٹھ ہزار سوار کر دیا۔ علاوہ ازیں غسل خانے کی خدمات بھی صفدر جنگ کو سونپی گئیں۔ ایک ماہ کے بعد اجمیر کی صوبہ داری اور نارنول کی فوج داری کے عہدے بھی اسے عطا ہوئے۔ لیکن اس نے اجمیر کے بدلے میں ذوالفقار خاں سے جو میر بخشی تھا۔ الہ آباد کا صوبہ لے لیا۔ اسی دن مرزا جلال الدین کو جن کی عمر ساڑھے سولہ سال کی تھی اعلیٰ منصب کے علاوہ شجاع الدولہ بہادر کا خطاب تفویض ہوا [2]۔ 1750 میں جب صفدر جنگ نے احمد خان بنگش کے خلاف فوج کشی کی تو اس نے شجاع الدولہ کو اپنا قائم مقام وزیر بنایا۔ اس موقع پر صفدر جنگ کو شکست فاش کا منہ دیکھنا پڑا [3]۔ اس شکست کی خبر سن کر تورانی پارٹی کے افراد اور جاوید خان نے احمد شاہ بادشاہ کو صفدر جنگ کے خلاف

1۔ سیر المتاخرین 3 (ا۔ت) ص 13، نیز دیکھیے۔ چہار گلزار شجاعی/219 ب۔ 220 الف، 99 الف و ب، اخبار محبت/486 عماد/36۔

2۔ تاریخ احمد شاہ/15 ب

3۔ میر کی آپ بیتی/105۔

ورغلا یا۔ اس کی جائداد پر قبضہ کرنے، شجاع الدولہ کو وزارت کے عہدے سے معزول کرنے، اور انتظام الدولہ قمر الدین خاں کو وزیر مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ ایسی حالت میں شجاع الدولہ اپنے والد کے مخالفین کے جال میں پھنس گیا۔ لیکن اس نے اپنی صاحب بصیرت و دانش مند والدہ کے مشورہ پر دس ہزار بہادر سپاہی جمع کر کے اپنی حویلی کی حفاظت کا انتظام کیا۔[1] اس وجہ سے سازش کرنے والوں کا منصوبہ ناکام رہا۔ اور اپنے والد کی واپسی تک شجاع الدولہ قائم مقام وزیر بنا رہا۔[2] دوسری مرتبہ جب صفدر جنگ نے افغانوں پر فوج کشی کی تو شجاع الدولہ پھر قائم مقام وزیر رہا۔ اس مرتبہ بھی وہ صرف نام و نمود کا وزیر تھا۔ جب کہ تمام سیاسی اور مالی معاملات میں نواب جاوید خاں کو پورے اختیارات حاصل تھے۔ واپسی کے بعد صفدر جنگ نے جو نواب جاوید خان کے اختیارات کلی سے تنگ تھا۔ اسے دھوکا دے کر قتل کروا دیا۔[3] حالانکہ مجموعی طور پر اس قتل کے نتائج صفدر جنگ کے حق میں مسموم ثابت ہوئے۔ لیکن فی الفور اسے بادشاہ کی ذات اور سیاسی معاملات میں مکمل اختیارات حاصل ہو گئے۔ صفدر جنگ نے شاہی قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے عہدوں پر اپنے نمائندوں کو مقرر کیا اور شجاع الدولہ کو میر آتش کے عہدے کے علاوہ نائب وزیر کا عہدہ بھی ملا۔ علاوہ ازیں اسے وہ چار عہدے بھی ملے۔ جو نواب جاوید خاں کے پاس تھے۔ یعنی اہادیث عرض مکرر۔ گرز برداران اور جلو خاص۔[4] اس کے چار ماہ بعد بادشاہ نے غسل خانہ کا عہدہ بھی شجاع الدولہ کو عطا کیا۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد دربار میں صفدر جنگ کے خلاف سازشوں کا جال پھیل گیا۔ اور جب مخالفوں کو پورا اقتدار حاصل ہو گیا تو انھوں نے سب سے پہلے شجاع الدولہ کو میر آتش کے عہدے سے معزول کروانے اور قلعہ معلیٰ سے باہر نکلوانے کا منصوبہ بنالیا۔ مگر صفدر جنگ کے خوف سے کوئی دوسرا امیر اس عہدے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوا لہٰذا یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا۔ 1753 میں احمد شاہ نے شجاع الدولہ کے نائب موسوی خاں کو جو نائب میر آتش تھا، بلوایا۔ اور بھرے دربار میں اس کی تذلیل کی۔ آدھی رات کو

1. عماد/50۔
2. سیر المتاخرین (ا۔ت) 3/33۔
3. تاریخ احمد شاہ/39ب۔40ب سیر المتاخرین (ا۔ت) 3/42-43۔
4. تاریخ احمد شاہ/44الف۔

بادشاہ کے حمایتیوں نے یہ افواہ پھیلادی کہ صفدر جنگ قلعہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ اور اس وجہ سے گڑبڑی پھیل گئی۔ قلعہ میں جو صفدر جنگ کے نمائندے تھے، وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور جو رہ گئے ان کو مار بھگایا گیا۔[1] اس کے بعد صفدر جنگ نے بادشاہ سے مقابلہ کرنے کی تیاریاں کیں۔ اس جنگ کے وجوہ اور نتائج کا تفصیلی ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔

مسند نشینی

5 / اکتوبر 1754 میں نواب صفدر جنگ کے انتقال کے بعد شجاع الدولہ اودھ اور الہ آباد کی مسند پر جلوہ افروز ہوا۔ جب نواب صفدر جنگ کی وفات کی خبر دہلی پہنچی تو عالمگیر ثانی نے شجاع الدولہ کے نام تعزیتی خط اپنے دست مبارک سے لکھ کر بھیجا اور اسے اودھ کا باضابطہ صوبہ دار مقرر کیا۔[2] اس کے بعد بادشاہ نے شجاع الدولہ کو شش پارچہ کا خلعت اور صوبہ داری کے عہدے پر تقرری کا شاہی فرمان ارسال کیا۔ یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ شاہی فرمان میں صوبہ الہ آباد کا کوئی ذکر نہ تھا۔ بعد میں بادشاہ نے اس صوبے کو اپنے نئے وزیر عماد الملک کو عطا کیا۔[3] لیکن اس خیال سے کہ ایک طویل اور خون ریز جنگ کے باوجود وہ اس صوبے پر قبضہ حاصل نہ کر سکے گا۔ عماد الملک نے صوبہ الہ آباد کی تنظیم کے بارے میں کوئی عملی قدم نہ اٹھایا اور یہ صوبہ بھی خاموشی سے شجاع الدولہ ہی کے قبضہ میں بطور ورثہ پہنچ گیا۔

تخت نشینی کے بعد شجاع الدولہ نے اپنے والد کے زمانے کے تمام عہدہ داروں کو برقرار رکھا۔ محمد قلی خاں کو الہ آباد کا نائب صوبہ دار رہنے دیا۔ اور اسماعیل خاں کابلی بطور مشیر خاص اور فوج کا کمانڈر بنا رہا۔[4] حالانکہ شجاع الدولہ کی عمر ابھی صرف 23 / برس کی تھی۔ لیکن نظام سلطنت کی طرف سے تغافل برتتا تھا اور لہو ولعب میں منہمک رہتا تھا۔[5] وہ حسن پرست اور امرد دوست تھا

---

1. سیر المتاخرین۔ (ا۔ت) 3 / 44۔
2. تاریخ احمد شاہ / 38 الف، خزانہ عامرہ / 86۔
3. سیر المتاخرین (ا۔ت) 3 / 48۔
4. سیر المتاخرین (ا۔ت) 3 / 48۔
5. خزانہ عامرہ / 86، تاریخ راحت افزا / 29 سیر المتاخرین (ا۔ت) 3 / 48

اور اس کے دیگر مشاغل کبوتر بازی پتنگ بازی، چوپڑ بازی اور اسی نوعیت کے دوسرے طفلانہ مشغلے تھے۔

قدرتی طور پر ملکی اور مالی معاملات کی باگ ڈور اسماعیل خاں کابلی کے ہاتھ میں چلی گئی۔ جو اپنے اقتدار ماضی کو برقرار رکھنے اور نواب کو کٹھ پتلی بنا کر رکھنے کا خواہش مند تھا۔ مگر نواب کی طفلانہ حرکتوں نے اسماعیل خاں اور دیگر عہدہ داروں کو نواب کے برخلاف کر دیا۔ علاوہ ازیں نواب نے اپنی حرکتوں سے اپنی ہندو رعایا کو بھی اپنا مخالف بنالیا تھا۔ لہٰذا نواب کے امرا نے شجاع الدولہ کو معزول کرنے اور محمد قلی خاں کو مسند کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن اس بیچ میں والدۂ نواب نے اپنی سیاسی بصیرت سے معاملہ کو رفع دفع کر دیا، محمد قلی خاں فیض آباد آیا، اور کچھ دنوں وہاں ٹھہرنے کے بعد اپنے صوبے واپس چلا گیا۔[1] ہندستان کا وزیر الممالک ہونا شجاع الدولہ اپنا موروثی حق سمجھتا تھا۔ مگر اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ عماد الملک پر حملہ کر کے اسے زیر کرسکتا۔ لہٰذا اس نے حکمت عملی سے عہدے کو حاصل کرنے کی کوشش کی اور علی قلی داغستانی کو اس منصوبے کی تکمیل کے لیے سورج مل جاٹ کے پاس بھیجا اور اس کی حمایت حاصل کی۔ اس کے بعد علی قلی خاں نے سیف الدین محمد خاں اور کشن چند کا اعتماد حاصل کیا اور ان کے توسط سے بادشاہ کو اس مسئلہ کی طرف رجوع کیا مگر وزیر کو بروقت اس بات کا علم ہو گیا اور اس نے اس منصوبے کو ناکام کر دیا۔

شجاع الدولہ کو نہ بذات خود ہی انتظامی معاملات میں دل چسپی تھی لیکن اس خیال سے بھی کہ اس کے نائب کے جذبات مجروح ہوں گے، وہ کسی معاملہ میں دل چسپی نہ لیتا تھا۔ مگر سال بھر ہی کے بعد 13/ اکتوبر 1755 کو اسماعیل خاں کابلی نے وفات پائی[2] نواب پھر بھی عیش و عشرت کے مشغلوں میں مصروف رہا۔ اور نظم و نسق کے تمام امور اپنے نئے نائب موسوی خاں کے ہاتھوں میں کلیتہً چھوڑ دیے[3]

وزیر الممالک اور نواب اودھ کے مابین تصادم

چونکہ صفدر جنگ اور عماد الملک کے آپسی تعلقات بے حد کشیدہ تھے اور اس کے علاوہ

1. عماد/68-66۔ 2. عماد/56۔
3. عماد/63۔

شجاع الدولہ نے ثانی الذکر کو وزارت کے عہدے سے معزول کرانے کا منصوبہ بھی بنایا تھا اس لیے جب عماد الملک کو پنجاب اور دیگر سیاسی معاملات سے فرصت ملی تو اس نے بنگش خاندان اور نواب شجاع الدولہ کے قلع قمع کرنے کی کوشش شروع کی۔ اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل کو پہنچانے کے لیے اس نے احمد خاں بنگش کو الہ آباد کا صوبہ دار مقرر کر دیا اور اسے حکم دیا کہ وہ جا کر مجوزہ صوبہ پر قبضہ کر لے۔ مگر شجاع الدولہ کو جوں ہی اس بات کا علم ہوا تو اس نے فوری تادیبی کارروائی کی اور اپنی فوج بھیج کر احمد خان بنگش کا راستہ روک لیا۔ اور محمد قلی خاں، نائب صوبہ دار الہ آباد کو دفاعی اقدام اٹھانے کا حکم دیا۔ اسی اثنا میں یہ افواہ پھیل گئی کہ سورج مل جاٹ اور نواب نے وزیر الممالک کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا ہے۔ لہٰذا نجیب الدولہ اور ناگرمل نے بیچ میں پڑ کر مصالحت کرا دی اور احمد خاں بنگش کی تقرری کا پروانہ منسوخ کروا دیا۔[1]

بلونت سنگھ کے کامیاب حملے

گزشتہ دو سالوں سے اودھ اور الہ آباد کے سرحدی علاقوں میں بدامنی کی صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی۔ صفدر جنگ کی کھلے بندوں بادشاہ وقت کی مخالفت، بغاوت اور طویل جنگ کے دوران میں اولوالعزم، زمینداروں کو نواب کی اطاعت سے روگردانی کرنے اور آزادی کا جھنڈا لہرانے کا سنہرا موقع مل گیا۔ اس سلسلے میں بنارس کا راجہ بلونت سنگھ زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔ اس نے پہلے اپنے عمدہ نظم ونسق، سیاسی بصیرت اور مالی وسائل سے اتنی فوجی طاقت حاصل کر لی تھی کہ 1752 میں اس نے الہ آباد کے نائب صوبہ دار علی قلی خاں کو بڑی کامیابی سے شکست دی۔[2] ایک دوسرے موقع پر دوبارہ اس نے صوبہ دار کی اطاعت سے روگردانی کی اور پیشکش ادا کرنا بند کر دیا۔ اور دونوں صوبوں کے نائب صوبہ داروں سے میدان جنگ میں مقابلہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔[3] بلونت سنگھ نے صفدر جنگ کی پریشانیوں اور خانہ جنگی کی ناکامیوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، اور اپنے سرحدی علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے اقدام

1۔ تاریخ عالمگیر ثانی/79 ب 84 ب، میر کی آپ بیتی/136-137۔

2۔ بلونت نامہ/25 الف۔

3۔ تاریخ احمد شاہ/12 الف

اٹھائے۔ اس کا واحد مقصد۔ وجے گڑھ کے قلعہ پر تسلط جمانا تھا۔ جو مرزا پور سے مشرقی جانب 58 میل اور بنارس سے جنوب کی طرف 54 میل کی دوری پر واقع تھا۔ بلونت سنگھ نے پہلے پٹیتا لطیف پور کو فتح کیا، اور اس کے بعد وجے گڑھ پر قبضہ حاصل کر لیا۔[1] جس زمانے میں بلونت سنگھ یہ فتوحات حاصل کر رہا تھا، صفدر جنگ دہلی میں موت اور زندگی کی الجھنوں میں غرق تھا۔ جوں ہی اسے دہلی کی جنگ سے نجات ملی، وہ فی الفور فیض آباد آیا، اور بلونت سنگھ کی سرکوبی کے مقصد سے بنارس کے لیے روانہ ہو گیا۔ جب صفدر جنگ بنارس پہنچا تو اس سے پہلے ہی بلونت سنگھ نے فرار ہو کر چندوتی کے قلعہ میں پناہ لے لی تھی۔ چونکہ صوبے کے دیگر زمینداروں نے بھی سر اٹھانے کی کوشش شروع کر دی تھی لہٰذا صفدر جنگ زیادہ دنوں تک بنارس میں قیام نہ کر سکتا تھا۔ ابھی وہ وہیں مقیم تھا کہ دہلی سے فرمان ملا کہ وہ فوراً دہلی چلا آئے اور اپنے دشمن مرہٹوں اور عمادالملک پر حملے میں شریک ہو جائے۔ سابق وزیر نے حکم شاہی کی تعمیل کی اور بلونت سنگھ کو اس کے نئے مقبوضات میں چھوڑ دیا۔

جب شجاع الدولہ مسند نشیں ہوا تو اس نے بلونت سنگھ سے پیشکش ادا کرنے کی مانگ کی چونکہ بلونت سنگھ نے نئے مقبوضات میں اپنے قدم جما لیے تھے۔ اس لیے اس نے نواب کی مانگ کو ٹھکرا دیا۔ اس وجہ سے شجاع الدولہ کو اس پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔

صفدر جنگ کی وفات کی وجہ سے صوبے کے نظم و نسق میں انتشار پیدا ہو چکا تھا اور لاقانونیت اور بدامنی پھیل چکی تھی۔ صفدر جنگ کے انتقال کے کچھ دنوں پہلے چنار کے قلع دار احمد بیگ خاں کا انتقال ہوا (1753) نواب نے مرحوم کے نابالغ لڑکے آغا جانی کو قلع دار مقرر کیا۔ اور اس کے غلام آغا میر کو اس کا نگراں مقرر کیا۔ اس وجہ سے چنار کے معاملات میں بھی بدنظمی وقوع پذیر ہو گئی تھی۔ اور یہی شجاع الدولہ کی تخت نشینی کا زمانہ تھا ان حالات کی وجہ سے بنارس کے راجا کو ایک ایسا موقع ہاتھ آیا جس کا وہ بہت دنوں سے منتظر تھا۔ اور اس نے چنار کے معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی۔ راجا کو یہ بات اچھی طرح واضح تھی کہ اگر وہ فوج کشی کے ذریعہ چنار کے قلعہ پر قبضہ کر لے گا تو اسے نواب کی فوج کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ لہٰذا اس نے رشوت کے

1. بلونت نامہ/ 31ب۔ 53الف

ذریعہ اپنا مقصد پورا کرنا چاہا تھا۔ اس نے آغا میر کو ایک لاکھ روپے رشوت میں دینے کی لالچ دی۔ اور اس طرح اس نے قلعہ پر قبضہ کرنا چاہا۔ لیکن بروقت شجاع الدولہ کی مزاحمت سے راجا کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ شجاع الدولہ کو جب بنارس میں فرقہ وارانہ کشید گیوں اور بلونت سنگھ کے چنار پر قبضہ کرنے کے منصوبوں کا علم ہوا تو قدرے اس کی حیرانی بڑھ گئی۔ لہٰذا اس نے موقع پر پہنچنے، مجرموں کو سزا دینے اور شہر کے فرقہ ورانہ عناصر کو دبانے اور وہاں امن وامان قائم کرنے کا مصمم ارادہ کیا۔ 1761 میں ایک بڑی فوج ساتھ لے کر وہ جون پور کے لیے روانہ ہوا۔ اس کے بعد بنارس کا رخ کیا۔ اس کی آمد کی خبر سن کر بلونت سنگھ نے فرار ہو کر لطیف پور کے قلعہ میں پناہ لے لی۔ راستے میں نواب کو راجا کی خوش دامن فوج کا مقابلہ کرنا پڑا، جو راجہ کے فرار ہونے کی وجہ سے اس سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اور اس کے دامن سے بزدلی کا داغ دھونا چاہتی تھی۔ لیکن شجاع الدولہ نے یہی کوشش کی کہ صلح ہو جائے ورنہ مستقبل میں لکھا جاتا کہ اس نے ایک عورت پر مظالم توڑے تھے۔ مختصر یہ کہ راجہ ہمت بہادر نے درمیان میں پڑ کر اِس بات پر صلح کرادی کہ وہ نواب کی عزت کو برتر رکھنے کی غرض سے قلعہ خالی کردے اور پھر فوراً ہی اسے قلعہ کا قبضہ دے دیا جائے گا۔ اس سمجھوتے کے بعد نواب چنار کے لیے روانہ ہوا۔

غدار آغا میر نے فرار کی راہ لی، شجاع الدولہ نے چنار کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور اپنے معتمد افسر کو قلع دار مقرر کیا۔ اس کے بعد دوبارہ شجاع الدولہ بنارس پہنچا اور فضل علی خاں بن عبداللہ اور غازی پور کے فوج دار کو حکم دیا کہ وہ بلونت سنگھ کو لطیف پور کے قلعہ سے مار بھگائیں۔ مگر راجا کوئی ایسا معمولی آدمی نہ تھا کہ وہ بآسانی نواب کے جال میں پھنس جاتا۔ اس نے لطیف پور کے قلعہ میں آگ لگادی، وجے گڑھ کے قلعہ میں پناہ لے لی۔ اور اپنی مدد کے لیے مرہٹوں کو پٹنہ سے بلوایا۔ جوانی اور طاقت کے نشے میں شجاع الدولہ نے شیخ علی حزین۔[1] کی دانش مندانہ نصیحت پر عمل نہ کیا۔ اور بنارس کے طاقت ور راجا سے مصالحت نہ کی۔ نواب فضل علی کو فوجی امداد پہنچانے کی غرض سے لطیف پور کی طرف بڑھا۔ فضل علی نے اس نازک موقع سے فائدہ اٹھایا اور نواب کی خدمت میں چند

1۔ برائے سوانح عمری دیکھیے۔ خزانہ عامرہ/193-200، سیر المتاخرین (ا۔ق) 2/ 662-663، مآثر الکرام 11/ 225-226۔

شرائط پیش کیں۔ ابھی اس معاملہ میں گفت وشنید ہو رہی تھی کہ دہلی سے یہ پریشان کن خبر پہنچی کہ احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر حملہ کر دیا۔ اس علاقے کو فتح کر کے دہلی آ پہنچا، وزیر الممالک نے شجاع الدولہ اور دیگر امیروں سے التجا کی کہ وہ فوراً اس کی مدد کو دہلی پہنچیں۔ اس نازک اور ذہنی انتشار کے موقع پر شجاع الدولہ کے وزیر اعلیٰ خواجہ تمکین اور محمد علی خاں اور دیگر مشیروں نے نواب کو مشورہ دیا کہ بلونت سنگھ جیسے طاقتور راجہ کو بہت دنوں تک باغی چھوڑ دینا صوبے کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوگا اور بالخصوص اس نازک زمانے میں جب ایک بیرونی حملہ آور نے شمالی ہندستان پر کشت وخون کا دریا بہا رکھا ہے۔ اور دونوں صوبوں کے زمیندار آزادی کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے اس بات میں مصلحت سمجھی کہ راجا کو وہ علاقے، جو اس کے قبضے میں پہنچ چکے ہیں دیدیے جائیں۔ اور اس پر مناسب تاوان لگایا جائے۔ کیوں کہ بلونت سنگھ ہی ایک ایسا جری راجا ہے جو بنارس جیسے علاقے کے سرکش زمین داروں سے لگان وصول کر سکتا ہے۔ فضل علی میں اتنی طاقت اور تدبر نہیں ہے جو اس کام کو انجام دے سکے۔ اور بڑی مشکل سے وہ غازی پور کے نظم ونسق کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ اس کے برعکس اگر فضل علی کو وہ علاقے عطا کر دیے گئے۔ جو بلونت سنگھ کے قبضے میں ہیں۔ تو اس طرح وہ دونوں صوبوں کے نصف حصے پر قابض ہو جائے گا۔ اور نواب سے برابری کا دعویٰ کرنے لگے گا۔ اور اگر راجہ نے اسے شکست دے دی جس بات کا قوی امکان ہے تو کافی مالی نقصان برداشت کرنا ہوگا۔ چونکہ احمد شاہ ابدالی کا خوف بھی دل میں جاگزیں تھا۔ اس لیے نواب کو محمد علی خاں کی دلیل پسند آئی۔ اور اس نے راجا سے صلح کر لی۔ راجا نے پانچ لاکھ روپے بطور پیشکش فوراً ادا کرنے اور پانچ لاکھ سالانہ مال گزاری کی صورت میں دینے کا وعدہ کیا۔ اور اس طرح بارہ لاکھ روپے سالانہ کی ادائیگی پر سمجھوتہ ہو گیا۔ شجاع الدولہ نے راجا کو اپنی جانب سے اس علاقے پر مقرر کر دیا۔ اور بطور جاگیر بھدوہی کا علاقہ عطا کیا۔ 1757 میں وہ فیض آباد چلا آیا۔ اور احمد شاہ ابدالی کے متوقع حملے کے دفاع کے لیے تیاریاں کرنے لگا۔

وزیر الممالک سے کشمکش

1756 کے اواخر میں احمد شاہ ابدالی نے دوبارہ ہندستان کا رُخ اس وجہ سے کیا تھا کہ وہ عماد الملک کو اس کے سرحدی علاقوں میں دیدہ دلیرانہ مداخلت کرنے کی سزا دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ

شمالی مغربی سرحدی علاقے ابدالی مملکت کا انگ بن چکے تھے۔ بلا کسی مزاحمت اور مخالفت کے احمد شاہ ابدالی دہلی تک آ پہنچا۔ اس کے بعد متھرا اور آگرہ تک کے علاقوں کو نیست و نابود کر کے وہ مارچ 1757 میں اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔ دہلی سے روانگی سے پہلے اس نے ایک فوجی دستہ مشرقی صوبوں، الہ آباد، اور اودھ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ چونکہ شجاع الدولہ کے والد صفدر جنگ نے احمد شاہ بادشاہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اس لیے وفادار ہندستانیوں کی نظروں میں اس کا وقار گر چکا تھا۔ اور مسند نشینی کے بعد نواب (شجاع الدولہ) نے بھی شاہِ مغلیہ کو مقررہ پیش کش نہیں بھیجی تھی۔ عماد الملک، شجاع الدولہ کو اپنا خاندانی دشمن سمجھتا تھا۔ لہٰذا اس نے احمد شاہ ابدالی کے سامنے تجویز پیش کی کہ اگر اسے دوآبہ پر حملہ کرنے کی اجازت دے دی جائے تو وہ دو کروڑ روپے ادا کر سکے گا۔ اس شرط پر عماد الملک کو دوبارہ وزیر مقرر کر دیا گیا تھا۔[1] اسی طرح شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ کے درمیان یگانگت نہ تھی کیوں کہ ثانی الذکر احمد شاہ ابدالی کا مشیر بھی تھا۔ علاوہ ازیں احمد خاں بنگش کے دل میں الہ آباد صوبے پر قبضہ کرنے کی خواہش اب بھی باقی تھی اور اس کا سفیر انداز خاں، بار بار احمد شاہ ابدالی کو اودھ پر حملہ کرنے کے لیے ورغلا رہا تھا۔ ان باتوں کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ احمد شاہ ابدالی کی ہندستان میں موجودگی کی طرف سے شجاع الدولہ نے غفلت شعاری سے کام لیا تھا۔ صوبہ اودھ کی سرحدیں دہلی تک پہنچتی تھیں اور درمیان میں صرف روہیلہ سرداروں کا علاقہ تھا جو حملہ آور کے حامی اور مددگار تھے۔ لہٰذا ابدالی حملے کے لیے یہ وجہ قوی وجہ ہو سکتی تھی۔ مجملاً، احمد شاہ ابدالی نے عماد الملک کو اس بات کی اجازت دے دی۔ اس کے ساتھ دو شہزادے، ہدایت بخش بن عالم گیر ثانی اور مرزا بابر، داماد عالم گیر ثانی، کر دیے اور اپنے سرداروں میں خان باز خان کو بھی ہمراہ کر دیا۔

اس شاہی فوج کی کمک کے لیے روہیلہ سردار اور احمد خاں بنگش بھی پہنچ گئے۔ جب حملہ آور فوج دوآبہ میں داخل ہوئی تو شجاع الدولہ نے انوپ گری گوسائیں کو شاہی افواج سے ٹکر لینے کے لیے روانہ کیا۔ انوپ گری نے پہلے فرخ آباد کا رخ کیا۔ اس وجہ سے احمد خاں بنگش اپنے علاقے کے دفاع کے لیے شاہی فوج سے واپس چلا آیا۔ ساتھ ساتھ انوپ گری نے مرہٹوں سے مدد کے

1۔ سیر المتاخرین (ا۔ب) 3/52۔

شرائط پیش کیں۔ ابھی اس معاملہ میں گفت وشنید ہو رہی تھی کہ دہلی سے یہ پریشان کن خبر پہنچی کہ احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر حملہ کر دیا۔ اس علاقے کو فتح کر کے دہلی آپہنچا، وزیر الممالک نے شجاع الدولہ اور دیگر امیروں سے التجا کی کہ وہ فوراً اس کی مدد کو دہلی پہنچیں۔ اس نازک اور ذہنی انتشار کے موقع پر شجاع الدولہ کے وزیر اعلیٰ خواجہ تمکین اور محمد علی خاں اور دیگر مشیروں نے نواب کو مشورہ دیا کہ بلونت سنگھ جیسے طاقتور راجہ کو بہت دنوں تک باغی چھوڑ دینا صوبے کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوگا اور بالخصوص اس نازک زمانے میں جب ایک بیرونی حملہ آور نے شمالی ہندستان پر کشت وخون کا دریا بہا رکھا ہے۔ اور دونوں صوبوں کے زمیندار آزادی کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے اس بات میں مصلحت سمجھی کہ راجا کو وہ علاقے، جو اس کے قبضے میں پہنچ چکے ہیں دیدیے جائیں۔ اور اس پر مناسب تاوان لگایا جائے۔ کیوں کہ بلونت سنگھ ہی ایک ایسا جری راجا ہے جو بنارس جیسے علاقے کے سرکش زمین داروں سے لگان وصول کر سکتا ہے۔ فضل علی میں اتنی طاقت اور تدبر نہیں ہے جو اس کام کو انجام دے سکے۔ اور بڑی مشکل سے وہ غازی پور کے نظم ونسق کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ اس کے برعکس اگر فضل علی کو وہ علاقے عطا کر دیے گئے۔ جو بلونت سنگھ کے قبضے میں ہیں۔ تو اس طرح وہ دونوں صوبوں کے نصف حصے پر قابض ہو جائے گا۔ اور نواب سے برابری کا دعویٰ کرنے لگے گا۔ اور اگر راجہ نے اسے شکست دے دی جس بات کا قوی امکان ہے تو کافی مالی نقصان برداشت کرنا ہوگا۔ چونکہ احمد شاہ ابدالی کا خوف بھی دل میں جاگزیں تھا۔ اس لیے نواب کو محمد علی خاں کی دلیل پسند آئی۔ اور اس نے راجا سے صلح کر لی۔ راجا نے پانچ لاکھ روپے بطور پیشکش فوراً ادا کرنے اور پانچ لاکھ سالانہ مال گزاری کی صورت میں دینے کا وعدہ کیا۔ اور اس طرح بارہ لاکھ روپے سالانہ کی ادائیگی پر سمجھوتہ ہو گیا۔ شجاع الدولہ نے راجا کو اپنی جانب سے اس علاقے پر مقرر کر دیا۔ اور بطور جاگیر بھدوہی کا علاقہ عطا کیا۔ 1757 میں وہ فیض آباد چلا آیا۔ اور احمد شاہ ابدالی کے متوقع حملے کے دفاع کے لیے تیاریاں کرنے لگا۔

وزیر الممالک سے کشمکش

1756 کے اواخر میں احمد شاہ ابدالی نے دوبارہ ہندستان کا رُخ اس وجہ سے کیا تھا کہ وہ عماد الملک کو اس کے سرحدی علاقوں میں دیدہ دلیرانہ مداخلت کرنے کی سزا دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ

شمالی مغربی سرحدی علاقے ابدالی مملکت کا انگ بن چکے تھے۔ بلا کسی مزاحمت اور مخالفت کے احمد شاہ ابدالی دہلی تک آ پہنچا۔ اس کے بعد متھرا اور آگرہ تک کے علاقوں کو نیست و نابود کر کے وہ مارچ 1757 میں اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔ دہلی سے روانگی سے پہلے اس نے ایک فوجی دستہ مشرقی صوبوں، الہ آباد، اور اودھ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ چونکہ شجاع الدولہ کے والد صفدر جنگ نے احمد شاہ بادشاہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اس لیے وفادار ہندستانیوں کی نظروں میں اس کا وقار گر چکا تھا۔ اور مسند نشینی کے بعد نواب (شجاع الدولہ) نے بھی شاہِ مغلیہ کو مقررہ پیش کش نہیں بھیجی تھی۔ عماد الملک، شجاع الدولہ کو کو اپنا خاندانی دشمن سمجھتا تھا۔ لہٰذا اس نے احمد شاہ ابدالی کے سامنے تجویز پیش کی کہ اگر اسے دو آبہ پر حملہ کرنے کی اجازت دے دی جائے تو وہ دو کروڑ روپے ادا کر سکے گا۔ اس شرط پر عماد الملک کو دوبارہ وزیر مقرر کر دیا گیا تھا۔[1] اسی طرح شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ کے درمیان یگانگت نہ تھی کیوں کہ ثانی الذکر احمد شاہ ابدالی کا مشیر بھی تھا۔ علاوہ ازیں احمد خاں بنگش کے دل میں الہ آباد صوبے پر قبضہ کرنے کی خواہش اب بھی باقی تھی اور اس کا سفیر انداز خاں، بار بار احمد شاہ ابدالی کو اودھ پر حملہ کرنے کے لیے ورغلا رہا تھا۔ ان باتوں کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ احمد شاہ ابدالی کی ہندستان میں موجودگی کی طرف سے شجاع الدولہ نے غفلت شعاری سے کام لیا تھا۔ صوبہ اودھ کی سرحدیں دہلی تک پہنچتی تھیں اور درمیان میں صرف روہیلہ سرداروں کا علاقہ تھا جو حملہ آور کے حامی اور مددگار تھے۔ لہٰذا ابدالی حملے کے لیے یہ وجہ قوی وجہ ہو سکتی تھی۔ مجملاً، احمد شاہ ابدالی نے عماد الملک کو اس بات کی اجازت دے دی۔ اس کے ساتھ دو شہزادے، ہدایت بخش بن عالم گیر ثانی اور مرزا بابر، داماد عالم گیر ثانی، کر دیے اور اپنے سرداروں میں خان باز خان کو بھی ہمراہ کر دیا۔

اس شاہی فوج کی کمک کے لیے روہیلہ سردار اور احمد خاں بنگش بھی پہنچ گئے۔ جب حملہ آور فوج دو آبہ میں داخل ہوئی تو شجاع الدولہ نے انوپ گری گوسائیں کو شاہی افواج سے ٹکر لینے کے لیے روانہ کیا۔ انوپ گری نے پہلے فرخ آباد کا رُخ کیا۔ اس وجہ سے احمد خاں بنگش اپنے علاقے کے دفاع کے لیے شاہی فوج سے واپس چلا آیا۔ ساتھ ساتھ انوپ گری نے مرہٹوں سے مدد کے

1۔ سیر المتاخرین (ا۔ب) 3/52۔

لیے اپیل کی۔ مرہٹہ سردار نے راگھو لچھمن پر ندری کو اپنا سفیر بنا کر شجاع الدولہ کی خدمت میں بھیجا۔ دو ماہ کی طویل گفت وشنید کے بعد مرہٹہ سردار نے سکھو رام باپو، انتاجی منکیشور اور دوسرے جہاں دیدہ سرداروں کی قیادت میں 23 ہزار کا ایک فوجی دستہ بظاہر شجاع الدولہ کی مدد کو بھیجا۔ حالانکہ ان کا داخلی مقصد دوآبہ کے ان علاقوں پر قبضہ بھی کرنا تھا۔ جو روہیلہ اور افغانوں کے قبضے میں تھے۔ مختصر یہ کہ شجاع الدولہ فیض آباد سے کوچ کر کے سانڈی پالی کے میدان میں خیمہ زن ہوا۔ قراولوں میں دو مرتبہ معمولی سی جھڑپیں ہوئیں۔ آخر کار سعد اللہ خاں بن علی محمد خاں روہیلہ کی وساطت سے جو شجاع الدولہ سے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا۔ پانچ لاکھ روپے کی ادائیگی پر صلح ہوگئی۔ عماد الملک اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ اور واپس فرخ آباد چلا آیا۔ 1757ء[1]

خطرے سے نجات پانے کے بعد شجاع الدولہ لکھنؤ واپس آیا۔ اور پھر عیش وعشرت کے گہوارے میں سو گیا۔ رگھو لچھمن، مرہٹہ سفیر چشم دید مشاہدات کے بنا پر لکھتا ہے کہ نواب جنسی تلذذات کی تحصیل اور لہو ولہب میں غرق ہو گیا۔ اور انتظامی اور مالی امور سے بالکل غفلت برتنے لگا۔ اور یہ غفلت شعاری اس درجہ کو پہنچ گئی کہ اس کی والدہ کو مداخلت کرنی پڑی، اور انھوں نے کچھ نیک اور مفید مشورے دیے۔ اور اس کی خدمت سے تمیں بیسواؤں کو برطرف کروادیا۔ لیکن وہ ان پانچ عورتوں کو برطرف کرنے پر راضی نہ ہوا جنھیں اس نے اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا۔ اس بے توجہی اور عماد الملک سے مقابلہ کے دوران صوبے سے غیر موجودگی کی وجہ سے کئی سرکش زمینداروں نے سرکاری عاملوں کو اپنے علاقوں سے مار بھگایا۔ اور نواب کے احکامات کی خلاف ورزی کی۔ اس طرح سیاسی انتشار پیدا ہو گیا۔

شہزادہ عالی گہر کا لکھنؤ پہنچنا 1756-1758

ہندستان کی تاریخ میں یہ زمانہ غیر معمولی اہمیت کا تھا۔ اس زمانے میں ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے ہندستان کی سرزمین میں مغلیہ حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور غیر شعوری طور سے ہندستان کا تخت وتاج مٹھی بھر سمندر پار کے بہادروں کے ہاتھوں میں رفتہ رفتہ چلا گیا۔ وزیر الممالک عماد الملک نے اپنی نااہلی اور خود غرضی کا ثبوت دیا کیوں کہ اس میں وطن پرستی اور آقا سے

1۔ خزانۂ عامرہ/ 87-86۔ سیر المتاخرین (ا۔ ت 3/ 52۔

وفاداری کا فقدان تھا۔ اور مرہٹوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ ان باتوں نے مغلیہ سلطنت کے گرتے ہوئے ڈھانچے کو منہدم کر دیا۔ علاوہ ازیں شاہی خزانہ بالکل خالی ہو گیا تھا۔ اور ملکی معاملات میں بادشاہ کی حیثیت صفر کے برابر رہ گئی تھی۔

مرہٹوں کی تلواروں کی حمایت سے عمادالملک نے نجیب الدولہ کو پست کر کے برطرف کروادیا تھا۔ اور اس کی جگہ حاصل کر لی تھی۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نجیب الدولہ ہی ایک ایسا واحد شخص تھا جو رعیت اور اسامیوں کی اطاعت حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ بدرجۂ مجبوری اسے اپنے علاقے میں جانا پڑا۔ اس کے جانے کے فوراً بعد ہی مرہٹے پنجاب کی طرف بڑھے، اور احمد شاہ ابدالی کے لڑکے اور اس کے سرداروں کو اس علاقے سے کھدیڑ دیا۔ اور خود قابض ہو گئے۔ (1758) اس کے بعد ولی عہد عالی گہر کی باری آئی۔ بہت دنوں سے عمادالملک شہزادہ کو اپنے قبضے میں کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ اور اس کی ستم ظریفیوں سے شہزادہ کا ناطقہ بند ہو گیا تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر مئی 1758 میں وہ دہلی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اور جلاوطنی کی حالت میں ہی اپنے تحفظ پر تکیہ کیا۔ عمادالملک کی ان احمقانہ باتوں کے سبب سے احمد شاہ ابدالی نے پھر ہندستان کے لیے کوچ کیا۔ اور اس بات کے لیے بہت دنوں تک ابدالی، مرہٹہ کشمکش چلتی رہی کہ شمالی ہندستان پر کس کا اقتدار قائم ہو۔ اور آخر کار پانی پت کی جنگ میں، جس کا پہلے حصہ میں ذکر آچکا ہے۔ عارضی فیصلہ ہو گیا۔ اور مرہٹوں کا قلع قمع ہو گیا۔ مگر بار بار ابدالی حملوں کی وجہ سے شاہانِ مغلیہ کا وقار گر گیا۔ ان کی کمزوری آشکارہ ہو گئی۔ ہندستان کے طاقتور امرا کی بے توجہی اور اقتدار حاصل کرنے کی باہمی کشمکش نے مرکزی حکومت کو اتنا موقع نہ دیا کہ وہ بنگال کے سیاسی انقلاب کی طرف توجہ کر سکتی۔ یہ وہ انقلاب تھا، جس میں انگریز تاجروں کو ''بادشاہ ساخت'' کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اور بعد میں سارے ہندستان میں ان کا طوطی بولنے لگا۔ ہمارے حکمراں طبقے کو جو آپسی جھگڑوں میں غرق تھے۔ اس بات کا احساس تک نہ ہوا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں کے سیاسی افعال دوررس نتائج سے پُر تھے۔ اور نہ انھیں اس بات کا خیال آیا کہ وہ رفتہ رفتہ اس ملک پر اپنا تسلط قائم بھی کر سکتے ہیں۔ حالانکہ وہ بظاہر تاجر ہی تھے۔ شجاع الدولہ، سورج مل جاٹ، عمادالملک، نجیب الدولہ، رگھوناتھ راؤ اور ملہار راؤ ہولکر، ان میں ہر ایک سیاسی بصیرت اور دوربینی سے عاری تھے، اور اپنے

ذاتی اور قبیلائی مفاد کو ملک کے مفاد کے لیے قربان نہیں کر سکتے تھے۔ اس وجہ سے بالعموم ملک میں اور بالخصوص بنگال میں وقوع پذیر رجحانات کی طرف متوجہ نہ ہو سکے جو ہندستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کے اضافہ کے پیش خیمہ تھے۔

مرہٹوں کی حمایت سے اقتدار حاصل کرنے اور نجیب الدولہ کی طرف سے نجات پانے کے بعد سازشی وزیر نے اپنے دوسرے دشمنوں کو پسپا کرنے اور انھیں موت کے گھاٹ اتارنے کا منصوبہ بنایا، معمولی درباریوں اور جاگیرداروں کو باآسانی مطیع کیا جا سکتا تھا۔ لیکن عمادالملک، شجاع الدولہ اور شہزادہ عالی گہر کو اپنی استبدادی حکومت کے لیے مستقبل میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا۔ چونکہ ایک حالیہ تجربے سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ شجاع الدولہ کے خلاف فوج کشی بے سود ہوگی۔ لہٰذا اس نے اسے بالکل بے سہارا کرنے اور اس کے حمایتیوں کا، چاہے وہ معمولی اور غیر معمولی امیر ہی کیوں نہ ہوں، قلع قمع کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ اس منصوبے کے تحت اس نے پہلے لطف اللہ بیگ اور مولوی قاسم کشمیری کو اس الزام میں گرفتار کروالیا کہ وہ شیر جنگ کے توسط سے شجاع الدولہ سے ساز باز رکھتے تھے۔ اور دہلی میں ایک انقلاب برپا کرنے کے درپے تھے۔ اس کے بعد عمادالملک نے شہزادہ کی طرف توجہ کی مگر شہزادہ نے فرار کی راہ لی[1] روہیلہ سرداروں کے علاقوں سے ہوتا ہوا وہ الہ آباد کے نائب صوبہ دار، محمد قلی خاں کی دعوت پر اس جانب روانہ ہوا۔ جب اس کا گزر لکھنؤ کے قریب سے ہوا اور وہ موہان میں خیمہ زن ہوا تو شجاع الدولہ خیر مقدم کے لیے آیا۔ ایک سو ایک اشرفی نذر میں پیش کیں اور مزید برآں ایک لاکھ روپے نقد، دو ہاتھی، پالکی، سات گھوڑے، ایک خوان جواہر، اسلحے، خیمے، ظروف اور چھکڑے برائے بار برداری پیش کیے۔ اس کے بعد عالی گہر نے خلوت میں نواب سے کچھ بات چیت کی اور الہ آباد کے لیے روانہ ہو گیا[2] اس کے بعد عالی گہر مشرقی صوبوں کی طرف چلا گیا۔

---

1. برائے تفصیل ملاحظہ ہو، تاریخ احمد شاہ/ 345-344، سیر المتاخرین (ا۔ت) 3/ 60-58، تاریخ مظفری 2/ 85 ب۔ 86 الف، میری کی آپ بیتی/ 117، خزانۂ عامرہ/ 92-90 تاریخ سعادت جاوید/ 345-344، جام جہاں نما/ 504۔

2. خزانۂ عامرہ/ 92، تاریخ راحت افزا/ 335-334، اخبار محبت/ 607-605، چہار گلزار شجاعی 220 الف سیر المتاخرین (ا۔ت) 37/ 60

الہ آباد پر شجاع الدولہ کا تسلط۔ 1759

شجاع الدولہ بہت دنوں سے صوبہ الہ آباد کے ہتھیانے کی تاک میں بیٹھا ہوا تھا۔ کیونکہ محمد قلی خاں، شجاع الدولہ کی طرف سے نائب صوبہ دار تو ضرور تھا۔ لیکن عماد الملک نے اپنی طرف سے اسے صوبہ دار مقرر کر رکھا تھا۔ علاوہ ازیں محمد قلی خاں بن مرزا محسن، برہان الملک سعادت خاں کا بھانجا تھا[1] اس لیے عوام میں اس کو کافی عزت حاصل تھی، محمد قلی خاں بہادر تو ضرور تھا، لیکن سیاسی بصیرت سے عاری تھا۔ جب شہزادہ عالی گہر الہٰ آباد پہنچا تو شجاع الدولہ نے محمد قلی خاں کی ہمت افزائی کی کہ وہ شہزادے کو مشرقی صوبوں کے فتح کرنے میں مدد کرے۔ لہٰذا وہ شہزادے کے ساتھ چلا گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر شجاع الدولہ نے الہ آباد پر قبضہ کر لیا[2] یہ خبر سن کر محمد قلی خاں برق رفتاری سے اس امید میں واپس آیا کہ شجاع الدولہ خاندانی رشتہ کا ضرور کچھ نہ کچھ خیال کرے گا۔ اور وہ صوبہ اس کے حوالے کر دے گا۔ مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ شجاع الدولہ نے اس کے آنے سے پہلے ہی بینی بہادر کو وہاں کا نائب صوبہ دار مقرر کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے ایک فوجی دستے کے ساتھ بنارس کے لیے رخصت کر دیا تھا، کہ اگر محمد قلی خاں واپس آئے تو اس کا مقابلہ کرے۔ جب محمد قلی خاں نواب کی خدمت میں پہنچا تو فریب دے کر اسے گرفتار کر لیا گیا اور جلال آباد کے قلعہ میں مقید کر دیا گیا۔ اس طرح صوبہ الہ آباد نواب کے قبضہ میں آ گیا۔ بعد میں محمد قلی خاں کو قتل کروا دیا گیا۔[3]

شمالی ہند میں مرہٹہ پالیسی 1759 - 1761

1761-1759 کے درمیان شمالی ہند کے بارے میں مرہٹوں کی پالیسی بہت ہی پر ہوس تھی۔ وہ ہندستان میں ہندو پت پادشاہی قائم کرنے کا خواب دیکھنے لگے تھے[4] 1752 میں احمد شاہ بادشاہ اور صفدر جنگ وزیر سے ایک مخصوص صلح نامہ کے ذریعہ انھوں نے ہندستان پر

1۔ سوانحات 1 / 21 خزانہ عامرہ میں عم زادہ لکھا ہے۔ ص 93۔

2۔ سیر المتاخرین (ا۔ت) 2 / 328-327، خزانہ عامرہ / 93۔

3۔ خزانہ عامرہ / 93، عماد / 69۔

4۔ تاریخ راحت افزا / 293۔

بیرونی حملہ آوروں سے دفاع کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی تھی۔[1] 1757 میں عماد الملک اور احمد خاں بنگش نے شجاع الدولہ کے خلاف محاذ بنایا تو شجاع الدولہ نے مرہٹوں سے استمداد کی درخواست کی۔ اور بادل نخواستہ انھیں بنارس اور اجودھیا کے علاقے دینا قبول کرلیا تھا۔ مگر اس نے قبضہ دینے میں پہلوتہی کی۔ 1759 میں مرہٹوں نے یہ تہیہ کرلیا کہ وہ سیاسی چالوں یا بصورت دیگرے فوجی طاقت کے ذریعہ بنارس اور الہ آباد پر قبضہ کریں گے۔ اس طرح وہ شجاع الدولہ کو اپنا مطیع بنانا چاہتے تھے۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے پہلے انھوں نے روہیلہ علاقوں پر قابض ہونے کے لیے اقدام اٹھائے۔[2]

سکرتال کا محاصرہ

پنجاب پر قابض ہونے کے بعد مرہٹوں نے نجیب الدولہ کی طرف رخ کیا۔ نجیب الدولہ نے سکرتال کے قلعہ میں پناہ لے لی۔ مرہٹوں نے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ اس نے متوقع مرہٹوں کے حملے کی اطلاع پہلے ہی شاہ ابدالی کو دے رکھی تھی۔ اس موقع پر نجیب الدولہ نے نواب شجاع الدولہ سے بھی مدد کی درخواست کی جس نے فوری مدد پہنچانے کا ارادہ کیا، مگر مرہٹوں سے جنگ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اور نہ ہی یہ بات اس کے مفاد میں تھی کہ نجیب الدولہ کا قلع قمع کردیا جائے۔ لہٰذا اس نے درمیان میں پڑ کر مصالحت کرادی۔ اور طے پایا کہ نجیب الدولہ 20 لاکھ روپے تاوان کے روپ میں ادا کرے۔ مگر یہ سمجھوتہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا کیوں کہ اسی اثنا میں شاہ ابدالی کی آمد کی خبر پھیل گئی، اور مرہٹوں نے محاصرہ اٹھالیا۔[3] اور شجاع الدولہ واپس چلا گیا۔

پہلے حصہ میں ہم تفصیل سے مرہٹوں کی شمالی ہند میں فتوحات کا ذکر کرچکے ہیں۔ لہٰذا یہاں صرف شجاع الدولہ کے سیاسی گٹھ جوڑوں کا مفصل ذکر کریں گے۔ اس زمانے کے حکمرانوں میں شجاع الدولہ کو ایک خاص حیثیت حاصل تھی۔ دوسرے مسلمان حکمرانوں، مثلاً نواب بنگال اور نجیب الدولہ کے

---

1. First Two Nawabs of Aoudh PP 200 -201

2. خزانہ عامرہ/87,88۔

3. کاشی راج/5 عماد/178-179۔

مقابلے میں وہ ایک وسیع، زرخیز اور گنجان علاقے کا حکمران تھا۔ اس کی فوج کا ملک کی عمدہ ترین افواج میں شمار ہوتا تھا۔ یہ فوج دو طاقتور عناصر پر مشتمل تھی۔ قزلباش، جن کی تعداد چھ سات ہزار تھی۔ اور ان میں سے اکثر ایک زمانہ میں نادر شاہ کی فوج میں ملازم رہ چکے تھے اور بعد میں صفدر جنگ کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ دوسرے ناگا گسائیں، ان کی تعداد دس ہزار تھی۔ یہ لوگ بڑے جری اور بہادر ہوتے تھے۔ ان کے سردار بالعموم فن ساحری سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ ان پر گولی اور توپوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ بلا کسی شک وشبہ کے اس کا توپخانہ ہندستان میں سب سے زیادہ عمدہ تھا۔ اس کے علاقے کے مالی وسائل زیادہ تھے۔ علاوہ ازیں سعادت خاں برہان الملک اور صفدر جنگ نے بھاری خزانہ ورثے میں چھوڑا تھا۔ شجاع الدولہ کے والد نے بحثیت وزیر الممالک پانچ سال تک ہندستان پر حکومت کی تھی۔ جس کی وجہ سے اودھ کے حکمران خاندان کا وقار بہت بڑھ گیا تھا۔ اس لیے متوقع جنگ کے موقع پر نواب اودھ ایک بیش بہا معاون ہو سکتا تھا۔ بشرطیکہ اس جنگ میں دل چسپی لینے کے لیے اسے تیار کر لیا جائے۔

مالوہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی بھاؤ نے گوبند بلال کے نام واضح احکام جاری کیے تھے۔ کہ جس طرح سے بھی ممکن ہو وہ شجاع الدولہ کو مرہٹوں کا ساتھ دینے کے لیے رضا مند کرے اور اگر وہ مرہٹوں کی طرف سے جنگ میں شرکت کرنے کے لیے کسی طرح راضی نہ ہو تو اس سے یہ وعدہ ضرور لے لیا جائے کہ وہ ہر طرح سے غیر جانب داری کا طرز عمل اختیار کرے گا۔ لیکن گوبند بلال اپنی کوششوں میں ناکام رہا۔ اور افغانوں نے شجاع الدولہ کو اپنی طرف ملا لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ ابدالی، علی گڑھ میں خیمہ زن تھا۔ اگر شجاع الدولہ پہلو تہی کرتا تو بہت ممکن تھا کہ شاہ ابدالی اس کی طاقت کو تہس نہس کر دیتا۔ 28 / اپریل 1760 کو پیشوا نے گوبند بلال کے توسط سے شجاع الدولہ کو یہ پیغام بھیجا کہ ان دونوں کے اغراض ومقاصد میں مماثلت پائی جاتی ہے، یعنی بیرونی لٹیرے حملہ آوروں اور دغاباز افغانوں سے، جو بدالیوں کی پشت پناہی، اور حمایت کر رہے تھے، ہندستان اور خاندان مغلیہ کا تحفظ کرنا، مزید برآں تواتر سے مرہٹہ اودھ کے حکمراں کے بہی خواہ اور حمایتی رہے ہیں۔ صفدر جنگ اور سندھیہ اور ہولکر کے آپس میں دوستانہ تعلقات رہے اور خود اس کے اور مرہٹوں کے بالخصوص ملہار راؤ ہولکر کے بڑے خوشگوار تعلقات

تھے۔اس کے علاوہ مرہٹوں نے شجاع الدولہ کو اس بات کا بھی یقین دلایا کہ مشترک دشمن پر فتح حاصل کرنے کے بعد مرہٹہ اور شجاع الدولہ دونوں مل کر ملک کا نظام چلائیں گے۔

اس کے برعکس شجاع الدولہ دونوں گروہوں کی کشمکش سے علاحدہ ہی رہنا چاہتا تھا۔اور کسی ایک گروہ کا ہم نوا نہیں ہونا چاہتا تھا[1] مگر کچھ دنوں کے بعد اس کا رجحان مرہٹوں کی طرف ہو گیا تھا۔اس نے بھاؤ کے خط کے جواب میں لکھا تھا کہ وہ اس کی کامیابی کا خواہش مند ہے۔اور مرہٹہ فوج سے وہ اس وقت آ کر مل جائے گا جب وہ اس کی سرحد کے قریب آ جائیں گی۔اس جواب سے خوش ہو کر بھاؤ نے شم جی رنگ ناتھ کو اپنا سفیر بنا کر نواب کی خدمت میں بھیجا تا کہ وہ مجوزہ اتحاد کی شرائط کے بارے میں مصالحت اور گفت وشنید کرے لیکن سفیر کے پہنچنے سے پہلے ہی نواب نے مرہٹوں سے اتحاد کرنے کی اپنی شرائط واضح کر دی تھیں۔وہ شرائط یہ تھیں۔" مجھے وزارت عطا کی جائے، اور شہزادہ عالی گہر کو شہنشاہ بنایا جائے۔اگر تم ان باتوں کا وعدہ حلفیہ تحریر میں بھیج دو تو میں تمھارے ساتھ مل جاؤں گا۔" اس میں قطعی شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ بھاؤ نے ان شرطوں کو منظور کر لیا ہوگا۔لیکن اس اثنا میں نجیب الدولہ اور جہاں خاں نے اپنی فوج کو اودھ کے سرحدی علاقوں کے قریب تک پہنچا دیا۔ اور حکمت عملی کے زور پر شجاع الدولہ کو تذبذب میں ڈال دیا اور اس وجہ سے مرہٹوں سے اتحاد کے بارے میں اس کے پیر ڈگمگا گئے۔دونوں گروہوں کو ناراض کرنے کے بجائے اس نے پھر غیر جانب داری کا اپنا پہلا راستہ اختیار کیا۔اور دونوں جانب کے سفیروں کی مسلسل گفت وشنید اور کھینچا تانی سے تنگ آ کر وہ اپنے مستقر فیض آباد سے نکل کر پٹنہ کی جانب روانہ ہو گیا۔اور اس نے یہ افواہ پھیلا دی کہ وہ شاہ عالم ثانی کے ساتھ شامل ہونے جا رہا ہے۔مگر اس خیال سے کہ اس کے صوبے کی مغربی سرحد پر افغانی فوج موجود تھی۔اور اس کا علاقہ خطرے سے بری نہ تھا، وہ لکھنؤ واپس چلا آیا، اور وہاں سے قنوج کے لیے کوچ کر دیا تا کہ وہ اپنے حدود کے نزدیک رہ کر افغانوں کی کاروائیوں سے باخبر رہے۔ان تمام باتوں سے بھاؤ کو بے حد پریشانی لاحق ہوئی۔لہٰذا ایک مرتبہ پھر اس نے اپنے پرانے وعدوں کو دہرایا۔اور شجاع الدولہ سے گزارش کی کہ وہ غیر جانب دارانہ طرز عمل اختیار کرے، مگر نواب افغان سفیروں کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔بھاؤ نے شجاع الدولہ کی والدہ کی

---

[1] کاشی راج/5، عماد/179-178۔

وساطت سے اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش بھی بارآور ثابت نہ ہوئی[1]

دوسری طرف احمد شاہ ابدالی نے بھی وہی سبز باغ دکھائے جو بھاؤ نے شجاع الدولہ کو دکھائے تھے۔ شاہ ابدالی نے اعلان کیا کہ اس کا مقصد شجاع الدولہ کو وزیر الممالک مقرر کرنا اور شاہ عالم ثانی کی قیادت میں مغلیہ سلطنت کو ایک نئی زندگی عطا کرنا ہے۔ لیکن ابھی تک نواب مرہٹوں سے مصالحت کرنے کی طرف مائل تھا۔ لہٰذا شاہ ابدالی نے محمد شاہ بادشاہ کی بیوہ ملکۂ زمانی کو اس کام کے لیے لکھنؤ روانہ کیا کہ وہ جا کر نواب پر دباؤ ڈالے کہ وہ افغانوں کی طرف راغب ہو جائے۔ اس وسیلے کا بھی جب خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تو شاہ ابدالی نے اس اہم سیاسی حکمت عملی کے کام کے لیے بذات خود نجیب الدولہ کو بھیجا[2]

وزارت شجاع الدولہ کے لیے اور تخت شاہ عالم ثانی کے نام کا صلح نامہ لے کر، جس پر شاہ ابدالی اور اس کے وزیر کی مہریں ثبت تھیں، نجیب الدولہ مہدی گھاٹ کے لیے روانہ ہوا۔ جہاں اس زمانے میں نواب خیمہ زن تھا، نواب نے نجیب الدولہ کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ جب دونوں میں کام کی بات شروع ہوئی تو نجیب الدولہ نے شاہ ابدالی کا پیغام اور صلح نامہ نواب کی خدمت میں پیش کیا اس کے بعد نواب نے اپنے مہمان کو ان شرطوں سے آگاہ کیا جو مرہٹوں نے اس کی خدمت میں پیش کی تھیں۔ اور بھاؤ کا اصلی خط بھی دکھادیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس نے غیر جانب دار رہنے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی کہا کہ مرہٹے اس سے اس بات سے زیادہ کسی اور بات کی توقع نہیں رکھتے۔ اور جنگ میں فتح کے بعد بھی وہ اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھیں گے۔ ایک سفیر کی حکمت عملی کو کام میں لاتے ہوئے نجیب الدولہ نے بھاؤ کے خط کو دھوکے کا ایک جال بتایا۔ اور اس نے کہا کہ مرہٹوں کا واحد مقصد سارے ہندستان کو اپنا مطیع بنانا ہے۔ اور بھاؤ مسلمانوں سے بہت سخت دشمنی رکھتا ہے اور جب بھی اسے طاقت حاصل ہو جائے گی تو بلا استثنا کوئی بھی مسلمان اس کے پنجے سے بچ کر نکل نہ سکے گا۔ اور آخر میں نجیب الدولہ نے اپنا آخری وار کیا۔ اور کہا یہ جنگ نہ تو ایک بیرونی حملہ آور اور ہندستان کے سرداروں کے مابین ہے

---

1. عماد/79، شجاع الدولہ کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش میں مرہٹوں کی ناکامی کے اسباب دیکھیے۔ خزانہ عامرہ/105۔

2. خزانہ عامرہ 891، کاشی راج (انگریزی) ص 7۔

اور نہ افغانوں اور غیر افغانوں کے درمیان جیسا کہ بھاؤ کا بیان ہے بلکہ دراصل یہ "کفر اور اسلام" کی جنگ ہے۔ یہ ایک جہاد ہے۔ اس جنگ میں شرکت کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اور بالخصوص نواب شجاع الدولہ جیسے ذی وقار امیر کے لیے جسے ایک بڑی عظمت کا مقام حاصل ہے۔ اس وعظ کو سن کر نواب کے مذہبی جذبات بھڑک اٹھے۔ اور اس نے کہا "خدا کی قسم یہ ہزار درجہ بہتر ہے کہ مرہٹوں کے خلاف جنگ کی جائے اور جام شہادت نوش کیا جائے۔" لیکن پھر بھی کچھ وجوہ کی بنا پر وہ غیر جانب دار رہنا پسند کرے گا۔ کیوں کہ وہ ایک ہندستانی تھا۔ اس کا تعلق شیعہ عقائد سے تھا۔ لہٰذا شاہ ابدالی اور اس کے افسروں کے ساتھ اس کا نبھاؤ نہ ہو سکے گا۔ کیوں کہ وہ بیرونی ممالک کے تھے اور سنی تھے۔ اس کے علاوہ اسے اس بات کا بھی خوف تھا کہ شاہ ابدالی اب بھی اس کے خلاف بغض اور انتقام لینے کے جذبات رکھتا ہوگا کیونکہ اس کے والد نے منوپور کے مقام پر 1748 میں اسے شکست فاش دی تھی مجملاً طویل گفت شنید کے بعد نواب نے حلفیہ وعدہ کیا کہ وہ شاہ ابدالی کا ساتھ دے گا۔[1] اس کے بعد بھی مرہٹوں نے نواب کو اپنا حمایتی بنانے کی بار بار بے سود کوششیں کیں۔

اپنے مشن میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کرنے کے بعد نجیب الدولہ واپس آیا، شاہ ابدالی نے شجاع الدولہ کے لیے خلعت اور وزیر الممالک کے عہدے پر تقرری کا فرمان بھیجا۔ اس کے بعد نواب شجاع الدولہ نے اپنے خاندان کے افراد کو لکھنؤ کے لیے روانہ کیا۔ اپنے بیٹے مرزا امانی کو راجہ بینی بہادر کی نگرانی میں اپنے صوبوں کا ناظم مقرر کیا۔ ایک بھاری فوج کے ساتھ[2] شاہ ابدالی کے پڑاؤ میں شامل ہونے کے لیے 18 / جولائی 1760 کو کوچ کیا۔ نواب کی آمد کی خبر پا کر ابدالی

---

1 برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ شاہ نامہ منور کلام (قلمی رام پور) ص 351، کاشی راج / 11-10، سیر المتاخرین (ا۔ت) 3 / 65، عماد / 80-79 مراسلات نجیب الدولہ نقل خط شجاع الدولہ بنام سورج مل جاٹ۔

"چوں نظر آمد آمد بھاؤ سردار دکن ہست مجموعی قرار یافتہ وہمہ سرداران برفاقت بادشاہ عہد موافقت بستند و برائی مقابلہ بھاؤ یک دل و یک جہت گشتند، چوں آمدن بھاؤ موجب اختلال ہندستان و دفع این فساد کشور آشوب بدوں اتفاق و موافقت ہر رئیس و نامدار صورت نمی بندد و نہر کسے کہ از رفاقت ہمدیگر پہلو تہی خواہند کرد ہدف تیر ملامت خواہد گردید لہٰذا بقلم می آید کہ ازاں مہربانی کہ بفضل الٰہی رئیس عمدہ ہندستان داند مصلحت کار چہ اندیشیدند" ص 3 ب۔ 4 ب

2 چہار گلزار شجاعی / 220 ب، تاریخ مرہٹہ و ابدالی / 25، سیر المتاخرین 3 / 65۔

وزیر، شاہ ولی اللہ خان نے کچھ منزلوں آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ اور بڑی عزت کے ساتھ شاہی خیموں میں لایا۔ شاہ ابدالی بھی بڑی گرم جوشی سے نواب سے ملے [1]

شجاع الدولہ نے صلح کی کوشش کی

جب بھاؤ کو خبر ملی کہ نواب افغانوں سے مل گیا ہے، تو وہ بے حد پریشان ہوا۔ اور اس نے نواب کے دربار میں مقیم اپنے سفیر بھوانی شنکر کو پھر لکھا کہ وہ نواب کی خدمت میں حاضر ہو کر بھاؤ کا خط پیش کرے۔ اس خط میں بھاؤ نے نواب سے اس بات کی شکایت کی تھی کہ وہ حملہ آور افغانوں کے ساتھ شریک ہو گیا۔ اور اس سے درخواست کی کہ وہ مرہٹوں کا ساتھ دے۔ اس خط و کتابت سے فائدہ اٹھا کر نواب نے خفیہ طور سے جھگڑے کو رفع دفع کرانے اور مصالحت کرانے کی کوشش کی۔ اس نے بھاؤ کو لکھا کہ صلح کرنا زیادہ سود مند ثابت ہوگا۔ کیوں کہ ہندستان کے تمام ہندو اور مسلمان امیر شاہ ابدالی کے ہم نوا ہو چکے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ اس جنگ نے مذہبی رنگ بھی اختیار کر لیا ہے۔ نواب نے بھاؤ کو اپنی دوستی کا یقین بھی دلایا۔ اور اس نے کہا کہ افغانوں کے خیموں میں اس کی موجودگی مرہٹوں کے مفاد میں تھی۔ کیونکہ صلح کے لیے ابھی دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اور صلح کرانے کی وہ حتی الامکان کوشش کرے گا [2] نواب نے راجہ دیبی دت اور کاشی راج کا صلح کی شرائط کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے مرہٹوں کے پاس بھیجا [3] بھاؤ نے اس بات پر رضا مندی ظاہر کی کہ وہ پنجاب کے کل علاقوں میں سے سرہند تک کا علاقہ افغانوں کے لیے چھوڑ دے گا [4] لیکن ہندستان کے افغانوں اور مرہٹوں کے تعلقات کا مسئلہ بہت نازک صورت اختیار کر چکا تھا۔ اور اس سلسلے میں کسی قسم کی مصالحت ناممکن تھی۔ اس کے برعکس عماد الملک اور سورج مل جاٹ ان شرائط کے حق میں نہ تھے۔ کیوں کہ سورج مل جاٹ عماد الملک کا حامی تھا۔ اور چاہتا تھا کہ وزارت کا عہدہ عماد الملک کے ہی پاس رہے۔ ناراض ہو کر یہ دونوں مرہٹوں کا ساتھ چھوڑ کر نکل آئے۔

---

1. خزانۂ عامرہ/ 89۔

2. کاشی راج/ 13، عماد/ 185-184۔

3. خزانۂ عامرہ/ 105 کاشی راج/ 15، عماد/ 185۔

4. کاشی راج/ 16-15، عماد/ 185

بذات خود نجیب الدولہ بھی صلح کے حق میں نہ تھا۔ اور ہر قسم کی رکاوٹیں ڈال رہا تھا[1] اپنی گزشتہ کامیابیوں کی وجہ سے بھاؤ بھی صلح کا زیادہ خواہش مند نہ تھا۔

اس اثنا میں شاہ ابدالی نے نواب سے مالی امداد کی درخواست کی۔ اس نے کہا کہ ”تم صاحب اقتدار امیر ہو۔ تمھارے قبضے میں دو کروڑ روپے سالانہ کی آمدنی کا علاقہ ہے۔ میں اپنے سپاہیوں کی بقایا تنخواہوں کی وجہ سے بے حد مالی مصائب میں گرفتار ہوں۔ اس رقم کا کچھ انتظام کرو۔“ شجاع الدولہ نے شاہ ابدالی کے وزیر شاہ ولی خاں سے مل کر اس مسئلے کو طے کرالیا اور اس سے زبردستی کوئی رقم وصول نہ کی گئی۔

دہلی کے قلعہ پر قابض ہونے کے بعد بھاؤ نے مرزا جوان بخت بن عالی گہر (شاہ عالم ثانی) کو تخت پر بٹھایا اور غائبانہ شجاع الدولہ کو وزیر الممالک مقرر کر دیا۔ اس تقرر کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما تھا کہ شجاع الدولہ عہدے کی لالچ میں ابدالیوں کا ساتھ چھوڑ دے گا[2] میدان جنگ میں پہنچنے کے بعد ایک بار پھر بھاؤ نے شجاع الدولہ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی اور تحفے تحائف بھیجے۔ نواب نے ایک بار پھر مصالحت کی کوشش کی لیکن نجیب الدولہ نے اس بات کی سخت مخالفت کی اور شاہ ابدالی کو اپنا ہم خیال بنالیا[3] اس کے بعد شجاع الدولہ کی کوشش ناکام رہی[4]

پانی پت کی جنگ اور اس کے نتائج کا پہلے مفصل ذکر کیا جا چکا ہے۔ مجملاً اس جنگ میں مرہٹوں کا قلع قمع ہوگیا۔ اس موقع پر بھی شجاع الدولہ نے مرہٹوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور مرہٹہ سرداروں کی نعشوں کو بے حرمتی سے بچانے کی کوشش کی۔ اور وسواس راؤ کی نعش دو ہزار روپے دے کر برخوردار خاں سے حاصل کر لی۔ لیکن شاہ ابدالی نے اس نعش کو ملاحظہ کے لیے منگوالیا[5] یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ شجاع الدولہ نے شکست خوردہ ابراہیم خاں گردی

---

1. کاشی راج/15-14۔
2. خزانہ عامرہ/106، سیر المتاخرین 3/67۔
3. سرگزشت نجیب الدولہ۔ عماد/193-192۔
4. عماد/190،194۔
5. عماد/201-202۔

کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی تھی۔ اور بعد میں شاہ ابدالی کی خدمت میں اسے پیش کرنا پڑا۔[1]

اس فتح کے بعد فاتحین کا قافلہ دہلی آیا۔ شاہ ابدالی نے شاہ عالم کی غیر موجودگی میں مرزا جواں بخت کو اس کا نائب مقرر کیا۔ شجاع الدولہ کو وزیر اور نجیب الدولہ کو امیر الامرا کے عہدے عطا کیے اور اول الذکر کو خلاع فاخرہ، مع اسپ دیراق خاصہ لطف فرما کر اودھ کے لیے رخصت کیا۔[2]

لکھنؤ پہنچنے کے بعد شجاع الدولہ نے بنارس کے لیے کوچ کیا۔ کیونکہ ان دنوں شاہ عالم سید نور نامی مقام پر خیمہ زن تھا۔ نواب نے شرف قدم بوسی حاصل کیا۔[3] وہاں سے کوچ کر کے جاجو پہنچا اور اس جوار سے مرہٹہ گماشتوں کو مار بھگایا۔ جنھوں نے اس کی غیر موجودگی میں ان علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔[4] پھر وہ کالپی کی طرف گیا۔ اور وہاں سے جھانسی کے اطراف کے مرہٹوں کی سرکوبی کے لیے پہنچا۔ شاہ عالم نے نواب کو ہفت پارچہ خلعت مع چارقب اور مالاے مرواریداور قلم دان مرصع عطا کیا۔ اسی زمانے میں نواب نے مرزا امانی کو دیوان خاص کا داروغہ مقرر کیا۔[5]

انگریزوں سے تصادم

پہلے یہ لکھا جا چکا ہے کہ میر قاسم نے انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لیے شاہ عالم ثانی اور نواب شجاع الدولہ کو اپنا حمایتی بنالیا تھا۔ اور بکسر کے میدان میں ان تینوں نے انگریزوں کے ہاتھوں بری طرح شکست کھائی تھی۔ ایک صلح نامہ کے تحت انگریزوں نے صوبہ الہ آباد شجاع الدولہ سے لے کر شاہ عالم ثانی کو دے دیا۔ اور اپنا ایک نمائندہ نواب کے دربار میں مقرر کر دیا۔[6] شجاع الدولہ بدستور وزیر الممالک کے عہدے پر برقرار رہا۔

شجاع الدولہ اور روہیلہ سردار

انگریزوں اور نواب شجاع الدولہ کے مابین صلح نامہ میں یہ بھی طے ہوا تھا کہ فریقین

---

1. عماد/200-201۔

2. عماد/204، 83-84، 70-71۔ خزانہ عامرہ/90۔

3. خزانہ عامرہ میں سید پور لکھا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ بادشاہ سے خلعت وزارت حاصل کرے۔ ص90۔

4. خزانہ عامرہ/96۔ .... 5. خزانہ عامرہ/97۔

6. چہار گلزار شجاعی/220ب۔221الف، سیر المتاخرین (ا۔ت) 3/83، سوانحات 1/74-77۔

لڑائی کے موقع پر ایک دوسرے کے معاون اور مددگار بھی ہوں گے۔ اس حقیقت کا مجملاً پہلے ذکر آچکا ہے کہ روہیلہ اور اودھ کے حکمران خانوادوں میں سیاسی رقابت بہت پرانی تھی اور صفدر جنگ نے روہیلوں کے قلع قمع کرنے کی غرض سے محمد شاہ کو اکسا کر بن گڑھ پر حملہ بھی کروایا تھا۔[1]

شجاع الدولہ نے حالانکہ وقتاً فوقتاً روہیلوں کی مدد بھی کی تھی۔ لیکن اس فعل کے پیچھے روہیلوں سے ہمدردی کا جذبہ کم اور اپنے علاقوں کے تحفظ کا جذبہ زیادہ کارفرما تھا۔ شجاع الدولہ ان کے وجود سے فائدہ اٹھا کر مرہٹوں کو اپنے علاقے میں داخل ہونے سے باز رکھنا چاہتا تھا۔ اب چونکہ مرہٹوں کی طاقت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ لہٰذا اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں کی استمداد سے ان کا نام ونشاں صفحۂ ہستی سے مٹانے کا منصوبہ بنایا۔ اس حملے کے جواز کے وجوہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن مقصد[2] روہیلوں کو نیست ونابود کرنا ہی تھا۔ میر نے ان واقعات کو اس طرح بیان کیا ہے۔

وزیراعظم امیر معظم، شجاع الدولہ جو بہت زور آور تھا، حافظ رحمت خاں روہیلہ سے جنگ کرنے نکلا۔ ان دونوں کی آپس میں بہت کٹی چھنی تھی، حریف (حافظ رحمت خاں) نے ازراہِ بداندیشی انگریزوں کو لکھ بھیجا کہ "وزیر (شجاع الدولہ) جو اتنی فوج اکٹھا کر رہا ہے وہ تمھاری پرخاش میں ہے"۔ چنانچہ گورنر بہادر مقابلے کے لیے نکل آیا۔ نواب وزیر جو اس بالادست قوم (انگریز) سے بہت ہی رعایت اور لحاظ کرتا تھا۔ ان کے پاس اکیلا گیا۔ اور کہا" میں تمھارا پاس کرتا ہوں اور کسی سے اپنی بات نیچی نہ کروں گا۔ اس میں جو کچھ ہونا ہے ہو رہے! چاہے مجھے اپنے ساتھ کلکتے لے جاؤ یا ملک کو میرے اوپر چھوڑ دو۔ انگریزوں نے وزیر کے سلوک پر نظر کر کے سب چیزوں سے ہاتھ اٹھالیا۔ کڑا اور الہ آباد بھی اس کے حوالے کر دیے اور چلے گئے۔ جب آسمان نے نیا شگوفہ کھلایا اور زمانہ ہی نیا انقلاب لایا۔"

23 اپریل 1774 کو کٹرہ میران پور میں روہیلوں اور شجاع الدولہ کے درمیان جنگ ہوئی۔

---

1. خزانۂ عامرہ/79.85 نیز دیکھیے سفرنامہ آنندرام مخلص۔

2. چہار گلزار شجاعی/ 221 الف، 212 الف۔ 13 ب جارج فارسٹر 1 /ص 205-199۔

روہیلہ مغلوب ہوئے، اور حافظ رحمت خاں نے شہادت پائی [1] اس جنگ کے بارے میں میر نے لکھا ہے:

"صاحب زادہ آصف الدولہ بہادر جواب وزیر اعظم ہیں، جنگ کے میدان میں بڑی سرگرمی سے لڑے، جدھر کا رخ کرتے دھواں سا اڑا دیتے اور توپ خانے کی زنجیر کو تلوار سے کاٹ دیتے۔ جب جنگ اپنے شباب پر آئی تو حریف کی ساری اکڑ فوں ہوا ہو گئی۔ (اِدھر سے) اتنے گولے برسائے گئے کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے جب زمین (رحمت خاں) پر تنگ ہو گئی اور اس نے دیکھا کہ نہ بھاگنے کا راستہ ہے، نہ نکلنے کا موقع تو دل کڑا کر کے میدان میں جم گیا اور دنیا سے دل ہٹا کر جان پر کھیل گیا۔ ایک ہی حلے میں روہیلوں کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ جانوں پر بن گئی۔ بڑے بڑے دلاوروں کے پتے پانی ہو گئے۔ ایک گولہ اس کے (حافظ رحمت) کے سینے میں لگا۔ صفیں درہم برہم ہو گئیں اور دشمن کا سر گیند کی طرح لڑھک گیا..... جب یقین ہو گیا کہ وہ (حافظ رحمت) مارا گیا تو وزیر نے اس فتح کے شکرانے میں سجدہ کیا۔ حریف کا لشکر لٹ گیا۔ بہت سے سردار قید کر لیے گئے اور اس کا سارا ملک وزیر (شجاع الدولہ) کے قبضے میں آ گیا۔" [2]

شجاع الدولہ کو روہیلوں کو نیست و نابود کرنے میں کامیابی تو ضرور حاصل ہو گئی۔ لیکن اسلام کو کاری ضرب لگی۔ شیو پرشاد نے تاریخ فرح بخش میں لکھا ہے کہ مسجدوں، مدرسوں، خانقاہوں، اور

1 "اخراجِ روہیلہ آباد ہمایوں" سے حافظ رحمت خاں کی تاریخ شہادت نکلتی ہے۔ تحریر 2/3/(68) ص 115 محبت خاں محبت نے اس واقعہ پر ایک مرثیہ لکھا تھا۔ تذکرہ طبقات الشعرا/453-452۔

2 میر کی آپ بیتی/174-173، نیز ملاحظہ ہو۔ چہار گلزار شجاعی/189 الف۔ 216 ب گلستان رحمت، تاریخ مظفری 2/197 الف۔200 الف، جارج فارسٹر 2/203، 112،202۔ مفتاح التواریخ 3541۔

مقبروں میں تلنگے گوبر سے چوکا لگاتے اور کھانا پکاتے تھے۔نواب علی محمد خان نے آنولہ شہر کو بڑی ترقی دی تھی۔وہاں مسلمان آباد کیے تھے۔اس عہد میں وہ شہر دارالاسلام تھا۔قلعہ اور مسجدیں تعمیر کی گئی تھیں۔اس فتح کے بعد وہ شہر تباہ و برباد ہو گیا۔اخوان محمد رحیم خاں کی مسجد میں رنڈیاں اور فاحشہ عورتیں رہنے لگیں، اور ان میں بیٹھ کر اعلانیہ کسب کراتیں۔[1]

شجاع الدولہ کی وفات

نواب شجاع الدولہ نے 23/ذی قعدہ 1188 بروز پنج شنبہ کو چار گھڑی رات گئے وفات پائی[2] اور گلاب باڑی میں دفن کیا گیا۔لیکن ہم عصر مورخوں میں اس کی وفات کے وجوہ کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے، میر نے تو صرف اتنا ہی لکھا ہے۔

> ''اس فتح عظیم کے بعد وزیر اعظم امیر معظم نواب شجاع الدولہ بڑی شان و شوکت سے اپنے صوبے میں داخل ہوا۔لیکن آسمان کی نظر تو اہل دنیا کی خرابی پر لگی رہتی ہے۔اس انبوہ پُر شکوہ کو بھی نظر کھا گئی۔یعنی وہ بہادر اور لائق وزیر آب و ہوا کہ تبدیلی سے ایسا بیمار پڑا کہ مرض کا تدارک مشکل ہو گیا۔بہت سے طبیبوں اور فرنگیوں نے معالجے میں کوشش کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔وزیر نے جب دیکھا کہ بیماری بڑھتی ہی جارہی ہے تو از راہ دانش مندی اپنے خلف الصدق نواب آصف الدولہ کو مسند وزارت پر بٹھادیا ... پھر اس دنیا سے کنارہ کر گئے۔''[3]

اس کے برعکس طباطبائی کا بیان ہے کہ ''ہندستان میں جسے خیارک کہتے

---

1 ماخوذ از تاریخ اودھ 2/ 270-271۔

2 چہار گلزار شجاعی/ 217 الف، سیر المتاخرین (ـ ت) 3/ میں 22 ذی قعدہ لکھا ہے۔ص 79، عماد میں 24 ذی قعدہ، 1188ھ لکھا ہے ص 119 مفتاح التواریخ میں 24 ذی قعدہ/ 29 جنوری لکھا ہے ص 54، تفضیح الغافلین۔ ص 13 تاریخ مظفری 22 ذی قعدہ 11 /ص 200 الف

3 میر کی آپ بیتی/ 175-174۔

> ہیں، ایک پھوڑا نمودار ہوا۔ مگر چنداں اس طرف توجہ نہ ہوئی کیوں کہ یہ امید مضبوط تھی کہ ایسے پھوڑے پھنسیوں سے جان جانے کا خوف نہیں ہے۔ ہندستان اور ولایتی جراح وغیرہ دوا معالجہ کرتے رہے مگر موثر نہ ہوا۔ آہستہ آہستہ مادہ نے وسعت پکڑ کے سرطانی حیثیت قائم کی۔ اس وقت ایک طرح کی تشویش اور تردد کا مقام ہوا تعجب انگیز تو یہ روید اد ہے کہ اس پھوڑے کے زخم کا اشتہار عموماً اس مضمون سے مشتہر ہوا کہ شجاع الدولہ نے حافظ رحمت خاں کی بیٹی سے خیال وصال کیا اور اسے خلوت میں طلب فرمایا۔ وہ بے چاری فرطِ غیرت اور کثرتِ جہالت سے جو عام عورات مخصوص پٹھانوں میں ہوتی ہے، ایک چاقو پوشیدہ اپنے ہمراہ لیتی گئی اور بروقت کشفِ پردہ کے اسی چاقو کو شجاع الدولہ کی ران میں مارا۔ اور وہ چاقو زہر سے بجھا ہوا تھا۔ اس وجہ سے زخم کا اندمال نہ ہوتا تھا۔ باوجودیکہ شہرت محض غلط اور افترا ہے۔ مگر ہنوز عموماً لوگوں میں زبان زد ہے،[1]

ہرچرن داس نے بھی شجاع الدولہ کی موت کو سبب خیارک کا عارضہ ہی لکھا ہے[2]، میر نے اصلی واقعہ بیان کرنے کے بجائے صرف تبدیلی آب و ہوا سے بیمار پڑنے کا ذکر کیا ہے۔ میر نے

1 سیر المتاخرین (ا۔ت) 3 / 96، غلام علی نقوی نے شجاع الدولہ کی رحلت کرنے کا ذکر کرتے ہوئے ابتدا ہی میں لکھ دیا ہے۔ ''ازیں جا گوش باید کرد کہ تنوع اقوال و اختلاف روایات در وجہ بیماری نواب سپہر جناب بسیار است لاکن ایں ہمہ بعضے بقرائن عقل و بعضے بعدم وثوق رواتش قابل ذکر نیست، آں چہ بتواتر رسیدہ ایں است کہ خیارک برآوردہ بود'' برائے تفصیل ملاحظہ ہو، عماد/ 119-118 ' آشوب ''بعلت ناسوری کہ در رانش افتادہ بود'' 1 / ص 13 الف تاریخ مظفری 2 / از عارضہ خیارک'' ص 200 الف تاریخ اودھ 2 / ص 295 .290 .265 .262 ۔ تاریخ سعادت جاوید/ 371 ۔ تاریخ فرح بخش (رام پور) ''بعارضہ دنبل۔'' 111 ب، 112 ب، 125 الف، 126 الف۔

2 برائے تفصیل دیکھیے۔ چہار گلزار شجاعی/ 216 ب۔ 219 الف۔

اصل واقعہ بیان کرنے سے اس لیے گریز کیا ہوگا کہ وہ نواب آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ تھا۔اوراس نے اپنی کتاب ''ذکرمیر'' عہد آصفی ہی میں مکمل کی تھی۔اسی طرح ہرچرن داس بھی نواب شجاع الدولہ کے ہاں ملازم تھا۔اوراس کا خاندان نوابان اودھ کانمک خوار تھا۔اس بناپراس نے اس بات کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا جوعوام میں زبان زدتھی[1]۔طباطبائی نے اس واقعہ کاذکرتو ضرورکیامگراس بات کوغلط بتایا،کہ اس نے حافظ رحمت خاں کی بیٹی سے بدفعلی کاارادہ کیاتھا۔لیکن غورطلب یہ بات ہے کہ اگر یہ بات غلط تھی توزبان زدعام کیوں کرہوئی۔اس واقعہ کی کچھ نہ کچھ صداقت ضرورہوگی۔

ہم عصر کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب جنسی تلذات سے بے حد دلچسپی رکھتا تھا۔اس کے حرم میں آٹھ ہزارمنکوحہ اورغیرمنکوحہ عورتیں تھیں[2]۔ایسی صورت میں اس بات کاقوی امکان ہے کہ اس نے حافظ رحمت خان کی بیٹی سے خلوت کی خواہش کی ہوگی۔اورزبان زدواقعہ غالباًعمل میں آیاہوگا۔

شجاع الدولہ کی وفات پرمیرحسن دہلوی نے یہ قطعہ کہاتھا۔

جس روز کہ تو جہاں فانی سے گیا　　دل سب کا نشاط وکامرانی سے گیا
کیا زیست کا لطف اب شجاع الدولہ　　تجھ بن تو مزا ہی زندگانی سے گیا

1۔ برائے تفصیل دیکھیے،چہارگلزارشجاعی/3الف۔7ب۔

2۔ برائے تفصیل دیکھیے۔چہارگلزارشجاعی/221ب۔222 الف،نیزدیکھیے۔

George Forster, Travels in India, 1,PP.213-214, Dow, History of Hindostan. 11, PP. 399/9 5 Memoirs of Delhi and Faizabad, 11,121.

نوابُ آصِف الدولہ

ولادت

نواب شجاع الدولہ کی بیگم امۃ الزہرا بیگم المخاطب بہ جناب عالیہ بہو بیگم کے بطن سے صرف ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔ جس کا نام مرزا یحییٰ خاں اور عرفیت مرزا امانی تھی۔ مسند نشینی کے بعد اس نے آصف الدولہ لقب اختیار کیا۔[1] مرزا امانی کی ولادت 1161ھ/1748 یا 1162ھ/1749 میں ہوئی تھی۔[2] صاحبزادگی کے زمانے میں شاہ عالم ثانی نے اسے میر آتش اور داروغۂ غسل خانہ کا عہدہ عطا کیا تھا۔[3] 1199ھ/1784 میں ختنے کی رسم ادا ہوئی۔[4] اس وقت مرزا امانی کی عمر پینتیس یا چھتیس سال کی تھی۔

تعلیم وتربیت

عام دستور کے برعکس سولہ یا سترہ سال کی عمر میں بسم اللہ خوانی کی رسم ادا کی گئی۔[5] اس کی تعلیم کے لیے ادیب اور خوش نویس مقرر ہوئے۔ سید شرف الدین محمد شاہی کو اتالیق مقرر کیا گیا۔ لیکن ایام

1. تفضیح الغافلین/5، سوانحات 1/ص2۔
2. تاریخ اودھ 3/1۔
3. تاریخ اودھ 3/1۔ تاریخ اودھ 2/63۔
4. تحریر 2 شمارہ 3/1968 ص113 ''زیب برسنت خلیل فزود'' سے تاریخ نکلتی ہے۔
5. ایضاً/113 گفتن اقرا باسم ربک، سالش بداں 1177ھ تاریخ بسم اللہ خوانی سے نکلتی ہے۔

طفلی سے ہی تحصیل علم کی طرف مرزا امانی کی رغبت نہ تھی۔ لہٰذا کچھ زمانے کی لا حاصل محنت اور مشقت کے بعد اتالیق برطرف کر دیے گئے[1] آصف الدولہ خط شکستہ خوب لکھتے تھے اور علامہ تفضل حسین خاں سے تربیت پائی تھی[2]

شادی

نواب شجاع الدولہ نے بڑے طمطراق سے مرزا امانی کی شادی انتظام الدولہ کی بیٹی سے کی۔ اس وقت نوشہ کی عمر 23 سال کی تھی۔[3] شعر و دِ نور قمری آفتاب، باید گفت، سے تاریخ شادی (1184ھ) نکلتی ہے[4]

ابتدائی زندگی اور طبعی رجحانات

سنِ بلوغ سے ہی مرزا امانی کا رجحان لہو ولعب کی طرف مائل تھا۔ اور ادنیٰ، نا اہلوں، احمقوں اور شہداؤں کی صحبت کی طرف رغبت تھی۔ محل و بے محل ہنسنا، دوسروں کو فحش گالی دینا، اور اس کے جواب میں ترکی بترکی گندی گالی کا طالب ہونا، ان کی فطرت کا خاصہ تھا۔ بے کار اور بے معنی مشغلوں سے دل چسپی تھی۔ اور بدزبان لوگوں کی صحبت میں بہت خوش ہوتے تھے۔ جس محفل میں جتنی زیادہ فحش آمیز گفتگو ہوتی، اتنا ہی وہ زیادہ محظوظ ہوتے۔ علم سے عاری مگر تیر اندازی اور بندوق زنی میں عمدہ مہارت رکھتے تھے۔ اپنی طبیعت پر قابو نہیں تھا۔ اپنے عزیز دوستوں کے ساتھ بھی بے رخی، بدکلامی، اور بدتمیزی سے پیش آتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی ان کی کسی بات پر معترض ہوتا یا ان کے رجحانات کے برعکس کوئی مشورہ دیتا، اس موقع پر ان پر جذبات کا بے حد غلبہ ہو جاتا۔ اور طیش میں آ کر اس شخص کو اپنی محفل سے باہر نکلوا دیتے اور دوستی طاق پر رکھ دیتے تھے[5]

---

1. تاریخ اودھ 3 / 3۔

2. عماد/103۔

3. برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ چہار گلزار شجاعی/199 الف و ب، تاریخ فرح بخش 11/ص 18، تاریخ اودھ 2 /153-152، مثنوی شادی آصف الدولہ، معیار (پٹنہ مارچ 1936) 14-12۔

4. تحریر جلد 2 شمارہ 3 / 1968 ص 113۔

5. تاریخ فرح بخش 11 / ص 18، تاریخ اودھ 3 / 2۔

مسند نشینی

چونکہ نواب شجاع الدولہ کی تاریخِ وفات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔لہٰذا نواب آصف الدولہ کی تاریخ مسند نشینی میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مجملاً نواب مرحوم کا جنازہ ابھی گلاب باڑی [1] پہنچا ہی تھا کہ مرزا امانی نے مرزا علی خان اور سالار جنگ کو، جوان کے سگے ماموں تھے، پیغام بھیجا کہ وہ جلدی واپس چلے آئیں جو نواب مرحوم کی تدفین میں گئے ہوئے تھے۔ ان کے واپس آنے کے بعد مرزا امانی نے ان سے مسند نشینی کے بارے میں مشورہ کیا۔ اس کے بعد کرنیل کلیس اور میجر پھیلر صاحب ریذیڈنٹ سے بھی مشورہ کیا۔ اوران سے درخواست کی کہ وہ جلدی سے انھیں مسند نشین کرادیں۔ چونکہ مرزا امانی نواب مرحوم کا بڑا بیٹا اور قاعدہ کے مطابق مسند اور ملک کا وارث تھا۔لہٰذا کسی کو اس بات پر کوئی عذر نہ ہوا۔ اور اسی وقت مسند نشینی کی رسم ادا کردی گئی۔ حاضرین نے جومیت چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ نذریں پیش کیں۔ نواب مرحوم کی تدفین کے بعد نقارچی واپس آئے اور آوازۂ شادمانی بلند ہوا۔ [2] مسند نشینی میں تعجیل کی وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نواب شجاع الدولہ نے مرزا امانی کے علاوہ 25 بیٹے اور بھی چھوڑے تھے، جو دوسری بیبیوں کے بطن سے تھے [3] اور وہ لوگ بھی وراثت کے مدعی ہو سکتے تھے۔ ان میں نظم ونسق چلانے کی اہلیت بھی تھی [4] بعض مورخوں کا کہنا ہے کہ مسند نشینی کی رسم بروز سوم 25 ذی قعدہ 1188 / 1774 کو ادا ہوئی تھی [5]

---

1 وہ باغ جس میں نواب مرحوم نے اپنا مقبرہ تعمیر کروایا تھا۔ وہ جگہ اب بھی گلاب باڑی کے نام سے مشہور ہے۔

2 سوانحات 1 / 91-90، تاریخ اودھ 3 / 7،9؛

"گشت از پائے آصف الدولہ رونق مسندِ وزارت ہند"

سے تاریخ نکلتی ہے۔ تفضیح الغافلین / 14-13 چہار گلزار شجاعی / 223 ب۔ 224 الف۔

3 سوانحات 1 / 2۔

4 سوانحات 1 / ص 91۔ نیز ملاحظہ ہو سیر المتاخرین (ا۔ت) 3 / 98، چہار گلزار شجاعی 224 عماد / 119۔

5 سوانحات 1 / 91، تاریخ تیموریہ میں لکھا ہے کہ عجلت کی ایک وجہ یہ تھی کہ نجومیوں نے مرزا امانی کو اس سلسلے میں مشورہ دیا تھا۔ بحوالہ تاریخ اودھ 3 / 8۔

حدودریاست

1765 میں انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کے تحت صوبہ الہ آباد جس کی سالانہ آمدنی 24 لاکھ روپے تھی اور صوبہ کوڑہ جہاں آباد، جس کی سالانہ 48 لاکھ تھی، شاہ عالم ثانی کے حوالے کر دیے گئے تھے، بقیہ صوبہ اودھ جس کا محاصل ایک کروڑ پچاس لاکھ تھا، اور بنارس اور غازی پور جن کی آمدنی پچاس لاکھ اور پندرہ لاکھ تھی، نواب موصوف کے قبضۂ اقتدار میں رہے۔ اس کُل آمدنی میں سے نواب کو پچاس لاکھ سالانہ اس فوج کے اخراجات کے لیے دینا پڑتا تھا۔ جو انگریزوں نے وہاں صوبے کی حفاظت کے لیے تعینات کر رکھی تھی[1] لہٰذا قدیم اودھ کے علاوہ نواب آصف الدولہ کو وراثت میں روہیلہ افغانوں کا کل علاقہ جو شمال میں ہردوار تک پھیلا ہوا تھا۔ دوآبہ کا تمام علاقہ جس میں الہ آباد بھی شامل تھا۔ جس کو منیر الدولہ[2] کے انتقال کے بعد معاوضہ کی رقم ادا کر کے حاصل کر لیا گیا تھا۔ مشرق میں جہانگیر نگر تک کا علاقہ جو ہاپڑ کے قریب تک تھا۔ علاوہ ازیں شاہ جہاں پور سے بنارس تک کا تمام علاقہ مع مضافات کے نواب کو ملا۔ اس طرح مزروعہ اور غیر مزروعہ زمین کا کل رقبہ چالیس کروڑ بیگھے تھا[3] کل سالانہ آمدنی 2 کروڑ ستر لاکھ روپے تھی اس میں سے تراسی لاکھ روپے میں چھ آنے کے حساب سے انگریزی سرکار کو دے دی جاتی تھی[4]

تقررات

نواب آصف الدولہ نے مسند نشینی کے بعد اپنے ان مصاحبوں کو جو سن بلوغ سے اس کے ہم جلیس رہے تھے، نوازنا شروع کیا۔ اور ان کو اونچے اونچے عہدوں پر مقرر کیا۔ مرتضیٰ خاں[5] عرف مرزا جانی کو، جو مسند نشینی سے چند دنوں قبل میر صدیق کی معرفت شہزادہ مرزا امانی کی خدمت میں باریاب ہوا تھا۔ اور ان کا میر سامان تھا، خلعت نیابت کے ساتھ نواب مختار الدولہ میر مرتضیٰ خاں

---

1. سوانحات 1 / 77۔
2. سیر المتاخرین (ا۔ت) 3 / 85۔
3. عماد / 119۔ .... 4. تاریخ اودھ 2 / 304۔
5. مرتضیٰ خاں کے حسب و نسب کے بارے میں مفصل معلومات کے لیے ملاحظہ ہو۔ عماد / 133، مفتاح التواریخ / 356 تفضیح الغافلین / 5، تاریخ اودھ 3 / 10،14۔

ہیبت جنگ کا خطاب[1] اور ہفت ہزاری منصب اور ماہی و مراتب سے سرفراز کیا۔ اس کے علاوہ قدیم ملازمین سرکار کو ازراہِ عنایت اعلیٰ رتبے اور عہدے عطا کیے اور خدمات اعلیٰ سے سرفراز کیا۔ راجہ صورت سنگھ کو خزانچی[2] سبقت اللہ خاں کو خانساماں، کرم بیگ خاں کو داروغۂ فراش خانہ مقرر کیا گیا۔ سید خاں جہاں اور دوسرے اہل کاروں کو خلعت اور مالا مروارید، وکلغی اور جاگیریں عطا کی گئیں[3] حسن رضا خاں[4] کو داروغۂ توپ خانہ کا عہدہ دیا گیا۔ کچھ تلنگوں کو جو شہزادگی کے زمانے میں مرزا امانی کے اردلی اور دیگر خدمات انجام دیتے تھے، راجہ کا خطاب ملا اور ہر ایک کو رسالدار بنایا گیا[5] علاوہ ازیں جواہر علی خاں خواجہ سرا[6] ناظر، ونشاط علی خاں اور بہادر علی خاں خواجہ سراؤں کو جنھوں نے امارت کا لباس ترک کر کے نواب مرحوم کے مقبرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی، تسلی وتشفی دے کر واپس بلوایا، عہدے اور خلعتیں عطا کیں[7] ابو طالب لندنی کا بیان ہے کہ "از عہد صفدر جنگ الی الان ہمیشہ مردم ادنیٰ نائب خانہ وزیر شدہ اند، الاختیار الدولہ کہ از اکابر است" محکمۂ فوج میں زیادہ تر خواجہ سراؤں کو ترقی دی گئی۔ مثلاً لطافت علی خاں اور محبوب علی خان کو جنرل کے عہدے پر فائز کیا۔ اسی طرح محکمۂ مالیات میں بہار علی خاں و جواہر علی خاں کو مقرر کیا گیا۔ عنبر علی خاں خواجہ سرا کو توشک خانہ و باورچی خانہ کی خدمات سونپی گئیں۔[8] اس خوشی کے موقع پر ہزاروں قیدیوں کو رہا کیا گیا۔[9]

1۔ طباطبائی کا بیان ہے کہ مرتضیٰ خاں کو مجید الدولہ کا خطاب دیا گیا۔ ملاحظہ ہو۔ سیر المتاخرین 3 / 99، نیز دیکھیے تفضیح الغافلین / 14، چہار گلزار شجاعی / 224 الف، تاریخ فرح بخش 11 / 22،24۔ عماد / 119۔

2۔ عماد / 122 میں لکھا ہے کہ رائے جگنا تھ کو دیوانی اور صورت سنگھ کو پتھر گڑھ کا علاقہ تفویض ہوا۔

3۔ چہار گلزار شجاعی / 224 الف، عماد / 122 تفضیح الغافلین / 6-7۔

4۔ برائے تفصیل دیکھیے۔ عماد / 136-135، تاریخ اودھ 3 / 13،133 تفضیح الغافلین

5۔ تفضیح الغافلین 14۔

6۔ برائے تفصیل دیکھیے۔ تاریخ فرح بخش 11 / 46،53۔

7۔ چہار گلزار شجاعی / 224 ب، 225 الف

8۔ تفضیح الغافلین / 6-7۔

9۔ چہار گلزار شجاعی / 225 ب

نواب سعادت علی خان کا مسئلہ

سعادت علی خاں عرف مرزا منگلی نواب شجاع الدولہ کی دوسری بیگم، خورد محل کے بطن سے تولد ہوا تھا۔ مرزا منگلی کے علاوہ دوسری بیگمات سے جن کی تعداد سات سو(700) کے لگ بھگ تھی 23 بیٹے اور بیٹیاں تھیں۔ اور کل تعداد 47 تھی[1] نواب مرحوم نے اپنی حیات میں مرزا منگلی کو بریلی کا علاقہ تفویض کیا تھا۔ نواب آصف الدولہ کی مسند نشینی کے کچھ دنوں بعد مختار الدولہ نے میجر پھلیر اور کرنیل کلیس سے کہا کہ وہ مرزا منگلی کو بریلی سے واپس بلالیں اور وہ آکر فیض آباد میں قیام کریں اور ان کی کفالت کا انتظام سرکار کی طرف سے کیا جائے گا۔ مختار الدولہ نے اپنی دلیل میں کہا کہ جس طرح ایک میان مین دو تلواریں نہیں رکھی جاسکتیں اسی طرح ایک ملک میں دو فرمارواؤں کا وجود محال ہے۔ مرزا منگلی مسند کا برابر کا حقدار ہے۔ آصف الدولہ کی مسند نشینی اس وجہ سے عمل میں آئی کہ وہ نواب مرحوم کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اگر مرزا منگلی بریلی میں خودمختارانہ حکومت کرتا رہا تو ملک میں بدامنی پھیل جانے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا یا تو ان کو واپس بلایا جائے ورنہ ان کے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مساوی برتاؤ کیا جائے۔ انھوں نے کیا قصور کیا ہے، جو انھیں حق وراثت سے محروم رکھا جائے اور انھیں بھی علاقے عطا ہوں۔ اس گفتگو کو سننے کے بعد پہلے تو ریذیڈنٹ نے اپنی معذوری ظاہر کی لیکن آخر کار بدرجۂ مجبوری اس نے مرزا منگلی کو شقہ لکھا۔ ریذیڈنٹ کے حکم کو پاتے ہی مرزا منگلی فیض آباد کے لیے روانہ ہوگیا۔ اور فیض آباد میں آکر بنیاد منزل میں سکونت اختیار کرلی۔[2] لیکن چند دنوں کے قیام کے دوران میں اس نے محسوس کیا کہ نواب اور ارکان دولت اس کی طرف سے بے توجہی برتتے ہیں اس لیے کبیدہ خاطر ہوکر ریذیڈنٹ کے توسط سے نواب عالی سے اجازت لے کر بنارس چلا گیا اور اس کی گزر اوقات کے لیے تین لاکھ روپے مقرر کردیے گئے۔[3]

---

1. سوانحات 1 / ص 2، چہار گلزار شجاعی، / میں 22 یا 32 لڑکوں اور 34 لڑکیوں کا ذکر ملتا ہے 221 ب ت تفضیح الغافلین / 5.16۔

2. عماد / 119، 12 سوانحات 1 / ص 94-93۔

3. عماد / 137، 120، سیر المتاخرین 3 / 101-100، سوانحات 1 / 95۔

بنارس انگریزوں کے سپرد کرنا

مختار الدولہ نے اپنی خیر خواہی اور نواب عالی پر اپنے اثرات کی وجہ سے نواب کو زمانے کے نشیب وفراز کے بارے میں بہت کچھ سمجھایا۔ اور یہ بات ان کے ذہن نشین کرادی کہ ان کا وجود انگریزوں کی حمایت کے بغیر ناممکن ہے انھیں کی وجہ سے انھیں مسند ملی، اور انھیں کے خوف سے مرزا منگلی کان دبائے بریلی سے فیض آباد چلا آیا۔ اس لیے ان کی خدمات کے صلے میں ازروئے احسان مندی بنارس اور غازی پور کا علاقہ انھیں عطا کر دیا جائے۔ جن کی سالانہ آمدنی 22 لاکھ روپے تھی۔ نواب نے اس مشورہ پر عمل کیا۔[1]

کم ظرفوں کا عروج

چونکہ نواب سفلہ پرور تھا۔ اور ادنیٰ لوگوں کی صحبت سے دل چسپی رکھتا تھا۔ اس وجہ سے اس کے زمانے میں ایسے لوگوں کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ غلام علی نقوی کا بیان ہے۔

> "کسانے کہ آباواجداد شان سواری اسپ کم در خواب آرزو داشتند در عہد او مالک فیل خانہ واصطبل شدند، ہیچ مفلو کے نبود کہ بامید پالکی جھالردار بر در دولتش استادہ نشود، خلاصہ ایں کہ مقتدراں از غرور خود بخاک سیاہ نشستند وتہی دستان کاسہ لیس را اقبال روز افزوں ملازم آستان گردید۔"[2]

نواب نے اپنے ایک کہار کو راجہ مہرا کا خطاب اور جھالردار پالکی، گھوڑا، ہاتھی اور فوجی دستے کی رسالہ داری سے سرفراز کیا۔ اس کہار نے پانچ سو سواروں کا ایک ایسا فوجی دستہ تیار کیا جن کی پگڑیاں سرخ تھیں۔ رانوں تک لمبے کوٹ تھے، اور ان میں سبز سنجاف لگی ہوئی تھی۔ پائجامے

1۔ عماد/122، نیز دیکھیے۔ تفضیح الغافلین/6,7، تاریخ فرح بخش 11 / 21 تاریخ اودھ 3 / 25-26۔

2۔ عماد/113-120۔ سیر المتاخرین 3 / 100,101، سوانحات 1 / 95۔

مشروع کے بنے ہوئے تھے۔ وہ کہار بڑا دور اندیش اور عقل مند تھا۔ اس نے بعض ناچنے والی عورتوں کو کہاروں کا ایک مخصوص گانا اور ناچنا سکھا کر نواب کی خدمت میں حاضر کیا۔ نواب نے ان کے رقص و سرود کو پسند فرمایا اور انھیں بہت سا انعام دیا۔ اس وجہ سے ممالک محروسہ میں اس قسم کے رقص کا بڑا رواج ہوا۔ اور اکثر ناچنے والی عورتوں نے اس طرز کے رقص و سرود کے ذریعہ نواب کے ہاں رسائی حاصل کر کے بہت دولت حاصل کی۔[1]

بہو بیگم، زوجہ نواب شجاع الدولہ سے تنازع

مختار الدولہ کے بہکانے پر نواب نے اپنی والدہ بہو بیگم سے اس دولت میں سے اپنا حصہ طلب کیا جو نواب شجاع الدولہ نے ان کے پاس محفوظ کر رکھی تھی۔ چونکہ نواب ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس لیے انھوں نے کچھ تامل کے بعد پچاس لاکھ روپے دے دیے۔ بعض مورّخوں کا کہنا ہے کہ بہو بیگم نے اتنی اتنی رقم کئی مرتبہ نواب کو دی۔ اس کے بعد نواب نے اپنی بڑی دادی صدر جہاں بیگم زوجہ نواب صفدر جنگ کے ساتھ ایسا ہی طرز عمل اختیار کیا۔ وہ ضعیفہ جہاں دیدہ تھی۔ وہ نواب کی نااہلی اور ناشائستہ حرکات سے بخوبی واقف تھی۔ لہٰذا انھوں نے گرد و پیش کے زمینداروں اور راجاؤں کو مع فوج کے اپنی مدد کے لیے طلب کیا۔ جب مختار الدولہ کو اس بات کا علم ہوا تو وہ دم دبا کر راتوں رات لکھنؤ چلا گیا۔[2]

مختار الدولہ کا عروج

چونکہ نواب لہو و لعب میں منہمک رہتا تھا[3] اور نظامِ حکومت سے بے توجہی برتتا تھا۔ اس لیے مختار الدولہ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی اور سپید و سیاہ کا مالک بن بیٹھا اور اس میں فرعونی نخوت پیدا ہوگئی۔ وہ اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ و افضل سمجھتا تھا اور کسی کو اپنا ہمسر مقابل تصور نہ کرتا تھا۔ بالفاظ دیگر وہ خدائی کا دعویٰ کرنے لگا۔ اس کا واحد مقصد

---

1. تاریخ اودھ 3/25-26۔

2. سیر المتاخرین 3/99، سوانحات 1/ص 92۔ Selections from the Letters etc (Cal. 1890)III.PP.12,21

3. سیر المتاخرین 3/104،110۔

سپاہ کو تباہ کرنا اور نواب کو معزول کرنا تھا۔[1] طباطبائی کا بیان ہے ''مختار الدولہ کی نیابت ایسی چمکی کہ آصف الدولہ سے بجز نام کے کچھ ظاہر نہ تھا اس نے اپنے بڑے بھائی سید محمد خاں کو اقتدار الدولہ بہادر کا خطاب دیا۔ اور نائب صوبہ اودھ کر دیا اور دوسرے بھائی معزز خاں کو معزز الدولہ بہادر کا خطاب دلوا کر نائب صوبہ الہ آباد کیا۔ اور اپنے اقربا میں سے ہر ایک کو صاحب اقتدار کر دیا۔ شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کے ملازمین اس کے دست نگر ہو کر رہ گئے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے خلاف دم مارتا''۔[2]

جب ہر طرح سے اس نے طاقت اپنے اور اپنے رشتہ داروں کے ہاتھوں میں مرکوز کر لی تو اس نے قدیم ملازمین کی تذلیل کرنی شروع کر دی اور نتیجتاً ان میں سے بعض کو جلاوطنی اختیار کرنی پڑی اور جو لوگ رہ گئے وہ ہمہ وقت ترساں و ہراساں رہتے تھے۔ ان کی زندگی عذاب تھی۔[3]

مختار الدولہ کا قتل

ساتھ ساتھ مختار الدولہ نے انگریزی افسروں کے ساتھ اپنا رسوخ بڑھا لیا تھا۔ اس وجہ سے وہ نخوت و غرور کے نشے میں سرشار رہنے لگا۔ کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔ افسران فوج کو بذلت تمام برطرف کروا دیتا۔ فوج کی تنخواہیں بقایا رہنے لگیں اور اس طریقہ کار نے انھیں بے حد بددل کر دیا۔ نواب کے ہاں ملازم فرانسیسی فوج برطرف کر دی گئی۔ صاحب عزت لوگ خاک میں ملا دیے گئے[4] اسفال او نچے عہدوں پر فائز ہو رہے تھے، رشوت خوری کا بازار گرم تھا، افسران نے لاکھوں روپے اپنی اولاد کو ترکے میں چھوڑا۔ مثلاً جب راجہ مہرا فوت ہوا تو ضبطی کے موقع پر دو کروڑ روپے کا اثاثہ برآمد ہوا۔ وہ تمام کا تمام اثاثہ نواب شمس الدولہ ہضم کر گئے۔[5]

---

1. تاریخ فرح بخش/ص 22,24۔
2. سیر المتاخرین 3 /ص 100۔
3. سیر المتاخرین 3 /ص 104، سوانحات 1 /ص 95۔
4. عماد/ 121 ۔
5. سوانحات 1 /ص 96۔ اودھ کے سپاہی مختار الدولہ سے اس قدر ناراض تھے کہ ان میں سے کسی کا جب کبھی اس کی قبر کے قریب سے گزر ہوتا تو خواہ مخواہ اس پر ڈھیلے مارتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ (بقیہ صفحہ 326 میں)

جس زمانے میں نواب فرخ آباد سے واپسی میں اٹاوہ میں خیمہ زن تھا تو میر احمد[1]، جو افسر بائیسی ۸ ہزار پلٹن نجیب[2] کا سردار تھا۔ مختار الدولہ کے حکم سے سپاہ کی بقایا تنخواہ لینے کی غرض سے آیا اور کوس بھر کی دوری پر خیمہ زن ہو گیا۔ اور اس نے سوچا کہ صبح کو جا کر تنخواہ کی رقم لے گا۔ مختار الدولہ نے میر احمد کے خلاف نواب کے کان بھرے اور اس پر بغاوت اور سرکشی کا اتہام لگایا۔ اور نواب سے اجازت لے کر ایک فوجی دستہ اس کی سرکوبی کے لیے بھیج دیا۔ نتیجتاً ایک محاربہ ظہور میں آیا اور سیکڑوں سپاہی کام میں آئے۔ آخر میں میر احمد کی سپاہ نے فرار کی راہ لی اور کچھ گرفتار کر لیے گئے[3]۔

اپنے اقتدار اور احتشام کی وجہ سے مختار الدولہ نواب کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا اور اس کے ساتھ بھی سرد مہری سے پیش آتا تھا۔ اور ریذیڈنٹ برسٹو کو نواب کے خلاف ورغلایا کرتا تھا[4]۔ نواب کو جب ان تمام باتوں کا علم ہوا، اور خیر خواہان سلطنت نے بھی نواب سے مختار الدولہ کی شکایتیں کیں تو نواب نے اس کے قلع قمع کا پروگرام بنایا، بسنت خاں[5] کو اس کام کے لیے مامور کیا۔ ان دنوں بسنت خاں دیوان خانے کا مہتمم بھی تھا۔ حالانکہ مختار الدولہ نے بسنت خاں کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ لیکن نواب کے اشارے پر وہ ہاتھ دھو کر اس کی جان کے درپے ہو گیا۔ موسم گرما میں ایک دن اس نے مختار الدولہ کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ تہ خانے میں ضیافت کا انتظام ہوا۔ رقص و سرود و قوالی کا بھی اہتمام کیا گیا۔ بے خودی کے عالم میں مختار الدولہ قیلولہ کرنے لگا۔ اسی اثنا میں میر طالب علی

(بقیہ صفحہ نمبر 325 کا) عشرہ محرم میں اس نے تعزیوں پر گولے برسوائے تھے۔ کمال الدین حیدر نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا تھا۔

ایضاً 1 / ص 97، نیز عماد / 121، سیر المتاخرین 3 / 104 -100 -99-

---

1 سوانحات 1 / 97-96، سیر المتاخرین 3 / 102-101، عماد / 127,129۔

2 برائے تفصیل پلٹن نجیب ملاحظہ ہو۔ سیر المتاخرین 3/101۔

3 عماد / 129-127، سیر المتاخرین 3 / 102-101، سوانحات 1 / 97-96، تاریخ اودھ 3 / 78,86۔

4 سیر المتاخرین 3 / 100

5 برائے تفصیل دیکھیے۔ سیر المتاخرین 3 / 102۔

نے اندر داخل ہو کر اس کا کام تمام کر دیا[1] بسنت علی خاں اس خوش خبری کو لے کر نواب کی خدمت میں حاضر ہوا اس خوف سے کہ کہیں راز افشا نہ ہو جائے۔ نواب نے اس پر طمنچہ کی ایک گولی ماری، وار خالی گیا، مگر بسنت علی خاں زمین پر دھڑ سے گر گیا۔ راجہ نول سنگھ نے جو اس وقت موقع پر موجود تھا، دوڑ کر اس پر تلوار کا وار کیا اور اس کا خاتمہ کر دیا۔ یہ واقعہ 27 صفر بروز چہار شنبہ 1190 / 1776 کو اٹاوہ میں پیش آیا۔[2]

انور خواجہ سرا کو نیابت ملنا

اسی وقت نواب ریذیڈنٹ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس کے روبرو انور خواجہ سرا کو جو مختار الدولہ کا نائب تھا۔ خلعت نیابت سے سرفراز کیا، اس بات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اودھ کی ریاست میں عملی طور پر انگریزوں کا پورا تسلط قائم ہو چکا تھا۔[3]

مرزا منگلی سعادت علی خاں کا فرار ہونا

مختار الدولہ کے قتل کے بعد لشکر شاہی میں یہ افواہ پھیل گئی کہ مرزا منگلی کے نوکروں نے اس کو قتل کر ڈالا۔ تفضل حسین خان نے مرزا منگلی کو اس بات سے مطلع کیا اور ساتھ ساتھ یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ بھاگ کر امراؤ گر کے ہاں پناہ لے لیں۔ جب نواب آصف الدولہ کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے امراؤ گر سے احتساب کیا لیکن اس کے جواب سے مطمئن ہو گئے۔ لیکن امراؤ گر نے مرزا منگلی کا اپنے ہاں پناہ گزین رہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے مرزا منگلی کو اپنی گھوڑی دے کر رائے دی کہ جہاں ان کے سینگ سمائیں چلے جائیں۔ لہٰذا اپنے چند رفقا میر مظہر، میر علی پناہ، میر فضل علی خاں، میر طالب علی، اور مرزا مومن بیگ کو ہمراہ لے کر وہ نجف خان کے لشکر میں چلا گیا۔[4]

---

1. سیر المتاخرین 3 / 102-103، تفضیح الغافلین/ 27-26۔ Shah Alam II and His Court.PP.105-110 سوانحات 1 / 97۔

2. سیر المتاخرین 3 / 103، عماد/ 130,132، مفتاح التواریخ / 356-357، تفضیح الغافلین/ 27,29، تاریخ اودھ 3 / 100, 103, 107۔

3. عماد/132، سوانحات 1 / 99۔

4. عماد/132، سوانحات 1 / 99۔ سیر المتاخرین 3 / 103، عماد/ 132-133 تفضیح الغافلین/ 45۔

1778-1779 میں دوبارہ وہ آگرہ سے لکھنؤ واپس آیا اور بنارس میں قیام پذیر ہوا۔[1]

محمد ایلچ خاں[2]

مختار الدولہ کے مظالم سے تنگ آ کر محمد ایلچ خاں لکھنؤ سے رخصت ہو کر دہلی کے لیے روانہ ہوا۔ اس نے کہا کہ دہلی جا کر وہ نواب کے لیے وزیر الممالک کا خلعت حاصل کرے گا۔ اس وجہ سے نواب نے اس کے ساتھ گوپال پنڈت کو اور دو پلٹنیں بھی کر دیں۔[3] محمد ایلچ خان آگرہ آ کر وہیں ٹھہر گیا۔[4] جس زمانے میں مرزا منگلی آگرہ پہنچا تھا، محمد ایلچ خاں وہاں موجود تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے اہل کار محمد مکرم خاں، محمد اسحاق خاں کو خیر مقدم کے لیے بھیجا اور ضعیف العمری کی وجہ سے آگے نہ جا سکا اور اپنی ڈیوڑھی پر شہزادہ کا استقبال کیا۔ نذر پیش کی اور بطور مہمان اپنے ساتھ رکھا۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے سعادت علی خان نے مرزا نجف کے لشکر میں پناہ لی تھی۔ کچھ دنوں بعد مرزا نجف خاں نے سعادت علی خان سے کہا کہ وہ محمد ایلچ خاں سے وہ تمام دولت زبردستی چھین لے جو اس کے پاس تھی۔ لیکن ثانی الذکر اس بات کے لیے راضی نہ ہوا۔[5] اسی دوران میں محمد ایلچ خاں نے نواب آصف الدولہ سے درخواست کی کہ اسے اودھ کے علاقے میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے۔ نواب نے بخوشی درخواست منظور کر لی۔ جب محمد ایلچ خان اودھ کے حدود میں داخل ہوا تو نواب نے بذاتِ خود اس کا خیر مقدم کیا۔ نواب نے اسے خلعتِ نیابت عطا کی۔ حالانکہ وہ ضعیف العمر تھا۔ اور علیل بھی تھا۔ پھر بھی اس نے یہ عہدہ قبول کر لیا۔[6] کام کی زیادتی کی

---

1. برائے تفصیل ملاحظہ ہو تفضیح الغافلین/45۔
2. تفضیح الغافلین/6، تاریخ اودھ 3/20,24۔
3. عماد/121، سیر المتاخرین 3/99,109 تفضیح الغافلین/14،
Shah Alam II and His Court. PP.41-42,44,45
4. سوانحات 1/99۔
5. عماد/134۔
6. سوانحات 1/100-101، سیر المتاخرین 3/109۔ عماد/134,135،
تفضیح الغافلین/31-32

وجہ سے روز بروز کمزوری بڑھتی گئی، فالج کا شکار ہوا اور وفات پائی [1]۔

نواب امیر الدولہ [2] حیدر بیگ خان کو نیابت کا خلعت تفویض ہونا

محمد ایلچ خاں کی وفات کے بعد نواب اور جان برشٹو، ریذیڈنٹ کو نیابت کے عہدہ پر کسی کے تقرر کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ چونکہ حسن رضا خاں [3] نواب شجاع الدولہ کے دور حکومت سے باورچی خانے کا داروغہ تھا۔ اور نواب کے حاشیہ نشینوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس وجہ سے نواب آصف الدولہ کے دور میں اسے خلوت اور جلوت کی مجالس تک رسائی حاصل تھی، اور حاضر باش رہتا تھا۔ لہٰذا نیابت کے لیے اس کا نام تجویز ہوا مگر سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ محض امی تھا۔ اور عیاش اور کاہل الوجود بھی تھا۔ حالانکہ حسن رضا خاں میں اس عہدے کے سنبھالنے کی اہلیت نہ تھی پھر بھی مسٹر برشٹو کی یہی رائے ہوئی کہ نیابت تو اسی کے نام رہے اور اس کی مدد کے لیے اس کا نائب ایک ایسا شخص بنایا جائے جس میں نظام حکومت کے چلانے کی صلاحیت ہو۔ ہر چند حسن رضا خاں نے اس عہدے کو قبول کرنے سے انکار کیا لیکن اس کی ایک نہ چلی اور اسے نائب مقرر کر دیا گیا۔ اس کی مدد کے لیے حیدر بیگ خان کو اس کی نیابت پر مقرر کیا گیا۔ دونوں کو خلعتِ فاخرہ سے نوازا گیا۔ حیدر بیگ خان نظام حکومت کے چلانے میں مصروف ہوا۔ اور حسن رضا خاں، جسے لاکھ روپے ماہوار کی جاگیر ملی ہوئی تھی، عیش و عشرت میں ڈوب گیا۔ ''صحبت شراب و کباب میں مشاغل، اور دربار میں آمد و رفت سے غافل ہوا۔'' اس وجہ سے فوج میں تخفیف ہوئی۔ اور بہتوں کو ذریعہ معاش سے محروم کر دیا گیا [4]۔

---

1. سیر المتاخرین 3 / 111۔ عماد/ 135، تفضیح الغافلین/ 32 تاریخ اودھ 3 / 28 رجب 1190ھ کو وفات پائی/ 126۔

2. رقعات مرزا قتیل'' امیر الدولہ خطاب حیدر بیگ خاں بود'' / 33 برائے حسب و نسب حیدر بیگ خاں ملاحظہ ہو۔

عماد/ 135، سیر المتاخرین 3 / 112۔ تفضیح الغافلین/ 31، وفات 92-1791 ص 120-119۔

3. تفضیح الغافلین/ 36-35، تاریخ سعادت جاوید/ 401-400 تاریخ اودھ 3 / 143، 142، 134۔

4. تفضیح الغافلین/ 35، تاریخ اودھ 3 / 133

روہیل کھنڈ کا محاربہ

نواب فیض اللہ خاں[1]، والئی رام پور نے 1209ھ/ 1794 میں وفات پائی، نواب مرحوم کا بڑا بیٹا نواب سید محمد علی خاں 17 ر ذیقعدہ 1209ھ میں مسند نشیں ہوا۔ ان کے برادر خورد سید غلام محمد خاں[2] نے افغانوں کو اپنا رفیق بنا کر بڑے بھائی کو قتل کروا ڈالا اور خود مسند پر قبضہ کرلیا۔ نواب آصف الدولہ چونکہ نواب محمد علی خاں کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ ان پر بڑی عنایتیں کی تھیں۔ اور اپنا بیٹا بنالیا تھا۔ اس لیے اس حادثہ کی خبر سن کر اپنا یہ فرض سمجھا کہ اس کے خون کا بدلہ لیں۔ نواب نے کمانڈر ان چیف ابلکرام کو حکم دیا کہ وہ غلام محمد خاں کو گرفتار کرلیں اور بذاتِ خود مع لشکر اور انگریزی فوج کے فرخ آباد کے راستے سے رام پور کے لیے کوچ کیا۔ 1209ھ/ 1794 میں جنگ واقع ہوئی۔ اور نواب آصف الدولہ کو رہڑہ کے مقام پر فتح نصیب ہوئی۔ نواب نے محمد علی خاں کے کم سن بیٹے احمد علی خاں کو مسند نشین کیا، اور سید نصیر اللہ خاں کو بطور منصرم ریاست اور محافظ احمد علی خاں مقرر کیا۔[3] اس کے بعد نواب آصف الدولہ کو پچاس لاکھ روپے اور روہیلہ افغانوں کا نصف ملک ملا۔[4] اس فتح کے بعد جب نواب آصف الدولہ 18 ر جمادی الآخر 1209ھ کو واپس لکھنؤ پہنچا تو کوتوال شہر میر بہادر علی بلگرامی نے نواب کا بڑا پر جوش خیر مقدم کیا اور اس موقع پر شہر میں آئینہ بندی کا اہتمام کیا گیا۔[5]

گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگ کی لکھنؤ میں آمد

حالانکہ میر 1196 / 1781 میں لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔ اور بہت سے سیاسی واقعات ان کی موجودگی میں وقوع پذیر ہوئے مگر انھوں نے نہ تو ذکر میر اور نہ ہی کسی دوسرے روزنامچہ میں ان کو قلم بند کیا۔ انھوں نے گورنر جنرل کی لکھنؤ میں آمد اور اس موقع پر جو کچھ عمل میں آیا اس کو قلم بند کیا

1. برائے تفصیل سوانح عمری۔ ملاحظہ ہو۔ وقائع عالم شاہی/ 204-203، عماد/ 151۔
2. دیکھیے تاریخ اودھ 3 / 323۔
3. عماد/ 153-151، تفضیح الغافلین/ 137۔
4. عماد/ 153 تاریخ اودھ 3 / 329-328۔
5. عماد/ 153 تاریخ اودھ 3 / 329-328۔

ہے۔1211ھ/98-1797 میں گورنر جنرل لکھنؤ آئے تھے۔میر لکھتے ہیں۔

''ادھر وزیر اعظم امیر معظم گورنر بہادر کے استقبال کے لیے روانہ ہوئے، جو ان کی دعوت پر آرہے تھے اور اس وقت تمام ملک میں وہ قوی اور غالب ہیں۔فوج کا غبار آسمان تک پہنچ رہا تھا۔یہ سفر الہ آباد تک ہوا۔اس ضلع کے تمام سرداران کی آمد سے آگاہ ہو کر ملاقات کا انتظار کر رہے تھے۔ایک منزل پہلے نواب گردوں رکاب سے ملاقات ہوئی۔وہاں سے اپنے ساتھ لکھنؤ لائے جو سلطنت کا صدر مقام ہے۔ہر منزل پر نئی نئی ضیافت ہوتی تھی۔نئے نئے خیمے، عجیب وغریب کھانے، ترکی وتازی گھوڑے، کوہ پیکر ہاتھی، قیمتی پوشاک، اور جواہر کی کشتیاں، خوشگوار شربت، ان گنت میوے، اس علاقے کے اچھے تحفے، جنوب اور مغرب کی (بنی ہوئی) تلواریں، چاچی کمانیں (ہر جگہ بہار دکھا رہی تھیں) جب لکھنؤ میں آئے اور محل میں اقامت فرما ہوئے تو روز رنگا رنگ کے فرش فروش، جن پر اعلیٰ درجے کا کام کیا ہوا، مکان کے کونے میں گلاب چھڑکا ہوا، نرم وملائم بستر خواب، معطر و معنبر لباس، مخمل کے اچھوتے فرش، سیم گل کی ہوئی دیواریں، پردوں اور جھالروں سے آراستہ ایوان، عنبر کی خوشبو عجیب مستی آفریں تھی۔بھنے ہوئے پستے اور بادام اور انگریزی چیزیں، نقل کے لیے رکھی ہوئی، راتوں کو حسین وجمیل عورتوں کا رقص ہوتا۔بلکہ وہ رقاصائیں بہشت کی حوروں سے زیادہ دل کش تھیں۔شیشے اور چینی کے گلدان سلیقے سے چنے ہوئے تمام طاق تازہ میوے سے بھرے تھے۔فرنگی رقص ہو رہا تھا۔عجب تماشا تھا۔عجب مکان تھا۔عجب ہوا تھی۔شام کو چراغاں

ہوا، آتش بازی لائی گئی، ''ستارہ'' اور ''ہوائی'' آسمان تک پہنچ رہی تھیں۔ چراغاں کا نظارہ دل کو لبھا رہا تھا اور مہتابی سے رات روز روشن کا نمونہ بن گئی تھی۔ زربفت کا سائبان اس خوبی سے کھینچا گیا تھا کہ سورج کی نگاہوں نے اس کا جواب نہ دیکھا ہوگا۔ تمام امرا خاطر میں لگے ہوئے، راجہ خدمت پر آمادہ۔ اچھے اچھے شعرا مدح خوانی کر رہے تھے۔ خوش منظر جوان تھے، ہر جگہ خوب سایہ پھیلا ہوا، پانی کے فوارے بہتے ہوئے، نرگس دان برابر رکھے تھے جیسے پائیں باغ (آراستہ) ہو۔ اور برف ایسی بہہ رہی تھی گویا پگھلی ہوئی چاندی ہے۔ طرح طرح کے خوش رنگ شربت، قسم قسم کی بنی ہوئی روٹیاں تھیں۔ نانِ بادام بڑی نزاکت سے بنی ہوئی شیر مال، اور باقر خانی، خورشید کے مثل صاف اور گرم، نانِ جوان ایسی کہ (واقعی) بوڑھا کھالے تو جوان ہو جائے۔ نانِ ورقی کی تعریف کروں تو دفتر بھر جائے۔ نانِ زنجیلی کو دیکھ کر ذائقہ محظوظ ہوتا تھا، ہر نوع کے قلیے، دو پیازے رکھے تھے، کہ تمام مہمانوں کا جی للچا رہا تھا، کئی قسم کے کباب دسترخوان پر حاضر تھے۔ ''کباب گل''، اپنی تازگی اور خوبی میں (لاجواب) اور خوش ذائقہ کباب ہندی دِل موہ لے رہا تھا۔ کباب قندھاری اپنی طرف مائل کر رہا تھا۔ تو کباب سنگ ایسے کہ رات کے تھکے ماندوں کو بشاش کر دیں۔ کباب ورق نہ جانے کس انداز سے تلے گئے تھے کہ طبیعتوں کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے، یہ سب کباب بہت ہی خوش ذائقہ اور لذیذ تھے۔ ایک ایک کھانے کی دس دس قابیں رکھی ہوئی تھیں اور ہر ایک مہمان کے سامنے طرح طرح کے پلاؤ، شوربے اور کھانے چنے گئے تھے۔

یہ مہمان داری چھ ماہ تک متواتر رہی اور اس دوران میں ملکی اور مالی معاملات میں گفت وشنید بھی ہوتی رہی۔"[1]

خلعتِ وزارت

نواب آصف الدولہ موروثی خلعت وزارت کے حاصل کرنے کا بڑا خواہش مند تھا[2] لہٰذا اس نے لطافت علی خاں خواجہ سرا[3] کو اس کام کے لیے شاہ عالم ثانی کی خدمت میں بھیجا، قطب الدین خاں بن ضیاء الدولہ، سعد الدین اور مجید الدولہ عبدالاحد[4] کے توسط سے یہ خلعت نواب کے پاس اس وقت پہنچی جب وہ اٹاوہ کے مقام پر خیمہ زن تھا[5]

وفات

یہ علامہ تفضل حسین[6] خان کی نیابت کا زمانہ تھا کہ نام نمود نواب آصف الدولہ نے 23 سال 7 ماہ حکومت کرنے کے بعد 28 ربیع الاول بروز جمعہ 1212ھ/ 21 ستمبر 1797 کو پچاس سال کی عمر میں رحلت کی۔ اور اپنے تعمیر کردہ امام باڑہ میں مدفون ہوئے۔[7]

1۔ میر کی آپ بیتی/ 184-182، نیز دیکھیے۔ چہار گلزار شجاعی/ 72ب۔ 73 الف، عماد/ 146-145، 27 مارچ 1784 کو گورنر جنرل لکھنؤ آئے، اور 27 اگست 1784 کو واپس گئے۔ تاریخ اودھ 3/ 241-240۔

2۔ Shah Alam II and His Court.P.41

3۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ تفضیح الغافلین/ 31-30، وقائع عالم شاہی/ 188-187، 13.15.17.19، تاریخ اودھ 3/ 72-71۔

4۔ ان کے والد نواب مجد الدولہ عبدالمجید خاں کشمیر کے باشندے اور احمد شاہ بادشاہ بن محمد شاہ کے بخشی سوم تھے۔ 1165/ 1753 میں انتقال ہوا۔ مجد الدولہ عبدالاحد خان کو 1187/ 1773 میں شاہ عالم ثانی نے نائب وزیر مقرر کیا، اس زمانے میں دہلی کی سیاست میں انھوں نے بڑے نشیب وفراز دیکھے۔ 1788/ 1203-1202ھ میں وفات پائی میر کی آپ بیتی/ 172-171، وقائع عالم شاہی ص 181,183۔

5۔ برائے تفصیل حصول خلعت دیکھیے۔ تاریخ اودھ 3/ 91-90۔

6۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ تذکرہ علمائے ہند/ 37-36، تفضیح الغافلین/ 6-5، تاریخ اودھ 3/ 348-345۔

7۔ مفتاح التواریخ/ 365، عماد/ 157، سوانحات 1/ 120,122۔

نواب آصف الدولہ کی وفات پر اودھ ریاست کے حدود

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ نواب آصف الدولہ کو ورثہ میں ایک وسیع ریاست ملی تھی۔ لیکن انھوں نے اپنی تغافل شعاری کی وجہ سے انگریزوں کو اس بات کا موقع بہم پہنچایا کہ رفتہ رفتہ وہ تمام علاقوں پر قابض ہو سکیں۔ اور ایسا ہی ہوا۔ انگریزوں نے دھیرے دھیرے نواب کے عاملوں کو اودھ، بریلی، کوڑہ جہاں آباد، اور مراد آباد سے برطرف کر کے اپنے نمائندوں کو حاکم مقرر کیا۔ اور محصول اور مال گزاری کی وصول یابی اپنے ملازمین کے ذریعہ کرانے لگے۔ یہی نہیں بلکہ انگریزوں نے نواب شجاع الدولہ کے زمانے سے ملازم فوج جس کی تعداد تقریباً تیس ہزار تھی، اور سپاہ توپ خانہ کو اپنی حکمت عملی سے برطرف کروا دیا۔ دو مرتبہ انھوں نے بہو بیگم اور دیگر بیگمات سے زبردستی کروڑ کروڑ کی رقمیں وصول کیں اور اس طرح قدیم خزانہ خالی کر دیا۔ اور شاہی خاندان کے افراد کو تنگ معاشی میں مبتلا کر دیا۔[1]

مرزا وزیر علی خاں

نواب آصف الدولہ کو عورتوں سے رغبت نہ تھی کیوں کہ قوت رجولیت سے عاری تھا۔ لیکن اس کے محل میں پانچ سو عورتیں تھیں۔ ان میں کچھ ایسی بھی تھیں کہ نواب نے ان کو ایسے زمانے میں اپنے حرم میں داخل کیا تھا جب وہ حاملہ تھیں اور جب ان سے لڑکے پیدا ہوئے تو نواب نے انھیں اپنے نطفے سے بتایا۔ اور ان موقعوں پر بڑی بڑی خوشیاں منائی جاتیں۔ ان لڑکوں کی اپنی اولاد ہی کی طرح پرورش کی جاتی۔ اس طرح کی کل اولاد ساٹھ تھیں، 32 لڑکے، اور 28 لڑکیاں۔ لڑکوں میں سب سے بڑا وزیر علی خان تھا۔ وزیر علی خان کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔ وہ نہایت ذہین، خوب صورت، ملیح، خوشنما تھا۔ علم و ہنر اور انشا کی تعلیم بخوبی پائی تھی۔ خوش نویسی میں مرزا محمد علی اعجاز رقم کا شاگرد تھا۔ اور فنون سپاہ گری رستم خاں پھکیت سے سیکھے تھے۔ اسپ تازی

---

1. برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ وقائع بعد از وفات عالم گیر/ 171 الف و ب نیز دیکھیے سیر المتاخرین 3 / 104 عماد، 158۔ سوانحات 1 / 120 تفضیح الغافلین/ 125-124۔

شمشیر افگنی، تیر اندازی اور چوگاں بازی میں اس کو خوب مشق تھی۔نواب آصف الدولہ کو اس سے کمال الفت تھی [1]

نواب نے وزیر علی خاں کی شادی میں قریب تیس لاکھ روپے خرچ کیے تھے،نواب کے انتقال کے بعد چار ماہ کے لیے مسند نشیں بھی ہوا۔ چونکہ وزیر علی خاں نواب کے نطفے سے نہ تھا اور کہا جاتا ہے کہ [2] فراش کا لڑکا تھا [3] اس لیے مسٹر جان شور ریزیڈنٹ نے اسے بہو بیگم کی رضامندی حاصل کر کے معزول کر دیا۔ معزولی کے فرمان پر تمام درباری امرا کے دستخط کروا کے اسے مقید کر لیا گیا۔ اور چند دنوں کے بعد اسے بنارس کی طرف روانہ کر دیا گیا [4] بنارس پہنچنے کے بعد مسٹر چیری بہادر، جو وہاں کا حاکم تھا، وزیر علی خاں کا مخالف ہو گیا۔ اور کلکتہ سے جو احکام وزیر علی خاں کے نام آتے ان کی تعمیل میں تاخیر کرنے لگا۔

1798-1799 میں وزیر علی خاں نے مسٹر چیری کو مع دو دیگر انگریز حاکموں کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور وزارت کا مدعی ہوا۔ آخر کار وہاں سے بھاگ کر دشت نوردی کرتا ہوا جے نگر پہنچا اور وہاں قیام کیا۔ ہندستانی اور انگریز وکلا نے وہاں پہنچ کر اسے گرفتار کر لیا۔ اور کلکتہ بھیج دیا گیا۔ جہاں اسے سخت قید میں رکھا گیا۔ گورنر جنرل اور کارنوالس نے وزیر علی خاں کو کھیتی باڑی کی اجازت دے دی تھی۔ ماہ شعبان 1232ھ/ ماہ جون 1816 کو وفات پائی [5]

1۔ تاریخ اودھ 3 / 360۔ 2۔ تفضیح الغافلین/ 134-135۔

3۔ محمد نجم الغنی نے لکھا ہے کہ نواب آصف الدولہ کے نطفے سے کوئی فرزند نہ تھا، ہمیشہ آرزومند رہے کہ کوئی وارث ریاست پیدا ہو لیکن نخل بارآور نہ ہوا۔ عالم مایوسی میں ایک غریب سید کے لڑکے کو نواب نے اپنی فرزندی میں جگہ دی اور وزیر علی نام رکھا۔ تاریخ اودھ 3 / 360 لیکن مصنف موصوف نے اپنے اس بیان کے ثبوت میں کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔

4۔ تاریخ سعادت جاوید/ 422، مفتاح التواریخ / 366-367، عماد/ 164.171۔

5۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ عماد/ 171-164، تاریخ سعادت جاوید/ 423،422 وزیر نامہ (از محمد امیر علی خاں) (نظامی پریس کانپور، 1876) ص 51-49، قیصر التواریخ 1 / 136,142، سوانحات 1 / ص 142-130، مفتاح التواریخ / 378، وقائع عبد القادر خانی 11 / 134، تاریخ مہاراجگانِ ہند (نجم الغنی، ہمدم برقی پریس لکھنؤ 1927) ص 345-344۔ تاریخ اودھ 3 / 377,385۔

اس مختصر دور حکومت میں اس سے ایسی حرکات ناشائستہ عمل میں آئیں کہ ان کا ذکر بے سود ہے۔ رذیلوں کو بڑے عہدے اور خطابات عطا کیے۔ تاڑی کش اور دوسرے رذیل فرقے کے لوگ اسے نصیب الدولہ کے خطاب سے مخاطب کرتے تھے۔[1]

نواب سعادت علی خان

وزیر علی خان کی معزولی کے بعد 3/ شعبان 1212ھ/ یکم جنوری 1798 کو سعادت علی خان کی مسند نشینی عمل میں آئی۔[2] سعادت علی خاں نواب شجاع الدولہ کا بیٹا، اور نواب آصف الدولہ کا بھائی تھا۔ مسند نشینی کے موقع پر ارکان دولت نے حسب دستور نذریں پیش کیں۔ جلوس کے دن نواب کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔ سال بھر عیش و عشرت میں گزرا۔ کسی کارخانہ، اہلکار و مصاحب اور منافق سے بے خبری برتی لیکن سب کے بارے میں رائے قائم کرتے رہے۔ عیش و عشرت کے جلسے اکثر نشاط باغ میں ہوا کرتے تھے۔ صبح کو سیر و سپاٹے کے لیے جایا کرتے تھے۔[3]

عہد نامہ فیمابین گورنر جنرل اور نواب سعادت علی خاں

بکسر کی جنگ میں نواب شجاع الدولہ کی شکست کے بعد نواب اور انگریزی سرکار کے مابین ایک سمجھوتہ ہوا تھا۔ اور اس کے تحت کل آمدنی میں سے 6 آنہ فی روپیہ کے حساب سے انگریزی فوج کے اخراجات کے مد میں دیے جاتے تھے۔ جو اودھ میں امن و امان برقرار رکھنے کے لیے تعینات کی گئی تھی۔[4] جب نواب سعادت علی خاں مسند نشین ہوئے تو ایک نئے عہد نامہ پر نواب کو

---

1. عماد/159۔

2. انشانے تاریخ جلوس میں یہ شعر کہا تھا۔ ع

جلوس کردہ امسال و سال حال الحال　　فزوں دوازدہ است از دوازدہ صد سال

کلیات انشا/406-405 ,252۔

3. سوانحات 1/ص 151 ,129، عماد/167 ,165۔

4. سوانحات 1/ص 157، تاریخ سعادت جاوید ص، 422۔

دستخط کرنے پڑے جس کی رو سے نصف ملک محروسہ انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا[1] اور اس پورے علاقے کی سالانہ آمدنی ایک کروڑ تیس لاکھ روپے ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ انگریزوں کا معاملات میں اس قدر اقتدار بڑھ گیا تھا کہ بقول سید کمال الدین حیدر "صاحب جانشین بلدۂ لکھنؤ میں اپنے عہدہ میں بمنزلۂ قائم مقام سرکار انگریز بہادر مقرر و معین ہیں۔ اور سب امور میں واسطہ مسترہ سوال و جواب فیما بین دولتیں متصور ہیں۔ اس صورت میں صاحب امور رسمیہ میں مراتب صلاح و صوابدید سرکار انگریز بہادر کو نواب گورنر جنرل کی طرف سے خدمت جناب عالی میں گزارش کریں گے۔"[2]

نواب کا وقار گر چکا تھا۔ ایک دن نواب کی سواری کے ساتھ نقارہ بج رہا تھا۔ جب سواری کا گزر بریگیڈیر صاحب کے بنگلے سے ہوا تو سنتری نے نقارہ رکوا دیا۔ نواب خاموش واپس چلے آئے[3] نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں ریاست کا زوال ہو چکا تھا۔ اور انگریزوں کا اقتدار بڑھتا جا رہا تھا، نواب انگریزوں کے نظر و کرم پر تخت پر جلوہ افروز تھا لیکن اختیار بالکل نہ تھے۔ انگریزوں کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔

سعادت علی خاں کی وفات

آخری عمر میں بصارت میں ضعف پیدا ہو گیا تھا۔ آغا میر کُحال کو دو سو روپے ماہوار پر ملازم رکھا گیا تھا۔ انھوں نے طرح طرح کے سرمے تیار کر کے بینائی کے بڑھانے کی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا 23 یا 24 رجب 1229ھ بروز دوشنبہ/ 11 یا 12 جولائی 1814 کو حسب معمول سواری تا مجان پر برآمد ہوئے۔ اور خاص بازار تک گئے۔ راستے سے مداری نامی گویئے کو ساتھ لیتے آئے۔ محل میں آکر اس کا گانا سنا، پچاس روپے بطور انعام مرحمت کیے۔ چار گھڑی رات گئے، خاصہ طلب کیا، پلنگ پر بیٹھے، پالک کا ساگ خشکے کے ساتھ کھایا، کئی پھلکے ساتھ میں کھائے۔ کھانے کے بعد یخنی پینے کا معمول تھا۔ خاصۂ طعام ہمیشہ قاب غوری میں نوش کرتے تھے۔ یہ بات مشہور ہے کہ غوری میں زہر کا اثر جلد ظاہر ہو جاتا ہے۔ یخنی کا گلاس لے کر نوش کیا۔ اس کے بعد سے طبیعت

1. سوانحات 1 / 157۔
2. سوانحات 1 / 157، تفصیل عہد نامہ ملاحظہ ہو۔ 169، 164، رقعات مرزا قتیل/ 24۔
3. سوانحات 1 / 170، تفصیل عہد نامہ ملاحظہ ہو۔ 169، 164، رقعات مرزا قتیل/ 24۔

خراب ہونا شروع ہوئی۔ اور چند گھنٹوں میں ان کی روح جسم خاکی سے پرواز کر گئی۔ سہ شنبہ کو دوپہر کے وقت گومتی ندی کے کنارے فرح بخش کے نیچے ایک خیمے میں غسل دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ غسل کے وقت نعش کے منہ سے خون جاری تھا۔ جنازے کو بڑی دھوم دھام سے لے جا کر خاص بازار میں نواب غازی الدین حیدر کے مکان میں دفن کر دیا گیا۔

"آہ شد گنج سعادت در زمیں" سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔[1]

نواب سعادت علی خاں نے دس لڑکے اور 5 لڑکیاں چھوڑیں جو مختلف عورتوں کے بطن سے تھیں۔[2]

---

1 سوانحات 1 /200-199 مفتاح التواریخ /376۔

2 سوانحات 1 /8-7 ، مفتاح التواریخ /376۔

باب ششم

اقتصادی حالت

نظام حکومت

کسی ملک یا ریاست کی صنعت وحرفت اور دست کاری وزراعت کی ترقی کے لیے جان ومال، اور امن وامان کی ضمانت لازمی ہے۔ اور یہ شرائط صرف ایک عمدہ نظم ونسق ہی سے حاصل ہوسکتی ہیں۔ نواب سعادت خاں برہان الملک، اور نواب صفدر جنگ مطلق العنان حکمراں تھے۔ اور عملی طور پر وہ مرکزی حکومت سے آزاد تھے مگر بظاہر وہ خود کو ایک صوبہ دار ہی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ کیونکہ بصورت دیگر عوام ان کی اطاعت سے روگردانی کرتے۔ وہ وزیر الممالک سے احکامات حاصل نہیں کرتے تھے۔ اور نہ ہی اپنے علاقوں کی آمدنی اور خرچ کا گوشوارہ ہی مرکزی حکومت کے روبرو پیش کرتے تھے، ان کا طرز عمل ایک آزاد حکمراں جیسا تھا۔ اس وجہ سے اپنے حاکموں کا وہ خود ہی تقرر کرتے تھے۔ اور انھیں القاب وخطاب خود ہی تفویض کرتے تھے۔ لہٰذا متذکرہ نوابوں نے اپنے صوبوں میں مرکزی حکومت کے طرز پر نائب صوبہ دار، دیوان، بخشی، قاضی، صدر اور حاکم بیوتات مقرر کیے۔ مال گزاری کی وصول یابی اور نظم ونسق میں سہولت پیدا کرنے کی غرض سے صفدر جنگ نے اودھ اور الہ آباد کے صوبوں کو ضلعوں میں تقسیم کیا اور ناظم کے لقب سے وہاں حاکم مقرر کیے۔ ہر ضلعے میں کچھ پرگنوں کو اکائی کی صورت میں حد بندی کر کے

وہاں ایک عامل مقرر کیا۔ فوجدار اور کروڑی کے عہدے موقوف کر دیے۔ امن وامان قائم رکھنے کے لیے ناظم اور عامل کی نگرانی میں فوجی دستے تعینات کیے۔ مواد کی کمی کی وجہ سے ہم یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ مال گزاری کے وصولی کرنے کے قواعد وضوابط کیا تھے۔ اور لگان کا تعین کس طرح ہوتا تھا۔ لیکن قیاس چاہتا ہے کہ وہ قواعد نرم تھے۔ اور مناسب لگان لیا جاتا تھا۔ رعیت فارغ البال تھی۔

آبادی

اس زمانے میں اودھ اور الٰہ آباد کی بیشتر آبادی ہندوؤں کی تھی۔ اور انھی کی اکثریت تھی مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ موجودہ زمانے میں بھی ان علاقوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اس آبادی کا زیادہ نمایاں حصہ راجپوتوں پر مشتمل تھا۔ جو تمام علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور کئی چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں منقسم تھے۔ راجپوتوں کے بعد برہمنوں کی تعداد زیادہ تھی اور بقیہ کی آبادی نچلے طبقے کے لوگوں کی تھی۔ اہیر اور کمہار بالخصوص زراعت کا پیشہ کرتے تھے۔ اٹھارھویں صدی میں زیادہ تر مسلمان شہروں اور قصبوں میں رہتے تھے۔ انھوں نے سرکاری ملازمتوں کے علاوہ کوئی دوسرا پیشہ اختیار نہیں کیا تھا۔ ان کی آبادی کا زیادہ حصہ افغانوں اور شیوخ پر مشتمل تھا۔ افغانوں کی زیادہ تر آبادیاں جون پور، الٰہ آباد، ملیح آباد میں تھیں۔ زیادہ تر شیوخ لکھنؤ، کاکوری، خیرآباد، گوپامئو اور بلگرام میں سکونت رکھتے تھے۔ نواب سعادت علی خاں اور صفدر جنگ کے مصاحبوں، دوستوں، آشناؤں، افسروں اور فوجی کمانڈروں نے جن میں ہزاروں ایرانی النسل تھے۔ لکھنؤ اور فیض آباد میں بود و باش اختیار کر لی تھی، چونکہ ان نوابوں کا مستقر فیض آباد تھا۔ لہٰذا اٹھارہویں صدی میں اس شہر کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔

زراعت، وصنعت وحرفت وتجارت

صوبہ اودھ ہمیشہ سے زرعی دولت سے مالا مال تھا۔ جغرافیائی محل وقوع ایسا تھا کہ اس علاقے میں جوار، باجرہ، سکبداس، جو، چنا، گیہوں اور دوسرے اناج اور تلہن خوب پیدا ہوتے

تھے۔ کپاس کی زراعت ہوتی تھی۔ میوے مثلاً آم، امرود، خربوزہ، تربوز کثرت سے ہوتے تھے۔ گنا اور پان کی کاشت ہوتی تھی، ہر قسم کی ترکاریاں خوب ہوتی تھیں، اس وجہ سے یہ صوبہ ''باغ ہندستان'' کہلاتا تھا[1] صنعت وحرفت کے لحاظ سے یہ صوبہ دوسرے صوبوں سے پچھڑا ہوا نہ تھا۔ سترھویں صدی کے نصف اول میں اودھ کی چھینٹ کی بھاری مانگ انگلینڈ میں تھی۔ 1640 میں انگریزوں نے لکھنؤ میں ایک فیکٹری قائم کی تھی، جو دریا آباد، خیرآباد اور دوسرے علاقوں سے منقش کپڑے جمع کرتی تھی، انگریزی تجاران کپڑوں کو دریا آبادی، خیرآبادی اور ایریز کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اودھ کے مغربی علاقوں میں ایک قسم کا کپڑا تیار کیا جاتا تھا۔ جومرکولیز کہلاتا تھا۔ اس کپڑے کو ایسٹ انڈیا کمپنی خریدتی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں اس صوبے میں کپڑے کی صنعت اوج کمال پر تھی۔ اور دریا آباد، خیرآباد، کو چھینٹ اور گزی کے بنانے میں مرکزیت کا درجہ حاصل رہا[2] شہزاد پور چھینٹ اور گزی گاڑھے کی تیاری کے لیے شہرت رکھتا تھا۔ اور یہاں سے شاہانِ مغلیہ کی ضروریات کے لیے خیمے، شامیانے، اور پردے بھیجے جاتے تھے۔ مگر مرکزی حکومت کی اقتصادی زبوں حالی کی وجہ سے اس صدی کے نصف آخر سے اس صنعت کا زوال شروع ہوگیا۔ جون پور، اونی اور ریشمی کپڑوں کی خرید وفروخت کی منڈی تھا۔ ان کے علاوہ وہاں کشمیر، نینی تال، کمایوں، بنگال، لہسہ اور دوسری جگہوں کا صنعتی مال پہنچتا تھا۔ اس شہر میں بڑے بڑے تجار رہتے تھے جو اس مقام سے صنعتی چیزوں کی نکاسی اور دوسری جگہوں سے اس مال کے درآمد کا کام کرتے تھے جو وہاں دستیاب نہ ہوتی تھیں۔ وہاں نیل پیدا ہوتا تھا۔ عطریات اور خوشبودار تیل بالخصوص اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں مرغوب خاطر تھا، اس وجہ سے کئی مقامات پر عطر اور تیل کشی کا کام ہوتا تھا[3] غازی پور میں خاص طور پر عطر گلاب اور آب

1 خلاصۃ التواریخ / 44۔

2 حدیقۃ الاقالیم / 154۔

3 MR. LEIGH. نے کمپنی کی نوکری سے سبک دوشی اختیار کر کے جون پور میں تجارت کا کام شروع کردیا تھا اور دوسرے بہت سے انگریز وہاں رہتے تھے۔ وہاں حقے کے نیچے اور سویاں بھی عمدہ بنتی تھیں۔ بڑی تعداد میں بھیڑیں باہر بھیجی جاتی تھی Twinning PP-326-27 ۔

گلاب تیار کیا جاتا تھا۔[1] جون پور میں عطر اور خوشبودار تیل اور بالخصوص روغن بیلا تیار ہوتا تھا۔[2] ان شہروں کے علاوہ دوسرے مقامات میں بھی چھوٹی چھوٹی کئی صنعتیں تھیں۔ گورکھپور میں اشیائے خوردنی کی کثرت تھی، جو شخص ایک مرتبہ وہاں پہنچ جاتا تو پھر وہیں کا ہو رہتا۔ وہاں روغن زرد عمدہ تیار ہوتا تھا۔[3] مرزاپور میں میووں اور پھلوں کی بہتات تھی۔ یہ شہر ایک بڑی تجارتی منڈی بھی تھا، قاضی مرتضیٰ بلگرامی کا بیان ہے، ''اکثر آنجا تجاران و بیوپاریانِ مال واجناس خود را از شہر ہای دور دراز بالخصوص مثل کشمیر و کمایوں ولاسہ و مشرق می آرند و می فروشند و آنجا بجائی دیگری برند اکثر چیز ہا آنجا بحسب تمنا کہ ارزاں بدست می آید، مخصوص اقمشہ ریشمی، و پارچہ سفید پوربی، ہزار ہا را کہ خواہند خرید کنند و ہم چنیں اشیا کولہ وغیرہ مرزاپور از جملہ ارنگ ست و ارنگ آں را گویند کہ جملہ اشیا آنجا خرید و فروخت می شوند''۔[4] اٹھارھویں صدی کے سیاحوں نے اس شہر کی تجارتی مرکزیت کا ذکر کیا ہے اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، ٹیوننگ کا بیان ہے کہ مرزاپور ایک تجارتی مقام تھا۔ یہاں کی آبادی بیس لاکھ کے قریب تھی، تجارتی لحاظ سے گنگا ندی کے کنارے پر ایک مشہور مقام تھا اور اس لحاظ سے وہ پٹنہ کے مدمقابل تھا۔ یہاں روئی کی گانٹھوں سے لدی سیکڑوں کشتیاں ندی کے کنارے کھڑی رہتی تھیں۔ مرزاپور روئی کی تجارت کے لیے ایک اہم منڈی تھا۔[5] فیض آباد میں

---

1. MR. LEIGH نے کمپنی کی نوکری سے سبک دوشی اختیار کر کے جون پور میں تجارت کا کام شروع کر دیا تھا اور دوسرے بہت سے انگریز وہاں رہتے تھے۔ وہاں حقے کے تلے اور سویاں بھی عمدہ بنتی تھیں۔ بڑی تعداد میں بھیڑیں باہر بھیجی جاتی تھی Twinning PP-326-27 ۔ /678

2. ایضاً Twinning PP-326-27 ۔ /677۔

3. حدیقۃ الاقالیم/152، تاریخ گورکھپور (قلمی) 12، الف تا 15 الف۔

4. حدیقۃ الاقالیم/668۔

5. ٹیوننگ نے 1794 میں شمالی ہندستان کا دورہ کیا تھا۔

Twinning : Travels in India. P. 156 Lumsion, A Jorney from Merull to London.

(1819-1820) P.9

Dauidson, Diary, Travels and Aduenture Etc.1. P 338

کپڑے بننے کی صنعت ہوتی تھی۔ ٹیوننگ نے وہاں تیار شدہ کپڑوں کے کچھ نمونے دیکھے اور پسند کیے تھے[1] ٹانڈہ میں سوتی کپڑا بڑی تعداد میں تیار ہوتا تھا۔ اور گھا گھرا ندی کے ذریعہ گنگا ندی میں بھیجا جاتا تھا۔ وہاں سے کلکتہ اور وہاں سے یورپی شہروں میں یہ کپڑا بھیجا جاتا تھا۔ 1793 میں ان کپڑوں کی مانگ بہت گر گئی تھی، مگر دوبارہ مانگ بڑھنے کے امکانات تھے، کیونکہ یہ کپڑا عمدہ سستا تھا اور اس پر ٹیکس بھی نہیں لگتا تھا[2] جلال پور میں سوتی کپڑا تیار ہوتا تھا[3] اس میں لکھنؤ میں خاص طور پر کمان اور عمدہ مٹھائیاں بنتی تھیں، لیکن اول الذکر صنعت کا اٹھارہویں صدی کے آخری ایام میں زوال شروع ہو گیا تھا[4] آصف الدولہ کے زمانے میں یہاں زردوزی کا عمدہ کام ہونے لگا تھا[5] بہرائچ میں نیپال سے آئی ہوئی چیزوں کی منڈی تھی۔ پہاڑی علاقے کے باشندے یہاں سونا چاندی اور کانچ کے زیورات، شہد، موم، مشک، اخروٹ، انگور، شکاری جانور وغیرہ اور دوسری چیزیں فروخت کرنے کے لیے لاتے تھے[6]

صوبہ الہ آباد کی آب و ہوا سازگار تھی لہٰذا وہاں عمدہ اور رنگ برنگ کے پھول اور میوے خصوصاً خربوزہ اور انگور کثرت سے ہوتے تھے، وہاں موٹھ کم یاب، جوار اور باجرہ بالکل نہیں ہوتا تھا، جھونہ اور مہر گل نامی عمدہ کپڑے بنے جاتے تھے[7]

اس دور میں صنعت وحرفت اور تجارت کی ترقی کی وجہ یہ تھی کہ نواب سعادت علی خاں اور نواب صفدر جنگ بلا استثنا اپنی رعایا کے ساتھ عدل وانصاف کرتے تھے اس وجہ سے قدرتاً ظالموں اور لالچی عاملوں پر روک لگ گئی صوبوں میں امن واماں قائم ہوا، لوگوں کو اطمینان اور سکون حاصل ہوا، ان کے جان ومال اور عزت کی حفاظت کی ضمانت دی گئی۔ نتیجتاً دست کاریاں، زراعت،

---

1. Twining P.P 318 ——— 2. Twining P.P 321 /321

3. Twining P.P 322-323 /

4. حدیقۃ الاقالیم/ قند داولہ شرینی وکمان انجا معروف بودہ اکنوں کمان آں خوبی ساختہ نشود/ 154۔

5. فسانۂ عجائب/9

6. حدیقۃ الاقالیم/ 152, 153, 668,679، خلاصۃ التواریخ / 44, 43۔

7. خلاصۃ التواریخ / 43۔

صنعت وحرفت اور تجارت ترقی کے اوجِ کمال کو پہنچ گئیں۔

محمد فیض بخش نے فیض آباد کی تجارتی اور اشیائے خورد ونوش کی سرگرمیوں کا چشم دید واقعہ بیان کیا ہے۔ اس کے بقول یہ بازار ہر قسم کی تجارت کا مرکز تھا اور خاص طور پر چوک کا بازار جہاں توران، فارس، چین اور یورپ کے تجار خرید وفروخت میں منہمک نظر آتے تھے۔ وہ اپنے ممالک کی اشیا یہاں لاتے اور اپنی خواہش کے مطابق منافع کماتے تھے۔[1]

میر حسن دہلوی نے فیض آباد کے بازار اور چوک بازار کی تجارتی خرید وفروخت کی سرگرمیوں کا اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں یوں ذکر کیا ہے۔

کھلا بازار اور رستے کشادہ — بیاضِ جدولی ہو جیسے سادہ
دو رستہ اہل حرفہ اور دوکاندار — لڑی موتی کی ہو جیسے نمودار
جو کوئی شام کو وہاں چوک جاوے — شب راحت کا دن کو حظ اٹھاوے

بازار فیض آباد کا منظر ملاحظہ ہو:

اِدھر کو جوہری اُدھر کو بزّاز — اِدھر صراف اور اُدھر طلاساز
جواہر کا کھڑے دلال لیں نام — میاں صاحب جواہر کا کہو کام
روپے اور اشرفی دیکھے برستے — دھرے تختوں پہ جوں نرگس کے دستے
کناری اور گوٹے وہاں مسلسل — مثالِ برق کرتے ہیں جھلا جھل
کہیں تربوز وخربوزوں کے انبار — کھڑی ہیں مالنیں لے کر کہیں ہار
کوئی مصری کے گنے کہہ پکارے — کوئی کہتا ہے بیٹھے ہیں کنارے
یہ فرنی اور فالودے کا عالم — کہے تو چاند اور تارے ہیں باہم
سراسر بیٹھے ہیں میوہ فروشاں — بھرے انبار سے میووں کی دوکان
دھرے ہیں خوانچے ان میں سراسر — پکارے ہے ہر اک اپنی صدا کر
کوئی کہتا ہے کیا نمکین بنے ہیں — کوئی کہتا ہے مرچوں کے چنے ہیں
لیے بیٹھا ہے کوئی سونٹھ کھٹی — پکارے ہے کوئی مصری کی پٹی

1۔ تاریخ فرح بخش (انگریزی ترجمہ) 2/ص 8۔

خطائی بیچتے ہیں کہہ کے مکھ پاٹ
کہ ہندستان والی ہے تری چاٹ

کہیں خشکا ہے اور سالن کہیں ہے
کہیں مچلو نہ اور پاچن کہیں ہے

لیے پھرتے ہیں شہدے روٹیوں کو
کہ لے سستی ہیں آدمی ڈیڑھ میں دو

ملائی دودھ کو دیکھو تو گویا
اسی میں مال حلوائی نے کھویا

کوئی لے کھیر کے بیٹھا ہے کاسے
یہ کہتا ہے کہ لے دودھ اور بتاسے

صدائیں ریوڑی والوں کی وہاں ہیں
کڑاکڑ بولتی غلابیاں ہیں

بلندی میں وہ حلوائی کی دوکان
ستارے گرد ہوں جن کے چراغاں

دھری ہیں گولیاں اور یوں اندر سے
کہ گویا چاند اور تارے ہیں برسے

وہ پیڑے روشن الدولہ کے ہاں کے
یہ کہتے ہیں پکارے اور ہانکے

مزا پڑ جائے برفی کا جنھوں کو
سدا چاٹا کریں اپنے لبوں کو

کھٹیوں اور گلابی لوزلوں کے بعد میر حسن سوہن حلوے کا ذکر کرتا ہے۔

نہ دیکھا ہم نے ایسا حلوہ سوہن
کہ ہو دیکھے سے جس کے شیریں تن من

خصوصاً ان میں وہ حبشی جو ہے وہاں
ملا ہے اس میں گویا آب حیواں

مٹھائی کی کروں تعریف تا چند
قلم کی ہو گئی اب تو زباں بند

جہاں قہوہ ہے اور سپیاری وبن
بساطی بیٹھے ہیں نیچے دکاں چُن

وہ دیکھی جنس ان کی جب سے پُرکار
نظر سے گھر گیا خانم کا بازار[1]

اپنے عدل اور عمدہ نظامِ حکومت اور بلا لگان میں اضافہ کیے نواب سعادت خاں برہان الملک نے اودھ کی آمدنی کو بڑھایا تھا۔ اور شعبۂ مالیات میں باقاعدگی پیدا کی تھی۔ غلام علی نقوی کا بیان ہے کہ نواب ہذا نے اپنی وفات پر 9 کروڑ نقد خزانے میں چھوڑے تھے[2] لیکن نواب صفدر جنگ کے زمانے میں اقتصادی زبوں حالی کا دور شروع ہوا۔ اس کی وجہ نواب صفدر جنگ کی فضول خرچی اور سخاوت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ غربا اور مساکین کے ساتھ بڑی

1. مجموعۂ مثنویات میر حسن/ 148، 151۔
2. عماد/29 تاریخ محتشم/ 11الف۔

دریادلی کے ساتھ پیش آتا تھا، جب کوئی گدا اس کے روبرو دست سوال دراز کرتا تھا تو نواب اسے پچاس اشرفیاں مرحمت کرتا تھا[1] تمام عمر اس کا یہی انداز رہا۔ صفدر جنگ کے بہت سے ایسے خطوط بھی ملتے ہیں، جو اس نے اپنے نائبوں کو لکھے تھے کہ وہ سیدوں اور دوسرے پرانے خاندانوں کی جاگیریں واپس کردیں، اور وظیفے دوبارہ جاری کردیں۔ جو افسران نے ضبط کر لیے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاگیردارانہ نظام کے مسموم اثرات اودھ کے اقتصادی نظام میں سرایت کر گئے۔ اور اس ریاست کا بھی وہی حال ہوا جو جاگیردارانہ نظم پر چلنے والے ممالک کا ہوتا تھا۔

1783 میں ولیم ہوجز فیض آباد گیا تھا۔ اس نے وہاں زوال کے آثار دیکھے، کیونکہ اس سے قبل نواب آصف الدولہ نے اپنا مستقر لکھنؤ کو بنا لیا تھا۔ اس سیاح کا بیان ہے کہ یہ شہر بہت وسیع تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہاں بہت بڑی آبادی تھی اور بیشتر نچلے طبقہ کے لوگ سکونت پذیر تھے لیکن اب زوال پذیر تھا۔ چونکہ لکھنؤ مستقر تھا اس لیے یہاں کے بڑے بڑے تجار، صرّاف، مہاجن، ساہوکار اور صناع یہاں سے وہاں چلے گئے ہیں۔ فیض آباد میں صرف عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں[2]

نواب شجاع الدولہ کی تخت نشینی اور بالخصوص بکسر (1764-1765) کی جنگ کے بعد اودھ کی اقتصادی زبوں حالی کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ نواب کی سرکار میں قریب ایک لاکھ پچاس ہزار سوار اور پیادہ تھے، پانچ سو ہاتھی، تین ہزار گھوڑے، علاوہ ازیں محکمۂ توپ خانہ رہکلہ، زنبور خانہ اور بان کے ملازمین[3] نواب کو جیسا کہ بعد میں مفصل لکھا جائے گا۔ کبوتر بازی اور مرغ بازی کا بھی شوق تھا۔ ان پرندوں کی اتنی بڑی تعداد تھی کہ ان کے دانے پر یومیہ ایک ہزار روپے صرف

---

1 حدیقۃ الاقالیم/386 "تاریخ محتشم (قلمی پٹنہ)" سخاوتش حد ندارد، با ہر کس کہ مساکین حرف می زد پنجاہ اشرفی بعد انقطاع کلام باوی بخشید وایں یکروز نبود بلکہ قاعدہ مستمرہ او ہمیں بودہ است واز سواران فوج و پیادہ گان بطرف ہر کس کہ بغور نگاہ می کرد دو روپیہ بحساب ماہواری اضافہ سوار می داد، وہ دہ روپیہ، پیادہ" ص 11 ب۔

2 William Hodges: Travals in India- PP 103

3 چہار گلزار شجاعی/221 ب

ہوتے تھے [1] بکسر میں نواب کی شکست کے بعد ان کے اور انگریزوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے نواب کو ان کے صوبے واپس کر دیے گئے، لیکن نواب سے الہ آباد اور کنڑہ کے ضلع لے لیے گیے۔ علاوہ ازیں انھیں جنگ کے تاوان کی صورت میں پچاس لاکھ روپے مزید اپنے خزانے سے ادا کرنے پڑے۔ اس کے ساتھ ساتھ نواب کو اپنے ہاں ایک انگریزی فوجی دستہ بھی رکھنا پڑا۔ جس کا خرچ ریاست کو برداشت کرنا پڑتا تھا [2] بنارس چیت سنگھ بن بلونت سنگھ کو دے دیا گیا [3] ان وجوہ کی بنا پر ریاست کی آمدنی تو کم ہوگئی مگر اخراجات بڑھ گئے۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس اقتصادی تنگ حالی سے مجبور ہو کر نواب نے وظیفہ خواروں پر ہاتھ ڈالا اور بقول طباطبائی ''اس جماعت کو جو لاکھوں سے زیادہ تھی، یک قلم روزینہ اور وجہِ معاش سے محروم کر دیا۔ ان کی آراضی اور دیہات کو ضبط کر لیا۔ جس کے نتیجے میں خلق اللہ ایسی تنگ ہوئی کہ بعض نے غیرت کے مارے اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے شرم کے مارے منہ نہ دکھایا، اور جان دی۔ اور بعض نے فقیری کا پیالہ لے کر در بدر بھیک مانگنی شروع کی''۔ [4]

جاگیرداروں اور عمال نے کاشت کاروں سے زیادہ مالیہ وصول کرنا شروع کر دیا۔ اگر ایک کاشت کار اپنا آبائی پیشہ ترک کر کے کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرتا تو اسے جبراً اپنے اصلی پیشے پر واپس

---

1. چہار گلزار شجاعی/221ب

2. سیر المتاخرین/(ا۔ت) 3 ص 183 انگریزی سرکار دوسرے طریقوں سے بھی زر وصول کرتی تھی۔ غلام علی نقوی کا بیان ہے کہ انگلینڈ سے بار بار گورنر جنرل کے نام ''فرمان تاکید ارسال زر از ہندستان شد/عماد/172، نیز دیکھیے۔ جارج فورسٹر 189 ,17.90 مصحفی نے بھی اس کا ماتم کیا ہے:

افسوس کہ لی چھین نصاری کی سکوں نے ☆ لوں ہاتھ سے اس فرقۂ اسلام کی روٹی

دیوان مصحفی دوم (رام پور) ص 188 الف۔

ہندستان میں دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی ☆ کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی ہے

دیوان مصحفی دوم (رام پور) ص 188 الف۔

3. George Forster: Travels-1-PP-191- 99

4. سیر المتاخرین (ات) 3/93۔

لایا جاتا۔ اودھ میں اندرونی بدنظمی اور عمال کی دست درازیوں کی وجہ سے کاشت کاروں نے زرعی کاموں سے ہاتھ کھینچ لیا۔ زمینیں بنجر اور غیر آباد ہوتی گئیں، حالانکہ نواب شجاع الدولہ کی سخاوت وفیاضی شہرۂ آفاق تھی۔ لیکن بقول جارج فورسٹر نواب زر و روپے کی تحصیل اور جمع کرنے میں کافی سختی سے کام لیتا تھا۔[1] سیاح ہذا آگے لکھتا ہے کہ نواب شجاع الدولہ بڑا دور بین اور چالاک تھا۔ جب اس کے سامنے کوئی مقصد نہ ہوتا تو وہ لوگوں کی بھلائی اور فلاح و بہبود کی طرف مائل ہوتا اور دست درازی اور ظلم سے پرہیز کرتا تھا۔[2] اٹھارھویں صدی میں آنے والے انگریز سیاحوں نے اودھ کی اقتصادی زبوں حالی کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس اقتصادی تباہی کے وجوہ پر بھی روشنی ڈالی ہے جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

نواب شجاع الدولہ کے دور میں اودھ کی بیرونی تجارت کو بڑا نقصان پہنچا۔ نواب نے کمپنی سے اجازت لے لی تھی، کہ یورپ اور بنگال سے اودھ آنے والی چیزوں پر وہ بھاری ٹیکس لگائے۔[3]

نواب آصف الدولہ کے دورِ حکومت میں نواب کی تغافل شعاری، عیش پرستی اور بے جا اسراف کی وجہ سے اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ نواب سخاوت کے نام پر فضول خرچی کرتا تھا۔[4] اس کا کوئی کارخانہ شاہانِ مغلیہ سے کسی بھی صورت کم نہ تھا۔ باورچی خانہ کا یومیہ خرچ سترہ سو روپے تھا، فیل خانے میں دو ہزار[5] ہاتھی تھے۔ جو صرف شکار کے دورے کے زمانے میں استعمال ہوتے تھے ورنہ بے مصرف تھے۔ ابوطالب لندنی کا بیان ہے خرچ فیل خانہ واصطبل و بازیخانہ

---

1. George Forster, 1/213.

2. George Forster, 1/211.

3. George Forster, 1/191-192

4. اس کے اسراف کا یہ عالم تھا کہ اس دور میں یہ کہا جاتا تھا۔ کہ جسے نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت چلانے کو روپیہ نہ رہا۔ میر حسن/102-101۔

5. ہوجیج نے لکھا ہے کہ نواب کے اصطبل میں بڑی تعداد میں ہاتھی تھے۔

Hodges: PP 100-101

نیز دیکھیے Twining: PP. 313۔

اوازیں جا قیاس باید کرد" کہ ہزار دو صد فیل و دو سہ ہزار اسپ و ہزار سگ راتب خور ہستند، از آنجملہ چہار صد فیل و پانصد اسپ و صد سگ لائق سواری و شکار در آن میان خواہد بود، باقی محض حرام خوراں، بجہت راہ وزدی آنہارا داشتہ اند" ملازمین کی حالت یہ تھی کہ اگر ان کتوں میں سے کوئی کتا مر جاتا تو وہ دوسرا کتا سڑک سے پکڑ کر اس گروہ میں شامل کر دیتے۔ اسی طرح کبوتر خانہ، مُرغ خانہ، دنبہ اور آہو و میمون، سانپ، عقرب اور عنکبوت خانوں کا اتنا بڑا خرچ تھا کہ اگر وہ اخراجات موقوف کر دیے جاتے تو نواب مرحوم (نواب شجاع الدولہ) کی اولاد کی کفالت کے لیے کافی ہوتا۔ تین لاکھ کبوتر تھے [1] ان اخراجات کے علاوہ شاگرد پیشہ لوگوں کی تنخواہیں تھیں دو ہزار فراش، ایک ہزار چوبدار، چار ہزار باغ بان اور سیکڑوں باورچی تھے۔ اسی طرح شکار میں جانے کے موقعوں کے لیے اسباب خیمہ برداروں کی تعداد ہزاروں کے قریب تھی، ان اخراجات کے علاوہ ہولی بازی متبنیٰ، اولاد کی شادیاں [2]، اور چراغاں میں لاکھوں روپے صرف کیے جاتے تھے [3] اشیائے خورد و نوش افراط سے خریدی جاتی تھیں۔ نواب نے حکم جاری کیا تھا کہ برف، گل کیوڑہ، اور اسی قسم کی دوسری چیزیں کوئی بازار میں فروخت نہ کرے بلکہ سرکار کے کارخانوں کے ہاتھوں فروخت ہوں [4] ہر سال ولایتی میوے اس بڑی مقدار میں خریدے جاتے تھے کہ کل میزانیہ ایک لاکھ روپے کو پہنچ جاتا تھا۔ وہ تمام میوے امرا اور رفقا میں تقسیم ہوتے تھے۔ [5] نواب کو انگریزی سامان خریدنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک گھڑی ایک لاکھ روپے

---

1 نواب چیونٹیوں اور مکڑیوں سے شغل کرتے تھے اور ان حشرات کی نگہبانی میں صد ہا روپے صرف کرتے تھے۔ تاریخ اودھ 3 / 273۔ نواب نے ایک چڑیا گھر بھی کھولا تھا۔ جس میں ہزاروں پرندے اور درندے تھے۔ اور سرکار ان کا خرچ برداشت کرتی تھی۔ Twining: PP 212-13

2 ان شادیوں میں کم سے کم بیس لاکھ اور زیادہ سے زیادہ چالیس لاکھ روپے صرف کیے جاتے تھے۔ تاریخ اودھ 3 / 305-306۔ دل بادل ہاتھی کی شادی کی تفاصیل دیکھیے۔ تاریخ اودھ 3 / 274-273۔ تفضیح الغافلین / 134۔

3 تفضیح الغافلین / 48-49، تاریخ اودھ 3 / 155۔

4 تاریخ اودھ 3 / 351۔

5 تاریخ اودھ 3 / 299۔

کی خریدی تھی۔ یہی حال دوسری چیزوں کے بارے میں تھا[1] کروڑوں روپے عمارتوں کی تعمیر میں صرف کیے[2] نجف اشرف میں نہر کھدوانے کے لیے پانچ لاکھ روپے بھیجے۔[3]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خزانہ خالی ہوگیا، سپاہ برطرف کرنی پڑی، ریاست میں چاروں طرف بد نظمی پھیلی ہوئی تھی[4] علاوہ ازیں سپاہ کو تنخواہ نہ ملتی تھی۔ میر حسن دہلوی نے ملازمین کی تنخواہیں نہ ملنے کا ذکر اس شعر میں کیا ہے۔

ہے غنیمت جو اس زمانے میں اپنی تنخواہ پائے جاتا ہے
ورنہ بے روزگاریوں کا غم ایک عالم کو کھائے جاتا ہے

نواب شجاع الدولہ کے زمانے سے دو ہزار ملازم چلے آرہے تھے۔ ان کو آصف الدولہ کے زمانے میں پندرہ ماہ سے تنخواہ نہ ملی تھی۔ پہلے تو ان ملازمین نے بڑی عاجزی اور انکساری سے اس بات کی کوشش کی کہ ان کی تنخواہیں ادا کردی جائیں، لیکن جب ان کی کسی طرح شنوائی نہ ہوئی تو انھوں نے نواب کی کوٹھی کا محاصرہ کرلیا، جا بجا توپیں لگادیں، شہر میں عجب ہنگامہ برپا ہوگیا۔ انجام کار نواب نے ان سپاہ کو برطرف کردیا جو نانِ شبینہ کے لیے دربدر مارے مارے پھرنے لگے[5] ان

1. Hodges: PP 101-102۔

2. امام باڑہ اور رومی دروازے کی تعمیر کے اخراجات دیکھیے۔ تفضیح الغافلین/ 114، 112،
نیز Twining PP311-312۔

3. برائے تفصیل دیکھیے تذکرہ گلشن ہند/ص 11، تاریخ اودھ 3/ 299 برائے دیگر اصراف ملاحظہ ہو، ایضاً 3/ص 155-156، لاکھوں روپے آتش بازی میں صرف ہوتے تھے، 3/ 183، برائے سخاوت دیکھیے ایضاً 3/ص 333، 332، 358، 375، 279، 278، 277، 275۔ تفضیح الغافلین/ 48-49 ان فضول خرچیوں کی وجہ سے عوام پر برا اثر پڑتا تھا۔ دیکھیے، تاریخ فرح بخش 2/ 83۔

4. تاریخ اودھ 3/ 90۔

5. چہار گلزار شجاعی/ 71 ب۔ 72 الف، 51 ب، نیز دیکھیے تاریخ اودھ 3/ 113-114 سیر المتاخرین (ا۔ت) 3/ 111۔ Polier: Shah Alam, II and His Court: PP 107-108

کلیات انشا:۔ تم سے ہم یوں اڑے ہیں بوسے پر ☆ پر مانگتے جیسے ہوں سپاہ خرچ (باقی صفحہ 351 پر)

حالات میں نواب کو انگریزی فوجی دستوں کے اخراجات بھی ادا کرنے پڑتے تھے، جو کسی بھی صورت میں ادا نہ ہو سکتے تھے، اور بڑی زیر باری کا سامنا کرنا پڑتا تھا[1] رفتہ رفتہ رزیڈیٹ ہر جزوی وکلی معاملات میں حاوی ہوتا گیا[2] نواب نے اپنی والدہ اور دادی پر بڑی سختیاں کیں، اور کئی مرتبہ زبردستی روپیہ وصول کیے[3] فیض آباد میں مقیم شاہی افراد اور ان کے ملازمین کی اقتصادی زبوں حالی کی دل دوز داستان تاریخ اودھ میں مذکور ہے[4]

ان حالات میں نواب سے یہ توقع رکھنی کہ وہ صنعت وحرفت، دست کاری، زراعت تجارت اور دیگر پیشوں کی سرپرستی کرے گا بے سود تھا۔ اگر ابو طالب لندنی کے بیانات پر اعتماد کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صنعت وحرفت کی سرپرستی تو درکنار وہ ان صنعتوں کی تباہی کے درپے تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ " باوجود ایں کہ برف سازان مکرر التماس نمودند کہ اگر حکم فروختن بدہند، زیادہ از حال برائے ودحیرہ سرکار جمع می کنیم، وخرچ ہم کمتر خواہد شد، رخصت نداد،"[5]

اسی طرح نواب نے باغ بانی کے پیشہ وروں کو تباہ کیا جو اس کام کے ذریعہ اپنی روزی کماتے تھے۔ حالانکہ لکھنؤ اور فیض آباد کے اردگرد نواب کے دو ذاتی باغ تھے۔ اور ان میں اس قدر میوے اور پھل پیدا ہوتے تھے کہ ہزاروں بیچ لوگ جو ان کی رکھوالی کے لیے ملازم تھے کھاتے تھے، اور پھر بھی بچ رہتے تھے۔ اور گل سڑ جاتے تھے لیکن آم کی فصل کے زمانے میں وہ فیض آباد اور لکھنؤ کے عام رعایا کے باغوں کو ضبط کر لیتا تھا۔ اور بعض مرتبہ تو یہاں تک نوبت پہنچ جاتی تھی کہ پیادے جو اس کام کے لیے مقرر ہوتے تھے، مالکان، باغات کے مکانات تک نیست و نابود کر دیتے تھے۔ نواب نے کیوڑے، گلاب، اور دیگر خوشبودار پھولوں کی فروخت پر پابندی لگا دی تھی کہ لوگوں کو

(بقیہ صفحہ 350 کا) ص40، تفضیح الغافلین/123 تاریخ فرح بخش (انگریزی ترجمہ) ص40 ,30۔

1. تاریخ اودھ 3/ 165 -156۔

2. تاریخ اودھ 3/ 116 ,112۔

3. تاریخ اودھ 3/ 59 ,54۔

4. تاریخ اودھ 3/ ص 227 ,222، شہزادوں کی زبوں حالی کے لیے دیکھیے۔ تفضیح الغافلین/46,48۔

5. تفضیح الغافلین/62

بنگال سے عرق کیوڑہ منگوانے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ اس وجہ سے اس عرق کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ ابو طالب لندنی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اپنی اولاد کی شادیوں کے زمانے میں اشراف لوگ جنگلوں سے پھول منگوا کر مہمانوں کے لیے ہار گندھواتے تھے، کیونکہ شہر میں کوئی شخص پھول فروخت نہ کر سکتا تھا۔ وہ پھل جو قلیل المقدار ہوتے تھے، ہمیشہ ضبط کر لیے جاتے تھے۔ اسی طرح آم اور خربوزے کی فصلوں کی فروخت پر پابندی عائد کر دی جاتی تھی۔ نواب نے چھینٹ سازی کی صنعت کو بڑا نقصان پہنچایا۔ ابو طالب لندنی کا بیان ہے۔

"واز اسباب و پوشاک و سائر اشیاے آسائش انچہ کہ بضبط تواند آمد، نیز قرق می باشند، چنانچہ شخصے اختراع صنعت جدید کردہ، چھینٹ ہائے نفیس در لکھنو بروئے کار آوردہ، وزیر فرمود کہ انچہ ساز" وہمہ رابوئے رساند۔ اتفاقاً جامہ بہماں چھینٹ در بر کسے بنظرش در آمد، استاد چھینٹ ساز را باآنکہ مرد آدمی و استاد چہار صد پانصد شاگرد بود، خرسوار کردہ بشہر گردایند"[1]

یہی طرزِ عمل تجاروں کے ساتھ تھا، مثلاً گھوڑے اور دوسری چیزوں کے فروخت کرنے والے جب تک پہلے نواب کے ہاں مال فروخت نہ کریں اور راجہ مہرا کی زبان اور ہاتھ سے اذیتیں نہ اٹھائیں کسی غیر شخص کو مال فروخت کرنے کی قدرت نہ رکھتے تھے۔ یہی رویہ دوسرے پیشہ وروں اور صناعوں کے ساتھ[2] حیدر بیگ خان اور اس کے اہلکاروں کے مظالم اور رشوت خوری اور مال گزاری کی زیادہ وصول یابی کے سبب سے کاشت کاروں نے زراعت کرنے کی طرف سے غفلت برتی، زمینیں بنجر ہو گئیں۔ ابو طالب کا بیان ہے۔

"د باید دانست کہ اظہار حیدر بیگ خاں سراسر است، کثرت ظلم، و ویرانی ملک سردار داند و نقص از خیانت۔ اما حقیقت ظلم و ویرانی اینکہ سردار ملکیت کہ قبل ازین بصد سال بقدر کروڑ روپیہ حاصل

---

1. تفضیح الغافلین/62-63۔
2. تفضیح الغافلین/63۔

داشتہ، در عہد نواب مرحوم شاید تا بست لکھ بعمل می آمد، و عاملان حیدر
بیگ خاں زیادہ از دوازدہ لکھ وصول نہ کردند، و کرنیل، بست و دو لکھ
روپیہ بلا خرچ، بسر کار وزیر رسانیدہ و باعث کمی جمع ملک باین درجہ
راجہائے حرام خور بغرض ہائے نفسانی شدہ اندو رعایا مدار معاش
خود بر منافع مواشی گزاشتہ عمل زراعت موقوف کردہ چنانچہ دیہے کہ
صد سال قبل دو ہزار جمع آں بود حالا صد روپیہ جمع آید۔"[1]

1784 میں الہ آباد کی زراعت کے بارے میں لکھے گئے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ تین سالوں سے زراعت سے کاشت کاروں نے غفلت برتی، اور سرکاری آمدنی بہت کم ہو گئی تھی۔[2] 1794 میں جب جورج فورسٹر کا گزر الہ آباد سے ہوا تو اس نے مشاہدہ کیا کہ زیادہ تر مزروعہ زمینیں بنجر پڑی تھیں۔ جس کی وجہ اودھ سرکار کے حکام کی دست درازیاں تھیں[3]

بھولا ناتھ، جو بخشی کے عہدے پر فائز تھا، اہل کاروں اور دیگر ملازموں سے رشوت لیا تھا۔ جس کی بنا پر عمال زراندوزی کے لیے رعایا پر دست درازی کرتے تھے، سپاہ تباہ حال تھی[4] حیدر بیگ خاں، نائب سلطنت نے جواہرات اور طلا کی صورت میں بے حد دولت جمع کر رکھی تھی۔ اس کی وفات کے بعد ضبطی کے قانون کے مطابق پہلے تو اس کی دولت ضبطی میں آئی، لیکن وہ تمام دولت اس کی مستورات کے قبضے میں دے دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے ملازمین نے اس دولت پر ہاتھ مارا، محمد حسین، خدمت گار کے ہاتھ قریب ایک لاکھ روپیہ لگا[5] اس طرح اودھ کی دولت سرکاری کارکنوں اور اہل کاروں کے قبضے میں تھی۔ ابو طالب لندنی کا بیان ہے کہ حیدر بیگ خاں کے زیر اثر رشوت خوری اور خیانت کا دور دورہ شروع ہوا اور اس سے ساز باز کر کے اہل

---

1 تفضیح الغافلین/68۔

2 Selections from the Letters (Cal-1890) III.PP.3,5۔

3 George Forster :Travels in Inida 1:PP.89-90

4 برائے تفصیل ملاحظہ ہو، تفضیح الغافلین/84۔

5 تفضیح الغافلین/121-120۔

کاروں نے ''تصرفہائے مالکی کردہ اند'' چنانچہ دیوان وسرشتہ دار، بخشی وخزانچی کے دفاتر میں بھی یہ وبا پھیل گئی، ان کے اخراجات نواب کے اخراجات کے مساوی ہو گئے[1] یہ ارکان دولت ضیافتوں میں پانچ ہزار روپے تک صرف کر دیتے تھے[2]

اسی طرح نواب وزیر علی خاں اسراف پسند اور عیش پرست نواب تھا[3] بسنت کے جشن میں لاکھوں صرف کر دیتا تھا[4] نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں انگریزوں کا پورا تسلط ہو گیا تھا۔ اس نواب نے بھی، عیش وعشرت[5] اور تعمیرات میں جو کچھ بھی پس انداز روپیہ تھا صرف کر دیا۔ خزانہ خالی تھا۔ ریاست کی کل آمدنی ایک کروڑ چودہ لاکھ روپے رہ گئی تھی[6] کیونکہ نواب شجاع الدولہ نے 1764 کے عہد نامے کی رو سے کل آمدنی سے چھ آنے فی روپیہ انگریزوں کو دے دیا تھا[7] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خزانہ خالی ہوتا گیا۔ اور ملازمین کو سرکار سے تنخواہیں ملنی بند ہو گئیں[8] اور کئی ماہ تک تنخواہیں سرکار پر چڑھتی رہتی تھیں۔ لہٰذا جب کبھی سپاہ تنخواہ کی مانگ کرتی تو ان کو توپ دم کرنے کی دھمکی دی جاتی تھی اور اس طرح ان کو دبایا جاتا تھا[9] مرزا قتیل نے اپنے ایک خط میں اس معاشی تنگ حالی کا ذکر کیا ہے۔ مرزا امانی نے مرزا صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ شیخ محمد

1. تفضیح الغافلین/50, 121-122۔
2. تفضیح الغافلین/123۔
3. تاریخ اودھ 3/368, 378۔
4. تاریخ اودھ 3/375۔
5. نواب سعادت علی خاں نے تعزیوں کے دفنانے کے لیے پچاس بیگھے زمین کے چاروں طرف فصیل تعمیر کروائی اور اس کے اندر کچھ عمارتیں بھی بنوائیں۔ دیگر عمارتوں میں درگاہ حضرت عباس، مبارک منزل، کوٹھی دلارام، اور کوٹھی دلکشا اس کی تعمیرات میں سے ہیں سوانحات 1/169-172، مفتاح التواریخ/372، دیوان جرأت ب466 ب462
6. سوانحات 1/181-182 7. Memoirs of Delhi and Faizabad II, P.4
8. ملاحظہ ہو، رقعات مرزا قتیل/73۔
9. گلزار شجاعی/20 ب، 71 ب، 251 ب، تاریخ فرح بخش (انگریزی ترجمہ) 11/107-108, 30, 41، Polier P.P.107-108 سوانحات 1/181-182۔

حسین کو سرکاری ملازمت دلا دیں۔ مرزا صاحب نے جواباً مرزا امانی کو لکھا ''نوکری در سرکار ایشاں خیلے مشکل ست، کسانے کہ ایں سرکار را ندیدہ اند ہوس دارند و آنہا کہ نوکر اند در فکر ترک بسر می برند لیکن توقفے کہ در ترک نوکری رو مید ہد از سبب نیامدن تنخواہ ہست، در انتظار برآمدن تنخواہ اول تنخواہ دیگر جمع می شود و بیچار ہا ایں قدر پول بخانہ ندارند کہ از تنخواہ دست بردارند''۔[1]

اودھ سرکار مقروض ہو گئی تھی 1780 میں یہ قرض ایک کروڑ چالیس لاکھ ہو چکا تھا۔[2]

امرا کی فضول خرچیاں

نوابان اودھ کے امرا بڑے خراج تھے اور اسراف بے جا میں مبتلا تھے۔ حیدر بیگ خاں کی فضول خرچی کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ اس کے انتقال کے بعد راجہ ٹکیٹ رائے نے اس کے خاصہ کے اخراجات کا تخمینہ پچاس لاکھ لگایا تھا۔ اسراف بے جا کی لت نہ صرف وزیر، حیدر بیگ، مرزا حسن رضا خاں اور راجا ٹکیٹ رائے میں پائی جاتی تھی بلکہ ہر وہ شخص جس کے ہاتھ میں علاقہ یا مال آجاتا تھا وہ اس مرض میں مبتلا ہو جاتا تھا کیونکہ اسے اس بات کا خوف رہتا تھا کہ مبادا اس کی دولت پر حکومت دست درازی کرے۔ چنانچہ الماس خاں کے چیلے فتح علی خان نے چند سالوں میں تقریباً بیس لاکھ روپے صرف تماشہ بینی میں ضائع کیے تھے۔ اور الماس خاں کے دیوان نے اتنی تعداد میں سرائیں، تالاب، مسجدیں اور مندر تعمیر کروائے تھے کہ ان کی تعمیرات میں بیس لاکھ روپے لکھنؤ میں صرف ہوئے ہوں گے۔ الماس خاں، بعضے عمال اور ٹکیٹ رائے کے رفقا میں سے ہر ایک کے اتنے زیادہ اخراجات کہ اس سے پہلے زمانے میں نواب شجاع الدولہ کے اخراجات تھے۔ یہی حال دوسرے عمال کا تھا۔ اس وجہ سے لکھنؤ کے شرفا بدحالی میں گرفتار، نانِ شبینہ کے لیے محتاج اور خانہ خراب تھے۔[3] یہی حال عین الدین کی فضول خرچی کا تھا۔ ہر سال محرم کے زمانے میں وہ اپنے گھر کا تمام مال واسباب لٹا دیتا تھا۔ اپنے عروج کے زمانے میں اس نے تقریباً چالیس پچاس لاکھ روپے

1۔ رقعات مرزا قتیل/81۔

2۔ تاریخ اودھ 3/160۔

3۔ تفضیح الغافلین/57۔

اسراف بے جا میں لٹا دیے تھے۔[1]

جواہر علی خاں نے ہر قسم کے پیشہ وروں، علما، حکما، انشا پردازوں، تیراندازوں، پتھر سازوں اور بڑی تعداد میں سپاہ کی سرپرستی کی تھی، اور اس طرح کافی روپیہ صرف کرتا تھا۔ مزید برآں اپنے ملازمین کے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیوں کے موقعوں پر ان کی مالی امداد بھی کرتا تھا۔ جو ان کی تنخواہوں کے علاوہ ہوتی تھی۔ جواہر علی خاں کی رہائش گاہ دوسرے خواجہ سراؤں کے مقابلے بڑی شان دار تھی، اس کا مکان بہت لمبا چوڑا تھا، بڑی قیمتی اور عمدہ قالینیں بچھی تھیں، بیش بہا پردے پڑے تھے اور عیش اور آرام سے زندگی گزارنے کی دوسری چیزیں بھی کثرت سے تھیں، مسندیں کمخواب، ریشم اور مخمل کے کپڑوں سے تیار کی گئی تھیں۔ اس کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ جس پر عمدہ طشتریاں رکھی ہوتیں اور عمدہ اور مرغن کھانے چنے ہوتے تھے۔ اس کے دسترخوان پر بڑی تعداد میں مہمان ہوتے تھے۔ مجملاً اس کی سخاوت مشہور تھی۔[2]

عوام کی معاشی حالت

ان تمام باتوں سے بخوبی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اعلیٰ طبقے کے لوگ، جو کل آبادی کا ایک جزوی حصہ تھے، دولت مند اور خراج تھے، بڑے زمیندار اور حکمراں طبقہ بڑی عیش کی زندگی گزارتا تھا۔ اور وقت کی تمام اشیائے آسائش سے محظوظ ہوتا تھا۔ اور مستقبل سے بے نیاز ہو کر اسراف بے جا پر عمل پیرا ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ ایک متوسط طبقہ تجاروں، چھوٹے زمینداروں، سپاہیوں اور اہل کاروں کا تھا۔ ان میں تجار اور زمیندار کفایت شعار تھے، لیکن فوجی افسر اور رشوت خور اہل کار عیاش تھے۔ حالانکہ آج کے زمانے کے حساب سے اس زمانے میں ملازمین کی تنخواہیں قلیل تھیں۔ مگر اس زمانے میں اشیائے خورد و نوش کی فراوانی تھی اور یہ تنخواہیں کافی تھیں۔ صفدر جنگ نے ہندستانی گھوڑ سوار کی 35 روپے مغل گھوڑ سوار کی پچاس روپے اور پیادہ کی دس روپے ماہوار تنخواہ کر دی تھی لیکن سعادت علی خاں کے زمانے میں ایک سپاہی کی تنخواہ آٹھ یا دس روپے تھی، مگر وقت پر ادا نہ ہوتی تھی۔ ہم عصر کتابوں میں اس زمانے کے اقتصادی حالات کے بارے میں مواد کے فقدان کی وجہ سے عام لوگوں کی معاشی زندگی کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ لیکن سیاحوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے

1. تاریخ فرح بخش 11/ 60 ,59 ,48۔
2. تاریخ فرح بخش 11/ 57۔

کہ عوام کی حالت بہت خراب تھی موجودہ زمانے کی طرح اس زمانے میں بھی عوام کچے مکانوں اور جھونپڑوں میں گزر بسر کرتے تھے۔ اور پیٹ بھر روٹی اور تن ڈھکنے کے لیے کپڑے پر زندگی گزارتے تھے[1] 1794 میں جب ٹیوننگ کا گزر لکھنؤ شہر سے ہوا تو اسے بڑی حیرت ہوئی کہ اودھ کا مستقر دیکھنے میں اتنا زبوں حال تھا۔ وہ لکھتا ہے، گلیوں سے بار بار آمد ورفت کے بعد میں نے ویسی ہی زبوں حالی دیکھی جیسی میں نے باہر سے دیکھی تھی۔ اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت میں کوئی بڑی خرابی ہے، جس کا مستقر اور خاص شہر اس قسم کی تصویر پیش کرتا ہے۔ بلا تحقیق کے طرز حکومت کی بہت سی خرابیاں اور نقائص نمایاں ہیں'[2] یہ تمام اقتصادی خرابیاں نوابان اور امرا کی فضول خرچیوں کے نتائج تھے جن سے عوام متاثر ہوتے تھے[3]

اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں اودھ کے علاقوں میں امساکِ باراں کے سبب سے قحط عظیم کی صورت پیدا ہوئی۔ اتفاقاً اسی زمانے میں بنگال میں قحط پڑا۔ لہٰذا انگریزوں نے فیض آباد سے غلہ خرید کر بنگال بھیج دیا جس کی وجہ سے یہاں قحط پر قحط پڑ گیا[4] ہر چرن داس نے اس زمانے کی معاشی تنگ حالی کا یوں ذکر کیا ہے۔

> ''خلائق کہ از گرسنگی بسبب گرانی فقیر دشہدہ ولچہ شدہ، وسر پابرہنہ وگرسنہ میگر دیدند۔ ہر چہ از قسم طعام وغیرہ راباز ارو کوچہ وغیرہ دردست کسی مین یافتند، گرفتہ می بردندو می خوردند۔ طرفہ ماجرا ایں است کہ شخصے راشادی کتخدائی شدہ، اور دزدوم از کتخدائی ہمون پوشاک شادی برائے زیارت درگاہ رفت۔ چوں بردروازہ درگاہ

---

1. William Hodges: Travels in India- P 99

الہ آباد سے فیض آباد تک کے زرعی علاقے کے مفصل بیان کے لیے دیکھیے ایضاً ص 107-106۔

2. Twining : Travels in India- P.3|3

3. Twining : Travels in India- P.312

4. چہار گلزار شجاعی/ ب،249 الف،250. 1783-1784 میں فیض آباد اور لکھنؤ میں قحط زدہ لوگوں کی زبوں حالی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو۔ تفضیح الغافلین/ 95، تاریخ گورکھپور/ 9 الف۔ 10 ب

رسید۔ شخصے دستار از سرش گرفتہ گریخت داد برہنہ سر ایستادہ ماند"[1]

ہوجیج نے الہ اباد سے فیض آباد کے درمیانی علاقوں میں زراعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کاشت کاری متوسط درجے پر کہیں اچھی تھی اور کہیں خراب، اور جہاں کہیں بھی زراعت کی طرف سے غفلت برتی جاتی تھی اس کی سب سے بڑی وجہ کاشت کاروں کی غربت تھی، اگر حالات سازگار ہوتے تو وہ عمدہ فصلیں پیدا کر سکتے تھے۔ دیہات، جن کی کثرت تھی، کچھ تو بظاہر متمول نظر آتے تھے اور بقیہ تباہ و برباد معلوم ہوتے تھے۔ بنارس کے زرخیز اور سرسبز علاقے کو دیکھنے کے بعد سیاح ہذا کو اس بنجر اور برباد علاقے کو دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کیونکہ یہ تباہی نواب کی غفلت شعاری اور عمال کی دست درازیوں کی وجہ سے ظہور میں آئی تھی۔ دیہاتوں سے غربت اور افلاس ٹپکتا تھا۔ اٹاوہ شہر وسیع تھا، مگر مکانات خستہ تھے جن سے غربت کے آثار ظاہر تھے[2] یہی حال اودھ کے دوسرے علاقوں کا تھا[3]

تجارت کا زوال

اس زمانے میں تجارت زوال پذیر تھی۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ انگریزوں نے اشیائے تجارتی پر بھاری ٹیکس لگا دیے تھے اور ندیوں کے گھاٹوں پر بھی ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا[4] انگریز جو اشیا فروخت کرتے تھے ان پر ٹیکس معاف ہوتا تھا[5] مرزا پور، جو ایک زمانے میں ایسی تجارتی

1. چہار گلزار شجاع ص۔ الف، 250۔ ب، 249۔

2. William Hodges: Travels in India :. PP.109-110 , George Forster, Travels In India.1,P.84.

3. ایضاً / ص 112-110۔ اس کے برعکس ٹیوننگ نے لکھا ہے کہ بنارس کے مقابلے میں اودھ کی زراعت عام طور پر بہتر تھی۔ Twinning: Travels in India, P. 324

4. رقعات مرزا قتیل / 80

5. راجا بنارس اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ دیکھیے۔ G.W.Forster:- Selections from the Letters etc (Cal-1890) 1,PP.28-29

منڈی تھا کہ مغربی صوبوں اور دکن کے تجار وہاں آتے تھے، اپنی چیزیں فروخت کرتے تھے۔ بنگال اور شمالی ہند کے علاقوں، مثلاً نیپال، اور تبت سے آئی ہوئی چیزیں خریدتے۔ اس زمانے میں اپنی تجارتی مرکزیت کھو چکا تھا۔ بلونت سنگھ کے جانشین نے تجارتی اشیا پر بھاری ٹیکس لگادیے۔ 1781 سے مرزا پور کا زوال شروع ہوا1773 میں کمپنی نے راجا بنارس کو جتنی چنگی لگانے کی اجازت دے دی تھی، وہی زیادہ تھی، مگر راجہ نے اپنی طرف سے اس کو اور بڑھا دیا۔ یہ ٹیکس زبردستی وصول کرتا تھا[1] اس کی وجہ سے صوبوں کے مابین تجارتی رابطے ٹوٹ گئے[2] اس طرح چیت سنگھ نے بھی تجارتی چیزوں پر بھاری ٹیکس لگادیے تھے۔[3] 1775 کی ایک روداد سے پتا چلتا ہے کہ کمپنی نے اودھ سے تعلقات کے دوران میں جو بھی اقدامات کیے تھے۔ ان کا ایک مقصد ملک کی صنعت وحرفت کو تباہ کرنا اور ہر قسم کی اشیا سے محروم کرنا اور ملک کو مالی نقطۂ نظر سے کنگال کرنا تھا۔ ملک کو افلاس اور انتشار کی حالت میں مبدل کرنا تھا[4] اودھ پر انگریزوں کے تسلط سے قبل مئو ایک بڑی تجارتی منڈی تھا۔ مگر 1782 میں اس کی مرکزیت بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ حالانکہ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ مگر اس کی بربادی کا اثر ملک کے دوسرے حصوں پر بھی پڑا تھا۔ کیونکہ یہاں سے سرحدی پہاڑیوں کے علاقوں کے باشندوں کو زندگی کے لیے ضروری چیزیں اسی جگہ سے دستیاب ہوتی تھیں۔ وہ لوگ یہاں اپنے علاقوں کی چیزیں لاتے اور یہاں کی چیزوں سے بدل لیتے تھے۔ مئو کی تباہی کے بعد یہ تجارتی رابطہ ٹوٹ گیا۔ اور بنارس اور اودھ کے تجاروں کا پہاڑی علاقوں کے باشندوں سے بہت تھوڑا تعلق باقی رہ گیا[5] اس زمانے میں ریاست اودھ کے حدود میں سونے چاندی کی قلت تھی۔ جورج فارسٹر نے اس کمی کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نواب آصف الدولہ جو رقم

1۔ راجا بنارس اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ دیکھیے۔

2 G.W.Forster:- Selections from the Letters etc (Cal-1890) 1,PP.1\36

3 GeorgeForster's Travel in India- 1,P.126

4۔ راجا بنارس اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ دیکھیے۔

G.W. Forster:- Selections from the Letters etc. (Cal-1890)1, 28-29

5 George Forster's Travel in India 1,PP.126

کمپنی کے نام پر لکھنؤ کے خزانے میں جمع کرتا تھا وہ وہاں سے بنگال کو بھیج دی جاتی تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں کمپنی کی مالی حالت خراب تھی۔ اس طرح کمپنی کے جو ملازم لکھنؤ میں رہتے تھے انھوں نے بھی اپنی دولت اسی طرح منتقل کر دی تھی۔ سونا چاندی کی کمی کی وجہ سے اودھ کی تجارت میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ کیونکہ مال بھیجنے کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اگر روپیہ مہیا ہو جائے تو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر کسی ملک کے ذرائع آمدنی مسدود ہو جائیں تو وہ ملک تباہ ہو جائے گا۔ یہاں کی دولت یورپ بھیج دی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں یہاں تجارت کچھ مخصوص لوگوں کے ہاتھوں میں تھی اور حکومت کا تجارت پر بڑا دخل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بنگال کے بلوں کے ادا کرنے میں صرافوں کو ساڑھے سترہ فیصدی کا منافع ہوتا تھا، اس کی وجہ سے چاندی کی کمی ہوتی جاتی تھی [1] اس زمانے میں اودھ کی آبادی بھی کم ہو گئی تھی۔ اور تجارت جو اگلے وقتوں میں بڑی اہم تھی، برباد ہو چکی تھی۔ فارسٹر کا بیان ہے کہ جن خرابیوں نے ہندستان کو تباہ کیا تھا وہ سب خرابیاں اودھ میں بھی سرایت کر گئی تھیں۔ اودھ کو تباہی سے بچانے کے لیے ایک عقل مند اور منصف حکمراں کی ضرورت تھی۔ ان خرابیوں کو صرف ایسا ہی شخص دور کر سکتا تھا [2]

جاگیروں کی ضبطی

جاگیردار لوگ بڑے خراج ہوتے تھے۔ وہ زندگی کی آسائش کی چیزیں چاہے مہنگی ہی کیوں نہ ہوں، خریدتے تھے، اور اس طرح بلاواسطہ صنعت و حرفت اور تجارت کو بڑھاوا دیتے تھے۔ ان کی سرکاروں سے بڑی تعداد میں صناع اور ملازم منسلک ہوتے تھے، جب ان کی جاگیریں ضبط ہو گئیں تو وہ سب صناع بیکار ہو گئے۔ ان علاقوں میں زراعت، آبادی اور تجارتی سرگرمی سرد پڑ گئی [3]

انگریزوں کا تسلط

فارسٹر کا بیان ہے کہ اودھ میں تباہی کے آثار بڑے نمایاں تھے۔ انگریزوں اور اودھ کے آپسی تعلقات سے چاہے انگریزوں کو فائدہ پہنچا ہو لیکن ثانی الذکر کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا اور

---

1. George Forster Travels in Inida,1,PP.100
2. George Forster Travels in Inida,1,P.99
3. George Forster Travels in Inida,1,PP.100

ریاست کی تباہی میں انگریز بڑی حد تک ذمہ دار تھے۔[1]

جاگیردارانہ نظام کی خرابی

جاگیردارانہ نظام کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ بڑی تعداد میں نوکر پیشہ اور صناع کسی فردِ واحد کی ذات سے وابستہ ہوتے تھے۔ اس کے عروج اور زوال پر ان سب کی روزی کا انحصار تھا، اس شخص کے انتقال پر یا زوال کی صورت میں سیکڑوں لوگ بے روزگار ہو جاتے تھے۔ مثلاً صدر النساء بیگم زوجہ صفدر جنگ کی سرکار سے ہزاروں ہنرمند وابستہ تھے ان میں سے بہتوں کو بلاواسطہ اور بالواسطہ اس سرکار سے روزی ملتی تھی، سپاہ، دوکاندار اور اکثر مستحق افراد ان کی سخاوت سے فیض یاب ہوتے تھے۔ ان کی وفات ان سب لوگوں کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوئی۔ خواجہ سرا لکھنؤ کو سدھارے۔ ان میں سے کچھ نے حج بیت اللہ کی تیاری کی، کچھ نے افلاس اور تنگ دستی میں زندگی گزارنی شروع کر دی۔ محمد فیض بخش نے خود اپنی آنکھوں سے ان خادماؤں کو دیکھا جو ان کی زندگی میں بڑی آن و بان سے زندگی بسر کرتی تھیں۔ ان کے بعد قلعہ کی ایک پرانی عمارت میں زندگی بسر کرنے لگیں اور اس عمارت میں اس طرح رہتی تھیں جیسے کہ کسی گودام میں غلہ کے بورے بھر دیے گئے ہوں اور دو تین روپے ماہوار کی آمدنی پر زندگی گزارتی تھیں۔[2]

مختصر یہ کہ اس عہد کے ادب سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے آواخر اور انیسویں صدی کے ربع اول میں اودھ ریاست کی اقتصادی زبوں حالی زوال کے آخری منازل طے کر چکی تھی، اقتصادی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ ہر طرح کے ہنرور، صناع، پیشہ ور، علما، ادبا، حکما اقتصادی پریشانیوں میں سرگرداں تھے۔ انشاء اللہ خاں انشا نے اپنی بے قدری اور زبوں حالی کے بیان کے ساتھ ساتھ ہنروروں کی پریشانیوں کا نوحہ لکھا ہے۔

کہاں تک کروں میں زمانے کا شکوہ　　مصیبت ہے یوں تو سب اہلِ ہنر پر

---

1. George Forster: Travels in India. 1,P.100-101۔

2. تاریخ فرح بخش 1 / 251-252، شاہ کمال نے ایک مثنوی عہد آصفی پر لکھی ہے۔ اس مثنوی میں اس دور کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے، مصنف نے نواب آصف الدولہ کی وفات پر لوگوں کی بے روزگاری کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو تذکرہ مجمع الانتخاب /ص 23 ب

خصوصاً وہ جو وضع داروں میں ہیں یہاں — برستا ہے افلاس ہی ان کے گھر پر
ٹکا رام جانے رپیا دیکھیا تو — کھڑا بنیا کہتا ہے اب ان کے در پر
سلیمانی تلوار تو لے چکا ہے — لگائی ہے اب تاک شاید سپر پر
پڑا ہنہناتا ہے بن گھاس گھوڑا — ہوئے چار فاقے ہیں پیہم نفر پر[1]

غلام حسین ہدایت نے ایک شہر آشوب میں اودھ کے پیشہ وروں کی اقتصادی زبوں حالی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ مجملاً ان پیشہ وروں کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔

امیروں کا حال

ہے اس کے وقت میں غم سے انھوں کو کام
جو بیٹھ بنگلوں میں باغوں میں سنتے تھے ہنڈول

منصب داروں کا حال

سوال ہر ایک سے کرتے ہیں رہ میں منصب دار
سلام کرکے غریبی سے بھکاری کیسہ ٹٹول

سپاہ کا حال

سپاہی وہ ہیں مشت جوار گو ہے گراں
ہے زیادہ قدر کا نامرد کے گھر سے مول

ساہوکار اور تجار

تمام ساہو تجار ظلم سے جس کے
ہوئے ہیں لٹ کے گدایوں---تول

فقیروں کی حالت

فقیر فاقے سے نالاں پھرتے ہیں در در
کہ جیوں پکارتے پھرتے ہیں سنبد یوالوں کے غول[2]

1۔ کلیات انشا/96

2۔ کلیات ہدایت (قلمی انجمن ترقی اردو، علی گڑھ) ص 151-150۔ مرزا جنگا کی زبوں حالی کی (بقیہ صفحہ 363 پر)

میر حسن دہلوی نے اپنی زبوں حالی کے ذکر کے ساتھ ساتھ تمام ہنروروں کی اقتصادی پریشانیوں کا مرثیہ لکھا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہنرمندوں کی بے قدری

جو آگے تھے ہنر سو عیب ہیں اب ... نہ ہو کس طرح دکان ہنر بند
دامن سے کوئی جھٹکے ہے پھیرے ہے کوئی منھ ... کیا کیا ہیں خواریاں میرے مشتِ غبار میں
جنس آسودگی کی نہیں ہم پاس ... درد اور غم کے کارواں ہیں ہم
جن کا دماغ عرش پہ تھا اب ہیں پائمال ... کوٹھے پہ جو کہ رہتے تھے زینہ پہ آرہے
جز بے سروسامانی حسن سے ہم نے جہاں میں ... افسوس کہ کچھ اور سرانجام نہ پایا

ہو جو قسمت میں پریشانی تو وہ جائے کہاں
گو خدائی کے ہنر اہل ہنر جمع کریں

☆☆☆

بقیہ صفحہ 362 کا)..

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ رقعات مرزا قتیل 71-اودھ کی عام اقتصادی حالت کے مطالعہ کے لیے دیکھیے مخمس شہرآشوب دیوان شاہ کمال (قلمی) ص 618,631۔

باب ہفتم

لکھنؤ کا معاشرہ وتمدن

نوابان اُودھ کی طرز زندگی

نواب سعادت علی خاں برہان الملک اور نواب صفدر جنگ کا زیادہ تر وقت دہلی میں وہاں کی سیاست میں گزرا اور انھوں نے اپنی ریاست کا نظم ونسق اپنے نائبوں کے ذریعہ چلایا تھا۔ اس لیے حکومت کے سلسلے میں ان کے نظام اوقات کا ہمیں علم نہیں ہے۔ نواب شجاع الدولہ کا تعلق دہلی کے دربار اور وہاں کی سیاست سے بالکل نہ تھا۔ اور آخری زمانے میں شاہ عالم ثانی نے اسے برائے نام وزیر الممالک مقرر کیا تھا۔ اور اس زمانے میں یہ عہدہ صرف اعزازی حیثیت رکھتا تھا۔ شاہِ مغلیہ خود انگریزوں کی حراست میں تھا۔ اس لیے سلطنتِ مغلیہ کے نظم ونسق کے سلسلے میں اس کا بالکل عملی تعلق نہیں تھا۔ ایسی صورت میں وزیر الممالک کی کوئی حیثیت نہ تھی مگر شجاع الدولہ نے اس اعزاز کو قبول کرلیا تھا تاکہ عوام میں اس کا اقتدار بڑھ جائے۔ اس بنا پر شجاع الدولہ کا سارا وقت اپنے صوبوں میں ہی گزرتا تھا۔ لہٰذا وہ ریاست کے نظم ونسق کو بذات خود چلاتا تھا۔ سید کمال الدین حیدر کا بیان ہے کہ نواب صبح سویرے اٹھ کر جابجا چھاؤنیوں میں سپاہ کی قواعد، سوار و پیادہ اور توپ خانہ ملاحظہ کرتے، 9 بجے دربار کرتے۔ ارکان دولت اور وکلائے ہر ریاست ہندستان حاضر ہوتے تھے کیونکہ وہ وزیر الممالک تھے۔ دو پہر کو حرم سرا میں داخل ہوتے، بہو بیگم کے ساتھ طعام تناول کرتے تھے، سہ پہر کو خورد محل میں داخل ہوتے، اسی وجہ سے وہ محل چور محل کے نام سے مشہور تھا۔ وہاں سے نکل کر تفریح طبع کے لیے لہو ولعب شکار، پرند باغیچہ

میں جاتے اور ان کے ساتھ دو شکاری ہوتے تھے۔ چار بجے دستار مبارک سر پر رکھ کر سرکاری کاغذات ملکی و مالی ملاحظہ کرتے۔ رات کو محل سرا میں رہتے۔ لیکن جس رات کو کہیں باہر آرام کرتے تو پانچ ہزار روپے بطور جرمانہ بہو بیگم کو دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ خورد محل کی مستورات سے کئی اولادیں تھیں [1]

نواب شجاع الدولہ کو سیر و شکار کا بہت ذوق تھا۔ وہ چھ ماہ اپنی ریاست کے دورے پر اور شکار کھیلنے کی غرض سے جایا کرتے تھے، اور موسم برسات میں فیض آباد میں مقیم رہتے تھے [2] نواب نے فیض آباد میں شکار گاہ کا انتظام کیا تھا۔ پہلی شکار گاہ شہر کے مغربی جانب گرجی بیگ خاں کی مسجد سے گپتر گھاٹ تک ایک بہت وسیع جنگل تھا۔ اس جنگل کے دو سمتوں میں مٹی کی فصیل کھڑی کی گئی تھی، اور تیسری سمت میں گھا گھرا ندی بہتی تھی، اور اس علاقے کو محصور کرتی تھی۔ اس جنگل میں برائے شکار جانور مثلاً ہرن، بارہ سنگھے، چیتے، چیتل چھوڑ دیے گئے تھے۔ دوسری شکار گاہ مشرقی سمت میں موضع جنورا کے چھاؤنی گسائیں سے شروع ہو کر دریا کے کنارے کنارے چھ میل کے فاصلے تک پھیلی ہوئی تھی۔ مگر یہ شکار گاہ مکمل نہ ہو سکی اور نہ اس میں جانور ہی پالے گئے [3]

نواب شجاع الدولہ کو جنگ فیلان دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ 1184 ھ میں اس موقع پر تماشہ بینوں کا مجمع پچاس ہزار کا تھا، جب غالب ہاتھی نے مغلوب کا تعاقب کیا تو اس ہڑبونگ میں چھ اشخاص ہلاک ہو گئے [4]

نواب آصف الدولہ کو جو ریاست ورثہ میں ملی تھی اس کے نظم و نسق کو چلانے کے لیے پوری توجہ کی ضرورت تھی، مگر نواب میں ابتدا ہی سے اس کی اہلیت نہ تھی اور اگر اہلیت ہوتی بھی تو اس

1۔ سوانحات/90-89۔

2۔ تاریخ اودھ 2/156۔، Memoirs of Dehli and Faizabad 11, P.10

Observations etc, PP. 410-411

3۔ Memoirs of Dehli and Faizabad, 11,P.6

نیز ملاحظہ ہو چہار گلزار شجاعی، 194 الف و ب، 192-191 ب، و الف، 195 ب، 197 ب، 199 الف 201 الف، تفضیح الغافلین/ 57, 60۔

4۔ چہار گلزار شجاعی/201 الف۔

صورت میں بھی وہ مفلوج ثابت ہوتا۔ انگریزوں کا اقتدار کافی بڑھ چکا تھا، لہٰذا نواب نے ریاست کے انتظامی امور سے بے توجہی برتی اور لہوولعب میں مشغول رہنے لگا۔ طباطبائی اپنے ذاتی مشاہدہ کی بناپر لکھتا ہے کہ نواب شعور و خرد سے عاری تھا۔ اراذل اور پوچ لوگوں کی صحبت میں مصروف رہتا تھا۔ بجز لہوولعب کے کسی کام کی طرف، چاہے ملکی ہو یا مالی، متوجہ نہ ہوتا تھا۔ ہر صبح کو اٹھ کر دوپہر تک ایک باغ سے دوسرے باغ میں یا ایک جنگل سے دوسرے جنگل میں جاتا، فیل خانے کے تماشے میں بسر کرتا۔ دو تین دن کے بعد ہمیشہ ہاتھیوں کی لڑائی دیکھتا۔ پس ایسے ہی اشغال میں صبح و شام بسر کرتا تھا، اور کوئی دوسرا کام نہ تھا[1] چونکہ نواب کو افیون خوری کی لت تھی اس لیے صبح کو دیر سے بیدار ہوتا تھا[2]

نواب کو شکار سے بہت شغف تھا۔ سال میں دو بار ضرور شکار کھیلنے جاتے، یہ سفر عجیب سیر و تماشا کا منظر پیش کرتے تھے، ہر مقام پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا شہر لکھنؤ وہاں آباد ہوگیا، اس سفر میں لاکھوں روپے صرف ہوتے تھے[3] دو مرتبہ میر تقی میر بھی نواب کے ہمراہ شکاری قافلے کے ساتھ گئے تھے، لہٰذا انھوں نے بڑے مفصل دو شکارنامے لکھے ہیں[4]

نواب سعادت علی خاں صبح سویرے اٹھ کر گھوڑے کی سواری کرتے تھے۔ کیونکہ سواری کی بڑی

---

1 سیر المتاخرین (ا۔ت) 3/ 104، نیز ملاحظہ ہو، چہار گلزار شجاعی/249 الف، ٹیوننگ کی ملاقات نواب سے ہوئی تھی، وہ لکھتا ہے کہ نواب کے اخلاق میں نفاست اور شائستگی پائی جاتی تھی۔ اپنی سخاوت، داخلی اور خارجی، اور فضول خرچی میں نواب آصف الدولہ کا مقابلہ یورپ کے کسی شاندار بادشاہ سے کیا جاسکتا ہے۔

Travels in India: P.311

2 تفضیح الغافلین/61، تاریخ فرح بخش (انگریزی) 11/ 103،

3 سوانحات 1/ 18,181 تفضیح الغافلین/75، چہار گلزار شجاعی/259 الف، 255 الف دب، 256 الف، 259 ب، تاریخ فرح بخش 11/ 232۔

4 کلیات میر/874، 852، میر کی آپ بیتی/186-187، تذکرہ گلشن ہند/10-11، چہار گلزار شجاعی/249، الف، 255 الف و ب، 259 ب، عماد/137 James Forster (I) Oriental Memoirs etc. 11, 232

کلیات سودا 1/ 321,323۔

مہارت رکھتے تھے، بادشاہ فرخ سیر کی طرح نواب کو بھی عمدہ گھوڑے رکھنے کا شوق تھا۔ نواب موصوف نے دکھنی، عرب اور جنگلی گھوڑے گھوڑیوں کے تال میل سے ایسے گھوڑے پیدا کیے تھے جو سیرت وصورت میں عجیب وغریب تھے۔ گھوڑسواری کے وقت انگریزی لباس زیب تن کرتے تھے، سیر وسپاٹے پر روانگی سے پہلے مرشدزادے، ان کے داماد، اور اہل کاران برائے مجرا حاضر ہوا کرتے تھے۔ ہواخوری کے لیے اکثر وبیشتر دلکشا سایا پار دریا (گومتی) یا موسیٰ باغ تک جایا کرتے تھے۔ دو گھڑی کے بعد واپس آتے۔ اس کے بعد جلوس کی سواری نکلتی۔ خود ہاتھی پر سوار ہوتے اور دوسرے درباری بھی ہاتھی پر ہوتے۔ جب گھوڑے پر سوار ہوتے تو صرف دو خاص بردار یا چوبدار داہنے بائیں ہمراہ ہوتے یا مرزا کریم بیگ یا محمد غلامی خانہ زادان حضوری پر سوار، لباس انگریزی پہنے، آگے ہوتے یا چند شکاری کتے باز ار وگرد کچھ فاصلے سے پیش رو ہوتے۔ روزآنہ چوکی پر ہر فرقے کے بائیس سو آدمی حاضر رہتے۔ دربار کے بعد نو بجے ناشتہ ہوتا۔ اس موقع پر ان کے ساتھ مقربان خاص، مثلاً صمصام الدولہ مرزا مجو، مرزا محمد تقی خاں، شاعر ہندی، بیٹے نواب مرزا علی خاں، انشاء اللہ خاں، ڈاکٹر لا صاحب، میر ابوالقاسم خاں بن میر مدن سپہ سالار فوج نواب سراج الدولہ وغیرہ ہوتے۔ اور خواجہ سرایان برائے مجرا حاضر ہوتے تھے۔ باہر برآمدے میں انگریزی بینڈ بجتا تھا۔ تیسرا دربار ہوتا تو مقربان خاص حاضر ہوتے۔ گیارہ بجے دربار برخاست ہوتا۔ اور محل سرا میں چلے جاتے۔ اور کوچ میں بیٹھ کر حقہ پیتے، چوتھا دربار بارہ بجے دن کو ہوتا۔ آمد وخرچ کے کاغذات ملاحظہ کرتے۔ شام کے وقت بگھی پر سوار ہوکر باہر نکلتے اور کوچوانی کے فرائض خود ہی انجام دیتے۔ اس موقع پر بختاور سنگھ کے ترک سوار اور اردلی ساتھ ہوتے، بعض مرتبہ تامجان کی سواری پر نکلتے۔ کبھی کسی گنج کی طرف جاکر غلہ کا نرخ پوچھتے، سال میں دو مرتبہ ریزیڈنٹ کے ہاں سالگرہ شاہ لندن اور بڑے دن کی تقریبیں ہوتیں، ان موقعوں پر ساٹھ ستر ہزار روپے صرف ہوتے۔ مرشدزادوں اور دامادوں کو کشتیاں اور امرا کو گوٹے کے ہار مرحمت ہوتے، اور آتش بازی چھوڑی جاتی تھی۔[1] دربار عام جمعہ کے دن ہوتا تھا۔[2]

نواب سعادت علی خاں شکار کھیلنے کا ذوق رکھتا تھا۔ رقعات مرزا قتیل میں کئی جگہوں پر اس

1. سوانحات 1 / ص 185، 183۔

2. رقعات مرزا قتیل/92۔

بات کا ذکر پایا جاتا ہے اور ان موقعوں پر مرزا قتیل بھی نواب کے ہمراہ ہوا کرتا تھا۔ ایک جگہ پر مرزا قتیل نے لکھا ہے کہ نواب "بطرف امیٹھی کلاں رو بآلہ آباد برائے شکار رفت"[1] نواب موصوف کو بندوق چلانے میں پوری دسترس حاصل تھی، جب نواب شکار کھیلنے کے لیے روانہ ہوتے تو ہزار ہا آدمی اور اوباش ان کے ہمراہ ہوتے۔ معمول یہ تھا کہ کچھ رات رہے سوار ہوتے، فانوس کی روشنی میں سفر طے ہوتا، شہنا نواز شہنائیاں بجاتے، اور خوانچے والے ہر قسم کی فواکہات فروخت کرتے اور زور زور سے پکارتے پھرتے[2] انشاء اللہ خاں انشا نے نواب موصوف کے لیے شکار نامے لکھے ہیں۔ اور جنگل کے مناظر اور شکار کھیلنے کے واقعات جزوی اور کلی انداز میں بیان کیے ہیں[3]

کھیل اور تفریحی مشاغل

شکار کھیلنے کے علاوہ کچھ ایسے تفریحی مشاغل بھی تھے جن سے نوابان اودھ مستقر میں قیام کے زمانے میں حظ اٹھاتے تھے۔ مثلاً چوپڑ بازی۔ نواب شجاع الدولہ کو چوپڑ کھیلنے کی بری لت تھی۔ تاریخ احمد شاہ میں لکھا ہے کہ شجاع الدولہ اِس کھیل کا اس حد تک گرویدہ تھا، کہ میدانِ جنگ میں بھی وہ انتظامی امور کو نظر انداز کر کے چوپڑ کھیلنے میں مشغول ہوگیا۔ بکسر کے میدان میں انگریزوں کے ہاتھوں اس کی شکست کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ چوپڑ کھیلتا رہا۔ اور فوج کی تنظیم وغیرہ کے مسائل کی طرف کوئی توجہ نہ دی[4] چوسر بازی۔ نواب آصف الدولہ کو چوسر کھیلنے کا شوق تھا اور اپنا زیادہ تر وقت اس بازی میں صرف کرتا تھا[5]

---

1. رقعات مرزا قتیل/78 ,70 ,69 ,49 ,40۔
2. سوانحات سلاطین 1 / 180-181۔
3. کلیات انشا۔ مثنوی شکار نامہ کہ حسب الارشاد جناب عالی مستعالی دو سفر دو بر بردہ بقید تاریخ بطریق روزنامچہ نوک قلم آمد۔ 352 ,347۔
4. تاریخ احمد شاہی (قلمی) ص 4ب۔
5. سیر المتاخرین (ا۔ت) 3/ ص 104۔

پتنگ بازی

نواب شجاع الدولہ[1] اور آصف الدولہ[2] پتنگ اڑایا کرتے تھے۔ان کے لیے عمدہ پتنگ اور مانجھے تیار ہوتے۔اسی طرح درباری امرا پتنگ اڑاتے اور نوابان سے ان کے مقابلے ہوتے تھے۔

کبوتر بازی

نواب شجاع الدولہ کے ہاں دو ہزار کبوتر پلے ہوئے تھے[3] نواب آصف الدولہ کے ہاں پلے ہوئے کبوتروں کی تعداد تین لاکھ تھی۔اور ان پر کافی رقم صرف ہوتی تھی[4] نواب سعادت علی خاں بھی اس شغل سے دل چسپی رکھتا تھا۔مرزا قتیل ایک رسید بنام سید حسین خاں لکھتے ہیں۔"کہ ہنوز در سر ملازمان ہوائے صاجزادگی باقی ست دریں حالت افلاس کبوتران از قسم پر برآوردن مور چکانست"[5] نواب آصف الدولہ کے ساتھ سفر و حضر میں ہزاروں کبوتر رہتے تھے[6] اور یہی حال نواب سعادت علی خاں کا تھا[7]

مرغ بازی

نواب شجاع الدولہ[8] نواب آصف الدولہ[9] اور نواب سعادت علی خاں کو مرغ بازی کا شوق تھا۔[10] میر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب آصف الدولہ عام مرغ بازوں سے بازی لگاتے

---

1. عماد/68۔
2. سیر المتاخرین (ا۔ت) 3/ص 104، تاریخ محمد شاہ تا نواب آصف الدولہ (قلمی) ص 7 تاریخ احمد شاہی/7ب۔
3. چہار گلزار شجاعی/221 ب عماد/68 نواب کو بیلدارجی بازی کا بھی شوق تھا۔
4. تفضیح الغافلین/48-49۔
5. ثمرات البدائع/36-37۔
6. Twining Travels in India P 311
7. رقعات مرزا قتیل/41۔
8. چہار گلزار شجاعی/221ب
9. تفضیح الغافلین/48-49 سیر المتاخرین (ا۔ت) 3/ 104، پولیر میں فونو دیکھیے۔کلیات انشا/447۔
10. گزشتہ لکھنؤ/175، 178۔

تھے یہ بازی ایک ایسے مقام پر ہوتی تھی جہاں عوام بھی جا سکتے تھے۔ میر کی ملاقات نواب سے اسی موقع پر ہوئی تھی جب وہ مرغ لڑانے آئے تھے۔[1]

ان کے مشاغل کے علاوہ نواب شجاع الدولہ کو کشتی لڑنے، پنجہ کشی، تیراندازی، شناوری اور بھالہ اندازی کا بھی شوق تھا، پنجہ کشی میں نواب کو اتنی مہارت تھی کہ جب وہ قریب المرگ تھا تو اس نے دانش علی خاں خواجہ سرائے سے کہا "مرا دریں حالت دیدہ کم زور خواہی دانست بیا دبا ما پنجہ کن، او ہر چند ابا نمود عذرش قبول نہ نمود و چوں تقید و تکرار از حد گذشت ایں بے چارہ لاچار شدہ حسب الحکم بعمل آورد"۔[2]

حرمِ شاہی

مسلمانوں میں پردے کی سختی کی وجہ سے نوابانِ اودھ کے حرم کی زندگی اور طرزِ معاشرت کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ محمد فیض بخش نے صدر النسا زوجہ نواب صفدر جنگ کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی زندگی بہت سادہ تھی اور وہ اپنی عصمت کا اس حد تک خیال رکھتی تھیں، کہ اپنے بھائی آغا علی خاں کو بھی بلا اجازت زنانے محل میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی تھی۔ جب وہ اپنے بھائی سے بھی ملتیں تو اس بات کا خیال رکھتی تھیں کہ جسم کا کوئی حصہ کھلا نہ ہو، یہاں تک کہ ہاتھوں پاؤں کو بھی اچھی طرح سے ڈھک لیتی تھیں، اور چہرے کے علاوہ کوئی حصہ نظر نہ آتا۔[3] جب سفر کرتیں تو ڈولی اور چوپالہ پر پردے کا بڑا اہتمام ہوتا تھا۔ ٹیونگ کا بیان ہے کہ نواب آصف الدولہ کے حرم میں کشمیر کی عورتیں تھیں۔ یہ بات غالباً اس نے شاہی ملازمین سے سنی ہوگی۔ کیونکہ وہ لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ یہ عورتیں پردہ دار پالکیوں میں سفر کر رہی تھیں اور پردہ اتنا سخت تھا کہ ان کا دیکھ لینا ناممکنات میں سے تھا۔ ان کی خادمائیں بھی اس طرز پر سفر کر رہی تھیں۔

---

1. میر کی آپ بیتی/179 تاریخ احمد شاہ/78 الف۔
2. چہار گلزار شجاعی/222 ب۔ 223 الف
3. تاریخ فرح بخش 11/ 254-253۔ نیز دیکھیے صفحات 455-454۔

ان سواریوں کی حفاظت کے لیے پیدل سوار تعینات تھے۔[1]

لیکن نواب نصیر الدین حیدر کے زمانے میں حرمِ شاہی کی طرز معاشرت کا حال ایک انگریز نے لکھا ہے جو نواب کے دربار سے وابستہ تھا۔ ان بیانات کے مطالعہ سے شاہان اودھ کے شاہی حرم کی زندگی کا مجموعی طور پر اندازہ ہو سکتا ہے اور ان کی بنیاد پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ صفِ اول کے نوابان کے زمانے میں ایسی ہی زندگی ہوگی۔

حرم شاہی کے محافظ زنانہ سپاہی ہوتے تھے۔ یہ عورتیں سپاہی مردوں کی وردیوں میں اور ہتھیار باندھ کر زنانہ ڈیوڑھیوں پر پہرہ دیا کرتی تھیں۔ ان زنانہ سپاہیوں کو دردولت کے صحن میں روزانہ قواعد کرائی جاتی تاکہ اگر موقع پڑے تو وہ مرد سپاہیوں کے ساتھ میدان جنگ میں کام آسکیں۔ ان زنانہ سپاہ کے علاوہ، عورتوں کا ایک اور گروہ کہاریوں کا ہوتا تھا۔ ان کے ذمے یہ خدمت تھی کہ حرم شاہی کے اندر جب بادشاہ سلامت یا کوئی بیگم صاحبہ ایک مکان سے دوسرے مکان میں جانا چاہیں تو ان کی پالکی اٹھا کر لے جائیں۔ ان کہاریوں کو بھی سپاہیانہ طرز پر قواعد کرائی جاتی تھی۔

بیگمات کی خدمت گزاری کے لیے حسین و جمیل خادمائیں، مامائیں اور اصیلیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ ان میں سے کچھ ایسی تھیں جن کے خاندان کی عورتیں قدیم زمانے سے شاہی حرم میں ملازم چلی آرہی تھیں اور ان کا خاندانی پیشہ یہی ملازمت تھی۔ ان کے علاوہ کچھ ایسی ملازمائیں تھیں جن کے والدین مفلوک الحال تھے اور ان کی حسین و جمیل لڑکیاں خرید لی جاتی تھیں ان کے علاوہ خواجہ سرا بھی ہوتے تھے۔ ان خواجہ سراؤں کو بقول میر، میر حسن علی، حقوق خصوصی حاصل تھے۔ اور دیگر ملازمین کے مقابلے میں ان کے ساتھ مخصوص مراعات کی جاتی تھیں۔ ان لوگوں کو ہر وقت اور ہر حالت میں زنان خانے میں داخل ہونے کی اجازت ہوتی تھی حرم شاہی میں بیگمات کو نہلانے کی خدمت یہ لوگ ملازماؤں سے بھی زیادہ اچھی طرح انجام دیتے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد سے ان خواجہ سراؤں کو بڑا عروج حاصل ہوا تھا۔ مثلاً خواجہ سرا جواہر علی خاں[2] اور

1۔ Twining Travels in India . PP. 311.312

2۔ تاریخ فرح بخش 11 /ص 48,60۔

امام بخش غلام بچہ[1] اور ان کے علاوہ بہت سے ایسے خواجہ سرا تھے جن کو بڑے عہدے ملے ہوئے تھے۔ان کی تفصیل نجم الغنی کی تاریخ اودھ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

زنانہ شاہی کی مستورات بڑے عیش وعشرت، تکلفات اور تجملات کے ساتھ زندگی بسر کرتی تھیں۔ان کے کمروں میں بڑے بڑے جھاڑ فانوس ہوتے، اور عمدہ سجاوٹ اور آرائش ہوتی۔ نوابان کے جتنے محل تھے سب کی ڈیوڑھیاں علاحدہ علاحدہ تھیں اور ہر ایک میں ملاقات کے کمرے، مسندیں، اور دالان الگ الگ تھے، مستورات شاہی اور ان کے ملازمائیں بڑے قیمتی لباس زیب تن کرتیں، لباس تو عام طرز کے تھے مگر کپڑے قیمتی اور جاذبِ نظر ہوتے تھے۔جسم پر زیورات ہوتے اور دیگر لوازماتِ حُسن کا بھی استعمال کرتی تھیں[2]۔نصیر الدین حیدر کے زمانے میں شاہی جلوس کے ساتھ بیگمات کی بھی سواریاں ہوتیں۔جس زمانے میں کوئی بیگم اولاد کی تمنا میں کسی مسجد کو جاتی یا زیارت کے لیے کسی متبرک مقام کو جاتی[3] تو سواری کا تزک واحتشام قابلِ دید ہوتا۔بادشاہ بیگم کی سواری کے ساتھ نوبت، نقارہ، ماہی ومراتب چتر زرنگار اور سایہ بان جو آفتابہ کہلاتا تھا ہوتا تھا[4]۔

واجد علی شاہ نے خودنوشت ایک مثنوی میں شاہی حرم کی زندگی کی یہ تصویر پیش کی ہے:

زنان حسینہ فراہم ہوئیں ۔۔۔ کہ پریاں ہماری جو ہمدم ہوئیں
مکاں بن گیا غیرتِ کوہ قاف ۔۔۔ پری دار تھے ان کے رخسار صاف
پری وار پرواز کرنے لگیں ۔۔۔ دَام آشنائی وہ بھرنے لگیں
اڑاتی تھیں باتوں میں عالم کے ہوش ۔۔۔ کبھی گرم الفت کبھی گرم جوش
صفائی لگاتی تھی پر اس کو پر ۔۔۔ پری خانہ تھا گو مکاں مختصر

---

1. سیر المتاخرین (ا۔ت)3 ص، 110-111، تاریخ اودھ 3 / 119-120۔

2. مجموعہ مثنویات میر حسن/ 20,26,30,31۔55, 56, 58,61,64۔مابعد

3. تاریخ فرح بخش 11 /ص 249-248۔مسز میر حسن علی۔سواری بادشاہ بیگم برائے زیارت درگاہ حضرت عباس/248، مثنوی واجد علی شاہ/ 164-165۔

4. برائے تفصیل، شباب لکھنؤ/ 102,118۔

عجب فرش اس قصرِ دیجاہ کا | کہ دھوکا ہوا چادرِ ماہ کا
وہ پردے تھے اس میں صفا لوامان | کہ تھی پردہ جسم حورِ جناں
عجب صحن تھا غلد جس کی فضا | جو دیوار دلچسپ درودل کشا
عیاں صحن میں سنگِ مرمر کا حوض | کہ ہم سنگ تھا حوضِ کوثر کا حوض
نیا ان پر آراستہ اک پلنگ | اوڑی جس سے تختِ سلیماں کا رنگ
دیا حکم آنے نہ پائے کوئی | اجازت طلب ہو نوائی کوئی
جو آئیں تو داروغہ نجم النسا | وہ پریاں و اربابِ رقص وغنا
سوا ان کے ہرگز نہ ہو دخل غیر | اگر غیر جائے اجازت بغیر
یہی صحبت عیش دو دوپہر | یہی مشق تھی مجھ کو شام وسحر[1]

شاہی حرم کی زندگی عیش وعشرت اور جشن کے علاوہ کچھ نہ تھی کبھی بچے کی ولادت کا جشن تھا۔ تو کبھی شعبان کے جشن کی روشنیوں اور رقص وسرود کی تیاریاں کی جاتی تھیں[2]

دربارِ اودھ کے جشن وتقریبات

دربارِ اودھ میں تقریباً بجنسہٖ، اسی اعلیٰ پیمانے پر جشن منعقد ہوتے تھے جن کا ہم دربارِ مغلیہ (دہلی) کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں، لہٰذا یہاں مجملاً ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

جشن نوروز

جشن نوروز کے دن ہر جگہ عوام وخواص رقص وسرود کی محفلوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اور یہ دن ان کے لیے بڑی خوشی کا دن ہوتا تھا، وقت کے مطابق لباس زیبِ تن کیا جاتا تھا، اگر رات کے وقت نوروز کی آمد ہوتی تو لباس کا رنگ سیاہ ہوتا، اگر دوپہر ہوتی تو لباس کا رنگ گہرا سرخ اور بھٹ کیلا ہوتا۔ ہر طبقے کے لوگ یعنی بادشاہ سے لے کر ادنیٰ آدمی تک ایسا ہی لباس پہنتے تھے۔

1. مثنوی واجد علی شاہ (قلمی) ص 134-133۔
2. مثنوی واجد علی شاہ (قلمی) ص 173-172۔ نیز عماد/ 73-72۔

اس دن دربار منعقد ہوتا، نواب تخت پر جلوہ افروز ہوتا، درباری امرا اور ملازمین نذریں پیش کرتے لوگ ایک دوسرے کو نوروز کی مبارک باد دیتے۔ بادشاہ بذات خود اپنے امرا کو نوروز کی مبارک باد دے کر مثال قائم کرتا تھا۔ محل شاہی میں عصرانہ کی ضیافتیں ہوتیں، تحفے تحائف بھیجے جاتے اور شاہی مستورات خاندانی افراد کے یہاں آتی جاتیں۔ تحفے تحائف اشیا کو خوانوں میں بہت سجا کر بھیجا جاتا جن کے بھیجنے کی تیاریاں بہت دنوں پہلے سے شروع ہو جاتی تھیں۔ دیگر رسومات کے علاوہ اس دن انڈے لڑانے کی رسم بھی ادا ہوتی تھی۔ انڈے ابالے جاتے، ان کو مختلف النوع رنگوں سے رنگا جاتا۔ اس لیے تحائف میں انڈے بھی بھیجے جاتے تھے۔ مذہبی لوگ وہ دن دعائیں کرنے اور نمازیں پڑھنے میں گزارتے تھے۔ عورتوں میں دوسری ایک یہ رسم بھی مروج تھی کہ اگر انھیں یہ معلوم ہوتا کہ نوروز کا آغاز دن کی روشنی میں ہوگا تو وہ کچھ دیر ایک تھال پر نظر گاڑ کر دیکھتی تھیں، ان کا خیال تھا کہ جب نوروز کا آغاز ہوگا تو گلاب کی کلی کھل جائے گی، لہٰذا گلاب کی ایک کلی توڑ کر ایک تھال میں ڈال دیتے تھے اور اس میں پانی بھر دیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ان کا یہ بھی خیال تھا کہ نوروز کے آغاز کے موقع پر خود بخود اس پھول کا رخ سورج کی جانب ہو جائے گا۔ نوروز کے دن متوقع دولہا دولہن کے گھروں کے افراد آپس میں ایک دوسرے کے ہاں تحفے تحائف بھیجتے تھے، بڑے اپنے چھوٹوں کو تحفے دیتے، یہی حالت ماماؤں اور اساتذہ کی تھی۔ دربار شاہی کے ملازمین کے لیے یہ دن بڑی مسرت کا دن ہوتا تھا۔[1]

درباری شعرا اس دن کی مبارک باد کے لیے تہنیت نامے موزوں کرتے، دربار میں جاتے، اور انعامات حاصل کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نوروز کے موقع پر سودا نے نواب شجاع الدولہ کی خدمت میں یہ قطعہ پڑھا تھا۔

تیری محفل میں شمع دولت افروز ہوا یہ سال نو فرخندۂ فیروز
تیری طبع مبارک کو جہاں میں ہوا اس سال کی ہے فرحت آموز
فروغ فیض سے تیرے ہے روشن بسان شمع جو تیرا ہے دل سوز
نگہِ ترک فلک کی باز گشتی تیرے اعداد کو ہے تیر جگر دوز

1. برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔

OBSERVATIONS ETC. 1,PP.283.287

تفضل سے جناب مرتضیٰ کے تجھے ہر روز ہوئے عید نوروز [1]

مرزا قتیل کے تہنیت نامہ سے جو انھوں نے نوروز کے دن نواب سعادت علی خان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ دربار کی محفل رقص وسرود کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس نے لکھا ہے:

''سازوسامان جشن جمشیدی وبزم کیقبادی حسن ترتیب
وزینت آرایش یافتہ واختر طالع محتاجان ومساکین بر مدار فلاح ابدی
ودولت سرمدی تافتہ۔ خواجہ سرایان محترم باہتمام مجلس بہشت آئیں
سرفراز، وناظران محتشم بندای حق علی العیش، بلند آواز مغنیان رنگیں
نوا بنغمۂ دلنواز ترانہ ریز ورامشگران ناہید لقا برقص گرم خیز وساقیان
حسین لالہ رخسار جامہ پیمای بادہ حسن ودلربائی ومحبوبان گلعذار از شور
ملاحت نمک ریز خوان ودلفریبی وخوش ادائی ندانم کہ بزمے درغایت
نزہت ولطافت زینت ترتیب پذیرفتہ'' [2]

اس زمانے کے شعرا نے جشن نوروز پر قطع اور غزلیں کہی ہیں[3]۔ انشا نے انڈے لڑانے کی رسم کا ذکر کیا ہے، اس کھیل کو ''سراور پچک لڑا'' کہا جاتا تھا۔

ٹھہرے گی خوب سی سراور پچک کی لڑکو آویں گے انڈے لڑانے کو کل آغا[4] نوروز [5]

بسنت

جشن نوروز کی طرح بسنت کا جشن بھی دربار میں منایا جاتا تھا۔ اس دن دربار ہوتا،

---

1. کلیات سودا 2/ص 4 'نواب آصف الدولہ بھی جشن نوروز کا اہتمام کیا کرتا تھا۔ تاریخ اودھ 3/ص 1۔
2. ثمرات البدائع/10-9۔ دیوان مصحفی پنجم (ق۔پ) 116۔الف۔115ب،
3. ملاحظہ ہو۔ کلیات میر حسن دہلوی (قلمی) 144، مجموعۂ مثنویات میر حسن/153۔ کلیات انشا/212 'دیوان مصحفی پنجم (قلمی پٹنہ) 115ب۔ 116الف۔
4. آغا ولایت کے باشندے کو کہتے تھے۔ انشا نے ایک شعر میں اس حقیقت کی نشان دہی کی ہے،
آغا وہ ہیں جو تازہ ولایت سے رات کو ☆ مطرب کو ڈوم کہتے ہیں بولے کہ دوم ہے۔ کلیات انشا/152
5. کلیات انشا/196، مجموعۂ مثنویات میر حسن/153۔

ضیافتیں ہوتیں، اور درندوں کی جنگوں کے تماشے کا اہتمام ہوتا تھا مسیز میر حسن علی کا بیان ہے کہ یہ جشن صرف دربار میں منعقد ہوتا تھا۔ اور عوام کو اِس تہوار سے کوئی زیادہ دل چسپی نہ تھی [1]
نواب آصف الدولہ اس جشن کے اہتمام میں ہزاروں روپے صرف کر دیتا تھا [2]

جشن سالگرہ

نوابان اودھ اور ان کے امرا اپنی سالگرہ کا جشن مناتے تھے۔ رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہوتیں، نواب کی خدمت میں امرا تحائف بھیجتے، اور اس خوشی کے موقع پر انھیں انعامات اور خلعتیں تفویض ہوتی تھیں۔ درباری اور شہر کے نامور شعرا مبارک بادی کے تہنیت نامے پیش کرتے، اور حسب حیثیت انعامات پاتے، سودا[3] نے نواب شجاع الدولہ، نواب آصف الدولہ[4] اور دیگر امرا کی سالگرہ کے موقع پر تہنیت نامہ پیش کیے تھے۔ ہرچرن داس نے نواب آصف الدولہ کے جشن سالگرہ کے بارے میں لکھا ہے۔

''شادی سالگرہ نواب آصف الدولہ بہادر کہ بیگم والدہ اش چہارم ذی الحجہ ہر سال می کند۔ دریں سال نواب (شجاع الدولہ) نیز شامل آن شادی شد'' [5]

نواب سعادت علی خاں بھی اپنی سال گرہ کا جشن منعقد کرتے اور لوگوں میں کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ مرزا قتیل ایک خط میں مرزا امانی کو لکھتے ہیں۔

''طعام سالگرہ جناب عالی از خانہ خاص محل آمدہ بود'' [6]

جشنِ تولدِ پسر

میر حسن دہلوی نے تولدِ پسر کے موقع پر درباری جشن کا تفصیلی ذکر کیا ہے یہ بیانات دہلی اور

---

1. OBSERVATIONS ETC. 1,287
2. تاریخ اودھ 3 /ص 1۔
3. کلیات سودا 2 /ص 6-5۔
4. کلیات سودا 2 /ص 6۔
5. چہار گلزار شجاعی/ص 259 الف
6. رقعات مرزا قتیل /ص 13۔

اودھ دونوں جگہوں کے لیے یکساں مطابقت رکھتے ہیں۔[1] دراصل مثنوی سحرالبیان فیض آباد میں لکھی گئی تھی۔ لیکن میر حسن دہلی، اور اودھ دونوں جگہوں کی رسومات سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے۔ لہٰذا ہم نے اس مثنوی کے حوالے دہلی کے بیانات میں بھی دیے ہیں۔

اس موقع پر بڑی خوشیاں منائی جاتیں، رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہوتیں، ملازمین کو انعامات ملتے، امرا نواب کی خدمت میں نذریں پیش کرتے۔ اور شعرا تہنیت نامے، نواب آصف الدولہ کے ہاں لڑکے کی ولادت کے موقع پر سودا نے یہ قطعہ پڑھا تھا۔

مبارک باد ایں فرزند دلبند ترا اے درۃ التاجِ شرافت
شدم در فکر تاریخ تولد برائے آں گل باغ نجابت
کہ ہاتف گفت تاگہ از سر ہوش گرامی گوہر درج سیادت [2]

نواب واجد علی شاہ نے بیدار بخت کے مولود ہونے کے موقع کے جشن کا یوں ذکر کیا ہے۔

ہوا جشن شادی مبارک ہوئی دیا حکم سلطاں نے سلک ہوئی
ملازم فرحساک (کذا) خاطر ہوئے مصاحب پئے نذر حاضر ہوئے
کہیں رقص رقاصی عشرت فزا کہیں گانے والوں کی دیکھیں صدا
صدا تھی یہ سارنگیوں کی بہم مبارک مبارک شہ ذی حشم
کسی سمت پریاں تھیں آراستہ سراپا جواہر سے پیراستہ
بکروں میں بیاں اس خوشی کا وفور عجب عید تھی طرفہ جشن سرور [3]

اسی طرح آقا علی خاں پسر قاسم علی خاں[4] اور کاظم علی خاں[5] کے ہاں تولد پسر کے موقع پر

---

1. مجموعہ مثنویات میر حسن/27 ,20۔
2. کلیات سودا121 ص12، نیز دیکھیے قطعہ مبارک باد تولد شدن تو نواب آصف الدولہ۔ ایضاً /4-3۔
3. مثنوی واجد علی شاہ/172۔
4. چہار گلزار شجاعی/134، الف و ب۔
5. چہار گلزار شجاعی/177 الف و ب۔

خوشیوں کے جشن منعقد ہوئے تھے۔ رقص وسرود، بھانڈوں کے تماشے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ غربا ومساکین میں بے دریغ زر تقسیم کیا گیا۔

جشن غسل صحت

نوابان اور امرا جب کسی سخت علالت سے شفا پاتے تو اس موقع پر غسل صحت کے نام سے جشن ہوتا تھا۔ اور نواب غسل صحت فرماتا تھا۔ امرا نذریں پیش کرتے اور شعرا قطعہ مبارک بادی پیش کرتے۔ ایک موقع پر نواب آصف الدولہ علیل ہوئے، بڑی مقدار میں نقدی روپے اور جنس بطور خیرات غربا ومساکین میں بانٹا گیا۔ نائب سلطنت حیدر بیگ خاں نے ضیافت کا اہتمام کیا۔ نواب حیدر بیگ کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہاں طعام تناول فرمایا۔ حیدر بیگ خاں نے پوشاک جواہر نگار نذر خدمت کی۔[1]

عیدالفطر

عیدالفطر کے چاند کا اعلان بندوقیں داغ کر کیا جاتا، فرطِ خوشی میں بگل اور نقارے بجائے جاتے، عید کے دن صبح کو عوام وخواص نماز کے لیے جانے کی تیاریاں کرتے۔ نواب اودھ بڑی شان وشوکت سے عیدگاہ جاتے۔ نواب کی سواری کے ساتھ امرا کا گروہ، فوجی دستے، گھوڑ سوار اور پیدل، یہ تمام لوگ زرق وبرق لباس میں ملبوس ہوتے۔ نواب کی سواری کے ہاتھی کو اس دن خوب صاف ستھرا کیا جاتا، بدن پر روغن لگایا جاتا۔ جلوس کی ترتیب اس طرح ہوتی۔ پچاس جوڑے اونٹ، جن پر اونٹ بان کے علاوہ دو بندوقچی بھی بیٹھے ہوتے تھے۔ ان کا لباس صاف ستھرا، اور سر پر سرخ اور نارنجی رنگ کی پگڑیاں ہوتیں، اونٹوں کے بعد توپ خانے کا دستہ ہوتا، اس شعبے کے متعلقہ ملازمین کا لباس نیلے رنگ کا ہوتا ان کے بعد نجیبوں کا دستہ، جو سرخ جاکٹ، اور سر پر چمڑے کی ٹوپیاں پہنے ہوتے، یہ ٹوپیاں مرصع اور زرنگار ہوتی تھیں۔ اس کے بعد ہاتھی گاڑیاں ہوتیں۔ ان میں سے ایک گاڑی میں نواب سوار ہوتے تھے۔ اور دوسری گاڑیوں میں امرا اور دوسرے خاص درباری۔ نواب کی سواری کی گاڑی میں چار ہاتھی جُتے ہوتے تھے، جن پر کم خواب

---

1. چہار گلزار شجاعی/254، نیز ملاحظہ ہو۔ دیوان مصحفی پنجم (قلمی پٹنہ) ص115 ب، 36 الف

نواب وزیر نے کیا غسل صحت　　کیا فتح علی کی آرزو برائے

اور اطلس کی مرصع جھولیں پڑی ہوتیں، نواب کی گاڑی کے آگے پیچھے گھوڑ سوار ہوتے، ہرکارے سونے اور چاندی کے عصا لیے نواب کی سواری کی آمد کا اعلان کرتے جاتے، راستہ صاف ہوتا جاتا، اس کروفر کے ساتھ جلوس عیدگاہ پہنچتا اور اسی انداز سے واپس آتا تھا۔[1] ہرچرن داس نے نواب آصف الدولہ کی سواری برائے عیدگاہ کا اس طرح ذکر کیا ہے۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر نواب غربا اور مسکینوں میں خیرات تقسیم کرتے چلتے تھے۔

"بمعہ مرزا منگلی ونواب بہادر ودیگر برادران وامرایان وارکان شوکت وحشمت تمام نوبت نوازاں وروپیہ ہا بر مسکینان وفقیران اندازان بہ عیدگاہ سوار شدوزر بسیار بہ محتاجان وپنجاہ ہزار روپیہ بکسائین امراوگر رسالہ دار ودوہزار روپیہ بہ مقبول علی خاں خواجہ سراوبسیاری خلعت ودوشالہ مرحمت فرمود"[2]

عیدگاہ سے واپسی کے بعد دربار ہوتا۔ امرا مبارکباد اور نذریں پیش کرتے۔ شعرا تہنیت نامے پڑھ کر سناتے، سودا، نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کی خدمت میں عیدین کے موقعوں پر تہنیت نامے پیش کیا کرتے تھے۔[3] اس طرح سودا نے حسن رضا خاں کے نام بھی عیدین کے موقعوں پر مبارک بادی کے قطعے پڑھے تھے۔[4]

عیدین کے دن شاہی حرم کی مستورات اپنی چار دیواریوں کے اندر تمام ممکن خوشیوں کے اظہار کے طریقے استعمال میں لاتیں، اس دن کی خوشی کا اظہار اچھے اور عمدہ لباسوں، زیورات اور لوازمات حسن کے استعمال کے ذریعہ کرتی تھیں۔ زنان خانے کے رقص وسرود کی گونجیں آسمان تک پہنچ جاتی تھیں۔ سہیلیوں کا ایک دوسرے سے گلے ملنا ایک دوسرے کو مبارک باد دینا، ڈولیوں

1۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ OBSERVATIONS ETC, 1,PP 262,65۔

نیز دیکھیے۔ کلیات میر حسن/144، چہار گلزار شجاعی/254ب، دیوان مصحفی پنجم (قلمی پٹنہ) ص115ب۔

2۔ چہار گلزار شجاعی/225ب۔

3۔ کلیات سودا2/ص4,5,7,8، کلیات میر حسن/147 کلیات ہدایت/95۔1 /297-298

4۔ کلیات سودا2/ص8,9۔

کا ایک محل سے دوسرے محل میں جانا۔ ملازماؤں کو تحفے تحائف دینا، غریبوں میں صدقہ تقسیم کرنا، اس دن نواب کی خاص محل، اپنی ملازماؤں کی نذریں قبول کرتیں، اور بدلے میں انعامات بطور عیدی عطا کرتیں۔1

عیدالاضحیٰ کے دن

عید کے دن کی طرح بڑی شان وشوکت سے نواب کی سواری عیدگاہ جاتی، عید کی نماز کے بعد نواب عیدگاہ میں اونٹ کی قربانی کرتا2 اور اس عمل کا اعلان توپ داغ کر کیا جاتا تھا3 واپس آکر دربار ہوتا، انعامات دیے جاتے، نذریں قبول کی جاتیں اور تہنیت نامے پڑھے جاتے۔4

جشن شعبان

واجد علی شاہ نے اس جشن کا بیان اس طرح کیا ہے، یہ جشن حضرت امام حسین کی ولادت کے دن منایا جاتا تھا۔

ہوا نصف جب ماہ شعباں تمام ۔۔۔ وہ تھا روز مولود شاہ انام
ہوئے قصر عالی لطافت سرشت ۔۔۔ بعینہ وہ گلزار باغ بہشت
کروں روشنی بزم کا گر بیاں ۔۔۔ تو ہو روشنی شمع روشن زباں

رقص وسرود اور شراب نوشی:

کسی سمت مردنگ کی ہے قطار ۔۔۔ کہ جنسی (کذا) ہوئے سو سے ہزار
کسی سمت مطرب تھی نغمہ سرا ۔۔۔ مغنی کسی سمت گرم غنا
جو سازندے تھے اور کرتے تھے مست ۔۔۔ وہ ساقی تھے گویا کہ ساغر بدست
دوپٹے گرے اور کھلی کا کلیں ۔۔۔ چہکتی تھی گلزار میں بلبلیں
عجب نغمہ لذت امیر تھے ۔۔۔ کہ ہر سمت طوطی شکرریز تھے

1۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ OBSERVATIONS ETC 1, PP.192-193

2۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ 1/259۔ Ross HINDU.

3۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ 1/259-263۔ Muhammadan Feasts ,PP. 102-3

4۔ کلیات سودا۔ 11/ص 9-4۔

وہ مینا خاص (کذا) بلوریں وجام محمد حسینِ صاحب اہتمام
طعامِ لذیذ ولطافت سرشت مزے میں بعینہ، طعام بہشت[1]

نواب سعادت علی خاں نے اس جشن کے انعقاد کا آغاز کیا تھا۔ پہلی مرتبہ یہ جشن 1212ھ چہارم شعبان کو منعقد ہوا تھا۔ "وامرا اعظام وخواتین ذی جبروت نذری آرندو بقدر خلعت سرفرازی شدند،"[2]

عام مسلمانوں کی معاشرت

رسوم ورواج

(الف) ولادت تا وفات:

بچے کی ولادت کے متعلق دہلی اور اودھ کی رسموں میں کوئی زیادہ تفاوت نہ تھا، اور بڑی حد تک ان میں یکسانیت ہی پائی جاتی تھی۔ مرزا قتیل نے ہفت تماشا اور سعادت یار خاں رنگین نے اپنی مثنوی مسائلہ میں ولادت سے وفات تک کی رسموں کا مفصل ذکر کیا ہے، جس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان تمام رسوم کا ہم دہلی کے رسم ورواج کے ضمن میں بڑی وضاحت سے ذکر کر چکے ہیں۔ دوبارہ تفصیل ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

بچے کی ولادت کے وقت دائی کی مدد حاصل کی جاتی تھی۔ انشا نے ایک شعر میں اس طرح اشارہ کیا ہے۔

لڑکا جو نگوڑا جنے بھوت سا کالا۔ اے دائی خبائی۔ پر چھائیں۔اری بی[3]

نومولود کے کان میں تکبیر کہی جاتی تھی[4] چھٹے دن چھٹی اور ساتویں دن عقیقہ کی رسموں کو ادا کیا جاتا تھا۔ اگر لڑکا ہوتا تو دو بکرے اور لڑکی ہوتی تو ایک بکری کی قربانی کی جاتی مگر شرط یہ تھی کہ ان

---

1. مثنوی واجد علی شاہ/202,207۔

2. عماد/173-174۔

3. کلیات انشا/217۔

4. OBSERVATIONS ETC., 210-211۔

بکروں اور بکری کے جسم کا کوئی عضو ناقص نہ ہو۔ عقیقہ کے دن نومولود کے سر کے بال مونڈے جاتے اور ان بالوں کے وزن کے برابر چاندی غربا اور مسکینوں میں بطور صدقہ بانٹ دی جاتی تھی۔ اس کے بعد بچے کا نام تجویز ہوتا۔

ایک سال کی عمر ہونے پر بچے کی سال گرہ کا جشن ہوتا دو سال کی عمر میں دودھ چھڑایا جاتا اور اس موقع پر خوشیاں منائی جاتیں، مرزا قتیل ایک خط میں اس موقع کی رسموں کا ذکر کرتے ہیں۔

''میر یوسف علی خاں دختر خود را از شیر وا کردہ است۔ نجش
شیرینی بخاس ہم فرستادہ بود۔ جائے دیگر مجبور خانہ ساز رفتہ بود و ایں
جا ہمہ از دکان کولی بود''[1]

پانچویں سال بسم اللہ خوانی، کی رسم ادا ہوتی، اور بڑے لوگوں کے ہاں اس موقع پر خوشیاں منائی جاتیں۔ ایک تقریب کا اہتمام ہوتا۔ اور بقول سعادت یار خاں رنگین شاہ و گدا شرکت کرتے تھے۔ پہلے بچے کو قرآنِ پاک کی تعلیم دی جاتی اور جب وہ ناظرہ قرآن پڑھ لیتا تو اس موقع پر بھی خوشیاں منائی جاتیں۔ بچے کے والدین اپنی حیثیت کے مطابق کھانا پکوا کر غربا اور مساکین کو کھلواتے تھے[2] سات برس کی عمر میں نماز کی ہدایت کی جاتی اور دس سال کی عمر کے بعد نماز پڑھنے پر اصرار کیا جاتا۔ سنِ بلوغ کو پہنچنے سے پہلے ختنہ کی رسم ادا ہوتی[3]

جب لڑکے اور لڑکی سنِ بلوغ کو پہنچ جاتے تو شادی ہوتی، ان رسوم میں ساچق مہندی اور نکاح کی رسمیں سب سے زیادہ اہم سمجھی جاتی تھیں[4] ساچق کی رسم میں شیخ فرید کا پوڑہ، بڑی اہمیت رکھتا تھا، شیعہ و سنی دونوں عقائد کے لوگ اس رسم کو ادا کرتے تھے، ساچق میں جو اشیائے خورد و نوش لڑکی والوں کے

1۔ رقعات مرزا قتیل/39۔

2۔ ملا نظام الدین سہالوی کے فرزند عبدالعلی (بحر العلوم) کی بسم اللہ خوانی کی رسم کی تقریب کے لیے ملاحظہ ہو۔ معارف (دسمبر 1970ء) ص 409 ،41 'نیز ملاحظہ ہو ملفوظ رزاقی/218۔

3۔ تاریخ فرح بخش (انگریزی) 11/ص 306۔

4۔ رقعات مرزا قتیل/'' بتاریخ بست و دوم ساچق بعمل خواہد آمد فردای آن حنا بندی و بست و چہارم یعنی شب بست و پنجم مجلس عروس مرتب خواہد شد'' /41۔

گھر بھیجی جاتیں تو ان میں ایک شکر کا پوڑہ رکھا جاتا تھا، اور وہ ''شیخ فرید کا پوڑہ کہلاتا تھا[1]۔

ساچق کی رسم حسب حیثیت دھوم دھام سے ادا کی جاتی تھی۔ مرزا قتیل نے اس رسم کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس کی صورت یوں تھی۔ مٹکیوں کو پوت کر ان پر پھول بوٹے بناتے تھے۔ ان میں نقل بھری جاتی جو شکر اور چنے سے تیار کی جاتی تھی اور ان مٹکیوں کو پستہ، بادام اور مصری سے پر کرتے تھے۔ چار مٹکیوں کو ایک تخت پر رکھتے، ہر ایک تخت کو ایک مرد اٹھاتا، تختوں کی کمی بیشی کا انحصار لڑکے کے والدین کی حیثیت پر ہوتا تھا۔ اسی طرح آرائشی تختوں پر جماتے تھے۔ ان کے علاوہ قند اور میووں کے چند خوان ہوتے تھے۔ پھولوں کے ہار اور دوسرے زیورات دولھن کے لیے ہوتے۔ اس جلوس میں مستورات اور رشتہ داروں کی سواریاں ہوتی تھیں۔ دولھا گھوڑے یا ہاتھی پر سوار ہوتا تھا۔ یہ جلوس بڑی شان وشوکت کے ساتھ اور نقارہ بجاتے دولھن کے گھر جاتا تھا۔ دولھن کے گھر میں دولھا کو ایک مسند پر بٹھایا جاتا اور وہاں رقص وسرود شروع ہوتا۔ جب دو پہر رات گئے گلاب سے معطر کیا ہوا مصری کا شربت مہمانوں کو پیش کیا جاتا مابعد دوسروں کو دولھا کے لیے یہ لازم تھا کہ وہ شربت پہلے دولھا کو پیش کیا جاتا، چکھنے کے بعد پانچ روپے یا کم یا ایک دو اشرفی تھال میں ڈال دے پھر کلی کرتا اور ایک دو روپے یا اس سے زیادہ لگن میں بھی ڈالتا تھا۔ اسی طرح دوسرے لوگ بھی شربت چکھنے کے بعد زرِ نقد تھالی میں ڈالتے تھے اور لگن میں ڈالنا ان کی خوشی پر مبنی تھا۔

ساچق کے اگلے دن یا اس کے دو تین دن بعد شب حنابندی قرار پاتی تھی۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ دولھن کے گھر سے دولھا کے لیے مہندی اس صورت میں لاتے تھے کہ آرائش کے تختے جو ساچق کے روز دولھا کے گھر سے آتے تھے، اسی جگہ چھوڑ دیے جاتے تھے۔ بہر حال دولھا کے گھر ساچق کے آنے کا شام کا وقت مقرر ہوتا تھا۔ اور حنا رات کو لائی جاتی تھی، حنا پہنچنے کے بعد دولھا کو زنان خانے میں بلایا جاتا۔ اور رشتہ کی سالیاں اس کے ہاتھوں پاؤں میں مہندی لگاتیں۔ جب عورتیں مہندی لگا چکتیں تو دولھا اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نقدی بطور نیگ دیتا تھا۔ وہ عورتیں جو دولھا سے عمر میں بڑی ہوتیں، اسے سلامی دیتی تھیں، اس رسم کی ادائیگی کے وقت مردانہ حصے میں دونوں طرف کی ناچنے والیاں باری باری رقص کرتی تھیں۔

1۔ ہفت تماشا/140.142۔

اور عورتوں کی مجلس میں ڈومنیاں[1] سرودِ بدھائی گاتی تھیں، جس طرح دولھن والوں کو شربت پلایا جاتا تھا اسی طریقے پر دولھا کے گھر دولھن کے ہاں کے آئے مہمانوں کو شربت پلایا جاتا تھا اور تھالی میں روپے لے کر سمدھن کو دے دیا جاتا تھا اور مہمان رخصت ہو جاتے۔

برات کے دن سرِ شام سے دونوں گھروں میں دوست، احباب، وضیع و شریف جمع ہونے لگتے تھے، دولھا کو زرد لباس میں ملبوس کر کے مسند پر بٹھا دیا جاتا، اور عورتوں کے رقص کا تماشا دیکھنے میں مصروف کر دیا جاتا، جب ناچنے والیوں میں سے ایک رقاصہ ناچتے ناچتے تھک جاتی تھی تو وہ بھڑوے کے اشارے پر بیٹھ جاتی اور دوسری طوائف مامور کی جاتی۔ اس موقع پر دولھا کے لیے لازمی تھا کہ وہ اس طوائف کو جو رقص کر چکی تھی، اپنے ہاتھ سے عطر، پان اور دھنیا پیش کرے۔

برات کی روانگی کے اوقات میں اختلاف پایا جاتا تھا، بعض گھروں میں دولھا کو رات کے آخری پہر سوار کرتے، پہلے دولھا کو اس طرح تیار کیا جاتا، پہلے غسل کراتے، زردوزی کا لباس جو مع سہرا کے پراچہ کے گھر سے کرایہ پر آتا، پہناتے اس کے بعد سر سے سہرا[2] لٹکاتے، گلے اور کاندھوں پر پھولوں کی بدھیاں ڈالی جاتیں، اس کے بعد خاندانوں کی رسم کے مطابق گھوڑے یا ہاتھی پر سوار کر کے اور اس کے ساتھ کسی کم عمر کے بچے کو بٹھاتے جو شہ بالا کہلاتا تھا، اس کے بعد بڑے تجمل کے ساتھ یعنی آرائش، روشنی، آتش بازی اور ساز و نوبت خانہ کی قسم کی دوسری چیزوں کے ساتھ دولھن کے گھر کے لیے روانہ ہو جاتے، برات کی ترتیب اس طرز پر ہوتی۔ پہلے دولھا کی

---

1. کلیات انشا

شادی مبارک آ کے لگے گانے عندلیب ☆ لہرا گئی خوشی سے ہر ایک اس چمن کی بیل

بول اوٹھیں بن کے ڈومنیاں ساری قمریاں ☆ صاحب ہمیں دلائی دولھا دولھن کی بیل

دیوان مصحفی (قلمی رام پور) 2/ص 82۔

شیخ جی کا جب ہوا میرزا کی پوتی سے نکاح

ڈومنی گائے بدھاوا میرا ابریالہ بنا /34ب

2. کلیات انشا۔ کس کا یہ بیاہ تھا جو موتیوں کے سہرے کے ☆ اب تلک جھڑتی ہیں دامن سحر سے لڑیاں/ 89

سواری، اس کے بعد آرائش اور مابعد تخت رواں[1] یعنی ناچنے والی عورتوں کے چند تختے ہوتے تھے جن کو زرباف کے کپڑوں سے سجاتے تھے، نوبت کے علاوہ روشن چوکی بھی ہوتی تھی، دولھن کے دروازے پر پہنچ کر دھنگانا کی رسم پوری ہوتی اور اس کے بعد دولھا مع براتیوں کے اندر داخل ہوتا، مسند پر بٹھایا جاتا، اور رقص و سرود کی محفل کا آغاز ہوتا تھا۔ اس کے بعد نکاح ہوتا، نکاح کے بعد دولھا اندر زنان خانے میں جاتا اور بہت سی ایسی رسمیں ادا ہوتیں جن کی بنیاد توہم پرستی پر تھی۔[2]

دولھن کو زعفرانی لباس[3] اور زیورات وغیرہ سے سجایا جاتا تھا۔ تمام رسموں کے ادا ہونے کے بعد رخصتی ہوتی، جہیز لڑکی کے ساتھ کر دیا جاتا، آخری رسم چوتھی کی ہوتی تھی، اس موقع دونوں خاندان کی عورتیں ایک جگہ جمع ہوتیں اور فرط خوشی میں ایک دوسرے پر رنگین پانی پھینکتیں، یہ رسم ہولی کھیلنا کہلاتی تھی، اس کے بعد پھولوں کے زیورات مع چند ٹوکریوں کے جس میں ہری ترکاریاں شلجم مثلاً بیگن، شلجم، اور دوسری ایسی ہی چیزیں اور پھل پھلاریا فصلی میوے مثلاً خربوزے ہوتے تھے، اور ہندوانہ وغیرہ داماد کے گھر سے لے جاکر دولھن کو پہناتے تھے، فریق ثانی کے زن و مرد متفق ہو کر یہی، پھل ترکاریاں داماد کے، دولھن کے اور ان کے قبیلے کی عورتوں کے پھینک کر مارتے تھے، اس کھیل میں چوٹ پھینٹ بھی آجاتی تھی، عورتیں اور بچے دھڑا دھڑ گرتے تھے، منھ سوج جاتے تھے، اور پٹھانوں میں بعض بعض کی تو بینائی تک جاتی رہتی تھی۔[4] انشاء نے اپنے اشعار

1۔ اس زمانے میں رقص و سرود کا اہتمام لازمی تھا، مرزا قتیل ایک خط میں مرزا امانی کو لکھتے ہیں۔ "حالا باید کہ اندوختہ خود را بما ظاہر نکنید کہ دریں شادی صرف کردہ آید اگر خواستہ باشید کہ کلمات چرب و شیریں روغن قاز مالیدہ ہیچ نہ بمید دست بردار نخواہم شد و ماچہ دانم کہ شاد ارید یا نداریداز ہر جا و بہر طور کہ بدست پول بیارید کہ مارا کار بارقص و سرود است پلاؤ شمارا بشما بخشیدم۔ رقعات مرزا قتیل/28 نیز ملاحظہ ہو۔ تاریخ فرح بخش 11/ص238 چہار گلزار شجاعی/174ب

2۔ ملاحظہ ہو ہفت تماشا/150-149، مجموعہ مثنویات میر حسن/127، مرزا محمد ناصر کی شادی کے موقع پر اسے دولھن کے گھر میں زیورات پہنائے گئے تھے، تاریخ فرح بخش 11/ص238 رقعات مرزا قتیل/4۔

3۔ رقعات مرزا قتیل "زوجہ اش زعفرانی پوش خواہند شد"/41۔

4۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو، ہفت تماشا/135،139، مسائل نیز مجموعہ مثنویات میر حسن/121،129۔

میں چھڑیوں کا ذکر کیا ہے:

نوعروسانِ چمن کا دیکھیے گا اختلاط　چل رہی ہیں خوب سے پھولوں کی چھڑیاں باغ میں [1]

تو مجھے کچھ نہ ہو معلوم مگر اتنا کچھ　چھڑی پھولوں کی کوئی جیسے کہ سدھن مارے [2]

کون سی حور یہاں کھیلنے چوتھی آئی　بوئے گل لے کے جو پھولوں کی چھڑی سے کیوں کہ مجھ سے لڑی [3]

شادی کی رسمیں اور بالخصوص برات کے مناظر اتنے دل کش اور جاذبِ نظر ہوتے تھے کہ نواب آصف الدولہ شادیوں کا بڑا اہتمام کیا کرتا تھا اپنی اولاد ہو یا چاہے دوسرے کی اولاد کی شادی کیوں نہ ہو بعض مرتبہ تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ جہاں شادی ہوتی تو ایک طرف وہ خود ہو جاتا، اور دوسری طرف اپنے کسی عملہ کو مقرر کرتا۔ کہا جاتا ہے کہ قائم خاں فوج دار فیل خانہ کے ہاں شادی کی تقریب تھی، نواب بذاتِ خود اس تقریب کا مہتمم ہوا[4] ایک انگریزی سیاح کا بیان ہے کہ نواب آصف الدولہ کو آتش بازی کے مناظر سے بڑی دل چسپی تھی، وزیر علی خاں کی شادی کے موقع پر اس سڑک پر جو طرف ثانی کے ہاں تک جاتی تھی، زمین میں آتش بازی دفن کردی گئی تھی، اور ہاتھیوں کے ہر قدم کے ساتھ چھوٹتی تھی۔ اس موقع پر بے حد چراغاں کا اہتمام کیا گیا تھا، ان تقریبات میں وہ بے دریغ روپیہ صرف کرتا تھا[5] اپنی بیٹی اور بیٹے کی شادی میں نواب نے لاکھوں روپیہ صرف کیے۔[6] نواب کا یہ ذوق اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ وہ درندوں کی شادی کا اہتمام کرتا تھا۔ ڈل بادل ہاتھی کی شادی بڑکنی ہتھنی کے ساتھ بڑی دھوم دھام اور تزک واحتشام سے کی اور لاکھوں روپیہ خرچ میں آیا، بارہ سو ہاتھی براتی تھے، الماس علی خاں خواجہ سرا دولھن والا اور نواب آصف الدولہ دولھا کی طرف تھا۔[7]

---

1. کلیات انشا/106۔
2. کلیات انشا/154۔
3. دیوان مجبور/18۔
4. سیر المتاخرین (ا۔ت) 3/ 111، تفضیح الغافلین/135۔
5. تفضیح الغافلین/49-48۔
6. چہار گلزار شجاعی/258ب، برائے اخراجات در شادی وزیر علی خاں ملاحظہ ہو، تفضیح الغافلین/ 134۔
7. تاریخ اودھ 3/ 274-273

کسی مرد یا عورت کی موت کے موقع پر پہلے تجہیز وتکفین کی رسمیں پوری کی جاتیں، مابعد سوم، دہم، چہلم[1]، ششماہی اور برسی کے دن مختلف رسومات ادا ہوتی تھیں[2] نوابان اور امرا کے جنازے کے ہمراہ ہزاروں آدمی ہوتے اور ان کو بڑی شان وشوکت، باجے گاجے، فوج پھاٹے اور شاہی تزک سے لے جاتے تھے، ان کے مزارات پر قرآن خواں بٹھائے جاتے تھے[3] اور سالانہ عرس منایا جاتا، چراغاں ہوتا، غربا اور مسکینوں میں کھانا تقسیم کیا جاتا[4] اسی طرح شاہی حرم کی خاص بیگمات کے مزار پر بھی سالانہ عرس کی تقریبات انجام پاتیں، زوجہ شجاع الدولہ، بہو بیگم کے مزار پر سالانہ عرس ہوا کرتا تھا[5]

درباری لباس

سعادت خاں برہان الملک اور صفدر جنگ حالانکہ ایرانی النسل تھے مگر وہ ہندستانی یعنی دربار مغلیہ کا لباس پہنتے تھے۔ لیکن شجاع الدولہ کے زمانے میں تبدیلی واقع ہوئی تھی، چونکہ وہ ایک سال تک شاہ ابدالی کے دربار اور فوجی پڑاؤ سے وابستہ رہا تھا لہٰذا اس نے ایرانی لباس اختیار کر لیا تھا۔ ایرانی لباس اس زمانے میں موسم سرما میں دہلی اور لکھنؤ کے درباروں میں پہنا جانے لگا تھا۔ کیونکہ اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں دہلی اور لکھنؤ کی درباری معاشرۃ ہرات اور قندھار کے طرز پر تھی[6]

1۔ تفضیح الغافلین، ر چنانچہ رسم نشستن چہل روز بہ تعزیت ص150۔

2۔ تاریخ فرح بخش 11/ص13، 319، کلیات انشا/ 81، فسانہ عجائب/ 152، والدہ شفیق علی خاں کے جنازہ کا ذکر کرتے ہوئے ہر چرن داس نے لکھا ہے۔ تابوت اور مخمل سبز پیچیدہ و نمگیرہ مخمل سبز بہ بالائش وفیلان پر از زناں ومرادی وگندم وزر نقد ہمراہش خیرات کناں'' چہار گلزار شجاعی/ 175 ب، نیز ملاحظہ شود، ص/ 2 الف و ب، ملفوظ رزاقی/ 237 دیوان مصحفی چہارم (رام پور) 15/ الف۔

3۔ تاریخ فرح بخش 11/ 233، شجاع الدولہ کے مزار پر قرآن خواں۔ چہار گلزار شجاعی/ 219 (الف و ب)

4۔ تاریخ فرح بخش۔ 11/ص 271، 233، 110' اس موقع پر مجلس مرثیہ خوانی بھی ہوتی تھی۔ روشنی ہوتی اور غربا میں کھانا تقسیم ہوتا۔ ایضاً 11/ص 113-112۔

5۔ ایضاً 11/ 305 نیز 75 ,73 ,56۔ OBSERVATIONS ETC.

6۔ سیر المتاخرین (انگریزی ترجمہ) ج 2/ص 549 فٹ نوٹ 290 نیز ص: 1356، اشاریہ 185۔

مجملاً اس زمانے میں لکھنؤ کے دربار کالباس، سر پر پگڑی، بدن پر نیمہ جامہ، نچلے حصے میں ٹخنوں سے اونچا تنگ مہری کا پائجامہ، پاؤں میں اونچی ایڑی کا کفش نما جوتا، کمر میں جامے کے اوپر پٹکا اور گھر میں سر پر ٹوپی ہے[1]

دربار میں بالعموم پگڑیوں کا رواج تھا مگر دہلی کی باوقعت امیرانہ دستاروں کا یہاں رواج نہ رہا اور امرا اور دیگر شاہی کارکنوں کے سروں پر ٹوپیاں رہ گئیں لیکن دربار کے لیے پگڑیاں آخری زمانے تک مخصوص تھیں۔ شاہی ملازمین اپنے آقا کے سامنے سر پر پگڑی باندھ کر ہی حاضر ہوتے تھے[2] نواب آصف الدولہ کے زمانے تک نوابان اودھ کے سروں پر دہلی کی سی سفید دستار ہوا کرتی تھی۔ دربار کے موقعوں پر اس پر جواہرات کی کلغیاں مرصع چینے اور سرپیچ لگا لیے جاتے تھے۔ یہ پگڑیاں بالکل سادہ اور سفید رنگ کی ہوتی تھیں۔ لیکن سعادت علی خاں کے سر پر پگڑی کے بجائے شملہ[3] ہوا کرتا تھا[4]

دربار مغلیہ کے لباسوں میں لکھنؤ کے تصنع پسند ماحول میں کچھ تغیرات ہوئے مثلاً کہ پاؤں کے جوڑوں پر لمبی صراحیاں بنائی گئیں اور ان صراحیوں کے درمیاں خوش نما چاند قائم کیے گئے۔ یہ چاند اور صراحیاں اس طرح بنائی جاتیں کہ باریک تنزیب کے پاؤں میں نین سکھ کی صراحیاں اور چاند کاٹ کر اندر کی طرف ٹانک دیے جاتے جو اوپر نمایاں ہو کر ٹوپی میں ایک اچھی نفاست، صفائی اور سادگی پیدا کرتے، یہ ٹوپی بہت پسند کی گئی اور عوام نے یکا یک پگڑی باندھنا ترک کر دیا، اور ہر مہذب اور شائستہ آدمی کے سر پر یہی ٹوپی نظر آنے لگی[5]

1۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ گزشتہ لکھنؤ ص 273, 266۔

2۔ گزشتہ لکھنؤ ص 280۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں رنگین پگڑیوں کا رواج تھا۔ تاریخ فرح بخش 11/ 51۔

3۔ شملہ کی ساخت کے بارے میں مفصل معلومات کے لیے دیکھیے۔ گزشتہ لکھنؤ/ 281۔ مرزا قتیل سفید پگڑی سر پر باندھا کرتے تھے۔

4۔ ایضاً/ 281، ایک خط میں مرزا امامی سے سفید پگڑی لانے کی فرمائش کی ہے۔ رقعات مرزا قتیل/ 60۔

5۔ گزشتہ لکھنؤ/ 274۔

نواب آصف الدولہ کے سادہ مگر شاندار لباس کو دیکھ کر سیاح ٹیونگ کو بڑی حیرت ہوئی تھی، اس وقت نواب کے سر پر کلاہ اور اس پر دستار بندھی ہوئی تھی اس کے کاندھے پر خوب صورت شال پڑی ہوئی تھی جو اس کی کمر سے لپٹی ہوئی تھی، پیروں میں سنہری زری کی جوتی تھی۔[1]

امرا اپنے ذوق کے مطابق لباس پہنتے تھے۔ مثلاً جواہر علی خاں شاہ نواز خانی کوٹ پہنا کرتا تھا، (زردوزی) کے کام کے شال یا کم خواب کا ہوتا تھا، وہ موسم گرما اور سرما کے لباس کا بالخصوص بڑا اہتمام کرتا تھا۔[2] امرا کمر میں دوپٹہ بھی باندھتے تھے۔[3]

عوام و متوسط طبقے کے لوگوں کا لباس

عوام اور متوسط درجے کے لوگ پائجامہ پہنتے تھے مگر مہری تنگ اور گھیر پرانے شرعی پائجامے کا سا ہوتا تھا۔ سارے ہندستان کے مسلمانوں نے یہی پائجامہ اختیار کیا تھا۔ مگر ہندو تہذیب کے زیر اثر ادنیٰ درجے کے مسلمان دھوتیاں بھی باندھتے تھے۔ لکھنؤ میں ڈھیلے عرض کے پائچوں کے پائجامہ کا رواج تھا۔ مگر سعادت علی خاں کے عہد کے بعد مروج ہوا، اس سے پہلے دہلی کی وضع کا پائجامہ پہنا جاتا تھا۔[4] جسم پر انگرکھا اور اس کے اوپر دوشالے کا بھی رواج تھا۔[5] اور یہی دربار اودھ سے خلعت میں بھی عطا ہوتا تھا، علاوہ ازیں شال اور رومال اوڑھنے کا بھی کسی حد تک رواج تھا، یہی دونوں چیزیں دہلی سے لکھنؤ آئیں مگر لکھنؤ میں زیادہ رواج رومال اوڑھنے کا تھا۔ جاڑوں میں بالعموم شال، رومال اور کافی سردی میں دوشالہ اوڑھا جاتا تھا۔ شرفا کا لباس یہ تھا، سر پر قالب چڑھی چکن کی چوگوشیہ ٹوپی، بدن پر انگرکھا، اور پیروں میں عرض کے پائچوں کا پائجامہ اور کندھے پر ہلکا چکن یا جالی کا رومال اور پیروں میں سلیم شاہی جوتا، ان جوتوں میں نوک بالکل نہ ہوتی تھی لیکن ان پر سلمے ستارے کے

---

1. Twinning: Travels in India. P. 167

2. تاریخ فرح بخش 11/52,58۔

3. رقعات مرزا قتیل/45۔

4. گزشتہ لکھنؤ/ص 290,294 مسیز میر حسن علی/63۔

5. دریائے لطافت (ا۔ت) ص 68-67، نیز ص 86۔

کارچوبی کا کام ہوتا تھا۔[1] انشا نے دہلی اور لکھنؤ کے مردانہ لباس کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اگر میں وہاں (دہلی) کی مردانہ پوشاک کا مقابلہ لکھنؤ کی پوشاک سے کروں تو بعینہ ایسا ہے کہ کاندھلہ، اور شاملی، کے بنیوں کی پوشاک کا ایران کے مرزاؤں کی پوشاک سے مقابلہ کرنا۔ وہاں کی پوشاک اگرچہ سوائے لکھنؤ کے اور شہروں کی پوشاک پر غالب آتی ہے۔''[2]

امرا کے لڑکوں میں انگریزی لباس کا رواج ہو چلا تھا۔ اشرف علی خاں کالڑکا مرزا عباس'' کہ لباس انگریزی می پوشید''۔[3]

زنانہ پوشاک

لکھنؤ کی زنانہ پوشاک، دہلی کی زنانہ پوشاک کے مقابلے میں وضع قطع اور کپڑے کی نوعیت میں کہیں زیادہ متنوع تھی۔ انشا نے لکھا ہے:

> ''لیکن یہاں کی زنانہ پوشاک کے سامنے وہاں (دہلی) کی زنانہ پوشاک ایسی ہے۔ جیسے میاں غلام رسول کے گانے کے سامنے لڑکے لڑکی کی شادی کے موقع پر بھلے مانسوں کی بہو بیٹیوں کا گانا، یا سرخ اطلس کے سامنے لال کھاردا''۔[4]

لکھنؤ کی عورتوں کے لباس میں تراش خراش اور کپڑوں کی بناوٹ میں کافی ترقی واقع پذیر ہوئی تھی، مراۃ الاوضاع کے مصنف کا بیان ہے:

> ''بیت السلطنت لکھنؤ از عہد نواب آصف الدولہ صناعان صنائع عجیبہ وکاملان فنون غریبہ ماندہ دریں زماں ہم کملائے ہر فن دریں شہر موجودہ اند، لہٰذا بسیاری اشیا ابداع واختراع انہا بوضعی دریں شہر تیار می شوند ..... بادلہ مقیش، ایں جا از بس سبک وباریک وخوش رنگ وکار زردوزی خیلے پاکیزہ وصاف می

---

1. گزشتہ لکھنؤ ص 294 ,290، میسو میر حسن علی ر 63.

2. دریائے لطافت (ا۔ت) ص 68-67، نیز ص 86۔

3. رقعات مرزا قتیل ر 81 شہزادہ مرزا جہانگیر نے انگریزی لباس اختیار کر لیا تھا ر 87۔

4. دریائے لطافت (ا۔ت) ص 68۔

شود، چنانچہ تاج ہر قسم از چو گوشیہ و ہشت گوشیہ و شش گوشیہ و نیز تاج سموری و دستہ
و تکمہ قبا، و مندیل، و شملہ زردوزی و سینہ بند نیم، تنہ، و پیشواز، و شلوار و دو پٹہ
زنان و جفت پای گھیلا...... ایجاد و اختراع میسازند"۔[1]

میر حسن دہلوی نے کپڑوں میں کناری، مسلسل، کم خواب، آب رواں، سنجاف، تن زیب اور لاہی وغیرہ کا ذکر کیا ہے[2] عورتوں کا پورا لباس دوپٹہ، اوڑھنی، سینہ بند، نیم تنہ، شلوار کلی دار، اکثر اوقات سینہ بند کے اوپر نیم تنہ کے بجائے انگرکھا شاہنوار خانی اور موسم سرما میں پائجامہ گھوٹنہ و جفت گھتیلہ، وغیرہ پر مشتمل تھا۔[3]

آخری زمانے میں گھاگھرے کا عام رواج ہو گیا تھا۔[4] انشا کے کلام میں پشواز اور لہنگا کا بھی ذکر ملتا ہے:

اوسکی پشواز کی سی لائی باس اوسکی میں گود بھرے پر غش ہوں[5]

لیجیے لہنگا پہن بادلے کے تھان کا[6]

لکھنؤ کی عورتوں میں بنارس کا دوپٹہ بہت زیادہ مروج تھا۔ انشا کے ایک شعر سے

---

1. مراۃ الاوضاع ص 110 الف۔ 111۔ ب

2. کپڑوں کی مختلف اقسام کے لیے ملاحظہ ہو، ثمرات البدائع / 27-26۔

3. برائے تفصیل ملاحظہ ہو، مراۃ الاوضاع ص 95 ب، 96 الف مجموعہ مثنویات میر حسن ص 154,159 ,24,25، دریائے لطافت (ا۔ت) ص 97,99 ثمرات البدائع ص / 27-26

OBSERVATIONS ETC.1,P.P - 102, 103, 105, 106, 108, 111, 113

دیوان مصحفی پنجم (پٹنہ) ص 2 الف، 51 الف، 36 الف، 121 الف، دیوان ہشتم (پٹنہ) ص 6 ب، 7 الف۔ 91 الف دیوان ہفتم (ق پ) 3 ب، 65 ب، 72 ب، 135 ب دیوان چہارم (ق رام پور) ص 76,78,79,80، دیوان دوم ص 10 الف دیوان دوم ص 35 الف، 46 الف،

کلیات انشا / 201 ,118 ,38,49 ,4,19,38,118,137,148,96,17,143,28,26۔

4. The Costumes and Textiles of INDIA-PP. 37-38۔

5. کلیات انشا / 69, 165,196۔

6. کلیات انشا / 186۔

اس کی نشان وہی ہوتی ہے۔

ادغیں سے کیے ہیں جو بنارس کے دوپٹا
چکیلے تو رکھ چھوڑ و کرو ماند کے ٹکڑے [1]

پیروں میں خوب صورت اور کام کی ہوئی جوتیاں ہوتیں تھیں [2] شاہی محلات کی خادماؤں کا لباس یہ تھا، دوپٹہ، سینہ بند، ونیم تنہ بالائے آں وشلوار کلی دار، بعد میں ان لباسوں میں تبدیلی واقع ہوئی اور اکثر اوقات بالائی سینہ بند، بجاری نیم تنہ، انگرکھا شاہنواز خانی وموسم سرما میں پائجامہ گھوٹنہ اور جفت کھتیلہ کے بجائے بوٹ زردوزی یا مخملی پیروں میں پہنتی تھیں [3]

زنانہ زیورات

عورتوں کے زیورات سے گہرے لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ عورتیں اکثر اپنی مخصوص دولت اور جائداد اپنے زیور کو سمجھتی ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ ہے کہ اکثر صوبجات ہند میں بھدے اور بھاری زیور کا زیادہ رواج ہے تاکہ وہ قیمت میں زیادہ ہوں، زیور ہوں، زیور کے بھاری ہونے کا شوق اودھ کے دیہات میں عموماً ہندستان کے تمام شہروں میں روز بڑھتا جاتا ہے، مگر لکھنؤ میں دہلی کے شریف خاندانوں کی معزز خاتونیں آئیں تو ابتداءً وہی زیور جس کا سارے ہندستان اور خود دہلی میں رواج تھا پہنے ہوئے تھیں مگر یہاں آنے کے چند روز بعد جب یہاں کی ترمیم شدہ مخصوص معاشرت قائم ہوئی تو زیور میں فقط زینت وآرائش کا خیال باقی رہ گیا اور ہر قسم کا زیور روز بروز سبک، ہلکا، نازک اور خوش نما ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آخر عہد میں امرا اور دولت مند گھرانوں کی بیبیوں کی یہ وضع ہوگئی کہ سادے بغیر سالے اور گوٹے پٹھے کے کپڑے پہنتیں اور زیور کی قسم کی دو ہی ایک چیزوں پر جو بہت ہی نازک، سبک اور قیمتی ہوتیں، کفایت کرتیں، اور اگر گلے اور ناک کان میں متعدد چیزیں پہنتیں بھی تو وہ بہت ہلکی ہوتیں۔ اس کا نتیجہ یہ

1. کلیات انشا/178، مجموعہ مثنویات میر حسن ص 118۔
2. مجموعہ مثنویات میر حسن/ بڑی پاؤں میں کفش زریں نگار ص 58.68 مسز میر حسن علی/63۔
3. مرأۃ الاوضاع/ص 95 الف وب۔ برائے تفصیلات لباس، فسانہ عجائب/101.103، زنانہ لباس کے متصل تفصیل کے لیے دیکھیے OBSERVATIONS ETC. I P.60- 61

ہوا کہ جیسا سبک اور ہلکا زیور لکھنؤ میں بننے لگا کہیں نہ بن سکتا تھا۔[1]

اودھ کی عورتیں مندرجہ ذیل زیورات زیب تن کرتی تھیں۔ یہ فہرست کلیات انشا، دواوین مصحفی اور مجموعہ مثنویات میر حسن سے مرتب کی گئی ہے اور یہاں صرف ان کے نام درج کیے جاتے ہیں:

عقد گوہر،[2] بلاق[3]، پازیب[4]، چھلا[5]، تعویذ[6]، آرسی[7]، حمائل[8] ہیکل[9]، نتھ[10]، بالی[11]، بندہ[12]، بالا[13]، بھیجبند، دولڑی وغیرہ، جگنو، اور یسی، کڑا،

---

1. گزشتہ لکھنؤ/302-303۔
2. دیوان مصحفی ج/5 (قلمی پٹنہ) ص الف کلیات انشا (در گوش) ص 147 ,137۔
3. دیوان مصحفی ج/5 (قلمی پٹنہ) ص الف کلیات انشا (در گوش) ص 3 الف، دیوان ہفتم/180 الف۔
4. دیوان مصحفی ج/5 (قلمی پٹنہ) ص الف کلیات انشا (در گوش) ص/6 ب، 17 ب، کلیات انشا/155۔
5. دیوان مصحفی ج/5 (قلمی پٹنہ) ص الف کلیات انشا (در گوش) ص 6 ب، 40، 117 الف، کلیاتِ انشا/ 90, 117,164, 248-
6. دیوان مصحفی ج/5 (قلمی پٹنہ) ص الف کلیات انشا (در گوش) ص/28 ب، 49 الف۔
7. دیوان مصحفی ج/5 (قلمی پٹنہ) ص الف کلیات انشا (در گوش) ص 47، ب، دیوان ہفتم (قلمی پٹنہ) 19 الف، 34 الف، کلیات انشا/ 149 ,139 ,24-
8. دیوان مصحفی ج/5 (قلمی پٹنہ) ص الف کلیات انشا (در گوش) ص 48 ب۔
9. دیوان مصحفی ج/5 (قلمی پٹنہ) ص الف کلیات انشا (در گوش) ص 49 الف۔
10. دیوان مصحفی ج/5 (قلمی پٹنہ) ص الف کلیات انشا (در گوش) ص 171 الف 117 الف، 140 الف، 147 الف۔
11. دیوان مصحفی ج/5 (قلمی پٹنہ) ص الف کلیات انشا (در گوش) ص 101 الف، 117 الف، ب، 140 الف، 147 ب، کلیات انشا/192۔
12. دیوان مصحفی ج/5 (قلمی پٹنہ) ص الف کلیات انشا (در گوش) ص 101 الف، و ب، کلیات انشا/50,162۔
13. دیوان مصحفی ج/5 (قلمی پٹنہ) ص الف کلیات انشا (در گوش) ص 117 الف و ب۔ کلیات انشا/50۔

کرن پھول 1، جھمکا، بازوبند، چودانی، چمپا کلی، جگنی، خلخال، زنجیر 2، سبزہ 3، توڑا 4، چھڑا 5، لچھا 6، جہانگیریاں 7، نورتن 8، پہونچی 9، کنگن 10، انگوٹھی 11، وغیرہ جس زمانے میں عورتیں کان میں زیور نہ پہنتی تھیں تو ان دنوں کانوں میں لونگ ڈال لیتی تھیں، تاکہ سوراخ بھر نہ جائیں 12 مرزا قتیل نے یارہ نامی ایک زیور کا ذکر کیا ہے جو ہاتھ کی زیبائش کے لیے عورتیں استعمال کرتی تھیں۔ [13]

---

1 دیوان مصحفی ج/5 (قلمی پٹنہ) ص الف کلیات انشا (در گوش) ص 140 الف۔ 147 الف، دیوان ہفتم (قلمی پٹنہ) کلیات انشا/167 ,18۔

2 دیوان مصحفی چہارم (قلمی رام پور) ص 80، کلیات انشا/ ,206 ,150 ,149 ,121 ,90 ,50- 261,782

3 کلیات انشا/ یہ جھمکے، بندے، بالی، توڑے، کڑے، چھڑے ہوں/95۔

4 کلیات انشا/18۔

5 کلیات انشا/18۔

6 کلیات انشا/194 ,82 ,25۔

7 کلیات انشا/46۔

8 دیوان مصحفی چہارم ب (قلمی رام پور) ص 80۔

9 کلیات انشا/196 ,165 ,57، نیز ملاحظہ ہو۔ نیز مسیر حسن علی/62۔

10 کلیات انشا میں نے دیکھی ہے اس کے کان میں لونگ/199 مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، دریائے لطافت (ا۔ت)99،
مجموعہ مثنویات میر حسن/24,25,154,159۔

11 گزشتہ لکھنؤ/303-304، فسانہ عجائب/100-101، مثنوی سراپائے عشق (آزاد بلگرامی/قلمی) 10 ب، 16، 17، الف، 15 ب۔

12 تذکرہ مجمع الانتخاب/319 الف 319 ب، 313 ب۔

13 رقعات مرزا قتیل/23۔

لوازمات حسن

کاجل[1]، مسی[2]، حنا[3]، مہندی، سرمہ[4]، پان[5]، کنگھی[6]، شانہ[7]، اور آئینہ[8]، کا بھی استعمال کرتی تھیں، بالوں کی ترتیب چوٹی کھجوری چوٹی کی صورت میں کی جاتی تھی، انشا کے چند شعر اس موضوع پر ملاحظہ ہوں:

کھجوری چوٹی یہ کس کی تھی جس کے دھوکے میں[9]

کیا چڑھے دھیان کسی شخص کے کنگھی چوٹی ☆ میرے پاؤں تلے لال پری کی چوٹی[10]

چہرے میں جاذبیت پیدا کرنے کے لیے غازہ کا استعمال ہوتا تھا[11]

کب مقابل تیرے مکھڑے کے ہو گو یا بادِ سحر ☆ عارضِ گل پہ ملے لاکھ طرح غازۂ صبح[12]

---

1. دیوان مصحفی ج/5 (قلمی پٹنہ) ص/7 الف کلیات انشا/8,15,104,112۔
2. دیوان مصحفی ج/5 (قلمی پٹنہ) ص/7 الف کلیات انشا/7 ب، دیوان ہشتم (قلمی پٹنہ) 5 ب، دیوان ششم /ص10 الف 17 الف، کلیات انشا/36۔
3. دیوان مصحفی ج/5 (قلمی پٹنہ) ص/7 الف کلیات انشا/10 الف، 24 ب دیوان ششم/ص14 ب، 17 الف کلیات انشا/88, 15, 217۔
4. دیوان مصحفی ج/5 (قلمی پٹنہ) ص/7 الف کلیات انشا/10 الف، 24 ب دیوان ہفتم/ص105 ب، کلیات انشا/36، 158، 194 الف۔
5. دیوان ششم (قلمی پٹنہ) ص7 الف دیوان ہفتم (قلمی پٹنہ) 5 الف۔
6. دیوان مصحفی چہارم (قلمی رام پور) ص31 ب
7. دیوان دوم (رام پور) ص11 ب کلیات انشا/87 فسانہ عجائب/138۔
8. کلیات انشا/113۔
9. کلیات انشا/29, 104۔
10. کلیات انشا/ص208۔
11. کلیات انشا/ص43۔ لوازمات حسن کے لیے ملاحظہ ہو، میسز میر حسن علی/57,60۔
12. کلیات انشا/ص43۔ لوازمات حسن کے لیے ملاحظہ ہو، میسز میر حسن علی/57,60۔

ماکولات

دہلی اور لکھنؤ کی ماکولات اور مشروبات میں کوئی زیادہ فرق نہ تھا فرق تھا تو اتنا کہ لکھنؤ میں ثروت کی وجہ سے اعلیٰ طبقے کے لوگ مرغن کھانے کھاتے تھے۔ ''کھانا پینا'' کے عنوان کے تحت عبدالحلیم شرر نے اودھ کے کھانے پینے کی اشیا کا مفصل ذکر کیا ہے۔ کھانوں کے متنوع ہونے کی وجہ یہ تھی کہ دہلی کے اجڑنے کے بعد ملک کے مختلف حصوں سے باورچی اس علاقے میں چلے آئے تھے، اور انھوں نے یہاں آکر اپنے فن کا خوب کمال دکھایا۔ لہٰذا یہاں کے لوگوں کے ذائقے کے مطابق یہاں کے کھانوں کو اس طرح تیار کیا جاتا تھا کہ زیادہ ذائقہ دار اور مرغن ہوتے تھے۔ اس بات کی شہادت انشا کے بیان سے بھی ملتی ہے۔ کہ یہاں کے امرا آدھ سیر پلاؤ کی تیاری میں بیس روپے خرچ کرتے تھے، اور اس کے بعد عیاشی کرتے تھے، ایک تورہ، سے جس میں مندرجہ ذیل اشیا خور ہوتی تھیں، لکھنؤ کے کھانوں کے بارے میں قیاس کیا جاسکتا ہے۔

پلاؤ، مزعفر، متنجن،، شیر مال، سفیدہ (میٹھے چاول) بورانی، شیر برنج، قورمہ، شامی کباب، مربہ، اچار، یا چٹنی [1] مختلف قسم کی مٹھائیاں [2]، ماش اور ارہر کی دالیں بھی امرا اور غربا دونوں کھاتے تھے [3] شمیم میر نے لکھنؤ کے کھانوں میں قسم قسم کی روٹیوں جیسے نانِ بادام، شیر مال، باقر خانی، نانِ جو، نانِ ورقی،

---

1. گزشتہ لکھنؤ/237,266، نیز دیکھیے مجموعہ مثنویات میر حسن/148,151، ثمرات البدائع/38 فسانہ عجائب/103۔

نواب آصف الدولہ نے ٹیوننگ کی دعوت کی تھی، اس موقع پر مختلف ذائقے کے گوشت، مچھلیاں وغیرہ دسترخوان پر چنی گئی تھیں، کھانوں کے علاوہ طرح طرح کی مٹھائیاں بھی تھیں، Twinning Travels in India-PP.767-68 شاہ برکت اللہ مارہروی کے عرس کے دن تیار ہونے والے کھانوں میں زیادہ تر ایسے کھانے تھے جو خالصتاً ہندستانی تھے، کاشف الاستار/358,361، نیز دیکھیے۔

رقعات مرزا قتیل/28,64,65,87,93۔ ویشب بجائے برنج یک پھلکہ با شوربائے چوجہ خوردہ خوابیدم'' نیز دیکھیے مثنوی خوان نعمت، تفصیل مطبخ نواب آصف الدولہ، ملفوظ رزاقی/62,96,102,103,193,197۔

2. رقعات مرزا قتیل/33 Mrs. Mir Hasan Ali- Observations etc 174۔

3. رقعات مرزا قتیل/93۔

نان زنجیلی، قسم قسم کے قلیے، دو پیازے، کئی قسم کے کباب، کباب گل، کباب ہندی، کباب قندھاری، کباب سنگ، طرح طرح کے پلاؤ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔[1]

علاوہ ازیں مختلف قسم کی مٹھائیوں کا رواج تھا، میرزا قتیل نے برفی کے تیاری کے بارے میں لکھا ہے:

''برفی شیر کو چک کو چک ورق نقرہ برآں پیچیدہ طیار ست یا کہنہ شدہ از مزہ افتادہ، اگر نو ساختہ باشد، ذائقہ دار شود''[2]

برفی کے علاوہ مرزا قتیل نے پیٹھا ،لڈو مونگ ،لڈو موتیا چور کا بھی ذکر کیا ہے۔ مرزا قتیل کو برفی کھانے کا بڑا شوق تھا اور خود بھی مٹھائی بنانے کی شد بد رکھتے تھے، اور بالعموم ''دوکان کولی'' کے ہاں سے مٹھائیاں منگوایا کرتے تھے، بازار میں مٹھائیاں اس زمانے کے حساب سے سستی تھیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''خدا کند کہ برفی تازہ بدست آید، ہرگاہ احوال برفی تحقیق شود فردا طلبیدہ منتظر من باید بود۔ امروز وقت سہ پہر بعد برگشتن لال بیگ از بازار خبر برفی کہنہ ونو باید نوشت شیرینی، پیٹھ و چیز دیگر اگر کہنہ باشید بیارد یا شش تنگہ را ہمیں برفی بیارد..... من اگر بسیاری خورم یکپاؤ و بلکہ کمتر خواہم خورد و چار آنہ را نیم سیر خواہد داد بلکہ تکرار بیارد۔ اگر دیروز ہم تیار شدہ باشد تا فردا از کہنہ نخواہد شد بلکہ بجبوری ساختہ پر پروز ہم تا فردا لذت نمی افتد امروز برفی دکان کولی وقند و برنج پیڑہ خشک داخل کردہ ام''[3]

مٹھائیوں کے علاوہ مختلف قسم کے حلوے مستعمل تھے۔ مثلاً حلوہ سوہن[4] حلوہ حبشی[5]،

1۔ میری آپ بیتی/183-184۔

2۔ رقعات مرزا قتیل/93۔

3۔ رقعات مرزا قتیل/93۔

4۔ رقعات مرزا قتیل/33، باقر بیگ، چند قسم کی روٹیاں پکانے، حلوے اور مربے تیار کرنے کی مہارت کلی رکھتا تھا۔ ایضاً/33۔

5۔ مجموعہ مثنویات میر حسن/15۔

حلوائے خوبانی[1]، پھلوں میں بالعموم شفتالو، انگور، سیب، انار، خربوزہ، نارنگی اور آم وغیرہ کھائے جاتے تھے۔[2] مرزا قتیل ولایتی انار روزانہ کھایا کرتے تھے[3]۔

اٹھارھویں صدی کے اواخر میں انگریزی کھانوں کی طرف رغبت بڑھنے لگی تھی، اور ایسے باورچیوں کی تلاش ہوتی تھی جو ہندستانی اور انگریزی دونوں قسم کے کھانے پکانے میں مہارت رکھتے ہوں۔

بازاروں میں ہر قسم کے کھانے پکے ہوئے مل جاتے تھے۔[4] جب کسی متوسط درجے کے آدمی کے یہاں کوئی تقریب ہوتی تھی تو گھر میں پکوانے کے بجائے وہ نان بائی کو کھانے تیار کرنے کا ٹھیکہ دیدیتے تھے۔ وہ اپنے گھر سے پکوا کر کھانا لے آتا تھا[5]

اس زمانے میں باورچیوں کی تنخواہیں زیادہ نہ تھیں مگر ان کا اپنا ایک طریقہ تھا کہ وہ مشاہیرہ کے علاوہ بھی کچھ لیتے تھے۔ مرزا قتیل ہندستانی باورچیوں کی ملازمت کی شرائط کا یوں ذکر کرتے ہیں:

> "حال باورچی ہندستانی در لکھنؤ
> بایں صورت باشد کہ ہفت روپیہ مشاہرہ
> ذات ویک پیش خدمت بدرماہہ سہ
> روپیہ ویک آثار آرد ہر روز گرفتہ
> باشد۔[6]

---

1 رقعات مرزا قتیل/78۔

2 رقعات مرزا قتیل/93، 83، 78، 58، 24، 23- ثمرات البدائع، 28،30۔

OBSERVATIONS. etc. P.P. 177-178۔

3 رقعات مرزا قتیل/93۔

4 رقعات مرزا قتیل/33

5 OBSERVATIONS. etc.P.P. 173-174

6 رقعات مرزا قتیل/38۔

مشروبات

بالعموم شربت کا رواج تھا۔ مختلف قسم کے شربت تیار کیے جاتے تھے۔[1] مرزا قتیل نے شربت انار کا ذکر کیا ہے۔[2] دہلی کی طرح لکھنؤ اور فیض آباد کے بازاروں میں قہوے خانے تھے، جہاں لوگ قہوہ نوش کرتے اور خوش گپیاں بھی کرتے تھے۔[3] انیسویں صدی ربع اول میں چائے نوشی کا بھی رواج ہو گیا تھا۔[4] مسز میر حسن علی نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں لوگ افطار کے وقت شربتوں کے علاوہ چائے بھی پیتے تھے۔[5] برف کا استعمال بہت زیادہ تھا۔[6]

سواریاں

لکھنؤ کی مردانہ اور زنانہ سواریاں بالکل اسی طرح تھیں جن کا ذکر دہلی کے ضمن میں کیا جا چکا ہے مثلاً، ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، چوپالہ، ہوادار فینس، میانہ، سکھپال، ڈولی، پالکی، نالکی، رتھ اور بہلیں وغیرہ۔[7] نواب آصف الدولہ گھوڑے اور پالکی کی سواری کیا کرتا تھا۔[8] جواہر علی خاں نے

1۔ مسز میر حسن علی نے مختلف قسم کے شربتوں کے بنانے کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو،

OBSERVATIONS.1, PP. 101,311

2۔ رقعات مرزا قتیل/42، 23۔

3۔ مجموعہ مثنویات میر حسن/151، رقعات مرزا قتیل/93۔

4۔ رقعات مرزا قتیل/93 "امروز دو پہر بخدمت شما حاضر خواہم شد چائے نخواہم خورد"۔

5۔ 101,176 نیز دیکھیے۔ فسانۂ عجائب/10۔

6۔ ملاحظہ ہو، تفضیح الغافلین/62۔ OBSERVATIONS:1, ETC 244۔

7۔ برائے تفصیل دیکھیے۔ تاریخ فرح بخش 2/248-149،

رقعات مرزا قتیل/44، 26، 50-78,79,22,23,25 ملفوظ رزاقی/ 52,96,101,190,217 کلیات انشا/204، 21,26,163,201۔ مجموعہ مثنویات میر حسن/36,122، دیوان مصحفی پنجم (ق۔پ) 121 الف، چہار گلزار شجاعی/160 الف، 176 ب، 190 الف فسانۂ عجائب/70, 71, 99, 102, 147, 148, 170, 172۔
OBSERVATIONS etc.)

8۔ Twinning: Travels in India P.168.

ایک قسم کی سواری ایجاد کی تھی جو سبک رواں کے نام سے موسوم تھی 1 مرزا قتیل کے ایک بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہل میں چار شخص بیٹھتے تھے۔

''یک بہل باتفاق دوکس بدوازدہ روپیہ تا اکبر آباد
انفصال یافتہ بہل بان دریں فکرست کہ شخص چارم ہم بہم ساند
اگر امروز وفردا بہم سید، خوب ست، والا بہمیں سہ کس
اکتفادرزیدہ براہ می افتد'' 2

کھڑ کھڑیہ بھی کہار اٹھاتے تھے، جس میں بارہ کہاروں کی ضرورت ہوتی تھی 3 ٹانگن بھی ایک قسم کی سواری تھی 4 چھکڑا بار برداری کے لیے استعمال ہوتی تھی 5

مُسلم جشن، تہوار اور تقریبات

عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کا تہواروں کے تفصیلی ذکر پہلے حصہ میں کیا جا چکا ہے۔ دوبارہ لکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ مجملاً اودھ کے مسلمان اپنی حیثیت کے مطابق ان تہواروں کو مناتے تھے۔ لکھنؤ میں ان ایام میں رقص وسرود کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی 6 عیدین کے دن لوگ ایک دوسرے کے ہاں یا تو نماز کے فوراً بعد ملنے جاتے یا شام کو کیونکہ ان وقتوں میں جب مالک خانہ کا گھر میں ہونا یقینی ہوتا تھا۔ 7

---

1 تاریخ فرح بخش 11 /ص59۔

2 رقعات مرزا قتیل/27۔

3 رقعات مرزا قتیل/44,46,75 ۔

4 رقعات مرزا قتیل/46۔

5 رقعات مرزا قتیل/81۔

6 برائے تفصیل دیکھیے OBSERVATIONS: ETC. 1, 98,111,14,151۔

7 رقعات مرزا قتیل/59۔

محرم

جیسا لکھا جا چکا ہے کہ نوابان اودھ شیعہ عقائد کے پیرو تھے، اور اپنے عقائد کی اشاعت وترویج میں کوشاں رہتے تھے[1] لہٰذا ان کی تقلید میں محرم کے تہوار کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی اور یہ تہوار بڑے جوش وخروش اور دھوم دھام سے منایا جاتا تھا، لکڑی اور کاغذ کے تابوت اور تعزیے بنائے جاتے، لکھنؤ کے تعزیوں کی ساخت کا مسیز میر حسن علی نے تفصیلی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ وہاں کے لوگ اپنی حسب حیثیت مختلف طرز کے تعزیے بناتے تھے یعنی چاندی سے لے کر لکڑی اور کاغذ تک ہوتے تھے۔ کچھ لوگ ہاتھی دانت، صندل، اور صنوبر کی لکڑی کے بھی تعزیے بنواتے تھے۔ ان تعزیوں میں بیش قیمت تعزیے دفن نہیں کیے جاتے تھے اور ان کو آئندہ سال کے لیے محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ معمولی تعزیے دہم محرم کو کربلا میں دفن کر دیے جاتے تھے۔ معمولی تعزیے دو دو روپے کے بازار میں مل جاتے تھے[2] ان تعزیوں کو برائے زیارت امام باڑوں میں رکھ دیا جاتا[3] شمالی ہندستان کے اکثر شہروں میں اور فیض آباد اور لکھنؤ میں بہت سے امام باڑے تھے۔[4] نواب آصف الدولہ نے بھی ایک امام باڑہ بنوایا تھا جو اب تک موجود ہے۔[5]

عاشورہ کے دنوں میں امام باڑوں میں چراغاں کیا جاتا تھا۔ روشنی اور کار چوبی کے کام کی

---

1. عماد/137، ہفت تماشا/3 OBSERVATIONS:1, ,P.10-etc
2. تفصیلات کے لیے دیکھیے۔ OBSERVATIONS etc. - 1,PP.31, 62
تذکرہ گلشن ہند/159 ' شباب لکھنؤ/145، ملفوظ رزاقی/104۔
3. OBSERVATIONS, etc, 1.P 32 ملفوظ رزاقی/104۔
4. OBSERVATIONS, etc, 1.P. 32 عقد ثریا/49 ' واقعات اظفری/107-108، شباب لکھنؤ/146۔ صدر النسا بیگم زوجہ نواب صفدر جنگ نے فیض آباد میں ایک امام باڑہ موتی باغ کے عقب میں بنوایا تھا۔ تاریخ فرح بخش 11 /ص250۔ داراب علی خاں نے جواہر علی خاں کے قدیم لکڑی کے امام باڑہ کو پختہ کروادیا تھا۔ ایضاً/266 لکھنؤ میں مرزا حاجی نے ایک امام باڑہ بنوایا تھا/ رقعات مرزا قتیل/27۔
5. تفضیح الغافلین/112-113 تاریخ اودھ 3 / 296-297، واقعات اظفری/107-108 '
شباب لکھنؤ/146 (OBSERVATIONS, etc.) 1, P 32)

چیزوں کی اس قدر چمک دمک ہوتی تھی کہ ناظرین کی نظر کو چکا چوندھ لگ جاتی تھی۔'' علموں کی طلائی اور نقرئی پنجوں کی جگمگاہٹ اور ان کے بھاری بھاری پٹکوں کی سجاوٹ، زردوزی کے کام پر گنگا جمنی کرن کی جھالروں کی زیبائش اور ان کی وجہ سے درودیوار کی آب وتاب، بس سارا امام باڑہ بقعۂ نور ہو جاتا تھا۔[1]

حضرت عباس کا علم

ساتویں محرم کو حضرت عباس[2] کی درگاہ میں علم[3] چڑھائے جاتے تھے۔ غلام علی نقوی کا بیان ہے
'' بتاریخ ہفتم محرم علم ہائے تمام شہر برآں آستانہ عالے می آمدند بسوائے ایں تاریخ روز ہائے، دیگر نیز در محرم ہمیں حال بود، لیکن بروز مذکور ہیچ جا علمی نبود کہ آنجانیاید'' شاہی امام باڑے سے جو علم اٹھتا تھا، اس کا جلوس بڑی شان وشوکت کا ہوتا تھا، اس جلوس میں سب سے آگے چھ سات ہاتھی ہوتے تھے، جن پر مغرق جھولیں اور پاکھریں پڑی ہوتی تھیں، نقرئی اور طلائی عماریاں کسی ہوتی تھیں اور ان ہاتھیوں کے گلے میں نقرئی گھنٹے اور ہیکلیں لٹکتی ہوتی تھیں، ہر ایک ہاتھی پر کچھ لوگ جواہر نگار علم ہاتھوں میں لیے سوار ہوتے تھے، اور ان کے ساتھ سپاہ کا ایک محافظ دستہ ہوتا تھا۔ ہاتھیوں کے عقب میں ایک شخص خاص طور پر سوگوار جلسہ میں ہوتا تھا، اس کے ہاتھ میں بانس کی ایک بڑی چھتر سیاہ کپڑے سے منڈھی ہوتی تھی۔ اس چھتر کے اوپر ایک الٹی کمان میں دو ننگی تلواریں آویزاں ہوتی تھیں۔ اس کے پیچھے خود بادشاہ سلامت ہوتے تھے، ان کے اردگرد خاندان شاہی کے افراد مقرب اور علما ہوتے تھے۔ ان کے پیچھے ''دُلدُل'' ہوتا تھا۔ اس کے پیر اور پہلو سرخ کردیے جاتے تھے، اور اس کا بدن تیروں سے چھدا ہوتا تھا، اس کی پشت پر نہایت مغرق زرتار وجواہر نگار ایک چار جامہ کسا ہوتا تھا، گھوڑے کا سب ساز وسامان طلائی ہوتا تھا، اور اس کی زین پر ایک عربی عمامہ کمان اور تیروں سے بھرا ایک ترکش بھی رکھ دیا جاتا تھا۔ اس کے پیچھے مغرق اور زرتار کے لباسوں میں ملبوس چند خادم ہوتے تھے، اور تماشائی خلقت ساتھ ہوتی تھی۔[4]

---

1 شباب لکھنؤ/146۔

2 شباب لکھنؤ/36,38۔

3 OBSERVATIONS, etc.1,P.P. 21-22۔

4 شباب لکھنؤ/150-149 عماد/ص173-172۔

ساتویں تاریخ کو" شادی امام قاسم" کی یادگار میں ایک شان دار جلوس نکلتا تھا۔ اور یہ جلوس " مہندی" کا جلوس کہلاتا تھا۔ مسز میر حسن علی کا بیان ہے،" شادی سے متعلق مہندی کی کئی کشتیوں کے علاوہ مٹھائیاں، میووں، چنبیلی کے پھول کے ہاروں، دوسرے قسم کے پھولوں کے ہار، جن کے نیچے آتش بازیاں پوشیدہ ہوتی تھیں، کشتیوں میں رکھ کر نکالی جاتی تھی، اس موقع پر ایک تعزیہ بھی نکالا جاتا تھا، اس کے ہمراہ چاندی کی پالکیاں اور چنڈول بھی ہوتے تھے۔ ان سواریوں میں شاہی خاندان کی مستورات یا امرا کے گھروں کی عورتیں ہوتی تھیں۔ ان سواریوں کے پیچھے کئی عدد بینڈ ہوتے تھے، اور بے حد روشنی کا اہتمام ہوتا تھا"۔[1]

دسویں کو تمام تعزیوں کو بڑی دھوم دھام، اور باجے گاجے کے ساتھ کربلا لے جایا جاتا تھا، اس موقع پر تجہیز و تکفین کی ساری رسمیں ادا کی جاتی تھیں[2] دولت مند لوگوں کے قیمتی تعزیے واپس لا کر امام باڑوں میں محفوظ کر دیے جاتے تھے۔[3] تعزیوں کو گڈھے کھود کر مع کل تحائف عروسی، ہار، پھول، عطریات وغیرہ کے دفن کر دیا جاتا تھا[4] اپنے مکانوں کو واپس آنے کے بعد تعزیہ دار غربا و مساکین میں کھانا، روپیہ پیسہ اور کپڑے بطور خیرات تقسیم کرتے تھے۔ محرم کے زمانے میں جو لباس وہ پہنتے تھے اسے بھی خیرات میں دے دیتے تھے۔[5]

شیعہ سنی تصادم

عاشورہ محرم میں شیعہ سنی اختلاف دوبارہ تازہ ہو جاتا تھا اور فتنہ و فساد کا شعلہ بھڑک اٹھتا تھا۔

---

1 برائے تفصیل دیکھیے۔ OBSERVATIONS, Val1, PP. 42-54 ۔

نیز دیکھیے رسالہ تعزیہ داری (قلمی) ص2، شباب لکھنؤ/150-55۔

2 تذکرہ گلشن ہند159۔ OBSERVATIONS, etc 1, 46,51۔

3 برائے تفصیل دیکھیے۔ OBSERVATIONS, etc.1,PP. 32,36

شباب لکھنؤ/155,157۔

4 شباب لکھنؤ/157، مدار الدولہ کی تعزیہ داری کے لیے دیکھیے۔ عماد/168, 128, 126۔

5 شباب لکھنؤ/157، OBSERVATIONS, etc.P P. 14، 52، 53 ہفت تماشا/ص155

ہدایت نامہ/12 رقعات مرزا قتیل ص89۔

یعنی مصنوعی تجہیز و تدفین میں شور و شر اور حقیقی کشت و خون کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ اس موقع پر کچھ نہ کچھ جانیں تلف ہو جاتی تھیں۔[1]

مجالس مرثیہ خوانی

عاشورہ محرم میں روز آنہ امام باڑوں میں دو مرتبہ تعزیوں کے روبرو مجالس عزا منعقد ہوا کرتی تھیں۔ نوابان اودھ خود ماتمی لباس پہنے اور سر پر طاؤس کے پروں کا تاج رکھے مرثیہ خوانوں کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ان کے پیچھے کثرت سے سرکاری ملازمین دو قطاروں میں بیٹھتے، واقعہ خواں واقعاتِ کربلا بیان کرتا، سامعین بڑی خاموشی سے مغموم و حزیں بنے بیٹھے رہتے، اور ہمہ تن گوش ہو کر مرثیہ سنتے، لیکن سنتے سنتے ان کے دل گداز ہونے لگتے اور بالآخر حاضرین ڈاریں مار مار کر گریہ وزاری شروع کر دیتے، اس حالت میں بعضے سامعین کی زبان سے ''حسین، حسن'' کا نعرہ بھی بلند ہوتا۔ اور آخر میں سب لوگ سینہ کوبی کرنے لگتے تھے۔ مجلس کے اختتام پر شربت سے سامعین کی تواضع ہوتی اور واقعہ خوانی کے بعد مرثیہ خوانی شروع ہوتی۔[2]

بیگمات شاہی کے امام باڑے محلات کے اندر علاحدہ علاحدہ ہوتے، وہاں کی مجلسوں میں عورتیں حدیث خوانی اور مرثیہ خوانی کیا کرتی تھیں۔ ان مجلسوں میں بھی سینہ کوبی اور حَسن حسین کے نعرے بڑے جوش و خروش سے بلند ہوتے تھے۔[3]

بدیں سبب مرثیہ نویسی اور مرثیہ خوانی کے فن کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ فیض آباد اور لکھنؤ کے تمام شعرا نے مرثیے لکھے ہیں، انیس اور دبیر نے اس فن کو نقطۂ کمال پر پہنچا دیا تھا۔ میر علی نے ''وہ طرزِ مرثیہ خوانی کا ایجاد کیا کہ چرخِ کہن نے مسلم الثبوت استاد کیا۔''[4] ان کے علاوہ میاں دلگیر[5]

---

1. شباب لکھنؤ ص۔157، OBSERVATIONS, etc.1,P P. 14،52،53،157۔
2. برائے تفصیل دیکھیے۔ OBSERVATIONS,1,PP. etc 19,25 تاریخ فرح بخش 2/ 53 رسالہ تعزیہ داری ص۔ 3,13,15 گزشتہ لکھنؤ/ص 373-372۔
3. شباب لکھنؤ/ص 148، OBSERVATIONS, etc, 1, PP.-24.29۔
4. فسانۂ عجائب/ص 8 'وقائع عبدالقادر خانی، 1 /ص 162۔
5. فسانۂ عجائب/ص 8 'وقائع عبدالقادر خانی، /ص 162۔/8

آغا محمد ندیم[1] مشہور مرثیہ خواں تھے۔ سودا، میاں حسرت، شاہ واقف، میاں جرأت مرزا کدا علی کدا، شیخ اللہ سکندر جیسے مرثیہ خواں ایک وقت میں فیض آباد میں جمع تھے۔ سید احسان حسن مخلوق سلام و مرثیہ کہتے تھے[2] مصحفی مرثیہ خوانی کرتے تھے، ایک شعر میں خود کہتے ہیں:

تمھارے ساتھ میاں مصحفی ہیں جوق کے جوق ☆ مگر تم آئے ہو مجلس سے مرثیہ پڑھ کر[3]

فاتحہ

کھانے پینے کی چیزوں مثلاً ریوڑی، الائچی دانہ، اور شربت کو تعزیوں کے سامنے رکھ کر فاتحہ دی جاتی تھی[4]۔ اور علموں کے سامنے حلوے سے بھرے کونڈے رکھے جاتے تھے۔[5] دوسرے دن یہ حلوہ غربا اور یتیموں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ عشرہ محرم کے زمانے میں پکا ہوا کھانا غریبوں اور ناداروں میں تقسیم کیا جاتا تھا[6] ہر چرن داس نے پینتالیس برسوں تک مرزا حسین علی خاں کے امام باڑہ میں کھانا تقسیم کرنے کی خدمات انجام دی تھیں[7] دوران محرم میں شربت کی سبیلیں لگائی جاتی تھیں[8]

سوگ

بالعموم مسلمانوں کے لیے اور بالخصوص شیعوں کے لیے عاشورہ محرم سوگ اور تمام لوازمات آسائش سے پرہیز گاری کا زمانہ ہوتا تھا۔ شیعہ حضرات نفس اور خواہشات انسانی پر جبر کرتے تھے۔ کھری چارپائیوں پر سوتے، موٹا جھوٹا کھاتے، مثلاً جو کی روٹی، ابلے چاول اور ابلی دال پر گزارا کرتے تھے۔ عورتیں زیورات اتار دیتیں، بناؤ سنگار، مسی، پان، سرمہ وغیرہ چھوڑ دیتی تھیں۔ دسویں محرم کو تعزیہ دار ننگے سر اور پیر تعزیوں کے ہمراہ کربلا تک جاتے تھے۔[9]

---

1 تاریخ اودھ 3/ 351، مرزا محمد رضا فیض آباد کے نامی گرامی مرثیہ خوانوں میں سے تھے۔ تاریخ فرح بخش 11/ 113۔

2 ریاض الفصحا/ 307 برائے مرثیہ خواناں لکھنؤ ملاحظہ ہو گزشتہ لکھنؤ/ 373,379۔

3 دیوان مصحفی سوم (رام پور) ص 130 الف

4 رسالہ تعزیہ داری/ 10,20۔

5 رسالہ تعزیہ داری/ 21,22۔

6 چہار گلزار شجاعی/ 246 الف 247 الف، کاشف الاستار/ 368۔

7 چہار گلزار شجاعی/ 246 الف 247 الف، کاشف الاستار/ 368۔

8 OBSERVATIONS, etc, P-13

9 برائے تفصیل دیکھیے OBSERVATIONS, PP.43-47 شباب لکھنؤ (149,748 دیوان مصحفی (ق۔11)

چہلم

دسویں محرم کے بعد چالیسویں دن چہلم کی رسومات اسی پیمانے پر ادا کی جاتیں جس طرح کسی عزیز کی وفات کے بعد، ماتم کیا جاتا، اور علم نکالے جاتے تھے۔[1]

فیض آباد اور لکھنؤ کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی محرم منائے جاتے تھے۔ جارج فورسٹر نے الہ آباد میں محرم کے انعقاد کا ذکر کیا ہے[2] یہی حال بلگرام اور مارہرہ کا تھا۔[3]

ایک بات توجہ کے قابل یہ ہے کہ محرم میں الاؤ پر کودنے کا بھی رواج پایا جاتا تھا۔

مرزا قتیل نے سنی تعزیہ داروں کے بارے میں لکھا ہے کہ شریف سنی حضرات تعزیہ داری نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ وہ روضہ خوانی کی مجلس میں شریک ہوتے، خطبہ اور مرثیے پڑھتے، اور واقعۂ کربلا فارسی اور مرثیہ ہندی میں سنتے تھے اور گریہ وزاری کرتے تھے، لیکن اس کے برعکس نچلے طبقے کے سنی تعزیہ دار تھے، محرم کے دنوں میں ہر دکان کے سامنے تعزیہ پایا جاتا تھا۔ مگر ان لوگوں کی تعزیہ داری ہندوؤں کے مانند تھی جو اپنی برادری میں نمود و نمائش کے لیے تابوت بناتے تھے، اہلِ سنت میں بھی بعض جاہل، جوانی کے غرور اور سرکشی کی وجہ سے عشرہ کے دن لڑائی جھگڑا کرنے کے لیے یا دوسرے تعزیہ داروں کے ساتھ راہ چلنے میں یا نیچ لوگوں کی صحبت کے اثر سے جوئے خانے میں یا ایسی ہی کسی دوسری جگہ پر جاتے تھے۔ اپنے گھروں پر تعزیہ داری کرتے تھے، جو شخص بھی اس کی زیارت کرنے آتا تو اس پر چار یار کا نعرہ لگا کر سنی ہونے کا بھی اظہار کرتے تھے۔ چونکہ شیعہ حضرات محرم میں سیاہ یا سبز لباس اور بعض اہلِ احتیاط نیلے کپڑے بھی پہنتے تھے۔ سنی اپنے بچوں کو سبز کپڑے اور سبز و سرخ ڈوریاں پہناتے تھے۔ جوان لوگ بھی پہنتے تھے، اور دس دن تک گوشت بھی نہیں کھاتے تھے۔ اکثر لوگ گھی بھی نہیں استعمال کرتے تھے۔ اور شب عاشورہ کو چہل منبر کی زیارت کے لیے بھی جاتے تھے، اور ہر منبر پر حصولِ مطلب کے لیے منت کا ڈورا بھی باندھتے تھے۔[4] قصبات کے سنی بھی تعزیہ داری

---

1. OBSERVATIONS, 1,99,100 فسانۂ عجائب/11 رسالہ تعزیہ داری۔
2. George Forster: Travels in INDIA, 1,PP. 88 ۔
3. کاشف الاستار/368۔
4. ہفت تماشا/154-155۔

کرتے تھے۔[1]

تورانی نسل کے لوگوں کی تقلید میں شیعہ حضرات بھی امیرالمومنین علیہ السلام کی نذر کا دسترخوان بچھاتے تھے، اوراس پر کھانے چُن دیتے تھے۔ پھر منتظر رہتے تھے کہ جناب امیرالمومنین تشریف لائیں گے، اوران میں سے بعض کھانے نوش فرمائیں گے، پھران کھانوں پر جناب امیر کے دست مبارک کے نشانات ڈھونڈھتے تھے۔[2]

مرزا قتیل نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض قصبات میں یہ بھی رسم ہے کہ عاشورہ کے دن نیچ ذات کی عورتیں نئے لباس میں آراستہ ہوکر تعزیہ داروں کے ساتھ شہر سے باہر جاتی ہیں اور ضریح مبارک اور کاغذ کے تابوت کودفن کرتے وقت ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈال کر زار زار روتی ہیں۔[3]

بعض مرتبہ ان جلوس اور جلسوں میں اتنا اژدحام ہوتا تھا کہ کافی تعداد میں لوگ زخمی اور جان سے ہاتھ دھو لیتے تھے۔ ایک مرتبہ قریب سات سو آدمی تلف ہوئے۔[4]

جشن ولادت امام حسین

سعادت علی خاں کے زمانے میں حضرت امام حسین کی ولادت کے دن ایک جشن منعقد ہونے لگا تھا۔ اس دن دربار میں بھی جشن منایا جاتا۔ امرا اور خواتین نواب کی خدمت میں نذریں پیش کرتے اور خلعتیں پاتے تھے۔[5] فاتحہ حضرت علی (کاشف الاستاد (368)

عید غدیر[6]

لکھنؤ میں عید غدیر کا جشن منایا جاتا تھا۔ انشاءاللہ خاں نے عید غدیر کی تہنیت میں ایک ترجیع

1. ہفت تماشا/167۔
2. ہفت تماشا/155-156۔
3. ہفت تماشا/169۔
4. چہار گلزار شجاعی/192الف
5. عماد/ص 174، مرزا رجب علی بیگ سرور کا بیان ہے کہ ہر امام کی ولادت اور شب وفات کو جشنوں میں لاکھوں روپے صرف کردیے جاتے تھے۔
6. آخری حج سے واپسی کے موقع پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے غدیر کے مقام پر (بقیہ صفحہ 409 پر)

بند شہزادہ سلیمان شکوہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس کا پہلا بند یہ ہے:

چمک کھڑی ہو سلیمان شکوہ کے شمشیر　　بلطف صفدر ضرغام دیں جناب امیر
خدا کرے یہ مبارک ہو ایسی عید غدیر　　یہی کہے ہے دعا مانگ ہر صغیر و کبیر
کہ نذر جشن جلوس اب کی سال دیوے وزیر[1]

شب برات

لکھنؤ میں اس تہوار کے منائے جانے کا اندازہ مسز میر حسن علی کے اس بیان سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ چاند کی چودھویں کی رات، شب برات کی رات ہوتی تھی اور یہ رات ہر طبقے اور حیثیت کے مسلمان کے لیے بڑی دل چسپی اور اہمیت کی ہوتی تھی کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ اس رات کو ہر ایک شخص کا اعمال نامہ کھولا جاتا ہے اور اس کی قسمت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس دن مخصوص قسم کے کھانے تیار کر کے مرحومین کی ارواح کو ایصال ثواب کے لیے الگ الگ فاتحہ دی جاتی تھی۔ اس کے بعد ہر ایک متوفی کے نام کا حصہ اس کی قبر پر پہنچا دیا جاتا تھا۔ اور اگر بآسانی اس کی قبر پر نہ پہنچایا جا سکے تو اس فاتحہ کے کھانے کو غریبوں اور مسکینوں میں بانٹ دیا جاتا تھا، مگر اس موقع پر پکائے جانے والے کھانوں میں کسی بھی صورت میں گوشت شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ مختلف قسم کی روٹیاں، میٹھے چاول اور دوسری طرح کا میٹھا اس موقع کے لیے مخصوص تھا۔[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ 409 کا　　قیام کیا۔ آپ نے خطبے کا اعلان کیا اور جو لوگ آگے جا چکے تھے ان کو بھی واپس بلالیا۔ اسی طرح اس موقع پر مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت جمع ہوگئی، اونٹوں کے پالان کا منبر بنایا گیا۔ اس پر کھڑے ہوکر آنحضرتؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ مابعد آں حضرت نے حضرت علی کا شانہ پکڑ کر فرمایا۔ میں جس کا مولا ہوں، حضرت علی اس کا مولا ہے۔ جس نے حضرت علی کو عزیز رکھا۔ مجھے عزیز رکھا، جس نے اس سے دشمنی کی، وہ میرا دشمن ہے۔ حاضرین نے حضرت علی کو مبارک باد دی۔ وہ دن شیعوں کی نظر میں خوشی کا دن ہے۔ لہٰذا اس دن کی یاد میں عید غدیر کا جشن لکھنؤ میں منایا جاتا تھا۔

---

1. کلیات انشا/419 نیز ملاحظہ ہو، دیوان مصحفی ششم (ق۔ پٹنہ) ص206 (الف) فسانہ عجائب/11۔
2. برائے تفصیل دیکھیے: OBSERVATIONS, etc.1,PP.300-302۔

اس رات کو آتش بازی اور چراغاں کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔[1] دین دار اور پرہیزگار مسلمان وہ رات توبہ واستغفار میں بسر کرتے تھے، اور متوفین کی نجات کے لیے دعائیں کرتے تھے۔ شیعہ حضرات اس رات کو بڑی اہمیت دیتے تھے، مسیز میر حسن علی کا بیان ہے۔

''اثنا عشری فرقے کے لوگ اس رات کو اور بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں، کیونکہ یہ دن امام مہدی کی ولادت کا دن بھی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگ امام حسین اور حسن کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ ان کے مصائب کی یاد میں اپنے گھروں کے سامنے کی زمین پر (یا صحن میں) چکر لگا کر زیارت کی رسم ادا کرتے تھے، تجہیز وتکفین کے مراسم ادا ہوتے تھے اور خاتم النبیین اور اماموں کے نام پر درود اور سلام پڑھے جاتے تھے، یہ سب رسمیں شب برات کی رات کو ادا ہوتی تھیں''[2]

شعبان

اس تقریب میں کشتی نما لکڑی کا ایک ڈھانچہ بنایا جاتا تھا۔ رنگین ململ یا ریشمی زربفت کے سنہرے اور نقرئی کپڑوں سے جن کے کناروں پر خوب صورت اور زری کے کام کے کاغذ کی گوٹ لگی ہوتی تھی، اس ڈھانچے کو ڈھک دیتے تھے۔ اس کشتی میں مٹی کے دیے جلائے جاتے تھے۔ اس کشتی کو 'الیاس' کی کشتی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور ایک بڑے جلوس، باجے گاجے کے ساتھ دریا تک لے جاتے تھے، گھروں کے ملازمین، امرا

1۔ برائے تفصیل 1 /ص 302، نیز ملاحظہ ہو، معدنِ معانی /30 ب، رسالہ نو بادہ/ 34 ب' دیوان عیشی (قلمی) ص 103-104۔

شب برات ہے آج اور یہ نور کا ہے وفور — کہ چشم روزن دیوار تک نہیں بے نور
پری رخوں کے نہیں ہاتھ میں یہ پھلجھڑیاں — ہیں نکلیں نور کے پھولوں کی لے کے چھڑیاں خور
یہ ہر گلی میں ہے گلہائے آتشیں کی بہار — کہ جس کو دیکھ کے کہتے ہیں اہلِ فہم وشعور
زیادہ سب سے اناروں نے سرکشی کی ہے — بھرا دماغ میں ہے کوٹ کوٹ کر شر وشور
یہ شب کہ جس کو شب قدر سے ہے نسبت نام — یہ شب کہ جس میں ہے عالم تمام عالم نور

کلیات انشا/193

شب برات جو آئی تو دیکھیو انشا — کہ بج رہی ہے پٹاخوں کی کیا چناخ پٹاخ

2۔ برائے تفصیل دیکھیے۔ OBSERVATIONS etc 1,P.303۔

کے سپاہی، اس جلوس میں دستور کے مطابق شامل ہوتے تھے۔ جوں جوں یہ جلوس دریا کے قریب تر ہوتا جاتا اس میں تماشہ بینوں کی کثرت ہوتی جاتی۔ بڑی دھوم دھام کے ساتھ وہ کشتی پانی میں چھوڑ دی جاتی۔ جوں جوں کشتی پانی میں دور ہوتی جاتی اس کا منظر قابل دید ہوتا جاتا۔ وہ روشنی دور سے بہت دل کش معلوم ہوتی تھی [1]

ہلال

ہر ماہ کی پہلی تاریخ کے چاند کو دیکھ کر ہر طبقے کے مسلمانوں میں ایک خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ اور ہر نیا چاند ایک تقریب کا موقع بہم پہنچاتا تھا۔ نوابوں اور امرا کے ہاں اس موقع کے اعلان کے لیے توپیں داغی جاتی تھیں۔ [2]مذہبی لوگ اس دن غسل اور کپڑے تبدیل کرنے میں مشغول رہتے تھے، توپیں دغنے کے بعد تو وہ لوگ قرآن منگواتے اور اس حصے کو کھولتے جہاں پر آنحضرتؐ نے اللہ تعالی سے دعا کی تھی۔ آئینہ سے چاند دیکھا جاتا، لوگ ایک دوسرے کو بغل گیر کرتے اور بڑوں کا احترام کرتے، غلام اور ملازمین مبارک باد پیش کرتے اور مٹھائیاں تقسیم کی جاتیں۔

عرس غوث الاعظم

بڑی کوشش کے باوجود کسی ہم عصر کتاب میں اس بات کا ذکر نہیں مل سکا کہ اودھ میں یازدہم پیر دستگیر کے جلسوں کی کیا نوعیت تھی اور کیا اسی پیمانے پر یہ جلسے اس علاقے میں بھی منعقد ہوتے تھے جس طرح دہلی کے ضمن میں ہم لکھ چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ نوابوں کو اس جلسے سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اس وجہ سے اودھ میں یازدہم کے جلسوں کا رواج نہ ہو سکا۔

غوث الاعظم کے عرس کے جلسے کا علم صرف عماد السعادت کے مطالعہ سے ہوتا ہے جو کتاب 1236 ھ میں لکھی گئی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ یازدہم کے جلسے اُودھ میں منعقد ہوتے ہوں مگر کسی مورخ نے ان جلسوں کے بارے میں لکھنے کی تکلیف گوارہ نہ کی ہو، غلام علی نقوی کا بیان ہے کہ [3]

1. برائے تفصیل دیکھیے۔ OBSERVATIONS etc. 1,PP.289-290۔

دیوان مصحفی دوم (ق رام پور) 91ب۔

2. برائے تفصیل دیکھیے۔ OBSERVATIONS etc. 1,PP.289-290۔

دیوان مصحفی دوم (ق رام پور) 292، 156, 158 ب۔

3. شاہ شرف الدین قادری شاگرد ملا کمال الدین سہالوی، معارف نومبر (70، ص 359)

شاہ مدن، جو پیر زادہ تھے اور ان کا سلسلۂ نسب غوث الاعظم تک پہنچتا ہے۔ شاہ آباد میں سکونت رکھتے تھے، اور بعد میں خالص پور میں رہنے لگے تھے، ہر سال وہاں غوث الاعظم کی یازدہم کا عرس منعقد کرتے تھے۔ جوق جوق علما، طلبا، فضلا، اور مشائخ قرب وجوار کے علاقوں مثلاً عظیم آباد، سہسرام، جونپور، الہ آباد، اودھ، شاہ آباد، کوڑہ جہاں آباد، کالپی، اٹاوہ، خیر آباد، سندیلہ، کاکوری، لکھنؤ، سلون، بریلی وغیرہ آکر جلسے میں شریک ہوتے تھے۔ تین دن تک یہ جلسہ ہوتا رہتا تھا اور زائرین کے طعام وقیام کا انتظام شاہ صاحب خود کرتے تھے۔ تقریباً تیس ہزار آدمی یہاں جمع ہوتے تھے۔[1] عبدالرحیم قوال شاہ صاحب کا مرید تھا اور اس موقع پر اور دوسرے قوالوں کے علاوہ مجلس میں قوالیاں گاتا تھا۔[2]

جشنِ بارہ وفات

بارہ وفات کے جلسے اور مجلسیں بلگرام میں منعقد ہوتی تھیں۔ سید حمزہ کا بیان ہے کہ شاہ برکت اللہ اپنی خانقاہ میں مجلس کا اہتمام کرتے، بڑا بھاری مجمع ہوتا، اور اس کے دوران زیارت موئے مبارک عمل میں آتی۔[3] مختصر بلگرام اور مارہرہ میں ہر ماہ یازدہم اور دوازدہم کا کھانا لوگوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔[4]

1۔ عماد/116 کاشف الاستار/ص368 شجاعت خاں افغان اور یازدہم کے جلسے، تفصیل دیکھیے۔

کاشف الاستار/525-527

رسالہ تعزیہ داری/18۔

2۔ عماد/131 اکبر آبادی کے مشہور شعر میں انھیں شاہ مدن کی طرف اشارہ ہے۔

اگرچہ شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی ☆ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

(ملاحظہ ہو: دید و دریافت از نثار احمد فاروقی)

3۔ کاشف الاستار/ص192-191 152-151۔

4۔ کاشف الاستار/ص368، نیز ملاحظہ ہو، دیوان مصحفی دوم (ق۔را) ص86ب

کھیل اور تفریحی مشاغل

چوپڑ

انشا[1] اور دیگر شعرا کے کلام میں چوپڑ کھیلنے کے بارے میں کثرت سے اشعار ملتے ہیں، جن سے عوام میں چوپڑ بازی کے رواج کے متعلق روشنی پڑتی ہے۔ مصحفی نے پوری ایک غزل شطرنج کی ردیف میں لکھی ہے۔[2] لکھنؤ کی عورتوں میں چوپڑ کھیلنے کا شغل پایا جاتا تھا۔[3]

نردبازی

مسیز میر حسن علی نے لکھا ہے کہ عورتیں تاش کھیلا کرتی تھیں۔ مرد نرد بازی کے ذریعہ قمار بازی کا شغل کرتے تھے۔[4]

پچیسی

عورتوں اور مردوں دونوں میں پچیسی کھیلنے کا رواج عام تھا۔[5]

شطرنج بازی کا عام رواج تھا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانہ آزاد میں اس کھیل کا مفصل ذکر کیا ہے۔[6]

---

1. کلیات انشا/
یوں لگی کو سے چوپڑ میں جو ہاری وہ پری　　　تی ہو جائے دمن مرتیراراجہ ئل جائے
/20,47,54.74.121,179۔

2. دیوانِ مصحفی (ق۔پ) 122 الف، 125 ب

3. OBSERVATIONS,1, etc. .P252 ۔
مجموعہ مثنویات میر حسن/28, 70۔

4. OBSERVATIONS,1, etc. P. 252 ۔ گنجینہ مثنویات میر حسن/70 کلیات انشا/138۔

5. کلیات انشا/191,204,21,211

6. فسانہ آزاد/590,595۔

پتنگ بازی

لکھنؤ کے عوام وخواص، ہر طبقے کے لوگوں میں پتنگ بازی کا شوق پایا جاتا تھا۔ مسز میر حسن علی نے لکھا ہے یہاں ہر عمر کے لوگ پتنگ بازی کا شغل کرتے ہیں۔ میں نے معمر لوگوں کو اس شغل میں مشغول دیکھا ہے جنھیں اس بات کا بالکل احساس نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایسے کام میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں جو صرف بچوں کو زیب دیتا ہے۔ پتنگ مکانوں کی چھتوں سے اڑائے جاتے تھے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے لوگ چھتوں پر جا کر اس شغل کے لیے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ وہ پتنگ بازی میں بہت مسرت محسوس کرتے تھے۔ پتنگ لڑانے کا یہ طریقہ تھا کہ لوگ مانجھا والی ڈور سے اپنے پڑوسی کے پتنگ سے اپنا پتنگ لڑاتے تھے۔ جب ہوا میں پتنگ ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں تو دونوں پتنگ باز اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کی ڈور اوپر آجائے، اوپر والی ڈور نیچے والی ڈور کو کاٹ دیتی ہے، پتنگ کٹنے کے موقع پر ان میں سے فاتح اور تماشہ بینوں کو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ بچے شور وغل کرتے ہوئے کٹی پتنگ کو لوٹنے کے لیے دوڑتے ہیں لیکن کسی ایک شخص کے ہاتھ وہ پتنگ نہیں آتا، بلکہ اس کے پُرزے پُرزے ہو جاتے ہیں۔ اپنی پتنگ کی ڈور کو اوپر کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی جاتی ہے تاکہ وہ طرف ثانی کی پتنگ کو کاٹنے میں کامیابی حاصل کر سکے[1]۔ بخشو اور سالاری کامل پتنگ باز تھے[2]۔

کبوتر بازی

لکھنؤ میں کبوتر بازی[3] کے شوق کا آغاز خاندان نوابان کے قیام کے ابتدائی زمانہ سے ہی ہو گیا تھا۔ وہاں کے عوام کو اس بازی سے بڑی دل چسپی تھی۔ مسز میر حسن علی نے کبوتر بازی کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔ ''اس شہر (لکھنؤ) کے مرد کبوتر بازی کے فن میں بڑے مشاق اور کامل فن ہیں۔

---

1 OBSERVATIONS,etc. 1, 216-17 Lumsdon: A Journey: P 14

ہوتا ہے پہلے خون سے مانجھے کا رنگ سرخ وہاں سارے ڈور پر نہیں اڑتا پتنگ سرخ۔ کلیات انشا/200 فسانہ عجائب/9

2 فسانہ عجائب/9

3 برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ گزشتہ لکھنؤ 187 -148، ثمرات البدائع/ 36,37 تاریخ احمد شاہ تا آصف الدولہ/ص 7، عماد/144۔

Lumsdon A Jourmey etc 14. ORLICH Travels. 1/P 93-94۔

اور وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے پاس عمدہ اور اچھی نسل کے کبوتر ہوں۔ اس لیے وہ دنیا کے مختلف حصوں سے بڑی قیمتوں پر کبوتر منگواتے ہیں، کبوتر باز اپنے کبوتروں کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ اور دوسرے غول میں گڈمڈ ہوجانے کے باوجود وہ پہچان لیتا ہے۔ چھتوں کے اوپر لکڑیوں کی جعفریاں بنائی جاتی ہیں اور ان میں ان کبوتروں کو رکھا جاتا ہے۔ روزانہ صبح و شام وہاں جاکر کبوتروں کا مالک انھیں دانہ کھلاتا ہے اور پھر انھیں پرواز دیتا ہے۔ بالعموم اسی وقت اس کا کوئی پڑوسی بھی اپنی کبوتریں اڑاتا ہے۔ یہ کبوتریں ان میں شامل ہوکر طرف ثانی کے دو ایک کبوتر اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ آئے ہوئے کبوتر اس کی قانونی ملکیت ہوجاتی ہیں۔ طرف ثانی اس وقت تک نوگرفتار کبوتروں کو ان کے مالک کو واپس نہیں کرتا جب تک وہ ان کی قیمت ادا نہ کرے یا ان کے بدلے میں وہ کبوتر واپس نہ کردے جو اس نے طرف ثانی کے غول سے پکڑ رکھے تھے۔ اگر طرف ثانی سے کسی قسم کا عناد ہوتا ہے تو ایسی صورت میں پکڑے گئے کبوتروں کو واپس حاصل کرنے کے لیے بڑی قیمت چکانی پڑتی ہے بعض مرتبہ ایسی صورت میں بات جھگڑے نمٹنے تک نوبت پہنچ جاتی ہے"۔[1]

یار علی، بریلی کا باشندہ تھا، اپنے وطن سے آکر اس نے فیض آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اپنے اس فن کی وجہ سے عہد شجاع الدولہ میں اس نے بڑا عروج پایا[2] شرفا کے خاندانوں میں بھی کبوتر بازی کا شوق سرایت کرگیا تھا۔ ابتدائی جوانی میں ملاّ نظام الدین سہالوی کے صاحب زادے ملاّ عبدالعلی (بحرالعلوم) کو کبوتر بازی کا شوق تھا۔ ایک بزرگ کے لعنت ملامت کرنے پر اس شغل کو ترک کردیا تھا[3] دہلی، فیض آباد اور لکھنؤ میں ایک ایسا طبقہ پایا جاتا تھا جو کبوتر فروخت کرکے اپنی روزی کماتے تھے، وہ جنگلوں میں جاکر کبوتروں کا شکار کرتے یا جالوں سے پکڑتے تھے[4]

مُرغ بازی

لکھنؤ اور فیض آباد میں مرغ بازی کا شوق عوام وخواص ہر طبقے کے افراد میں پایا جاتا تھا۔

---

1. OBSERVATIONS etc.PP. 217-18۔
2. محمد فیض بخش نے یار علی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ تاریخ فرح بخش 11 / 225.229۔
3. معارف (دسمبر 1970 ص 415-414۔
4. مجموعہ مثنویات میر حسن/ 152، OBSERVATIONS, etc , P225-226. فسانہ عجائب۔

عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے ”مرغوں کی لڑائی کا شوق یہاں نواب شجاع الدولہ کے عہد سے آخر تک برابر رہا۔ نواب آصف الدولہ کو بے انتہا شوق تھا۔ نواب سعادت علی خاں باوجود بے دار مغز کے مرغ بازی کے دل دادہ تھے۔ ان کے شوق نے سوسائٹی پر ایسا اثر ڈالا کہ لکھنؤ کے امراد بار در کنار اس زمانے میں جو اہلِ یورپ یہاں موجود تھے۔ انھیں بھی یہی شوق ہو گیا تھا۔ چنانچہ جنرل مارٹن اوّل درجے کے مُرغ باز تھے اور نواب سعادت علی خاں سے بازی بد کر لڑایا کرتے تھے۔“[1]

میر تقی میر نے لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرت کے بارے میں اتنا کم لکھا ہے جو نا کے برابر ہے مگر انھوں نے ایک مثنوی وہاں کے مرغ بازوں کے بارے میں لکھی ہے، مرغ بازی بالعموم جمعہ اور منگل کو ہوا کرتی تھی۔ وہ مثنوی یہاں نقل کی جاتی ہے تاکہ مُرغ بازی کی پوری تصویر قارئین کی نظروں کے سامنے آجائے۔

دلی سے ہم جو لکھنؤ آئے — گرم پر خاشِ مرغ یہاں پائے
پروپُرزا درست یکساں ہے — مُرغ تصویر کا بھی حیراں ہے
مرغ ہے ایک ایک جیسے کلنگ — قازوسارس سے جنگ جس کا ننگ
حوصلہ کس قدر حواصل کا — ذکر کیا کرکسِ شتردل کا
لات کی گھات کر جو مڑ جاوے — نسرِ طائر کا رنگ اڑ جاوے
زہرہ ققنس کا اس خطرے آب — شب نہ سووے ہر اِن سے سُرخاب
بکری سافیل مرغ کو مارا — کب شترمرغ سے ہوا چارا
آدمی جو بڑے کہلاتے ہیں — مرغ مارے بغل میں آتے ہیں
سرخہ دبنزوار کے سب مرغ — ہیں ثنا گستر ایسے تھے کب مرغ
ہو جو کیں مرغ خانگی کے تئیں — مت سُن اس ہرزہ چانگی کے تئیں
لات ماری جو کاٹ کر حلقوم — حیدر آباد تک پڑی ہے دھوم
کھاکے سینے کی مدعی سووے — نسر واقع کا واقعہ ہو وے
نے ثنا سے بطیں ہی ہیں تر لب — مرغِ عیسیٰ ہیں مدح خواں ہر شب

---

1. گزشتہ لکھنؤ، ص176۔

ٹینی کے سر پہ آج ٹیکا ہے | اس کے آگے کٹیل پھیکا ہے
کیا عجب ان کی رہ گزر کا فرش | ہوں پر افشاں تو ہو خروس عرش
اڑ گیا حلق کا جو لڑتے پوست | کی صدا مرغ دوست نے ہی دوست
کیس اس رنگ ہوتے ہیں محسوس | جوں گلستاں میں ہو ویں تاج خروش
شور جنگ آوری کا تا کہسار | کبک کا گھر خروس پر ہے بار
کب ہیں پہلے سے مرغ زریں بال | حسن لاکھے کا سمجھے مرغ خیال
کر سکے وصفِ مرغ کیا کوئی | مُرغ آمین کو دعا گوئی
وقر اتنا کہ دیر بچے لیں | جان دے کوئی تخم مرغ نہ دیں
مرغ بازوں سے ساز کر دیکھا | درالطاف باز کر دیکھا
ربط رکھا بہت انھوں کے ساتھ | ایک پر مرغ کا آیا نہ ہاتھ
مُرغ کا مرغ ہو وے مُرغ انداز | مُرغ ایسا ہو تو بجا ہے ناز
یعنی اپنا حریف جب پاوے | پر ہلانے نہ دیوے کھا جاوے
سینہ کیا سینہ بال کیا پروبال | جیسے چشمِ خروس آنکھیں لال
بازی بدبد کے جب لڑاتے ہیں | کانٹے لوہے کے باندھ لاتے ہیں
آیا حلقوم کے کہ حلق کے پار | پھوٹا چھاتی میں ایک لگ کے دوسارے
ہاتھ جس مرغ بازس کے تھا وہ | پانی کرنے لگا تر آکروہ
کچھ تو ٹھہرا تو دم دیا ان نے | تعبیہ کر کے رکھ لیا ان نے
اور جو ست ہو ہوا تھیلا | دونوں بازو کے پردیے پھیلا
دم سے کیا ہو یہ بیدم ومجروح | قصد پرواز میں تھا مرغ روح
ہوچکا ہوچکا ہوا یہ شور | ڈھلکی گردن گیا وہ سارا زور
پھیلا پانی میں وہ غمِ جاں سوز | دل زرہ پھر ہیں مُرغ دست آموز
جانور رنگ باختہ سب ہیں | یعنی حیران فاختہ سب ہیں
مرغ قبلہ نما کو وحشت ہے | بال کھولے ہیں پر نہ طاقت ہے

ورنہ اڑکر کہیں چلا جاتا دیر اپنے مقام پر آتا
جمع منگل کو پالی کی ہے دھوم گلیوں میں روز محشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش
مرغ لڑتے ہیں ایک دولاتیں سیکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
ان نے پرجھاڑے یہ پھڑکنے لگے ان نے کی توک یہ کڑکنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج ساتھ اس کے بدلتے ہیں کج دھج
مرغ کی ایک پرفشانی ہے ان کی صدرنگ بدزبانی ہے
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ
جھکتے ہیں آپ کو تراتے ہیں لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں
ایک کے منہ میں مرغ کی منقار ایک کے لب پہ ناسزا گفتار
منہ پہ آیا جو کچھ وہ بکنے لگے تیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگے
طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے بعد نصف النہار رخصت ہے
کھانچے سرپر بغل میں مارے مرغ لے گئے جیتے ہارے سارے مرغ
پھر جو روز معین آوے گا نالہ مرغ سحر سناوے گا
عالم آوے گا گردویسا ہی گرم ہنگامہ ہو گا ایسا ہی

میر ان کا نہ ہووے گو قائل
مُرغ معنی پہ وہ بھی ہے مائل [1]

☆☆☆

مصحفی نے ''مثنوی مرغ نامہ مرزا تقی فیض آبادی'' میں مرزا تقی کے مرغوں اور ان کی مرغ بازی اور مرغوں کی تربیت اور غذا کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ مرزا تقی کو اس فن کی اچھی مہارت تھی، مشہور ومعروف مرغ باز تھے، اور تین تین ہزار روپے کی بازی بدکر مرغ لڑاتے تھے، اپنی دولت انھوں

1۔ کلیات میر، ص808،810 نیز دیکھیے: گزشتہ لکھنؤ/ص 175،178، عماد/144۔

OBSERVATIONS, etc.1.- P.220, Lumsdon:P.14۔

نے اس بازی کے نذر کر دی تھی[1]

انشاءاللہ خاں انشا کو مرغ بازی کا شوق تھا، انشا نے ایک مثنوی ''مرغ نامہ'' کے نام سے لکھی ہے، جس میں انھوں نے اپنے اس شوق کا ذکر کیا ہے۔

اب مجھے بھی یہ شوق ہے اس کا   کہ سمجھتا ہوں مرغ کو عنقا
قصد پالی کا جب کہ کرتا ہوں   گیا ہے ڈگ لمبے لمبے بھرتا ہوں
داب اپنی بغل میں ایک مرغا   چلتا رپ رپ قدم ہوں میں یرغا
مثل فولاد مرغ ہیں اپنے   دادبے داد مرغ ہیں اپنے
پاس اپنے جو مرغ ہے جاوا   ہے وہ اسفند یار کا باوا
ہیں غرض خوب خوب عالی مرغ   ہے بجا کہیے اگر انھیں سیمرغ[2]

بٹیر بازی

بقول عبدالحلیم شرر بٹیر بازی کا شوق لکھنؤ میں پنجاب سے آیا وہاں کے بعض کنجن لوگ جن کی عورتیں عصمت فروشی کیا کرتی تھیں نواب سعادت علی خاں کے عہد میں لکھنؤ میں وارد ہوئے اور گھاگھس بٹیرا اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کو وہ لڑاتے تھے۔ چونکہ بٹیر لڑانے کے لیے کسی میدان وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، بلکہ کمرے کے اندر ہی صاف ستھرے فرش پر بیٹھ کر اس کی لڑائی کا تماشہ دیکھا جا سکتا تھا۔ اس لیے لکھنؤ کے معاشرے نے اس کو بہت پسند کیا[3]

مسز میر حسن علی کا بیان ہے کہ بٹیر بہت لڑاکو پرند ہوتا تھا۔ ان کی غذا کا بڑا اہتمام کیا جاتا، اور لڑنے کی تربیت دی جاتی اور مشق کرائی جاتی تھی۔ یہ چھوٹے غریب پرند جب ایک مرتبہ لڑنا شروع کر دیتے تھے۔ تو اس وقت تک لڑتے رہتے تھے جب تک ان کا سانس باقی رہتا تھا[4] اس عہد

---

1 دیوان مصحفی پنجم (قلمی پٹنہ) الف 127 'ب 125، دیوان مصحفی سوم (ق۔ رام پور) ص3، نیز کلیات سودا 1 /ص 404

2 برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ کلیات انشا/ 447,448۔

3 بٹیر بازی کے بارے میں مفصل معلومات کے لیے دیکھیے۔ گزشتہ لکھنؤ/ 178,182۔

4 OBSERVATIONS etc.1,P.220 اردو/ 144۔

کے شاعروں کے کلام میں بٹیر بازی پر اشعار با آسانی مل جاتے ہیں۔ مصحفی کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

یہاں نہ روبہ کی اور نہ شیر کی بحث　　رات دن ہے یہی بٹیر کی بحث[1]

دیگر پرندوں کی لڑائیاں

مُرغ اور بٹیر بازی کے علاوہ تیتر بازی، لووَں کا لڑانا، گلدم لڑانا، لال لڑانا، اور طوطے بازی کا شغل بھی تفریح کا ایک اہم ذریعہ تھا۔[2] اودھ کے اکثر اضلاع میں موجودہ زمانے میں بھی تیتر بازی کا رواج پایا جاتا ہے۔ تیتروں کو لڑنے کی تربیت دی جاتی ہے اور انھیں مقوی غذائیں کھلائی جاتی ہیں۔ طوطے بھی عام طور پر پالے جاتے تھے اور انھیں بولنا سکھایا جاتا تھا۔ رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب میں ایک طوطے کی دل چسپ داستان لکھی ہے۔[3] مرزا قتیل کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ "میناچڑیا بھی پالی جاتی تھی" میر یوسف علی درخریدن میناخیلی اہتمام دارد۔[4] لسڈن نے لکھا ہے کہ ہندستانی بالخصوص لکھنؤ کے باشندے کوئلیں لڑایا کرتے تھے، اور بازی لگایا کرتے تھے۔[5]

درندوں اور چوپایوں کی لڑائی

درندوں اور چوپایوں کے لڑانے کا شغل عام طور پر خواص میں پایا جاتا تھا۔ اس کی وجہ کا ذکر کرتے ہوئے عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

> جب لوگوں کو ملک گیری وصف آرائی سے فرصت ملی اور
> میدانِ جنگ میں کھڑے ہونے کا حوصلہ نہ رہا تو جنگ جوئی کے
> جذبات نے جانوروں کو لڑا لڑا کر جان بازی وخوں ریزی کا

1۔ دیوان مصحفی ششم (رام پور) ص 129، ملا نظام الدین سہالوی کے صاحبزادے ملا عبدالعلی (بحرالعلوم) کو عنفوان شباب میں بٹیر بازی کا شوق تھا، (معارف (دسمبر 1970ء) ص 415۔

2۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو، گزشتہ لکھنؤ/ص 182,184,188۔

3۔ فسانۂ عجائب/19 مجموعۂ مثنویات میر حسن/152۔

4۔ رقعات مرزا قتیل/70، مجموعۂ مثنویات میر حسن/152۔

5۔ A JOURNEY: FROM MEERUT TO LONDON.P.14۔

تماشہ دیکھنے کا مشغلہ پیدا کیا۔ یہ شوق یوں تو تھوڑا بہت ہر جگہ ہے مگر اس میں جس قدر انہماک اہلِ لکھنؤ کو ہوا، اور ان بے نتیجہ اور سنگ دلی کی دل چسپیوں کو ان لوگوں نے جس درجۂ کمال کو پہنچادیا اور مقامات کے لوگوں کے خواب وخیال میں یہ بھی نہ گزرا تھا۔ اور اگر غور سے دیکھیے تو تسلیم کرنا پڑے گا، کہ اس شوق اور ان مشاغل کے جیسے کرشمے اور دل کش تماشے سوادِ لکھنؤ میں دیکھے گئے، دہلی یا ہندستان کا کوئی دربار در کنار غالباً ساری دنیا کے کسی شہر میں نہ دیکھے گئے ہوں گے [1] درندوں میں شیر، چیتے، تیندوے، ہاتھی، اونٹ، گینڈے بارہ سنگھے، مینڈھے اور سانڈ لڑائے جاتے تھے اور تماشا دیکھ کر دل بہلایا جاتا تھا [2]

فنونِ حرب

فنونِ جنگ میں سپہ گری کے فنون کے علاوہ لکھنؤ میں ذیل فنون کا عام رواج تھا۔ جن کے باکمال استاد وہاں موجود تھے، مثلاً کشتی، لکڑی، پٹہ ہلانا، بانک بنوٹ، برچھا، بانا تیراندازی کٹار بازی اور جل بانک۔

کشتی

شمالی ہندوستان میں بالعموم اور پنجاب میں بالخصوص اس فن کو کافی عروج حاصل ہوا۔ لیکن بقول عبدالحلیم شرر، لکھنؤ کی آب وہوا کو قدرت نے یہ صلاحیت ہی نہیں دی تھی کہ اس کی خاک سے پہلوان پیدا ہوں۔ اس لیے لکھنؤ کی کشتی کا فن صرف پیچ کا کمال دکھانا تھا۔ جس میں اپنے سے دونے پر غلبہ حاصل ہو جاتا تھا لیکن اس سے زیادہ طاقت ور کو زیر کرنا مشکل تھا [3]

---

1 گزشتہ لکھنؤ/163-164۔

2 برائے تفصیل دیکھیے گزشتہ لکھنؤ/164,174۔ نیز شباب لکھنؤ/119,144۔

OBSERVATIONS, etc. PP.224,225

3 گزشتہ لکھنؤ/159,160۔ چہار گلزار شجاعی/222ب

مسز میر حسن علی کا بیان ہے کہ لکھنؤ کے لوگ اپنی چھاتی کو چوڑا کرنے اور پٹھوں کو مضبوط کرنے کے لیے مگدر گھماتے تھے۔[1] مرزا قتیل نے مرزا اچھو بیگ پہلوان کا ذکر کیا ہے۔[2] لکھنؤ کے شعرا کے کلام میں کشتی کے فن کے بارے میں اکثر شعر مل جاتے ہیں:

فن کشتی میں قیامت ہے وہ بت کا درکا
دھوم دیتا ہے مچا آوے ہے جب دھوبی پاٹ[3]

وہ پہلوان سا وہ لب جو ڈنڈ پیل
ہو لاکھ کوئی غش ہو تو ایسے بہنڈ پر[4]

لکڑی بازی

اس فن کو پھکیتی کہتے ہیں[5] لکھنؤ میں اس فن کے مشہور معروف استاد گزرے ہیں ان سے محمد علی خاں، رستم علی[6]۔ میر نجم الدین خاں قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ صرف شریف زادوں کو اپنی شاگردی میں قبول کرتے تھے۔ اور اس موقع پر فاتحہ کی مٹھائی لیتے تھے۔ جب تک لکھنؤ میں نوابی کا زور رہا اس فن کے بہت سے استاد وہاں موجود تھے۔ ان میں سے بہت سے دربار سے وابستہ تھے۔[7]

پٹہ بازی

اس فن کی تعلیم کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اگر کوئی انسان دشمنوں کے نرغے میں پھنس جائے تو لکڑی ہاتھ میں لے کر چاروں طرف پھینکتا ہوا سب کو پیچھے ہٹا کر، سب کو مارتا ہوا جان بچا کر محفوظ باہر نکل جائے، یہ فن دہلی میں بھی مروج تھا۔ مرزا مظہر جان جاناں کو اس فن کی پوری

---

1. OBSERVATIONS. 1,etc. P.218.
2. رقعات مرزا قتیل/85۔
3. دیوان مصحفی ہفتم (ق۔پ) ص46 (الف)
4. کلیات انشا/51۔
5. برائے تفصیل دیکھیے۔ گزشتہ لکھنؤ/ص 153-152۔
6. عماد/159۔
7. گزشتہ لکھنؤ/154-153۔

مہارت تھی۔ پورب کے جلاہوں میں یہ فن عام تھا۔ بعد میں شرفا اور بالخصوص شیخ زادوں نے اس فن کو اختیار کر لیا تھا۔ لکھنؤ میں اس فن کے صاحب کمال میر ولایت علی ڈنڈا توڑ تھے۔ ان کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ حریف کے ہاتھ میں کتنا زبردست ڈنڈا کیوں ہی نہ ہو، وہ اس کو توڑ دیتے تھے[1]۔

محرم کے زمانے میں پٹہ بازی کے رواج کے سبب سے بھی اس فن کو ترقی ہوئی تھی۔ مرزا قتیل اس فن کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "پٹہ باز[2] حضرت علی کو اس فن کا کامل جانتے ہیں۔ اس فن کی ابتدا دکن سے ہوئی ہے لیکن اب ہندستان کے تقریباً تمام بڑے شہروں میں اس کا رواج ہو گیا ہے۔ کوئی شہر اس کی تربیت گاہوں سے خالی نہیں ہے استاد کو خلیفہ جی کہتے ہیں اور یہ بے حقیقت لوگ جوان کاموں میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اس کا سلسلہ اس فن میں ایک ہندو پر منتہی ہوتا ہے جو تمام عمر فاقے کرتا رہا اور لوگوں کے کہنے کے باوجود سوکھی روٹی اور موٹے کپڑے کے سوا دنیا سے کوئی تمتع اس نے نہیں کیا، یارذیل اور بازاری مسلمان مثلاً سبزی فروش، رنگ ریز، باورچی، حجام، یا اسی قبیل کے لوگ جو حضرت علی کو اس فن کے استادوں کا استاد اور حضرات حسنین کو استاد زادہ تصور کرتے ہیں اور اسی نسبت سے اپنا پیر مانتے ہیں، اس لیے اس گروہ کے بہت سے لوگ خواہ وہ شیعہ ہوں یا سنی ننگے پیر ننگے سر تعزیے کے ساتھ ساتھ اپنے استاد کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ راہ چلتے میں جہاں کہیں دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ چھتوں پر یا چبوتروں پر بیٹھے تماشا کر رہے ہیں تو ماتم داروں کو روک دیتے ہیں۔ سقہ چھڑکاؤ کرتا ہے اور پھر تماشائیوں کے سامنے لکڑی اور پٹے کے فن کا مظاہرہ شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کرتب دکھانے کے بعد پوری آواز سے یا حسین کا نعرہ لگاتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ راہ چلتے میں تابوت کے آگے کود پھاند کرتے ہیں اور "ہے دوست کے نعرے لگاتے ہیں"[3]۔

1۔ گزشتہ لکھنؤ/154-155۔

2۔ لوہے کی ایک چیز ہوتی تھی، دو دھاری سیدھی تلوار کی طرح، اسے چلانے والا ہاتھی کی سونڈ کی طرح ہر طرف ہلاتا تھا، بلکہ عجب نہیں اس کا خیال ہاتھی کی سونڈ ہی سے ماخوذ ہو، ہفت تماشا/178۔

3۔ ہفت تماشا/172-171۔

بانک

فنون حرب میں یہ فن بڑی اہمیت کا حامل تھا اور بالخصوص شریف زادے خاصی جدوجہد اور شوق سے اس فن کو سیکھتے تھے۔ اس فن کی ابتدا اس مقصد سے ہوئی کہ چھڑیوں کی مدد سے حریف کا مقابلہ کرنا تھا۔ اودھ میں اس فن کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں منصور علی خاں نیکیت اس فن کے استاد کامل تھے۔ نواب آصف الدولہ کے دورِ حکومت میں شیخ نجم الدین کا شمار اس فن کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ میر بہادر علی[1] اور آغا مرزا[2] بانک کے فن کے کامل استاد تھے۔

مندرجہ بالا فنون کا ذکر کرتے ہوئے مراۃ الاوضاع کے مصنف نے لکھا:

جوانان ایں محلہ ہا (مفتی گنج، رستم نگر، محمود نگر، منصور نگر[3]) روزانہ
بہ اشغال آموختن بانک، وپٹہ ولکڑی وکشتی گیری میگزرانیدند[4]

بنوٹ

اس فن کی غرض وغایت کا ذکر کرتے ہوئے عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ حریف کے ہاتھ میں جو کچھ بھی ہو۔ مثلاً تلوار، لٹھ یا کوئی دوسرا حربہ، اسے گرادے، ایک رومال سے جس میں پیسہ بندھا ہوا کرتا تھا، یا اپنے ہاتھ سے حریف کو ایسا صدمہ پہونچائے کہ اس کا کام تمام ہو جائے۔ لکھنؤ میں اس فن کے بہت سے صاحب کمال استاد تھے۔ مثلاً محمد ابراہیم خاں رام پوری اور طالب شیر خاں[5]

برچھا

قدیم زمانے میں آریوں، ترکوں اور عربوں میں برچھے کا استعمال عام تھا۔ برچھا چلانے کے کام نے ایک فن کی صورت اختیار کر لی۔ لکھنؤ میں میر کلو اس فن میں پوری دسترس رکھتے تھے۔

1۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ گزشتہ لکھنؤ/155,158۔

2۔ عماد/135۔

3۔ یہ سب لکھنؤ کے محلے تھے۔ فسانہ عجائب میں محمود نگر کا ذکر ملتا ہے۔ ص13۔

4۔ مراۃ الاوضاع/90ب نیز دیکھیے دریائے لطافت (ا۔ت) ص65۔

5۔ گزشتہ لکھنؤ/158,160۔

نواب سعادت علی خاں برہان کے عہد میں میر کلو کو بڑی شہرت نصیب ہوئی تھی لیکن نواب آصف الدولہ کے دورِ حکومت میں اس فن کا مکمل زوال ہوگیا۔ 1

بانا یا لٹھ بازی

بانا ایک لمبی لکڑی کا نام تھا جس کی ایک طرف لٹو ہوتا تھا اور بعض کے دونوں طرف لٹو رکھتے تھے۔ بعض لوگ لٹوؤں میں کپڑا باندھ کر اور تیل میں ڈبو کر انھیں روشن کرتے اور اس طرح ہلاتے کہ ہلانے والے پر آگ کا مطلق اثر نہ ہوتا اور دشمن آگ کے خوف سے دور ہی دور رہتا۔ یہ فن لکھنؤ کے نچلے طبقے میں مروج تھا۔ اس کے نقوش اب بھی پائے جاتے ہیں 2

تیراندازی

یہ فن اودھ میں دہلی سے پہنچا۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں استاد فیض بخش اس فن کے ماہرین میں سے تھے۔ انھوں نے نواب کے ایما سے مرزا حیدر کے والد کو جو ہاتھی پر سوار آرہے تھے، ایسی پھرتی سے تیر مارا کہ نہ کسی نے ان کو نشانہ لگاتے دیکھا اور نہ انھیں خبر ہوئی 3 اودھ کے دوسرے قصبوں میں بھی اس فن کے ماہرین پائے جاتے تھے۔ میر غلام نبی بلگرامی در تیراندازی کمال مہارت داشت۔ 4

کٹار بازی

اپنی جان کی حفاظت کے لیے عام طور پر مسلمان اپنے ساتھ کٹار رکھتے تھے۔ کٹار چلانے کی فنی تربیت کسی استاد کی شاگردی اختیار کر کے حاصل کی جاتی تھی۔ 5

جل بانک

یہ شناوری اور تیراکی کا فن تھا۔ اس فن کا مقصد گہرے پانی میں دشمن پر قابو حاصل کرنا تھا۔ اس

---

1 گزشتہ لکھنؤ/160 نیز OBSERVATIONS, etc.1,PP. 218-19

2 گزشتہ لکھنؤ/160-161۔

3 گزشتہ لکھنؤ/161، نیز 219-20۔ OBSERVATIONS,- etc. PP.219-20۔

دریائے لطافت (فارسی) ص 37۔

4 تذکرۃ الشعرا/102، تذکرہ ید بیضا/148 الف

5 گزشتہ لکھنؤ/162۔

کو باندھ کر باہر لاتا۔ اس کا وہیں کام تمام کر دیتا۔ لکھنؤ میں میر کب جان اس فن کے استاد تھے۔ انھوں نے سیکڑوں شاگردوں کو اس فن کی تعلیم دی تھی۔ 1

گھوڑ دوڑ

بقول مسز میر حسن علی، گھوڑ دوڑ کا شوق متمول گھرانے کے نوجوانوں میں انیسویں صدی کے اوائل میں پیدا ہوا تھا۔ لکھنؤ والوں کو اس میں بہت زیادہ دلچسپی پیدا نہیں ہوئی تھی لہٰذا وہ گھوڑ دوڑ سے زیادہ لطف اندوز نہیں ہوتے تھے۔ 2

گھوڑے اور ہاتھی کی سواری

متمول خاندان کے نوجوانوں کو گھوڑے اور ہاتھی کی سواری کرنے کی خاص طور پر مشق کرائی جاتی تھی، یہ سواریاں میدان جنگ کے علاوہ سفر کے لیے بھی استعمال میں آتی تھیں۔ 3

تلوار چلانا

قرون وسطیٰ میں تلوار کو ایک حربہ کی حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل تھی اور میدان جنگ میں تلواروں کی جنگ ہوتی تھی۔ اس لیے فوجیوں اور شہزادوں کو اس فن کی تعلیم دی جاتی تھی، علاوہ ازیں جو لوگ مگدر چلانے کے مشاق ہوتے تھے وہ تلوار چلانے میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے۔ یہ ایک ورزش بھی تھی۔ 4

بچوں کے کھیل

آنکھ مچولی

انشا کے بیان کے مطابق لکھنؤ میں "آنکھ مچولی" کا کھیل کھیلنے کا عام رواج

---

1. برائے تفصیل دیکھیے۔ گزشتہ لکھنؤ/163، فسانہ عجائب/8۔

2. OBSERVATIONS ETC. PP. 220,224 ۔ دریائے لطافت (ف) ص65۔

3. دریائے لطافت (ف) ص218۔

4. دریائے لطافت (ف) ص218۔

تھا۔[1] قیاس کہتا ہے کہ اودھ کے دیگر اضلاع میں بھی یہ کھیل عام ہوگا۔ اس عہد کے شعرا کے کلام میں بچوں کے کھیلوں کے ذکر کے سلسلے میں آنکھ مچولی کے موضوع پر اکثر شعر مل جاتے ہیں۔

ہے تب مزا کہ آنکھ مچولی کے کھیل میں × ہمسن کئی ہوں لڑکے پری رو صنم کے ساتھ
دالان میں ہر ایک کو دوڑا لے اور مجھے × چپکے سے یوں کہے تو لپٹ رہیو تھم کے ساتھ
پھر چور چور کہہ کے پکڑ لے جو میرا ہاتھ × دے منہ سے منہ ملا وہیں لطف و کرم کے ساتھ[2]

جُھولا

ساون کے مہینے میں بچوں اور عورتوں میں جھولا جھولنے کا عام رواج پایا جاتا تھا۔ انشا کے کلام میں اس موضوع پر کثرت سے اشعار ملتے ہیں:

ہے بندھا مینھ کے تار کا جھولا × کیوں نہ لے جھونٹے یار کا جھولا[3]
چل نہ امریوں میں جھولیں درختوں کی ہوا × چھاگئی کالی گھٹا ہے تیرہ بختوں کی ہوا
جھولتے ہیں یہ جھولے میں سو کہتے ہیں مجھے × ایک وعدے پہ تجھے برسوں جھلا سکتے ہیں
ہزار حیف کہ باغوں میں جاکے اب کے سال × بہم نہ جھول سکیں ہم تم اور ساون جائے
لگی ہے مینہ کی جھڑی میں چلو جھولیں × کہ جھولنے کا مزا بھی اسی بہار میں ہے

گیندہ بازی

بچے اور جوان عورتیں باغوں میں جاکر گیندہ کے پھول سے کھیلا کرتے تھے۔ اس زمانے میں بھی بچے گیندہ کے پھولوں سے کھیلتے نظر آتے ہیں:

گیند بازی میں مہارت ہے یہ تجھ کو کہ تری
گومتی پار تلک پہنچی ہے اب دار کی گیند[4]

---

1. دریائے لطافت (ا۔ت) ص23۔
2. کلیات انشا/120 نیز دیکھیے دیوان حسرت/169 الف، دیوان مصحفی ہفتم (ق۔پ)/175 ب۔
3. کلیات انشا/120 نیز دیکھیے دیوان حسرت/169 الف، دیوان مصحفی ہفتم (ق۔پ)، 15,19, 90,
159, 179 فسانہ عجائب/7
4. کلیات انشا/46۔

زعفرانی رنگ آتا ہے نظر صحن چمن
گیندہ بازی کو جو ہیں مشغول طفلاں[1]

بھانڈ، بھگتیے، نقال اور لطیفہ گو

ان پیشہ وروں کا ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہے۔ بقول انشا اللہ خاں دہلی کی تباہی کے بعد یہ پیشہ ور فیض آباد اور لکھنؤ آ گئے تھے اور عوام و خواص کے لیے تفریحی سامان مہیا کرتے تھے۔ انشا نے لکھا ہے،، چونکہ سپاہی اور مصاحب پیشہ، لطیفہ گو، اور نقال، گانے بجانے والے اور قصہ خواں جو لکھنؤ میں ہیں سب دہلی سے آئے ہوئے ہیں، اس جم غفیر میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کے بزرگوں کے مکان کو لکھنؤ میں بنے سو سال کا زمانہ گزر چکا ہو؟ راقم کے دیکھنے میں ایک مکان بھی ایسا نہیں آیا کہ اب سے پچاس برس قبل کا بھی بنا ہوا ہو اور شاہ جہاں آباد سے منسوب ہو۔'' [2] مگر ان تمام پیشہ وروں میں تمام کے تمام دربار اودھ سے وابستہ ہوں گے۔ ان میں بہت سے عوام کو تفریحی سامان مہیا کر کے اپنی روزی کماتے تھے، نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں اس فرقے کے اکثر لوگ دربار سے وابستہ تھے۔[3] لیکن نواب آصف الدولہ کے زمانے میں اقتصادی زبوں حالی کا دور دورہ شروع ہوا اور ان میں اکثر و بیشتر بے روزگار ہو گئے تھے۔ اس فرقے کے لوگ بازاروں، شادی بیاہ اور دیگر تقریبوں[4] کے موقعوں پر اپنے کرتبوں کے ذریعہ زر معاش تحصیل کرتے تھے۔

فیض آباد اور لکھنؤ کے بازاروں میں بھانڈ اور بھگتیے جم غفیر کو اپنے کرتبوں سے محظوظ کرتے۔

فرقۂ دارباز

نٹوں کا فرقہ خالصتاً ہندستانی تھا اور فرقے کے تمام افراد ہندو تھے۔ بعد میں ان میں سے کچھ

1. دیوان مصحفی ہفتم/ (ق۔پ) 63ب
2. برائے تفصیل دیکھیے۔ دریائے لطافت (ا۔ت) ص118-117۔
3. چہار گلزار شجاعی/ 201ب۔
4. چہار گلزار شجاعی/ 174ب، 112ب، مجموعہ مثنویات میر حسن/ 23۔

خاندانوں نے اسلام مذہب اختیار کر لیا تھا[1] نٹ اور نٹنیاں اپنے مختلف کرتبوں سے ناظرین کے لیے تفریحی سامان مہیا کرتے تھے۔ اور بالعموم شادیوں میں ان کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں[2] لکھنؤ میں ایک پیشہ ور فرقہ دار باز کے نام سے پایا جاتا تھا۔ یہ فرقہ نٹوں کے فرقہ کی ایک شاخ تھا۔ مرزا قتیل نے ان کے کرتبوں میں سے ایک کرتب کا ذکر ان سطور میں کیا ہے:

ایک دن فرنگی دوستوں میں سے ایک شخص پالکی میں بیٹھا ہوا جا رہا تھا کہ ایک دار باز دائیں طرف اور ایک بائیں طرف سے ظاہر ہوا اور زمین سے بلند ہو کر پالکی کے اندر سے اِدھر اُدھر اس طرح کود کر نکل گیا کہ اس کا بدن پالکی سے نہیں لگا اور دوسرے ساتھی کی گردن پر جا بیٹھا، اگر پالکی ٹھہری ہوتی تو اتنی حیرت اور تعجب کی بات نہ تھی۔ ہر چند اس صورت میں بھی سوائے دار باز کے اور کوئی شخص اِدھر سے اُدھر نہیں پھلانگ سکتا تھا۔ اور کہاروں کے بھاگنے کی حالت میں تو، جبکہ آہستہ چلنا ان کی موت کے مترادف ہے، ایسا شعبدہ صوفیوں کے خوارقِ عادات سے کم نہیں ہے یا جادوگر ایسا کر سکتے ہیں"۔[3]

جرہ باشہ

دار بازوں کی طرح ایک دوسری جماعت جرہ باشوں[4] کی تھی۔ ہندستان کے بڑے شہروں میں جہاں امیروں اور اربابِ کمال کا مجمع ہو۔ یہ لوگ بھی مل جاتے تھے۔ وہ اپنے شعبدوں کے ذریعہ اپنی روزی کماتے تھے۔ کسی امیر زادے یا شریف زادے یا کسی اور کے اشارے پر انعام کے لالچ میں سڑک پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اور تماشائی کوٹھوں پر ہوتے تھے۔

جرہ باشوں کی اصطلاح میں محرمِ راز کو داغی کہا جاتا تھا۔ راہ گیروں میں سے کوئی ایک شخص جرہ باشہ کے قریب جاتا، اس کا بشرہ دیکھ بھال کر اپنا احوال بیان کرنا شروع کرتا تھا۔ جو بالکل بے بنیاد اور من گھڑت ہوتا تھا۔ مثلاً وہ کسی سے کہے گا میں سال بھر یا دو سال یا چھ ماہ پہلے فلاں

---

1. برائے تفصیل راقم الحروف کا مضمون "ہندستان کے بازی گر" آج کل اپریل مئی 1969 ملاحظہ ہو۔

2. چہار گلزار شجاعی/174ب

3. ہفت تماشا/189۔

4. برائے تفصیل دیکھیے۔ ہفت تماشا/189۔

شخص کا مصائب تھا اور فلاں سفر میں، ایک صبح کو دریا کے کنارے جارہا تھا، اچانک ایک باؤلا گیدڑ میرے پیچھے آیا اور اس نے میرے پیر میں دانت گاڑ دیے اور بھاگ گیا۔ میں اسی وقت دیوانہ ہو گیا اور رنگ برنگ کے جھاگ میرے منھ سے نکلنے لگے۔ اور باؤلوں کی طرح چاروں طرف دوڑنے لگا۔ اور جو کوئی شخص بھی سامنے آتا اس پر حملہ کر دیتا تھا۔ اور کاٹ کھاتا تھا۔ اس کے سوا ان کی اور حرکتیں یہ تھیں کہ بعض جرے کسی رہ گیر کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اس کے کان میں کوئی بات کہتے تھے، جسے سن کر وہ کپڑے اتار ڈالتا تھا، اور ننگا ہو جاتا تھا، پھر اسے جرہ حکم دیتا تھا کہ گھوڑا بن کر چل، پھر اس کی پیٹھ پر زین کس دیتا تھا اور جب ان کاموں سے نمٹ جاتا تھا تو پھر اشارہ کرتا تھا کہ وہ کپڑے زیب تن کرلے اور اپنا راستہ لے۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں جروں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے تھے یعنی پوری پوری پلٹن کو بھگا دیا تھا۔1

ایک دوسرا فرقہ بہروپیوں کا تھا۔ اس فرقے کے لوگ حسب خواہش ہر رُوپ میں ظاہر ہو جاتے تھے اور یہاں تک کہ جانوروں میں سے کسی جانور کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ اور تماشہ بینوں میں سے کوئی شخص اس کی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ مرزا قتیل کا بیان تو یہاں تک ہے کہ وہ لوگ روپ بھرنے میں اتنے مشاق تھے کہ کسی شخص کا روپ کر کے رات بھر اس کی بیوی کے ساتھ مباشرت کرتا رہتا تھا۔2 یہ بات مبالغہ معلوم ہوتی ہے۔

قصہ خواں

دہلی کے مہاجرین لطیفہ گویوں، نقالوں اور قصہ خوانوں نے لکھنؤ اور فیض آباد آ کر یہاں کے معاشرہ میں قصہ خوانی کو مروج کیا۔3 اسی زمانے میں مثنویوں کے علاوہ یہاں کی مجالس میں کہانیاں پڑھی جاتیں تھیں۔

انشا نے سلک گوہر اور رانی کیتکی کی کہانی، کہانیاں لکھیں۔ ان کے علاوہ مرزا رجب علی بیگ

---

1 برائے تفصیل دیکھیے۔ ہفت تماشا/ 194-189۔

2 ہفت تماشا/196-194۔

3 فسانۂ عجائب/15-14۔

سرور نے "فسانۂ عجائب" لکھی۔ فسانۂ عجائب کی تحریر کی وجہ بیان کرتے ہوئے سرور نے لکھا ہے:

> "حسب اتفاق ایک روز مع چند دوست صادق ومحبان صفا کیش وموافق باہم بیٹھا تھا، مگر نیرنگی زمانہ ناہنجار وکجروی فلک سفلہ پرور دون نواز جفا شعار سے سب بادل حزیں وزار اور ہجوم اندوہ ویاس سے اور کثرت حرمان وافکار سے کہ ہردم یہ پاس تھے دل گرفتہ سینہ ریش اور اداس تھے انھوں نے کہا...... اس وقت کوئی قصہ یا کہانی بہ شیریں زبانی ایسا بیان کر کہ رفع کدورت وجمعیت پریشانی ہو...... یہ فسانہ انھیں بہت پسند آیا اور کہا کہ بدلجمعی تمام تو اس قصہ پراگندہ کو از آغاز تا انجام زبان اردو میں فراہم اور تحریر کردے۔ 1"

ان حالات کے تحت 1240ھ میں درمقام کان پور یہ کہانی مکمل کی گئی۔ دوسری کہانیوں میں چار چمن مصنفہ عاجز، جو دورِ سعادت علی خاں میں لکھی گئی اور گلدستۂ عجائب رنگ، مصنفہ حکیم جعفر علی مروت عرف حکیم بھچو ساکن، سنبھل نواب نصیرالدین حیدر کے عہد میں ضبطِ تحریر میں آئی، قابلِ ذکر ہیں۔ 2

مختصر یہ کہ لکھنؤ کی تعلیم یافتہ عورتیں اور مرد اور بالخصوص امرا اور ان کے محل کی مستورات فرحت بخش اور ادبی کتابیں اور قصے کہانیاں پڑھ کر اپنا دل بہلایا کرتے تھے، مسز میر حسن علی کا بیان ہے کہ "اونچے مردوں اور عورتوں کی یہ عادت ہے کہ جب وہ بستر استراحت پر دراز ہو جاتے ہیں تو انھیں نیند کے لیے قصے کہانیاں سنائے جاتے تھے۔ 3

انشا کے دو شعروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصۂ "صنوبر گل" بہت ہر دل عزیز تھا اور ان

---

1 فسانۂ عجائب/15-14۔

2 مرزا قتیل نے کتاب افسانہ عربی کے ترجمے اور افسانہ زعفران پری کا ذکر کیا ہے۔
اول الذکر کتاب کا ترجمہ خود مرزا قتیل نے کیا تھا۔ رقعات مرزا قتیل/43،
افسانہ زعفران پری کا مصنف مرزا امامی تھا اور یہ افسانہ فارسی زبان میں تھا۔ ایضاً/ص 54

3 Observations etc,1, P. 251

قصوں کے سننے کا واحد مقصد بے فکر ہو جانا اور نیند لانا تھا۔

ہاں کس طرح وہ قصہ صنوبر بہ گل چہ کرد
اے قصہ خواں ادھوری نہ یہ داستاں چھوڑ[1]

قصہ خواں نیند جو تھوڑی سی بھی آجائے تو دوں
جوڑی سونے کے کڑوں کی تجھے کم خواب پہ رکھ[2]

سید احسان حسن بن میر حسن دہلوی" در فن افسانہ گوئی رونق تمام پیدا کردہ"۔[3]

حقہ اور پان

لکھنؤ اور فیض آباد اور اودھ کے دیگر اضلاع کے عوام و خواص بالعموم حقہ پیا کرتے اور پان کھایا کرتے تھے۔ محرم کے زمانہ میں شیعہ عورتیں اور مرد پان اور حقہ نوشی سے پرہیز کیا کرتے تھے۔ مسز میر حسن علی کا بیان ہے،، پان فرحت بخش پان جو اس ملک کے باشندوں کے لیے سب سے بڑی فرحت بخش شے ہے (محرم کے بعد) بازار میں نظر آنے لگتے ہیں جس کو دیکھ کر ہر طبقے کے لوگوں کی نظروں کو فرحت اور دل کو مسرت حاصل ہوتی ہے، جو اس تھوڑے سے پرہیز گاری کے وقفہ کے بعد بڑے چاؤ سے کھایا جاتا ہے،،[4]

شاہ عبدالرزاق بانسوی پان اور اس میں تمباکو بھی کھاتے تھے[5] سحر البیان، گلزار ارم، اور فیض آباد اور لکھنؤ کے تمام شعرا کے کلام میں پان کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں[6]

1۔ کلیات انشا/62۔

2۔ کلیات انشا/122۔

3۔ ریاض الفصحا/307۔

4۔ برائے تفصیل دیکھیے Observations 1, PP. 57, 77-78۔ نیز ملاحظہ ہو۔
ثمرات البدائع، اس سلسلے میں خط ہیں۔ مہمانوں کو رخصت کرتے وقت پان پیش کیا جاتا تھا۔ ص 31-30۔ چہار گلزار شجاعی/135 الف و ب ملفوظ رزاقی/228۔

5۔ ملفوظ رزاقی/79۔

6۔ مرزا قتیل نے ڈلی، سپاری، الائچی، چکنی ڈلی، کشنیز کا ذکر کیا ہے۔ رقعات مرزا قتیل/59,74۔

نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خاں حقہ پیا کرتے تھے۔ آخرالذکر کے بارے میں مرزا قتیل نے لکھا ہے "از حضور حصہ بردار تقید بسیار است برائے حقہ بلکہ نوشتہ اند کہ شما، میخواہید کہ من نان خشک خوردہ باشم یک حقہ بردار کہ سوائے ایں کہ آتش بسر قلیان بگذارد و دیگر ہیچ سلیقہ دریں کار نداشتہ باشد، لیکن قدرے خوش ظاہر و جوان باشد، [1]

ملا نظام الدین سہالوی[2] اور حضرت شاہ سید غلام دوست بن شاہ عبدالرزاق حقہ پیا کرتے تھے[3] مرزا قتیل خود حقہ پیا کرتے تھے۔ اور سبحان علی خاں نے موسوم کے لیے کان پور سے حقہ بردار مہیا کیا تھا[4]

طوائفیں اور نچلے درجے کی عورتیں بھی حقہ پیا کرتی تھیں۔ میر حسن دہلوی نے طوائفوں کے بارے میں لکھا ہے:

کھڑے ہو کے دو گھونٹ حقہ کے لیے[5]

شاہ کمال نے حقہ نوشی پر ایک قطعہ کہا تھا:

دھرا تھا سامنے حقہ جو فرشی   لگے کہنے کہ پی پیتا ہے تو پی
اٹھا منہال میں نے کھول نیچا   لگا کر منہ سے ایک دم جونہی کھینچا[6]

رقص و سرود

دہلی کے اجڑے ہوئے اربابِ کمال میں اربابِ رقص و سرود بھی فیض آباد اور لکھنؤ پہنچے۔[7] دیگر اربابِ کمال کی طرح اربابِ رقص و سرود کو بھی دربار اودھ کی سرپرستی حاصل ہوئی، اور یہاں

---

1. رقعات مرزا قتیل/38۔
2. ملفوظ رزاقی/153۔
3. ملفوظ رزاقی/187۔
4. ملفوظ رزاقی/33,35۔
5. مجموعۂ مثنویات میر حسن/124 ثمرات البدائع/40 ,38 کلیات انشا/79,146,206۔
6. تذکرہ مجمع الانتخاب/316 الف، دیوان مصحفی دوم (رام پور)/30 ب
7. دریائے لطافت (ا۔ت) ص117۔

کی فارغ البالی کی وجہ سے اس فن کو کافی فروغ نصیب ہوا جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ نواب شجاع الدولہ بذاتِ خود فنِ موسیقی میں دسترس رکھتا تھا۔[1] اس نے ہزارہا گانے والی طوائفوں کو جن میں سے اکثر و بیشتر دہلی اور دیگر بلاد سے بلا کر اپنے ہاں جمع کر لیا تھا۔[2] عبدالحلیم شرر کا بیان ہے کہ نواب شجاع الدولہ کی قدردانی اور فیاضی نے سارے ہندستان کے موسیقی دانوں کو اودھ کی سرزمین میں اکٹھا کر لیا تھا۔ علاوہ ازیں اودھ میں قدیم الایام سے اجودھیا اور بنارس میں موسیقی کے قدیم اسکول قائم تھے۔ جون پور کے شرقی سلاطین کی قدردانی کی کچھ نہ کچھ یادگاریں باقی تھیں، ان میں جب دہلی کے باکمال گویے اور تان سین خاں کے مستند اسکول کے استادانِ موسیقی بھی آ کر مل گئے تو ایک خاص شان پیدا ہو گئی اور موسیقی کا دراصل ایک نیا دَور شروع ہو گیا۔[3] بلگرام کی سرزمین میں فنِ موسیقی کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ سجان رائے بھنڈاری کا بیان ہے:

''اکثر مردم آنجا خوش فہم و سرود سرا ہستند''[4]

یہاں کے مشہور گویے ہوتے ہیں[5]

نواب آصف الدولہ، نواب وزیر علی خاں اور سعادت علی خاں[6] کو بھی رقص و سرود سے بڑی دل چسپی تھی۔ ہدایت نے نواب آصف الدولہ کے گلشن محل میں رقص و سرود کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

دیکھے جدھر ہے خوشی سے ادھر کو ناچ رنگ
سُر سے ہے ڈھولک کے پکھاوج کے ہے سرعود و چنگ

---

1. چہار گلزار شجاعی/223 الف۔
2. تاریخ فرح بخش 11/ص 10-9۔
3. گزشتہ لکھنؤ/200۔
4. خلاصۃ التواریخ/44۔
5. برائے تفصیل دیکھیے۔ سروِ آزاد/354,400، تذکرۃ الشعرا/102,105۔ تذکرہ ید بیضا/148 الف۔
6. دیوان مجبور/224,233، نیز مجلس ہولی نواب سعادت علی خاں ایضاً/228,230، دریائے لطافت (ا۔ت) 82-81۔

بزم میں حاضر ہے اہلِ رقص ہر یک سبزہ رنگ
کوئی الاپے ہے بھباس اور کوئی بھیروں اس کے سنگ
صبح کو بولے ہے اس جا طنبورے کا تار الف

نوب شجاع الدولہ کے عہد سے نواب سعادت علی خاں کے عہد تک امیروں کی رقص وسرود سے دل چسپی کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔نواب سالار جنگ[1] ''درعلم موسیقی سرآمد روزگار خوب بودند وہر جمعہ مجلس فرمودے، موسیقی دانایان جمع گشتہ باظہار ہنرہا پرداختند،،[2]

فیض آباد اور لکھنؤ میں بالخصوص خالص ہندستانی موسیقی کی بڑی ترقی ہوئی[3] انشا نے سندیلہ کے ایک مولوی صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ فارسی راگوں کے مقامات کو بخوبی جانتے تھے، اور ساتھ ساتھ بھیروی بھباس، بھیروی، للت، رام کلی، کھٹ، گن کلی، بھٹیار، سگھرنی، سوہا، گوجری، گندھار، اساوری، توڑی، بلاول، الہیا، دیوگری، اور دوسری راگ اور راگنیوں کو خیال میں گاتے تھے، اس فن میں انھوں نے اپنے بہت سے شاگردوں کی تربیت کی تھی[4] مرزا بزرگ پسر مختار الدولہ'' در پنجہ ید بیضا دارد۔ من ومرزا حاجی برای شنیدن میر علی خاں خواہم رفت،،[5]

لکھنؤ کے سازندوں اور گویوں کا ذکر کرتے ہوئے رجب علی بیگ سرور نے لکھا ہے'' کلاونت قوال بے مثال، چھجو خاں غلام رسول سب کو موسیقی میں کمال حصول شوری کی منہ زوری کی دھوم ہے ٹپے کا موجد ہوا، سب کو معلوم ہے۔ بخشو اور سلاری نے طبلہ ایسا بجایا کہ پکھاوج کو شرمایا،،[6]

---

1 نواب سالار جنگ بن محمد اسحاق خاں موتمن الدولہ، برادر کوچک افتخار الدولہ نواب مرزا علی خاں، دریائے لطافت (ا۔ت)125۔

2 تاریخ سعادت جاوید/386۔

3 برائے تفصیل دیکھیے۔گزشتہ لکھنؤ/192,220، سرد آزاد/354,400، تذکرۃ الشعرا/102,105۔ دیوان مہجور/234-233, 230, 228۔الف، ملاحظہ ہو کلیات میر/780,782,787۔

4 دریائے لطافت (ا۔ت) ص82-81۔ 5 رقعات مرزا قتیل/37۔

6 فسانۂ عجائب/9 میر محمد پناہ نامی گرامی سازندے تھے۔انجیا برس کلانت سے تربیت پائی تھی، سراج الدین علی خاں کو دھرپت کی تعلیم دیتے تھے۔

اس عہد کی کتابوں سے معلوم ہوتا کی آنند بخش[1] شجاعت خاں[2] محمد خاں[3]، دیبی داس، جیون خاں[4]، مصاحب خاں وہسو خاں[5] اور میر ضاحک مشہور و معروف موسیقی دان تھے[6]

نوابین کی موسیقی سے دل چسپی اور ان کی قدر دانی کی وجہ سے نواب آصف الدولہ کے عہد میں ''اصول النغمات الآصفیہ'' کے نام سے ایک کتاب فارسی زبان میں لکھی گئی[7]

ناچنے والوں کے دو گروہ تھے، مرد اور عورتیں، ناچنے والے مردوں میں ایک ہندو کتھک اور رہس دھاری[8] اور دوسرے مسلمان کشمیری بھانڈ، مگر اصلی ناچنے والے کتھک تھے[9]

رنڈیاں

ناچنے والیاں ہندستان کے ہر شہر میں پائی جاتی تھیں[10]۔ لیکن بقول عبدالحلیم شرر'' جیسی باکمال ناچنے اور بتانے والی رنڈیاں لکھنؤ میں پیدا ہوئیں، شاید کسی شہر میں نہ ہوئی ہوں گی۔ آج سے چالیس سال پیشتر لکھنؤ کی ایک مشہور رنڈی'' منصرم والی گوہر، نے کلکتہ میں جا کے نمود حاصل کی تھی۔ میں نے ایک محفل میں اس کا یہ رنگ دیکھا کہ کامل تین گھنٹے تک ایک ہی چیز کو ایسی خوبی سے بتاتی رہی کہ حاضرین محفل اول سے آخر تک محوِ حیرت و سکوت تھے، اور کوئی بچہ بھی نہ تھا جو ہمہ تن غرق نہ ہو، زہرہ اور مشتری شاعرہ اور صاحب کمال گانے والیاں ہی نہیں بے نظیر رقاصہ بھی تھیں،

---

1. دیوان شاہ کمال/169,853 (دھرپت کی تعلیم دیتے تھے۔ عماد/161۔
فیروز خاں، بین نواز تھے۔ دیوان مجبور ص 14۔
2. دیوان شاہ کمال/855۔
3. دیوان شاہ کمال/855۔
4. کلیات سودا 1 /ص 333۔
6. کلیات سودا 1 /ص 333۔
7. کلیات سودا۔ 1۔/ص 340۔
8. کلیات سودا۔ 1 /ص 333۔
9. گزشتہ لکھنؤ/198-197۔
10. ہفت تماشا/80-79۔ برائے تفصیل دیکھیے۔ گزشتہ لکھنؤ/210,216، مجموعہ مثنویات میر حسن/152۔

جدّن نے ایک مدت تک زمانے کو اپنے رقص و سرود کا گرویدہ رکھا ہے'' [1]

سعادت یار خاں رنگین نے عزیزن [2] طوائف اور مہتاب کے رقص و سرود کا بڑے پر لطف انداز میں ذکر کیا ہے۔ آخر الذکر کے رقص کے بارے میں لکھتے ہیں:

'در لکھنؤ بہ شادی پسر رام رتن مودی بادشاہی بندہ و ابوالحسن خاں بر پشت بام نشستہ بودیم و روبروے مجلس زن مہتاب نام طوائف واقعی بہتر از ماہ بود، بکمال خوبی مجرای نمود، چوں طرف او نگاہ کردم، دل از دست رفت، بدیہہ ایں مطلع گفتم و بآواز بلند از بیقراری خواندم۔''

تھی شعلہ یا وہ برق کہ جی میرا جل گیا
ایسی ہی کی نگاہ کہ بس دم نکل گیا۔ [3]

اودھ میں تین قسم کی رنڈیاں پائی جاتی تھیں، کنچنیاں جو بنیادی طور سے رنڈیاں تھیں اور ان کا پیشہ بالعموم عصمت فروشی تھا۔ ان کا اصلی وطن پنجاب اور دہلی تھا لیکن نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں اودھ میں وارد ہوئی تھیں۔ دوسری چونہ والیاں، ان کا پیشہ چونا بیچنا تھا مگر بعد میں بازاری پیشہ ور عورتوں میں شامل ہو گئیں، اس گروہ میں چونے والی حیدرا اپنی سریلی آواز کی وجہ سے بہت مشہور تھی، اور اپنی برادری کی رنڈیوں کی سردار تھی اور تیسری ناگرنیاں۔ [4] ان گروہوں کے علاوہ میر حسن دہلوی نے خانگیوں [5] اور کسبیوں [6] کا بھی ذکر کیا ہے۔ میر حسن دہلوی نے ایک مثنوی میں جو انھوں

---

1. گزشتہ لکھنؤ/317۔

2. وہ شاعرہ بھی تھی اور عزیز تخلص اپنایا تھا۔ سعادت یار خاں رنگین نے اس کا ایک قطعہ بھی نقل کیا ہے، مجالس رنگیں۔ ص 70۔

3. مجالس رنگین/42۔

4. گزشتہ لکھنؤ/218-217۔

5. فاحشہ عورتیں جو گھر میں بیٹھ کر اور پردہ دار بن کر پیشہ کرتی تھیں۔ مجموعہ مثنویات میر حسن/153 (فٹ نوٹ 4)

6. رنڈیاں، بازاری عورتیں، / ایضاً 152 (فٹ نوٹ 5)

نے قاسم علی خاں کی محفل شادی کے موقع پر لکھی تھی اس موقع پر نظر علی نامی ان کے دوست نے ان سے فرمائش کی جو طوائفیں وہاں موجود تھیں ان سب کے بارے میں علاحدہ علاحدہ فردیات لکھی جائیں۔لہٰذا انھوں نے ''در تعریف طوائف'' بنام ہر یک علاحدہ فردیات لکھیں۔ان میں مندرجہ ذیل کے نام موجود ہیں:

راجہ، جیونی، جلالو، ماہ رتن، فیضو، ننھی، پنا، مصری، نور بخش، مانی، جمیت، دردانہ، اجاگر، الٰہی بخش، گوجری، تاجی، فیض بخش، دودلی، واصلا، چوری۔دولت آبادی،، نورا، ظہورا، دل دجانی، سبزہ، چت لگن، کاکو، مستم یار، اوجاگر، (دوبارہ) رکھی، نادرا، کریم بخش، برنی، مصری، (دوبارہ) راجہ (دوبارہ)[1]

مرزا قتیل نے لکھنؤ کی طوائفوں میں سے جگیا، امیر بخش، بی جی مغلانی، بی بی گلو کے نام لکھے ہیں۔کلیات انشا میں امیر بخش طوائف پر ایک شعر موجود ہے۔

بازاروں میں رنڈیوں کے اڈے ہوتے تھے، وہ پیشہ بھی کرتی تھیں اور رقص وسرود سے بھی روزی کماتی تھیں، فیض آباد کے بازار کے ضمن میں میر حسن لکھتے ہیں۔

کہیں ہیں رنڈیاں ہی ماہ پارہ　　انھوں کا کرتا ہے کوئی نظارہ[2]

میلہ ٹھیلوں کے موقعوں پر بھی رنڈیاں مع اپنے ڈیروں کے جاتی تھیں اور تماشہ بینوں کو محظوظ کرتی تھیں۔

فیض آباد میں لال باغ کے میلے کے موقع پر۔

ہزاروں خانگی اور کسبی آکر　　کریں ہیں سیر لالہ دل لگا کر[3]

مختصر یہ کہ انیسویں صدی کے نصف اول تک لکھنؤ میں رنڈیوں کے رقص وسرود کی بڑی گرم بازاری تھی، مرزا رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں:

''وہ رنڈیاں پری شمائل زہرہ پیکر مشتری خصائل، اس
ناز و انداز سحر کرامات غمزہ عشوہ اداگات بانکی کہ ہاروت و ماروت تو

---

1. میر حسن اور ان کا زمانہ/302-301۔
2. مجموعہ مثنویات میر حسن/152۔
3. برائے تفصیل دیکھیے۔مجموعہ مثنویات میر حسن/153,159۔

کیا معاذ اللہ اگر سب فرشتے عرش سے فرش خاک پر آئیں ان کی چاہ میں لکھنؤ کے کنویں بھر جائیں، گھر بھر ان سے زانو بزانو بیٹھے، توبہ نصوحا ٹوٹے ان کا دروازہ نہ چھوٹے، لولی چرخ ان پر نثار ہے۔ ہر ایک حور کردار ہے،،[1]

ادبی سرگرمیاں

نوابان اودھ کو شعروشاعری کا ذوق تھا۔ خود شعر کہتے تھے اور شعرا کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ نواب سعادت خاں برہان الملک کی فطرت شاعرانہ تھی، امین تخلص اختیار کیا تھا، ریاض الشعرا مصنفہ وآلہ علی قلی خاں داغستانی میں ان کے کچھ اشعار نقل ہوئے ہیں[2] ان کے دربار سے کئی فارسی گو شعرا منسلک تھے۔ مثلاً میر امام قلی خاں حشمت،[3] سید محمد فدائی،[4] شیخ عبدالرضا متین[5] علی قلی خاں والہ،[6] آقا عبدالعلی تحسین[7]، محمد رحیم خاں[8]، میرزا احد علی سخا[9]

---

[1] فسانہ عجائب/9۔

[2] خزانہ عامرہ/76 سفینہ ہندی/33,36۔ نتائج الافکار/51 مخزن الغرائب 1/126,128۔ تکملہ الشعرا (قلمی رام پور) ص67-66۔

[3] مخزن الغرائب 1/795-794، نتائج الافکار/166، عقد ثریا/21، خزانہ عامرہ/247-246، نشتر عشق (قلمی) ص427۔ [4] سفینہ ہندی/159۔

[5] سفینہ ہندی190-189 ۔ تذکرہ مردم دیدہ/91-90، سرو آزاد/227-226، عقد ثریا/51، خزانہ عامرہ/427-426، تذکرہ نتائج الافکار/517 مخزن الغرائب (قلمی)11 /424۔

[6] سفینہ ہندی۔23 عقد ثریا/61، سفینہ خوشگو/294-293، خزانہ عامرہ/446,450۔

[7] سفینہ ہندی/41، سفینہ خوشگو/267-266، عقد ثریا/18، تذکرہ ید بیضا (قلمی) 43ب۔

[8] سفینہ ہندی/93 مخزن الغرائب (قلمی)1 /366۔

[9] سفینہ ہندی/109، سفینہ خوشگو/194-193۔

میر عبد العلی طالع[1] اور میر غلام نبی بلگرامی غلام[2]

آزاد بلگرامی کی تحریر کے مطابق نواب صفدر جنگ کو علم وادب سے کوئی دل چسپی نہیں ہونی چاہیے تھی[3] لیکن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر نواب کو علم وادب سے بڑی دل چسپی تھی اور وہ شعرا اور علما کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔ شاہ باسط[4] کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی، اس سے محسوس ہوتا ہے کہ نواب کو تصوف سے بھی کچھ نہ کچھ لگاؤ ضرور رہا ہوگا۔ حالانکہ اس زمانے کا یہ عام دستور تھا کہ عوام وخواص کسی نہ کسی بزرگ سے بیعت ضرور کرتے تھے۔ کیونکہ ان کی فلاح و بہبود کا انحصار شیخ کی دعاؤں پر تھا۔ ان کے علاوہ شیخ محمد حسن (ایرانی) سید زین العابدین طباطبائی مشہدی) سید محمد علی اورنگ آبادی۔ میر غلام نبی بلگرامی[5]، ملک العلما مولوی فضل[6] اللہ خاں، مرزا علی نقی جو نواب شجاع الدولہ کے اتالیق تھے[7]

---

1 سفینۂ ہندی/128 ،سفینۂ خوشگو/64، تذکرۂ ید بیضا/114 ب

2 سروِ آزاد/312-313۔

3 ماثر الکرام 1/ص 221-222۔

4 خواجہ جعفر کے بیٹے تھے، ان کا سلسلۂ نسب خواجہ علاء الدین عطار تک پہنچتا ہے۔ ان کے اجداد میں سے کوئی شخص ماوراء النہر سے ہندستان آیا تھا اور اکبر آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اسی شہر میں خواجہ باسط تولد ہوئے، اپنے چچا صمصام الدولہ خاندوراں خاں کی سرپرستی میں خوردسالی میں دہلی پہنچے، وہیں ان کی نشوونما ہوئی، اپنے والد کے خلیفہ اور جانشین ہوئے، جب دہلی میں سیاسی افراتفری اور اقتصادی زبوں حالی کا دور دورہ شروع ہوا تو شجاع الدولہ کی درخواست پر لکھنؤ چلے آئے۔ وہاں سے فیض آباد پہنچے، وہیں وفات پائی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے داماد حضرت نصیر خلیفہ وسجادہ نشین ہوئے، دستور کے مطابق مجلس سماع منعقد ہوتی رہی۔ بھگوان داس ہندی کو ان مجالس میں شرکت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ملاحظہ ہو۔ سفینۂ ہندی/33-37، مرقع دہلی/68-69، مجموعۂ مثنویات میر حسن/145-146 میر کی آپ بیتی/(ات)90۔

5 برائے تفصیل ملاحظہ ہو، ماثر الکرام 1/ص 299،301، تذکرہ نتائج الافکار/410-411 سروِ آزاد/371۔

6 تذکرہ علمائے ہند/52-53۔

7 عماد/52 سیر المتاخرین (فارسی) 11/ 615-616۔ 11/ص 878۔

قاضی احمد علی سندیلوی،[1] مولوی احمد حسین لکھنوی،[2] ملا باب اللہ جونپوری[3]، مولوی محمد اعظم قاضی زادہ سندیلہ، مولوی عبداللہ ابن[4] مولوی زین العابدین مخدوم زادہ سندیلہ و مرید شاہ عبدالباسط امیٹھوی، میر سید محمد سید احمد،[5] اور سید محمد اشرف[6] ان کے دربار سے وابستہ تھے۔

محمد علی خاں نے نواب صفدر جنگ کی شعرا پروری کے سلسلے میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے نہ صرف نواب موصوف کے شعری ذوق کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس کی دریا دلی اور سخاوت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ایک دن نواب بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے جاتے ہوئے لال قلعہ دہلی میں رواں دواں نہر فیض کی روانی کے منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے ٹھہر گئے۔ چونکہ وہ منظر بہت دل کش تھا۔ لہٰذا نواب کچھ دیر کے لیے تخیلات کی دنیا میں کھو گئے۔ اس موقع پر نواب کے ہمراہ مرزا اعظمی اصفہانی[7] شاعر بھی موجود تھا۔ نواب نے اصفہانی سے حسب موقع شعر پڑھنے کو کہا، اصفہانی نے نواب کے جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔

قد خمیدہ سد رہ گریہ ام نشد
ایں آب رفتہ رفتہ زبالای پل گزشت

یہ شعر سن کر نواب کو بے حد مسرت حاصل ہوئی اور اس نے اصفہانی کو بطور انعام ایک گھوڑا مع سنہری ساز و سامان، اور پانچ ہزار روپے نقد عنایت کیے۔[8]

---

1. تذکرہ علمائے ہند/20، ہفت تماشا/ 173.
2. تذکرۂ علمائے ہند/13 (ملا احمد حسین فرنگی محلی)
3. ہفت تماشا/173۔
4. تذکرہ علمائے ہند/103۔
5. ماثر الکرام 1 /ص105۔
6. ماثر الکرام 1 /192۔
7. تذکرہ انیس الاحبا (قلمی) صفدر جنگ، خدمتش را از مغتنمات نگاشتہ،
ودر ایک صحبت گرامی سعادت می پنداشتہ، 8ب
8. تاریخ مظفری 11 /ص29 (الف و ب)۔

مرزا اعظمی اصفہانی کے علاوہ مرزا باقر حقیر[1]، میر محمد اسماعیل قربان[2] شیخ محمد رضا متین[3] میر فیض علی[4] ناصری، مرزا ابراہیم[5] نور، محمد یحییٰ خاں[6] خرد، مرزا اعظیما[7] اکسیر، سید احمد احمدی بلگرامی[8] سید عظیم الدین[9] بن سید نجابت بلگرامی، اور سید غلام نبی بلگرامی محب[10] ہدایت علی خاں ضمیر[11] نواب صفدر جنگ سے وابستہ تھے۔

ان شعرا کے علاوہ دیگر شعرا کو بھی وقتاً فوقتاً انعام واکرام سے نواز جاتا تھا، مرزا ابو علی ہاتف کو اس مصرعہ:

''مارا چہ ازیں قصہ کہ گاوٗ آمد وخر رفت'' کے عوض صفدر جنگ نے ایک بیش بہا خلعت اور گھوڑا عنایت کیا تھا۔ صفدر جنگ کے انتقال کے بعد ہاتف شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ رہے۔ اور تین سو روپے ماہانہ پاتے رہے[12]۔ شجاع الدولہ کی ولادت کے موقع پر رائے سناتھ سنگھ بیدار نے صاحب زادے کی تاریخِ ولادت کہی تو صفدر جنگ نے اسے پانچ ہزار روپے عطا کیے۔[13]

---

1. سفینۂ ہندی/61۔
2. سفینۂ ہندی/171۔
3. سفینۂ ہندی/189-190۔
4. سفینۂ ہندی/44,255، سفینۂ خوشگو/222، عقد ثریا/19۔
5. تاریخ مظفری 11/29 (الف و ب)
6. تذکرہ مردم دیدہ/161۔
7. سفینۂ ہندی/3-4۔
8. سرو آزاد/332-333۔
9. سرو آزاد/337-338۔
10. سرو آزاد/338-339۔
11. عماد/34۔
12. عقد ثریا/62 سفینۂ ہندی/240-241۔
13. عقد ثریا/23-24۔

نواب شجاع الدولہ کو شعر و شاعری سے دل چسپی تھی اور اس نے سراج الدین علی خاں آرزو کو دہلی سے بلا کر اپنے ہاں ملازم رکھا تھا اور تین سو روپے ماہانہ مقرر کر دیے تھے۔ آرزو نے اپنی بقیہ زندگی فیض آباد اور لکھنؤ میں گزاری اور 1169ھ میں وہیں وفات پائی [1] نواب نے مرزا سودا کو بھی مدعو کیا تھا لیکن پہلے تو انھوں نے انکار کر دیا تھا مگر نا مساعد حالات سے مجبور ہو کر فیض آباد چلے آئے تھے [2] خاں آرزو اور سودا کے علاوہ شیخ ثناء اللہ[3] مرزا محمد سمیع ذرہ[4]، مرزا ابو علی[5] ہاتف، مرزا احسن علی[6] احسن، شاہ واقف، واقف[7] مرزا عنایت اللہ، ساکن[8] اور علی قلی والہ جن کو نواب نے پرگنہ سندیلہ کا نصف حصہ بطور جاگیر عنایت کیا تھا[9] میر فخر الدین ماہر کو سات روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی [10]

نواب شجاع الدولہ کے صاحب زادے مرزا سیف علی خاں [11] شگفتہ خود شعر کہتے تھے اور سخن پرور بھی تھے۔ مرزا کاظم علی جوان، منتظر، اور شاہ ملول الہام ان کے دربار سے منسلک تھے [12] دوسرے صاحب زادے نواب امیر الدولہ[13] عرف مینڈو کے ہاں مشاعرہ ہوتا تھا، ان شعرا کے

---

1. تاریخ مظفری 11 / 134 الف 136 الف، خزانہ عامرہ/ 116,119، عقد ثریا/ 8-7۔
2. تذکرہ ہندی/ 126-125، تذکرہ شعرائے اردو/ 83، تذکرہ بہار بے خزاں/ 64۔
3. مخزن الغرائب 1 / 480، صبح گلشن/ 178، نتائج الافکار/ 137، سفینہ ہندی/ 105۔
4. عقد ثریا/ 28، صبح ابراہیم (قلمی پٹنہ) ج 1 / ص 322 الف
5. عقد ثریا/ 62، تذکرہ نتائج الافکار/ 603۔
6. تذکرہ شعرائے اردو/ 16، تذکرہ ہندی/ 17۔
7. تذکرہ شعرائے اردو/ 190۔
8. تذکرہ نشتر عشق/ 679-678۔
9. کاشف الاستار/ 420 ب۔
10. مجموعہ نغز 2 / 153۔
11. سوانح سلاطین اودھ 1 / 2۔
12. ریاض الفصحا 1 / 155۔
13. سوانح سلاطین اودھ 1 / 2، مجموعہ نغز 1 / ص 72۔

علاوہ شاہ واقف، میاں جرأت، مرزا گدا علی گدا، شیخ سعد اللہ سکندر وغیرہ شعرا فیض آباد میں موجود تھے اور ''بازار شعر و سخن ہندی بسیار گرم بود''[1]

نواب آصف الدولہ شعری ذوق رکھتے تھے، فارسی اور اردو، دونوں میں شعر کہتے تھے، آصف تخلص[2] تھا، خاں آرزو سے تلمذ حاصل تھا[3] نواب نے شاہ کمال کو ''دہ ہزار روپیہ نقد و یک دوشالہ الفی و یک رومال الفی،، عنایت کیا تھا[4] نواب شاہ حیرت کا بڑا احترام اور ادب کرتے تھے[5] مختصراً نواب کے دربار سے رائے جسونت سنگھ[6] دیوانہ، سلام اللہ خاں سلام[7]، مرزا مغل الدین[8] محمد صفائی، کرپادیال عرف کنور سین مضطر[9]، خواجہ حسین علی روشن[10]، حکیم شفائی

1۔ تذکرہ مجمع الانتخاب/2ب۔

2۔ تذکرہ ہندی/5، تذکرہ گلشن ہند/10-9' مجموعہ نغز 1/36-35، تذکرہ گلشن سخن/51 تذکرہ طبقات الشعرا ہند/401، تذکرہ خوش معرکۂ زیبا میں لکھا ہے کہ اگرچہ شعر و شاعری مرتبہ شہنشاہی سے کم تر ہے، لیکن شعرا کی قدردانی کے خیال سے خود بھی فارسی اور ریختے میں آبدار موتیوں جیسے اشعار کہتے ہیں۔ آفتاب تخلص ہے۔ ص 27الف۔ مصنف ہذا نے غلطی سے شاہ عالم ثانی کا تخلص نواب آصف الدولہ کے نام سے منسوب کردیا ہے۔ اور اول الذکر کے تمام اشعار نواب کے کلام میں درج کر دیے ہیں۔ یہ مشہور قطعہ: صبح تو جام سے گزرتی ہے..... نواب کے کلام میں درج ہے۔ تذکرہ خوش معرکۂ زیبا/28الف۔

3۔ بعض تذکروں میں یہ بھی لکھا ہے کہ نواب کو بندعلی خاں باسطی اور میر سوز سے بھی تلمذ تھا۔ عقد ثریا/15، تذکرہ خوش معرکۂ زیبا/28، الف، 48الف، تاریخ اودھ 3/359۔

4۔ تذکرہ مجمع الانتخاب/5، الف۔

5۔ مخزن الغرائب (قلمی) 1/ص 279۔

6۔ عقد ثریا/15۔

7۔ عقد ثریا/18 مخزن الغرائب 1/ ایک فی البدیہہ شعر سن کر پانچ سو روپیہ انعام میں دیے/448، روز روشن/ص 252۔

8۔ عقد ثریا/36۔

9۔ عقد ثریا/57 (فٹ نوٹ 1)

10۔ تذکرہ شعرائے اردو/74۔

خاں ارشد[1] میاں منعم ندیم[2] مرزا احسن علی احسن[3] وابستہ تھے اور اچھی خاصی تنخواہیں پاتے تھے[4] نواب آصف الدولہ مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے اور بعض مرتبہ صدارت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، ایک مرتبہ انھوں نے عیش باغ کے مشاعرے کی صدارت کی تھی[5]

وزیر علی خاں کو شعر و شاعری سے دل چسپی تھی، وزیری تخلص کرتے تھے[6] ان کا دورِ حکومت مختصر تھا اس لیے کسی تذکرہ سے یہ معلومات حاصل نہیں ہوتی کہ ان کے دربار سے کون سے شعرا منسلک تھے۔

نواب سعادت علی خاں کے دربار سے مرزا قتیل[7]، میاں بشارت، بشارت[8] اور انشاءاللہ خاں وغیرہ شعرا وابستہ تھے۔

نوابان کے علاوہ ان کے امرا میں سالار جنگ، نواب محبت خاں' نواب خان، عالم خاں، نواب شوکت جنگ سوزاں، راجہ ٹکیت رائے، جواہر علی خاں اور حسن رضا خاں شعرا اور ادبا کے مربی تھے[9]

ہدایت[10] نے ذیل مخمسات میں اودھ کے ان امرا کا ذکر کیا ہے جنھوں نے سخن وروں کی

---

1. ریاض الفصحا/17۔
2. تذکرہ خوش معرکۂ زیبا/144ب۔
3. تذکرہ خوش معرکۂ زیبا/44ب، میر فتح علی شیدا بھی نواب آصف الدولہ کے ہاں ملازم تھے۔ مجموعۂ نغز/ص356۔
4. تذکرہ گلشن بے خار/15۔
5. تذکرہ خوش معرکۂ زیبا/44ب۔
6. تاریخ اودھ 3/386۔
7. عقد ثریا/46۔
8. ریاض الفصحا/50، تذکرہ گلشنِ ہند/2۔
9. میر حسن/103۔
10. تذکرہ شعرائے اردو/196۔

سرپرستی کی تھی اور ان کے بعد شعرا کی بے قدری کا دور شروع ہوا۔

اول گویم قدرداں نواب حیدر جنگ　　دوم نواب گویم امیر وہ (کذا) داور جنگ
امیر ملک مروت سوم ہے صفدر جنگ　　نہال گلشن توصیف کے گل خوش رنگ
سخن کے باغ کو آب ثنا سے جن کے بہار　(کذا)

کہاں ہے آہ وہ عبد السلام خاں سا کبیر　　قیام دولہ بخلق وکرم امیر کبیر
سخی صاحب ایثار اور محب فقیر　　غریب پرور و بندہ نواز باتدبیر
قدر شناس وسخن فہم و گفتار

زیادہ ان کے پسران کے ہیں دلاور جنگ　　امیر ابن امیرو کریم صاحب سنگ
بخلق ولطف ومروت کرم سے نت یکرنگ　　پھرا نہ گھر سے کوئی ان کے جا کہ ہو دل تنگ
رہا ہمیشہ وہ خوش ان سے جو ملا ایک بار

گئے کدھر وہ مربی حسن خاں غازی　　تھے در سے جن کے غریبوں کو نت سرافرازی
سخا سے جن کے ملع خون بمکہ حجازی (کذا)　　جو گوسفند بخشے ہر ایک کو تازی
زیادہ غم سے جن کے ثنا کے حرف شمار1

سالار جنگ برادر نسبتی شجاع الدولہ نے میر حسن دہلوی کی سرپرستی کی تھی 2 میر حسن نے ایک قصیدے میں ان کا یوں ذکر کیا ہے:

سخن شناس سخن سنج نکتہ دانِ سخن
سخن پذیر وسخن پرور اور سخن پہ قدیر3

مرزا سلیمان شکوہ

دہلی میں آئے دن کی مصیبتوں سے تنگ آ کر شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ بن شاہ عالم ثانی لکھنؤ چلے آئے تھے۔ نواب آصف الدولہ نے شہزادہ کی بڑی تعظیم واحترام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب

---

1 کلیات ہدایت (قلمی) 284۔

2 میر حسن/276، عماد/36، دریائے لطافت (ا۔ت) 125، تذکرہ شعرائے اردو/92۔

3 دیوان میر حسن دہلوی (سبحان اللہ کلیکشن علی گڑھ)

شہزادہ ہاتھی کی سواری پر نکلتا تو نواب ان کے ساتھ ہودے پر بیٹھ کر مگس رانی کیا کرتا تھا۔ نواب نے شہزادہ کے ذاتی اخراجات کے لیے پانچ ہزار ماہانہ اور سات ہزار برائے اخراجات مطبخ مقرر کردیے تھے[1]۔ لکھنؤ میں شہزادہ نے ایک چھوٹی سی اپنی دتی بسا رکھی تھی۔ شعروسخن کا ذوق تھا، سلیمان تخلص تھا، اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ شعرا اور اہلِ فن کے قدردان تھے۔ انشا، جرأت، سوز اور مصحفی[2] وغیرہ ان کے دربار سے وابستہ تھے، یا انعام واکرام سے مستفید ہوتے رہتے تھے، ان کے علاوہ مرزا نعیم اللہ نعیم[3]، سعادت یار خاں رنگین[4]، میر صادق علی صادق[5]، طالب حسین خاں طالب[6]، میر محمد حسین منشی[7]، شیخ ولی اللہ محب[8]، میرزا نعیم بیگ جوان[9] وغیرہ بھی ان کے ہاں ملازم تھے۔ شہزادے کے دربار میں اکثر وبیشتر مشاعرہ منعقد ہوا کرتا تھا[10] اور بقول مصحفی "اکثرے از کاردانان ایں فن در حضور آمدہ حاضری شدند"[11]۔

1۔ تذکرہ ہندی/121-120۔ تذکرہ طبقات الشعرا/398، عمار/146۔ 9/ذی القعدہ 1253ھ/24 فروری 1838 کو اکبرآباد میں انتقال کیا۔ اور اکبر بادشاہ کے مزار کے قریب، جو سکندرہ میں واقع ہے، مدفون ہوئے، مفتاح التواریخ/395۔

2۔ تذکرہ ہندی/121۔

3۔ تذکرہ ہندی/66۔

4۔ تذکرہ ہندی/101۔

5۔ تذکرہ ہندی/140۔

6۔ تذکرہ ہندی/148۔

7۔ تذکرہ ہندی/221۔

8۔ تذکرہ ہندی/231۔ مجموعہ نغز2/164۔

9۔ تذکرہ ہندی/66۔ مجموعہ نغز1/174۔

10۔ تذکرہ طبقات الشعرا/398، تذکرہ ہندی/66 مجموعہ نغز1/301۔ شاہ کمال نے ان مشاعروں میں شرکت کی تھی، مرزا بیگ جوان سے ان کی ملاقات مرزا سلیمان شکوہ کے مشاعرہ میں ہوئی تھی۔ مجمع الانتخاب/122ب

11۔ تذکرہ ہندی/121۔

نادر شاہ کے حملے (1739) کے بعد سے مغلیہ سلطنت کے سیاسی اقتدار کے ساتھ دولت اور اطمینان ناپید ہوئے، خواجہ میر درد جیسے بزرگوں کو ان حالات کے باوجود دہلی کی خاک پاک سے الفت تھی۔ دہلی کی گلیوں پر جان دیتے تھے کیونکہ وہ "اوراک مصور" تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات ناقابل برداشت ہو گئے، افلاس نے آگھیرا، ہنرمندوں کے قدردان نہ رہے کیونکہ اب وہ خود نان شبینہ کو محتاج تھے اور میر جیسا شاعر کہتا ہے "پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں" لہٰذا "متاع ہنر کے جوہری دہلی سے رخصت ہوئے" انشاء نے دریائے لطافت میں لکھا ہے۔ "دوسری بات یہ ہے کہ افلاس کی وجہ سے بہت سے اونچے گھروں کے لوگ اور فصیح اشخاص مدتیں ہوئیں، دارالخلافہ سے نکل آئے ہیں۔ اور پورب کے شہروں میں آباد ہو گئے ہیں"[1] قلندر بخش جرأت نے حسن بخشی کے حال پر جو مثنوی لکھی ہے اس میں اپنے لکھنؤ کے سفر کا ذکر کیا ہے:

ہوا تھا شہر دہلی جب سے غارت — تھی اپنی اسی جگہ میں استقامت
فلک نے کر جہاں آباد کو برباد — کیا تھا خوب فیض آباد، آباد
تو جو تھے ساکنانِ شہرِ دہلی — سکونت ان کی فیض آباد میں تھی[2]

اس زمانے میں اگر کہیں سر چھپانے کو جگہ مل سکتی تھی تو وہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جو ابھی تک سیاسی حوادث سے محفوظ تھیں۔ ان ریاستوں کے حاکموں نے دہلی دربار کے طرز پر چھوٹے چھوٹے دربار آراستہ کر رکھے تھے اور ابھی تک ان کی اقتصادی حالت اتنی خراب نہ ہوئی تھی کہ وہ مہاجرین کو پناہ نہ دے سکتے، یہ ریاستیں، اودھ، فرخ آباد، ٹانڈہ اور مرشد آباد وغیرہ تھیں۔ دہلی کے مہاجرین اربابِ فضل وکمال پہلے تو فرخ آباد اور ٹانڈہ گئے پھر ان ریاستوں کے اجڑنے[3] کے بعد ان میں سے اکثر و بیشتر فیض آباد اور لکھنؤ پہنچے۔

1۔ دریائے لطافت (ا۔ت) 64۔

2۔ کلیات جرأت۔ مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن۔ نیپلز۔ 1971۔ ص 55-17۔

3۔ مصحفی نے صوبائی درباروں کے اجڑنے کا حال ان الفاظ میں لکھا ہے "از انجا کہ فلک حقہ باز از قدیم الایام بازیہائے تازہ برروئے کار آرد بیک ناگاہ بر شیشۂ انعقاد ایں مجلس بہشت آئین سنگ تفرقہ انداختہ شراب عیش یاراں رابذائقہ ہلاہل ہجراں مبدل ساخت" تذکرہ ہندی/14-13۔

ان مہاجرینِ شعرا و ادبا میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کے دم سے دہلی میں شعر و شاعری کی بزم میں رونق تھی۔ ''اس مجلس کے میر سراج الدین علی خاں آرزو تھے، جن کے شاگردوں سے دلی میں شاعری کا رنگ قائم تھا''[1] سب سے پہلے خاں آرزو لکھنؤ پہنچے، ان کے بعد شجاع الدولہ ہی کے دَور میں اشرف علی خاں فغاں[2]، اور ان کے بعد سودا، میر، میر سوز[3] ترکِ وطن کر کے لکھنؤ آئے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور ان کے علاوہ مرزا جعفر علی حسرت[4] میر حیدر علی حیران[5]، مصحفی، خواجہ حسن حسن[6]، مرزا فاخر مکین[7] میر ضاحک[8] اور میر حسن[9] اور جرأت[10] بھی فیض آباد اور لکھنؤ پہنچے۔

ان کے علاوہ میر قمر الدین[11] منت اور ضیاء الدین[12] ضیاء وغیرہ کی شاعری لکھنؤ ہی میں پروان چڑھی۔ اس طرح دلی کی اجڑی ہوئی ادبی بساط لکھنؤ کی سرزمین میں از سرِ نو بچھی اور وہاں بھی شعر و شاعری کا ہنگامہ برپا ہوا۔ افسوس آرائشِ محفل میں لکھتے ہیں۔ ''شعرا بھی جتنے اس شہر لکھنؤ میں کیا فارسی گو کیا ریختہ گو کہیں نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد برہم ہونے شاہ جہاں آباد کے اکثر غریب امیر مرزایان ہندستان سے نواب صفدر جنگ اور شجاع الدولہ کے عہد میں آ کر اس شہر میں

---

1. لکھنؤ کا دبستان شاعری/ 24۔
2. تذکرہ ہندی/ 160-159، تذکرہ شعرائے اردو/ 115، تذکرہ گلشن ہند/ 184 تذکرہ طبقات الشعرا/ 74۔
3. تذکرہ ہندی/ اس 111، تذکرہ شعرائے اردو/ 88-87، تذکرہ گلشن ہند/ 151 تذکرہ طبقات الشعرا/ 231۔
4. تذکرہ ہندی/ 74، تذکرہ شعرائے اردو/ 52، تذکرہ گلشن ہند/ 107 تذکرہ طبقات الشعرا/ 290۔
5. تذکرہ ہندی/ 71، تذکرہ گلشن ہند/ 107، تذکرہ شعرائے اردو/ 109 تذکرہ طبقات الشعرا/ 283۔
6. تذکرہ ہندی/ 72، تذکرہ گلشن ہند/ 115، تذکرہ طبقات الشعرا/ 284۔
7. سفینہ ہندی/ 182-181۔
8. تذکرہ شعرائے اردو/ 104، تذکرہ گلشن ہند/ 172۔
9. تذکرہ ہندی/ 68، تذکرہ شعرائے اردو/ 54-53۔
10. تذکرہ ہندی/ 63-62، تذکرہ گلشن ہند/ 90 تذکرہ طبقات الشعرا/ 302۔
11. تذکرہ ہندی/ 230، تذکرہ شعرائے اردو/ 158۔
12. تذکرہ گلشن ہند/ 171، تذکرہ شعرائے اردو/ 100۔

بہ سکونت دائمی ساکن ہوئے۔ پس شہر تو عبارت اشخاص سے ہے۔ یہی دلی ہو گیا اور باشندے بھی اس کے بسبب کثرت صحبت وتتبع زبان تلفظ صحیح کرنے لگے، یہاں تک کہ جن کی طبع موزوں تھی شاعر ہو گئے،،[1]

مشاعرے

مجلس[2] ریختہ کی طرز پر لکھنؤ میں مشاعرے ہوا کرتے تھے، جہاں شعرا اپنی ادبی تخلیقات سامعین کے سامنے پیش کرتے۔ دربار اودھ اور مرزا سلیمان شکوہ کے مشاعروں کے علاوہ قدرت اللہ قاسم نے لکھنؤ کے کئی ایسے اشخاص کا ذکر کیا ہے جو پابندی سے مشاعرے کے انعقاد کا اہتمام کرتے تھے۔ مثلاً مرزا تقی خاں ترقی، اور مرزا رضا بیگ آشفتہ[3] آخر الذکر کا تذکرہ کرتے ہوئے مصحفی نے لکھا ہے:

''درایامے کہ فقیر از شاہ جہاں آباد در لکھنؤ آمدہ اول طرح مشاعرہ او انداختہ''[4]

مصحفی نے لکھنؤ کے ان مشاعروں کا ذکر کیا ہے۔ مشاعرہ مرزا سلیمان شکوہ[5]، مشاعرہ اُنس پسر[6] میر اعلیٰ علی، مرزا حسین خاں[7] اثر، صدر الدین صدر[8]، قمر الدین احمد خاں عرف مرزا حاجی بن مرزا جعفر، جعفر[9]، مشاعرہ در خانہ مصحفی، در لکھنؤ[10]، منور خاں

---

1. آرائش محفل/121، نیز دیکھیے۔ دریائے لطافت/(ا-ت)64-65۔
2. تذکرہ نکات الشعرا/50۔
3. مجموعہ نغز1/ص379، تذکرہ گلشن بے خار/132، عیار الشعرا/42ب۔
4. تذکرہ ہندی/18-19,71,74، ریاض الفصحا/37,245۔
5. تذکرہ ہندی/66,121۔
6. ریاض الفصحا/31-32۔
7. ریاض الفصحا/32۔
8. ریاض الفصحا/35,117,157,177,318۔
9. ریاض الفصحا/69,115,260، دیوان مصحفی ششم/(قلمی) ص74ب، مرزا جعفر، رقعات مرزا قتیل/11۔
10. ریاض الفصحا/100,152۔

غافل[1]، میر مہر اللہ غیور[2]، شیخ مغل فانی[3]، مشاعرہ موتی لال[4]۔

سید جعفر رنبیر پوری، روحی کے تکیہ میں مشاعرہ ہوتا تھا[5]۔ مرزا قتیل نے لکھنؤ کے کئی مشاعروں کا ذکر کیا ہے[6]۔ فیض آباد میں اپنے قیام کے دوران میں میر حسن دہلوی اپنے ہاں مشاعرہ کی مجلس ترتیب دیتے تھے[7]۔

ان مشاعروں میں شعرا اپنے شاگردوں کو ساتھ لے کر جایا کرتے تھے۔ اس طرح ان کو منظرِ عام پر کلام پڑھنے کی مشق بھی کرادی جاتی تھی اور ساتھ ساتھ ان کی ہمت افزائی بھی ہو جاتی تھی۔ مصحفی نے لکھا ہے کہ میر صدر الدین صدر کے مشاعروں میں وہ اپنے شاگردوں کو بھی لے جاتے تھے[8]۔ اچھے اشعار کی تعریف ہوتی اور مکرر پڑھنے کی فرمائش کی جاتی تھی، میر حسن دہلوی اپنے ایک شعر میں اس بات کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

وہ جو ہیں سننے والے اہلِ دل سے   مکرر مجھ سے پڑھواتے ہیں ہر بند الفے

عبدالقادر خاں رام پوری نے اپنے سفرنامے میں لکھنؤ کے ایک مشاعرہ کا ذکر کیا ہے۔ ''ایک

---

1. ریاض الفصحا۔/ص 234۔
2. ریاض الفصحا۔/ص 240۔
3. ریاض الفصحا۔/ص 250۔
4. ریاض الفصحا۔/ص 324۔
5. سروآزاد/207-208۔
6. رقعات مرزا قتیل/19,26,35,39,40,54,73,87۔
7. تذکرہ شعرائے اردو/133,181۔
8. دربار لکھنؤ سے وابستہ تھے، نواب غازی الدین حیدر کے عہد میں مرزا جعفر اور ان کے بیٹے قمر الدین احمد خاں عرف مرزا حاجی کو بہت عروج حاصل ہوا۔ نواب موصوف کو مسند نشین کرانے میں ان لوگوں کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ مرزا جعفر نے 1230ھ/1814 میں وفات پائی، تاریخ اودھ 4/ 90,115,206 قیصر التواریخ 1/ 229 ریاض الفصحا/ 69۔

الفے مشاعروں میں داد و تحسین کے بارے میں معلومات کے لیے ملاحظہ ہو۔ رقعات، مرزا قتیل/ 54۔

دن مشاعرہ کی محفل میں جوان دنوں مرزا جعفر[1] کے مکان پر ہوتی تھی، میں بھی چلا گیا۔ مرزا قتیل، مصحفی، میر نصیر دہلوی اس زمرہ میں سرکردہ شمار ہو رہے تھے، اور شیخ امام بخش ناسخ[2] کو ان دنوں اس فن میں دن دونی رات چوگنی شہرت حاصل تھی۔[3]

انشا کے ایک شعر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں میر، قتیل، مصحفی، جرأت اور مکین میر شعروشاعری کرتے تھے۔

میر و قتیل و مصحفی، و جرأت و مکین
ہیں شاعروں میں یہ جو نمودار چار پانچ [4]

پابندی اوقات

بالعموم یہ مشاعرے عصر اور مغرب کے درمیانی وقفے میں ہوا کرتے تھے اور بعض مرتبہ مغرب کے بعد تک نشست رہتی تھی۔[5] مرزا قتیل ایک خط میں لکھتے ہیں:

"احوال مشاعرہ بریں منوال است کہ چوں روز ہائے موسم سرما کم عمر ست وتا فارغ شدن مردم از طعام و طے کردن مسافت تا بایں جاو انعقاد پذیرفتن صحبت سہ پہر می زنند، ازیں جہت صحبت دیر وزہ بہ نصف شب کشید جا بجا دروازہ ہا بند شدہ بود۔ حنجرہ میر صاحب[6] باوصف خوش گوئی

1۔ دہلی کے باشندے تھے۔ شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے۔ کچھ دنوں شاہ عالم ثانی کے دربار سے بھی منسلک رہے۔ بعد میں لکھنؤ چلے گئے۔ کچھ دنوں وہاں قیام کے بعد دیوان چندو لال کی شہرت سن کر حیدر آباد چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ 1254 / 1838 گل رعنا/ 272,287، آب حیات/ 442,456۔ طبقات الشعرا ہند (مرتبہ عطا کاکوی) ص 1۔

2۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری/ 368-367-

3۔ وقائع عبدالقادر خانی 1/ 159۔

4۔ کلیات انشا/ 41۔

5۔ تذکرہ ہندی/ 80۔

6۔ حنجرہ۔ حلقوم، گلا۔

بدستور بودہ است تمام جسم مبارک ایشاں رعشہ داشت و آواز را ہم کسی نمی
شنید لیکن من وخدا کہ غزلہا خوب گفتہ بودند،،[1]

اس عہد کے لوگوں کو ان ادبی مجالس سے اتنی زیادہ دل چسپی تھی کہ سوگ کے زمانے میں بھی ایسی مجلس کو ملتوی کرنا گوارہ نہ ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مہدی علی خاں عاشق کے ہاں ہر جمعہ کو مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اتفاقاً ان کے لڑکے نے وفات پائی اور سوم کی رسم جمعہ کی صبح کو ادا ہوئی مگر اسی دن سہ پہر کو دستور کے مطابق مشاعرہ منعقد ہوا[2] مگر بعد میں اوقات کی پابندی نہ رہی تھی بلکہ فرصت اور وقت کے تقاضے کو ذہن میں رکھا جاتا تھا۔[3]

شعرا کی باہمی چشمک اور مناظرے

جس طرح سیاسی میدان میں درباری امرا کی باہمی رقابت اور چشمک اپنے شباب پر تھی اور دربار مغلیہ میں سازشوں اور افترا پردازیوں کے اکھاڑے جمے ہوئے تھے اسی نہج پر شاعری کے میدان میں بھی درباری شعرا میں باہمی رشک و رقابت بڑھتے بڑھتے کبھی کبھی مناظرہ اور شعری رزم کا انداز اختیار کر لیتی تھی۔ جب ایک شاعر کسی نواب کے دربار سے وابستہ ہو جاتا تھا تو وہ ہر ممکن کوشش کرتا تھا کہ کوئی دوسرا شاعر اس دربار سے منسلک نہ ہونے پائے اور اگر بغرض محال ہو بھی جائے تو اسے جمنے نہ دیا جائے اس وجہ سے ان میں آپسی نفاق اور رقابت کی آگ بھڑک اٹھتی اور یہ رقابت بعض مرتبہ دشمنی کی صورت اختیار کر لیتی اور یہ ادبی مجلسیں میدانِ جنگ میں مبدل ہو جاتیں۔ اس سلسلے میں میر قدرت اللہ قاسم کا ذیل کا بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے جو انھوں نے مرزا مینڈو کے دربار سے وابستہ شعرا کے بارے میں دیا ہے:

"مرزا صاحب در مشاعرہ خود با ہر کس سلوک مدارا پیش آمدند و از طبع
ہر متنفسے کہ شعر تر می تراوید بہ تقاضائے انصاف موردِ تحسین بلیغ می شود
بدو ستدار سراپا وفاق حکیم ثناء اللہ خاں فراق و شاعر طبع قدیم مرزا عظیم بیگ

---

1. رقعاتِ مرزا قتیل/54۔
2. مجموعہ نغز11/ 379۔
3. رقعات مرزا قتیل/ص40۔

عظیم وخوشہ چین شعراے بلاغت نشان اعنی قاسم ہچمدان سراپا نقصان ہر
چہ تمامتر عنایات واشفاق مبذول می داشتند سخن سنج فصاحت اما انشا سخن
گوے سراپا خیر وبرکت، برکت اللہ خان برکت ومشتاق علی خاں مشتاق
راحسب اقتضاء ترکیب عنصری خوش نمی آمد کہ غیر ایں بزرگان احدے
موردِ تحسین وآفریں گردد...... وایں بزرگان خاصہ انشا خصوصاً از مرزا عظیم
بیگ عظیم سخت بے مزہ وناخوش بودند وبرائے تجبین وتذلیل ہر یکے از ما
قابوی جستند،،

اس رقابت نے اتنا طول پکڑا کہ عظیم نے یہ قطعہ سر مشاعرہ پڑھا،

عظیم اب گو ہمیشہ سے ہے یہ شعر کہنا شعار اپنا
طرف ہر ایک سے ہو بحث کرنا نہیں ہے کچھ افتخار اپنا
کئی سکھن بازکھنڈ گویوں ہو نہو اعتبار اپنا
جنھوں کی نظروں میں ہم سبک تھے دیا انھیں کو وقار اپنا
عجب طرح کی ہوئی فراغت گدھوں پہ ڈالے سے بار اپنا[1]

ان جھگڑوں کا ذکر کرتے ہوئے شیخ ولی اللہ محب نے یہ قطعہ پڑھا:

مجلس میں چکے چاہیے جھگڑا شعرا کا اس فن کے کسو صاحب توقیر کے آگے
یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہنچے یہ قضایا اکبر تئیں یا شاہ جہانگیر کے آگے[2]

ان ادبی مجادلوں کا ذکر کرتے ہوئے رام بابو سکسینہ رقم طراز ہیں:

''اب چونکہ شاعری امیر رسی کا ایک ذریعہ ہوگئی تھی۔ لہٰذا شاعر
ایک دوسرے سے سخت رقابت وعداوت برتتے تھے اور ان کے
شاعرانہ مقابلے اب تہذیب وشائستگی کی حد سے گزر کر گالی گلوج اور
لپاڈگی کے درجے تک پہنچ جاتے تھے، چنانچہ انشا اور مصحفی کے

1۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو، مجموعہ نغز1 /ص82,86۔ نیز دیکھیے آب حیات/288,293۔

2۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو، مجموعہ نغز1 /ص86۔

ہنگامے اس زمانے کی تاریخِ شاعری پر ایک نہایت بدنما دھبہ ہیں،، 1

مولوی عبدالحق اس ضمن میں لکھتے ہیں، ''ہمارے درباروں میں حسد و رشک، رقابت وغماز ی اور سازو باز کی گرم بازاری ہمیشہ رہی ہے۔ ہر منہ چڑھا مصاحب دوسرے کو اکھاڑنے اور اپنے کو جمانے کی فکر میں رہتا ہے اور اس میں وہ عیاریاں اور افتراپردازیاں، حرفتیں، اور جدتیں کام میں لائی جاتی ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انشا، جرأت، اور مصحفی خواجہ تاش ہم پیشہ تھے، اول اول شاعرانہ چشمک رہی، بعد میں بڑھتے بڑھتے نوبت جنگ و جدل اور فحش اور پھکڑ تک پہنچ گئی۔ ان ہزلیات میں مصحفی اور انشا نے وہ کیچڑ اچھالی ہے کہ حیا اور غیرت کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ سید انشا بے حد ظریف، ٹھٹھول اور بے چین طبیعت کے تھے اور اس پر ذہانت اور غضب تھی، مصحفی پختہ اور پرانے استاد تھے، ساتھ شاگردوں کا لشکر تھا، انشا کی زیادتیاں گوارا نہ ہوئیں، ترکی بہ ترکی جواب دینے لگے۔ غرض ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، جس کے مزے صاحب عالم (مرزا سلیمان شکوہ) اور نواب بھی لینے لگے، اور شہر والوں کو ایک دل لگی ہاتھ آ گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ انشا اپنی طراری، تیزی اور رسوخ سے بازی لے گئے اور مصحفی کو خفت نصیب ہوئی۔ صاحب عالم کی نظر ان کی طرف سے پھر گئی۔ تنخواہ میں تخفیف ہوئی اور آخر میں قطع تعلق کر کے خانہ نشین ہو گئے،، 2

یہ جھگڑا اس حد تک پہنچ گیا کہ کوتوال شہر کو نقصِ امن کی وجہ سے مداخلت کرنی پڑی۔ مصحفی خود لکھتے ہیں:

---

1 تاریخ اردو ادب/176۔

2 تذکرہ ہندی (مقدمہ) ص5، سلیمان شکوہ کے مشاعروں میں شعری معرکوں کے لیے ملاحظہ ہو۔ ایضاً/ 66, 121, 148 ان معرکوں کے بارے میں قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں۔

''بہ میاں غلام مصحفی کہ شاعریست مسکین نہادے بیچ بعدے طرف شدہ کہ کار راز گفتگوے رکیک کہ شایان شان ہنرمندان نبود واگزاشتہ، بجو گوئی کشید، بلکہ آنچہ زبان زدعوام الناس است وبجلس عامیان نسزد تا بہ محفل بہشت آئین وسلاطین چہ رسد'' مجموعہ نغز 1 / 81، تذکرہ خوش معرکہ زیبا ص88۔

الف 920ب، تذکرہ بہار بے خزاں، ص92، آب حیات/348,362۔

حصول یہ ہے کہ جب کوتوال تک قضیا — کیا ہوا از پے تہدید شاعران شریر
تو کوتوال ہے بس اون سے اب سمجھ لے گا — یہ دم بدم کی شکایت کی ہے عبث تحریر [1]

دربار سے قطع تعلق ہونے سے پہلے مصحفی نے مرزا سلیمان شکوہ کی خدمت میں ''قصیدہ در معذرت اتہام انشا'' کے عنوان سے پیش کیا تھا، اور شہزادے کو حقیقت سے روشناس کرنے کی کوشش کی تھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

قسم بذاتِ خدائے کہ ہے سمیع و بصیر — کہ مجھ سے حضرت شاہ میں نہیں ہوئی تقصیر
سوائے اس کے حال اپنا کچھ کیا تھا عرض — دلے بطور شکایت تھی اند کے تقریر
مزاج میں یہ صفا ہے کہ کرلیا باور — کسی کے حق میں کسی نے جو کچھ کیا تقریر
مصاحب ایسے کہ گر کچھ کسی سے لغزش ہو — تو اس کی رفع کی ہرگز نہ کرسکیں تدبیر
دگر کریں تو پھر ایسی کہ نار طیش و غضب — مزاج شہ میں ہو مشتعل بصد تشویر
سو تاب ذرہ کہاں نور آفتاب کہاں — کہاں وہ سطوت شاہی کہاں غرور فقیر
مقابلہ جو برابر کا ہو تو کچھ کہیے — کہاں وہ بیتی و دیبا کہاں بلاس و حصیر
میں اک فقیر غریب الوطن مسافر نام — رہے ہے آٹھ پہر جس کو قوت کی تدبیر
یہ افترا ہے بنایا ہوا سب انشا کا — کہ رزم و بزم میں ہے پائے تخت کا وہ مشیر [2]

آخری زمانے میں نواب سعادت علی خاں اور انشا کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور انھیں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا، اس بے روزگاری کے زمانے میں سبحان قلی بیگ راغب [3] نے انشا پر چند ہجویں لکھیں اور اس طرح اس کی شہر میں تذلیل اور رسوائی کی۔ مرزا قتیل ایک خط میں مرزا امامی کو لکھتے ہیں۔

''احوال خان مربور انیست کہ از دو ماہ برطرف شدہ و سبحان قلی بیگ

1۔ دیوان مصحفی 1 ح/4 (رام پور) ص 60۔
2۔ دیوان مصحفی/ ح/4 /ص 58-57۔ مصحفی اور انشا کے شعری معرکوں کے لیے نیز ملاحظہ ہو آب حیات۔
3۔ برائے حالات دیکھیے، تذکرہ طبقات الشعرائے ہند (مرتبہ عطا کاکوی 92 (ب) ص 27
مجموعہ نغز 1/ ص 266

راغب کہ آشنائے چہل سالہ اش بود، او را در تمام شہر رسوا نمودہ یعنی چند ہجو برایش گفتہ کہ جا بجا نقل آں برداشتہ شد و او سوائے ایں کار دیگر ایں کرد کہ ہجو بعضے اعزۂ شہر گفتہ نزد خان موصوف فرستادہ۔ ایں عزیز بی تامل آں ہجو ر ارانزد طرف ثانی ہا بایں خیال فرستاد کہ گویندہ را شلاق بکنند۔ آنہا چوں ایں معنی مطلع شدند سبحان قلی بیگ را طلبیدہ پرسیدند کہ اے عزیز تو خود را چہ فہمیدہ بودی کہ ایں راہ رفتی حالا بتو چہ سلوک بورزیم، سبحان قلی بیگ گفت کہ میانۂ من و صاحب کدام معاملہ دنیا بود کہ بر سر آں ہجو میکردم ایں قدر گفتہ قرآن را بر سر گذاشت کہ اگر من یک مصرع در ہجو صاحب گفتہ باشیم قرآن مجید کمر مرا بزند، چوں من دریں روز ہا ہجو انشا اللہ خاں کردہ ام واونمی تواند کہ چشم مرا بکند لہٰذا از راہ جبن ایں تبارا گذاشتہ کہ ہجو اعزہ خود گفتہ تخلص من داخل نمودہ است تا بزرگان و بزرگ زادگان درپے آزار من شوند چوں خان موصوف ہجو بعض بیگناہان گوشہ نشین و دیگر اجلہ و اہالی کردہ بود ہمہ را بگفتہ سبحان قلی بیگ راغب، یقین حاصل کہ ایں ہجو ہا گفتہ خان مزبور ست دفعتہً مستعد آں شدند کہ بلای بر سر خاں موصوف نازل بکنند، ایں مرد ازیں خبر دست و پاچہ شدہ داماد و پسر خود و دیگر آشنایان خودش را نزد طرف ثانی فرستاد و بالحاح وزاری پیش آمدند و بہ ایمان موکدہ واحلاف عرضیہ ازیں بلا محفوظ ماند،،[1]

درباری معرکوں کا اثر عام مجلسوں پر بھی پڑا اور ان مشاعروں میں بھی معرکے ہونے لگے بقا اللہ بقا کے حال میں مصحفی نے لکھا ہے:

''طبع شوخش بطرف ہجو مائل افتادہ، در شاہ جہاں آباد با میر و در لکھنؤ با مرزا (سودا) معرکہ گیر بپا کردہ و دقتِ طبع خود را اظاہر نمود،،[2]

---

1. رقعات مرزا قتیل/71۔

2. تذکرہ ہندی/43۔

مرزا علی مہلت نے شاگرد جرأت کے بارے میں لکھا ہے:

''اورا پیش ازیں بہ علی نقی محشر مناظرہ درمیان آمدہ بود۔ آخر ہر دو بریں قرار دادند کہ از گومتی عبور کردہ آنروے آب بہ تیغ جنگ کنند، آخر ہمیں کردند کہ مشارٌ الیہ چوں زخمی شدہ بخانہ رسید، وارثانش ہر چند پرسیدند از ضارب خود نشان نہ داد و در عرصۂ قلیل از ہماں زخم جانستان زندگانی راجواب داد،،[1]

لیکن اس کے وارثوں نے مہلت پا کر لطف علی کو قتل کر دیا[2]

عام طور پر مشاعروں میں سامعین شعرا کے کلام کو سن کر بڑے جوش و خروش سے داد و تحسین کے نعرے بلند کیا کرتے تھے، مصحفی نے ایک شعر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے:

ان لوگوں کی مجلس میں غوغا میں نہیں دیکھا
بزم شعرا ہے یہ یا مرغوں کی پالی ہے۔[3]

درباروں سے وابستگی کے برے نتائج

دہلی کے اکثر و بیشتر شعرا دربار مغلیہ سے وابستہ نہ تھے۔ اس وجہ سے وہ اپنے مذاق اور مزاج کے مطابق کلام کہتے تھے۔ اور اپنی خودداری برقرار رکھتے تھے۔ اگر وہ کسی نواب کے ہاں وابستہ بھی ہوتے اور ان سے مالی امداد بھی ملتی ہوتی تو ایسی صورت میں بھی وہ بھانڈوں کا پیشہ نہ اختیار کرتے۔ مثلاً خواجہ محمد باسط، میر تقی میر کی مفلسی پر رحم کھا کر انھیں نواب امیر الامرا صمصام الدولہ کے پاس لے گئے اور مدد کی التجا کی۔ نواب نے ایک روپیہ روزینہ مقرر کر دیا۔ میر نے کہا یہ بات لکھ کر دی جائے تا کہ متصدیوں سے بلا پریشانی روزینہ مل سکے۔ میر نے درخواست نکالی، خواجہ صاحب نے کہا یہ قلم دان کا وقت نہیں ہے۔ یہ سن کر میر نے جملے کی ترکیب پر اعتراض کر دیا[4] ایک مرتبہ رعایت خاں نے میر سے درخواست کی کہ وہ اپنے چند شعر ڈوم کے لڑکے کو

---

1. تذکرہ ہندی/ 229-230۔
2. تذکرہ خوش معرکۂ زیبا/67ب
3. دیوان مصحفی دوم (رام پور) 81الف
4. میر کی آپ بیتی/92-91۔

یاد کرادیں۔'' چونکہ ملازمت کا پاس تھا۔طوعاً وکرہاً تعمیل کی اور پانچ شعر ریختہ کے اسے یاد کرادیے۔مگر یہ بات میری طبع نازک پر بہت گراں گزری، آخر دو تین دن بعد گھر بیٹھ رہا۔اس نے ہر چند بلایا،نہیں گیا،اوراس کی نوکری چھوڑ دی'' [1]

راجا جگل کشور نے میر کو اپنے ہاں رکھا'' اور اپنے اشعار پر
اصلاح کی خدمت سپرد کی، مگر میں نے اصلاح کی قابلیت نہ دیکھی
اوران کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا'' [2]

لیکن دہلی کے اکثر و بیشتر مہاجرین شعرا کسی نہ کسی دربار سے وابستہ ہوگئے جس کا برا نتیجہ یہ نکلا کہ انھیں اپنی آزادیٔ طبع سے ہاتھ دھونا پڑا۔اور اپنے ولی نعمت نواب، یا امیر کے مذاق اور مزاج کے مطابق شعر کہنے پر مجبور ہونا پڑا، چونکہ اودھ میں فارغ البالی تھی، نوابان اودھ تعیش پرست تھے اوران پر رکیک جذبات کا غلبہ تھا۔نواب شجاع الدولہ جنسی تلذذات کا دیوانہ تھا اور اپنا زیادہ وقت حسین ومہ جبیں عورتوں میں گزارتا تھا۔سفر وحضر میں طوائفوں کے ڈیرے اس کے ہمراہ ہوتے تھے۔درباری امرا پر بھی اس کا اثر غالب تھا'' چنانچہ جس شاعری میں بگڑنے کے آثار پیدا ہو چلے تھے، ان کے اعمال ناموں کی سیاہی سے آلودہ ہوگئی۔ایسی شاعری کا ایک خاص نام معاملہ بندی ہوا جس کے پردے میں بداعمال اپنی سیہ کاریوں کا اعلان کرنے لگے، اس حالت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اربابِ فضل وکمال کے ساتھ ساتھ دہلی کی پیشہ ور عورتیں [3] بھی فیض آباد اور لکھنؤ میں آرہی تھیں'' [4]

رفتہ رفتہ ہزل گوئی اور فحاشی ایک مستقل صنف بن گئی [5] نسائیت اور فحش گوئی سے مل کر ریختی کی بنیاد پڑی۔'' یہ ایسی صنف ہے جو اردو کے علاوہ کسی اور زبان کی شاعری میں موجود

---

1. میر کی آپ بیتی/103۔
2. میر کی آپ بیتی/110۔
3. دریائے لطافت (ا۔ت) ص 117۔
4. لکھنؤ کا دبستان شاعری/33-32۔
5. لکھنؤ کا دبستان شاعری/33۔

نہیں ہے۔[1] سعادت یار خاں رنگین اس صنف کے موجد تھے۔[2] عیاش مزاج لوگوں کو یہ زبان بہت پسند آئی۔ انشا کا ایک دیوان ریختی اس زبان میں ہے۔[3]

لکھنؤ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے انشا نے لکھا ہے:

''ریختے میں استاد میاں ولی،، ہوئے، ان پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی۔ پھر میاں آبرو[4] اور میاں ناجی[5] اور میاں حاتم، پھر سب سے بہتر مرزا رفیع سودا، اور میر تقی صاحب، پھر حضرت میر درد صاحب جو میرے بھی استاد تھے، وہ لوگ تو سب مر گئے اور ان کی قدر دانی کرنے والے بھی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ اب لکھنؤ کے جیسے چھوکرے ویسے ہی شاعر ہیں تخم تاثیر صحبت اثر سبحان اللہ، یہ کون میاں جرأت، بڑے شاعر پوچھو تو تمھارا خانماں (رائے مان) کس دن شعر کہتا تھا اور رضا بہادر کا کون سا کلام ہے۔ اور دوسرے میاں مصحفی کہ مطلق شعور نہیں رکھتے، اگر پوچھیے کہ ''ضرب زید عمرا، کی ترکیب تو ذرا بیان کرو، تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لے کر لڑنے آتے ہیں، اور میاں حسرت[6] کو دیکھو، اپنا عرق بادیان اور شربت انارین چھوڑ کے شاعری میں آ کے قدم رکھا اور سب سے زیادہ ایک اور بات سنیے کہ سعادت یار خاں کا بیٹا، انوری ریختہ کا آپ کو جانتا ہے۔ رنگین تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے۔ اس مثنوی کا دل پذیر نام رکھا ہے۔ رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے۔ میر حسن پر زہر کھایا ہے ہر چند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا۔ بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی، سانڈے کا تیل بیچتے ہیں بھلا، اس کو شاعر کیوں کر کہیے، سارے لوگ لکھنؤ کے اور دلی کے رنڈی سے لے کر مرد تک اسے پڑھتے ہیں۔

---

1. لکھنؤ کا دبستان شاعری/34۔
2. دریائے لطافت (ا۔ت) 96,171۔
3. کلیات انشا/ص185 مابعد۔
4. ملاحظہ ہو دیوان آبرو، مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن۔
5. ملاحظہ ہو دیوان شاکر ناجی مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق۔
6. تذکرہ ہندی/74۔

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی   کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

اور کراہی پن جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے، تو ریختے کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے۔ اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں اور ان کے ساتھ اپنا منھ کالا'' کرے [1]

مختصر یہ کہ اس دور کی لکھنوی شاعری سے ایک ایسے سماج کی عکاسی ہوتی ہے۔ جو عیش وعشرت، رنگ وبو، اور مے نوشی میں غرق تھا۔ مثلاً انشا اور مصحفی، جرأت کے کلام میں حد درجہ کا ابتذال، سوقیانہ پن، فحاشی، رکاکت اور جنسی عریانی پائی جاتی ہے۔ ان شاعروں کا پورا کلام شاہد ہے۔ ان کے اشعار میں تخیلات، بلند پروازی، شعری حسن کا فقدان ہے۔ ان کے اشعار پڑھنے سے جنسی جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔ انشا کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

شب میں نے جو نہی ہاتھ لگایا تو وہ پری   بے اختیار شرم کے مارے سمٹ گئی
ہم دو گھڑی بھی ساتھ ترے سو رہے نہ ہائے   باتوں میں یوں ہی چار پہر رات کٹ گئی
مجھ سے لپٹ کے آخر شب یار نے کہا   کیا جانے ان دنوں کی یہ کیوں رات گھٹ گئی

رضائی شال کی اوڑھیں چلیں ہم تم چھپر کھٹ میں
ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی آرہی ہیں خوب جاڑا ہے
کیوں کر نہ گدگداہٹ ہاتھوں میں اس کے اوٹھے
وہ گوری گوری رانیں جس نے دبائیاں ہیں

جاڑے میں کیا مزہ ہو وہ تو سمٹ رہے ہوں   اور کھول کر رضائی ہم بھی لپٹ رہے ہوں

میر حسن دہلوی

ساتھ سونے کو ہمارے سیم بر آتی نہیں   جس سے چین آتا ہے جی کو وہ نظر آتی نہیں [2]
آج کی چاندنی وہ ہے کہ کسی شوخ کے ساتھ   کھول آغوش لپٹ جایئے اور سو رہیے

---

1 برائے تفصیل ملاحظہ ہو، دریائے لطافت (ا۔ت) 95,100۔

2 دیوان میر حسن
(سبحان اللہ کلیکشن، علی گڑھ)

مصحفی

کہا میں رات اس سے ایک بوسہ   جو چھپ کردے تو دانائی ہے تیری
خفا ہو کر لگا مجھ سے یہ کہنے   اب کم بختی کیوں آئی ہے تیری 1

جرأت

کیا اکیلے تیرے بن جایئے اور سو رہیے   تو نہ ہو پاس تو کچھ کھایئے اور سو رہیے
بزم میں بیٹھے ہو کیا رات چلی جاتی ہے   لوہمیں اب کہیں سلوایئے اور سو رہیے
پائینتی بیٹھ کے تلووں کو تو سہلاؤں میں   اتنا منھ سے مجھے فرمایئے اور سو رہیے
جاگتے ہیں بس اسی فکر میں ہم تو دن رات   کیونکہ گھر میں اسے لے آیئے اور سو رہیے
تم تو بیٹھے ہی رہے اور چلی وصل کی رات   لو گنہ بخشیے مل جایئے اور سو رہیے
نیند آنکھوں میں ہے اور کہتے ہیں ہم اے جرأت   پاؤں اس کوچے میں پھیلایئے اور سو رہیے

شاعری کا معیار بالکل گر چکا تھا اور بقول مصحفی:

کیا چکے اب فقط میرے نالہ کی شاعری   اس عہد میں ہے تیغ کی بھالے کی شاعری
سامان سو طرح کا ہو لڑنے کا جن کے پاس   ہے آج کل انھیں کا رسالہ کی شاعری
شاعر رسالہ والے نہ دیکھے نہ سنے   ایجاد ہے انھیں کا رسالہ کی شاعری 2

مذہب اثنا عشری کے زیر اثر مرثیہ گوئی کو عروج حاصل ہوا، ہندستان میں مرثیہ گوئی اگرچہ ابتدائی دور میں دکن میں رائج تھی اور شمالی ہند میں سودا، مسکین، سکندر، تقی، میر ضاحک نے مرثیے لکھے، اور دہلی میں مرثیہ خوانوں کو کافی عروج حاصل ہوا۔ جیسے کہ پہلے حصہ میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ لوگ ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر مرثیے لکھتے تھے۔ اور رفتہ رفتہ اسے فنی حیثیت حاصل ہوتی گئی مگر جو ترقی اس خاص صنف کو لکھنؤ میں حاصل ہوئی اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں

---

1. دیوان مصحفی چہارم (ق۔رام پور) ص 79۔

2. دیوان مصحفی دوم ص 34 ب کلیات میر حسن دہلوی، میں خلیفہ سکندر شاگرد ناجی کی ہجو میں بے حد ابتذال پایا جاتا ہے۔ اسی طرح جرأت کی ہجویں فاشی کی بدترین مثالیں ہیں۔

دیوان مصحفی دوم (رام پور) ص 82 ب۔ 83 الف۔

انیس و دبیر اور دیگر شعرا مثلاً ضمیر، خلیق وغیرہ کے نام مشہور ہیں۔

مرثیہ لکھنے کے ساتھ ساتھ مرثیہ خوانی کو لکھنؤ والوں نے ایک خاص فن بنالیا اور اس زمانے میں بھی صاحب کمال مرثیہ خواں لکھنؤ میں ملتے ہیں۔

دہلی کی شاعری میں تصوف کو بڑا دخل تھا اور تصوف کے بہت سے مسائل نظم ہوتے تھے، مثلاً مرزا مظہر جان جاناں، خواجہ میر درد، میر تقی میر اور میر اثر کا کلام اس سے پُر ہے، لیکن اس کے برعکس مذہب اثنا عشری کے پیروؤں کو تصوف سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ کی شاعری میں تصوف کو خارج کر دیا گیا، لکھنؤ والوں نے عشق حقیقی پر عشق مجازی کو ترجیح دی اور اس کے مضامین نظم کیے۔ لکھنؤ کی شاعری میں معاملہ بندی اور اس کے متعلقات اس غلط روی کے نتیجہ ہیں۔

اسی طرح مذہب کا اثر دوسرے اصناف سخن میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً دہلی میں لکھی گئی مثنویوں میں بالعموم حمد ونعت کے بعد ممدوح کی تعریف بیان کر کے اصل قصہ شروع کر دیا جاتا تھا۔ لکھنؤ کی مثنویوں میں ائمہ کرام کی مدح کو بھی جزوِ ضروری سمجھا گیا۔ میر حسن، دیا شنکر نسیم وغیرہ نے اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے۔

علم وادب

شمالی ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے بعد "سرزمین پورب معدن علم وعلما تھی"۔ اسی سرزمین سے مولانا نسرین الدین شافعی، اودھ کے شیخ الاسلام تھے۔ مولانا علاء الدین نیلی اودی[1] نے وہاں کے شیخ الاسلام مولانا نسرین الدین سے کشاف کا درس لیا تھا۔ مولانا شمس الدین یحییٰ[2]

1 شیخ نظام الدین اولیا کے خلیفہ تھے۔ مزار درگاہ نظام الدین میں ہے۔ سیر الاولیا/ 222, 275,278۔ اخبار الاخیار/ص 171-170، تذکرہ علماے ہند/ 141-140۔

2 شیخ نظام الدین اولیا کے خلیفہ تھے اور اودھ کے باشندے تھے، تحصیل علم مولانا ظہیر الدین بھکری اور مولانا فرید الدین شافعی سے کیا تھا۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی نے آپ کی خدمت میں (بقیہ صفحہ 464 پر)

مولانا عبدالکریم شیروانی[1]، قاضی محی الدین کاشانی[2] مولانا افتخار الدین محمد گیلانی[3] اور دیگر علما نے اس دیار میں علم وادب کے چراغ روشن کیے۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی نے اپنی ابتدائی تعلیم مولانا عبدالکریم شیروانی اور مولانا افتخار الدین محمد گیلانی سے حاصل کی تھی۔ آزاد بلگرامی رقم طراز ہیں۔ کہ دراصل مسلمانوں کے دور حکومت میں ہندستان کے تمام صوبوں میں علم وادب کے چرچے اور سرگرمیاں تھیں اور علوم معقول ومنقول کا عام رواج پایا جاتا تھا لیکن صوبہ اودھ اور الہ آباد اپنی علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے خاص طور پر مشہور ومعروف تھے اور اس بارے میں دوسرے صوبوں کا ان سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ دور دور سے تشنگان علم اپنی پیاس بجھانے کشاں کشاں ان علاقوں میں چلے آتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام صوبہ اودھ اور الہ آباد میں ہر پانچ اور دس کوس کے فاصلے پر شریف مسلمانوں کی بستیاں تھیں جہاں کے مسلمانوں کو سلاطین اور حکام وقت سے وظائف اور مدد معاش کی زمینیں ملی ہوئی تھیں۔ انھوں نے مسجدیں، مدارس، اور خانقاہیں تعمیر کروائیں۔ اس طرح معلموں نے ہر مقام پر درس وتدریس اور علم وادب کے دروازے کھول دیے اور دور دراز علاقوں سے طالب علموں کو وہاں بلایا گیا۔ ان شرفا میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو ان طلبا کی امداد کرتے اور ان کی رہائش، خورد ونوش اور لباس کا بھی انتظام کرتے تھے۔ اس گروہ کی خدمت کرنا وہ ایک نیک کام سمجھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورب میں علم وادب کا بہت چرچا ہوا اور ایک وقت ایسا آیا کہ ایک موقع پر شاہ جہاں بادشاہ نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔ ''پورب شیراز مملکت مااست'' مگر یہ سرگرمیاں 1130 / 1717 تک باقی رہیں۔ اس کے بعد مدارس اور خانقاہوں پر اوس

(بقیہ حاشیہ صفحہ 463 کا) زانوے ادب تہ کیے۔ ملاحظہ ہو۔ سیر الاولیا/222,236، اخبار الاخیار، 178-179۔ تذکرہ علماے ہند/86-87۔ ماثر الکرام 1 /ص 182-183۔

---

1. سیر العارفین/92۔

2. شیخ نظام الدین اولیا کے مریدوں میں سے تھے۔ اپنے تبحر علمی، زہد اور تقویٰ کی وجہ سے بڑی شہرت پائی تھی۔ برائے تفصیل دیکھیے، سیر الاولیا/294,296۔ تذکرہ علماے ہند/221-222۔

اخبار الاخیار/ص 179-180

3. ملاحظہ ہو۔ خیر المجالس (مقدمہ) ص 40 (اشاریہ۔1)

پڑگئی۔ درس وتدریس کا بازار سرد پڑ گیا اور وہ جوش دھیمے پڑ گئے کیونکہ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری اس علاقے کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ اس بنا پر صوبہ الہ آباد کے عمدہ شہر مثلاً جون پور، بنارس، غازی پور، کڑہ ومانک پور اور کوڑہ جہان آباد وغیرہ اس کی حکومت میں آگئے۔ برہان الملک نے قدیم اور جدید خانوادوں کے وظائف اور سیورغال یک قلم بند کردیے۔ [1]اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شریف اور نجیب معاشی اور اقتصادی افلاس میں گرفتار ہو گئے، اور اس اقتصادی بدحالی نے وہاں کے لوگوں کو تحصیل علم سے محروم کر دیا۔ اور انھیں پیشۂ سپہ گری اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کا دوررس نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اس دیار میں درس وتدریس اور تحصیلِ علم کے کاروبار میں بے رونقی پیدا ہونے لگی اور رفتہ رفتہ پہلے جیسی سرگرمیاں باقی نہ رہیں اور وہ مدرسے جو قدیم زمانے میں علم وادب کے گہوارے تھے، بالکل تباہ وبرباد ہو گئے اور ارباب علم وفن کی انجمنیں منتشر ہو گئیں۔

برہان الملک کے بعد ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کا دور آیا اور اس کے دورِ حکومت میں بھی وظائف اور مدد معاش بدستور سابق بند رہے۔ آخر میں 1159ھ میں محمد شاہ بادشاہ نے صفدر جنگ کو الہ آباد کی صوبہ داری بھی تفویض کر دی۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے وظائف بھی موقوف کر دیے گئے جن کو کسی وجہ سے مل رہے تھے اور موقوفی کی آفت سے محفوظ تھے۔ احمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں صفدر جنگ، وزیر الممالک کے عہدے پر فائز ہوا اور ان علاقوں کی تنظیم کے لیے اس نے اپنے نائب مقرر کیے۔ اس زمانے میں وظیفہ خواروں کی زندگی تنگ تر ہو گئی۔ اور 1752-1753 تک یہی حالت رہی۔ مگر پھر بھی مدارس، مساجد، خانقاہوں میں علم وادب کا چرچا رہا۔[2]

ماثر الکرام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف شہروں میں اب بھی درس وتدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ مثلاً شمس آباد میں مولوی سید قطب الدین[3]، جنھوں نے ملا قطب الدین شہید سہالوی سے تحصیلِ علم کیا تھا، درس کا کام کرتے تھے۔ اور جمِ غفیر را بہ افاضۂ دانش وبینش مرتبہ کمال وتکمیل

---

1. ملفوظ رزاقی میں لکھا ہے کہ برہان الملک نے سندیلہ کے شرفا کے وظائف موقوف کر دیے تھے جس کی وجہ سے وہاں بدحالی پیدا ہو گئی تھی "شرفائے آنجا بلکھنؤ رفتہ بنا بر معافی رفتند، وسعی کردند، بمقصد نرسیدند"، ص 99۔

2. ماثر الکرام (دفتر اول) ص 222-221۔

3. امیٹھی وطن تھا، وہاں سے نکل کر شمس آباد میں سکونت اختیار کی۔ اپنے عصر کے علما (بقیہ صفحہ 466 پر)

کرامت نمود"۔ شیخ غلام نقشبند[1] لکھنوی، شیخ احمد المعروف بہ ملا جیون[2] امیٹھوی، ملا نظام الدین سہالوی، سید عنایت اللہ[3]، مولوی اصغر[4]، میر عبد الہادی[5]، شیخ عثمان احمد[6]، سید غلام نبی[7]، مولوی قطب الدین گوپاموی[8]، حاجی صفت اللہ خیر آبادی[9] اور شیخ کمال الدین[10] اپنے اپنے مقامات پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ 465 کا ۔ سے تحصیل علم کیا اور آخر میں ملا قطب الدین شہید سہالوی کے درس میں شریک ہوئے اور تکمیل علوم کیا۔ 1126ھ میں وفات پائی، ماثر الکرام 1 /ص 210۔)

---

1 گھوسی، قصبہ کے باشندہ تھے، شیخ پیر محمد لکھنوی سے تلمذ تھا، آپ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب کشف نقش بندی سلسلے کے صوفی بھی تھے۔ 1121ھ میں وفات پائی اور لکھنؤ میں مزار ہے۔ ماثر الکرام 1 /ص 216-213 تذکرہ علمائے ہند/159-158

2 امیٹھی میں پیدا ہوئے، علوم عقلی ونقلی میں بحر لا متناہی تھے، اپنے عصر کے علما سے کسب علوم کیا۔ ملا لطف اللہ کوروی کی خدمت میں رہ کر فارغ التحصیل ہوئے۔ اورنگ زیب نے اپنے لڑکوں کو ان کی خدمت میں تحصیل علم کے لیے بھیجا تھا۔ اورنگ زیب اور بہادر شاہ اول ان کا بڑا احترام کیا کرتے تھے۔ 1130 میں دہلی میں وفات پائی، ان کی نعش کو امیٹھی لے جایا گیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ ماثر الکرام 1 /ص 217-216۔

3 بلگرام وطن تھا، دور دور سے طالب علم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ 1120ھ میں وفات پائی۔ ماثر الکرام/243-242۔

4 مولوی اصغر اور ملا جیون ہم مکتب تھے اور مولوی لطف اللہ سے تکمیل علوم کیا تھا۔ مولوی اصغر نے لکھنؤ میں شیخ پیر محمد لکھنوی کے دست مبارک پر بیعت کی۔ اس کے بعد قنوج چلے گئے اور تمام عمر درس وتدریس کے شغل میں منہمک رہے۔ "خلقے کثیر در حوزۂ درس او منتہائے فضیلت حاصل کردند"، آخر عمر میں قرآن کی تفسیر "ثواقب التنزیل" کے نام سے لکھی۔ 1140ھ میں وفات پائی۔ ماثر الکرام 1 /ص 251-250۔

5 برائے حالات ملاحظہ ہو ماثر الکرام 1 /ص 252-251۔

6 ملاحظہ ہو ماثر الکرام/299۔

7 ماثر الکرام/300-299۔

8 ماثر الکرام/301-300۔

9 ماثر الکرام/302-301۔

10 ماثر الکرام/303-302۔

مشغل درس وتدریس روشن کیے ہوئے تھے۔ اسی طرح جونپور میں، جو قدیم الایام سے معدن علم وادب تھا علم وادب کی سرگرمیاں برابر جاری رہیں، وہاں نامی گرامی علما وفضلا وجود میں آئے۔ مولوی روشن علی، بامروت اور آشنا پرست انسان تھے، قاضی مرتضیٰ بلگرامی کے ان سے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان کے بھائی درویش علی علم وادب کے زیور سے آراستہ وپیراستہ تھے، مولوی علی، حلیم ومتواضع شخص تھے، اور دانش مندوں کی فہرست میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مولوی باسط علی، رمضان علی، حسنِ اخلاق وتواضع میں اپنی نظیر آپ تھے۔[1]

مرزا قتیل نے اپنے زمانے سے پہلے علم وادب کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ''اب سے پہلے (1226ھ سے پہلے) شاہ پیر محمد صاحب[2] کے ٹیلے پر جو لکھنؤ میں دریا گومتی کے کنارے مشہور جگہ ہے۔ سات سو طلبا کے رہنے، کھانے پینے اور پہننے کے اخراجات کے لیے بادشاہ ہندستان کی طرف سے ضروری مشاہرہ مقرر تھا،،[3]

نواب شجاع الدولہ نے بھی اپنے آبا واجداد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے وظیفہ خواروں کو دوبارہ وظیفے مقرر نہیں کیے بلکہ جو اب بھی باقی تھے ان کے بھی وظائف بند کر دیے۔ طبا طبائی نے نواب کی اس حرکت کی بڑی مذمت کی ہے، وہ لکھتا ہے ''اپنے وظیفہ خوارانِ ممالک محروسہ کے حق

---

1 حدیقۃ الاقالیم/78-677۔

2 آپ اپنے زمانہ میں صاحب علم ودانش، علوم باطنی اور ظاہری سے آراستہ ایک بزرگ تھے جونپور کے مضافات میں واقع مقام منڈیاہوں کے باشندہ تھے۔ انھوں نے جونپور، مکہ ومدینہ، دہلی واجمیر اور قنوج میں تحصیل علم کیا تھا۔ اس کے بعد لکھنؤ آئے، بہت زمانے تک شاہ مینا نامی مقام پر ریاضیات شاقہ اور مجاہدات میں مصروف رہے۔ مولوی قاضی عبدالقادر لکھنوی سے سند حاصل کی اور فاتحہ فارغ التحصیلی انھیں کے ہاتھوں انجام پایا۔ علم باطنی میں شاہ مینا کی روح پاک سے استفادہ کیا۔ بعد میں شاہ عبداللہ سیاح چشتی کے مرید ہوئے۔ اپنے پیر کی وصیت کے مطابق درس وتدریس میں زندگی گزاری 1080ھ/1669ء میں وفات پائی، مزار لکھنؤ میں گومتی کے کنارے زیارت گاہ خاص وعام ہے۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ خلاصۃ التواریخ 44۔ خزینۃ الاصفیا ج1 / 483-482، تذکرہ علمائے ہند/35-34۔

3 ہفت تماشا/175۔

میں ایسا بدگمان ہوا کہ اس جماعت کو جو لاکھوں سے مضاعف تھے یک قلم روزینہ اور وجہ معاش سے محروم کر دیا۔ اور آراضی اور دیہات ضبطی میں لایا، جس کے نتیجہ میں خلق اللہ ایسی تنگ ہوئی کہ بعضوں نے تو اپنے گھروں میں غیرت کے مارے دروازے بند کر کے شرم سے منہ نہ دکھایا اور رفتا ہوئے، اور بعضوں نے کشکول گدائی لے کر در بدر بھیک مانگنا شروع کر دیا۔ ممکن ہے دس بیس امور ناشائستہ کے مرتکب ہوئے ہوتے تو خیر انھیں کہ تنبیہ کی جاتی بلکہ بہتر یوں تھا کہ اغماض فرماتا،،[1]

نواب آصف الدولہ، وزیر علی خاں اور نواب سعادت علی خاں کو ان امور سے کوئی دل چسپی نہ تھی، کچھ امرا ضرور علم وادب کے فروغ میں دل چسپی لیتے تھے۔ مثلاً نواب ابراہیم الدین خاں اور نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں، آخر الذکر نے مولانا فضل اعظم خاں[2] کی اس زمانے میں بڑی مدد کی تھی جب وہ ایک طالب علم کی زندگی گزار رہے تھے[3] مولانا محمد منیر[4] اور محمد خلیل[5] کو جواہر علی خاں کی سرپرستی حاصل تھی۔

انیسویں صدی کے ربع اول میں طالب علموں کی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے، مرزا قتیل لکھتے ہیں۔

''اس ملک میں زیادہ تر طلبا کا طریقہ یہ تھا کہ بعض کسی دوسرے کی روٹیوں کے محتاج نہ تھے، جب یہ لکھنؤ آتے تھے تو ان کے والدین تین چار روپے مہینہ یا اس سے زیادہ ان کے خرچ کے لیے ماہ بماہ بھیجتے تھے۔ اور بعض کو مدرسے سے کھانا ملتا تھا اس طرح امرا بھی حسب حیثیت اس فرقے کی خدمت کرتے تھے۔ چونکہ امرا کی طرف سے ہر عالم کے لیے ایک یا دو گاؤں مقرر تھے، اس لیے سب ہی علما اپنے شاگردوں کو کھانا کھلاتے تھے، رات کے وقت مطالعہ کے لیے چراغ کا

---

1. سیر المتاخرین (ا۔ت) 3/ 97۔

2. تاریخ فرح بخش 11 /ص 133 'برائے حالات مولوی فضل عظیم ملاحظہ ہو، ایضاً 11 /ص 133.136۔

3. تاریخ فرح بخش 11 /ص 133 'برائے حالات مولوی فضل عظیم۔ ملاحظہ ہو،
تاریخ فرح بخش 11 /ص 133.136۔

4. تاریخ فرح بخش 11 /ص 230۔

5. تاریخ فرح بخش 11 /ص 231۔

تیل بھی استاد کی طرف سے ملتا تھا[1] اب حال یہ ہے کہ وہ علمار ہے نہیں اور فیاضی نے امیروں سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے۔ طلبا حیران پریشان اور تباہ حال ہیں، بعضوں کو تو بے حد پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، جب کہیں آدھ سیر آٹا ہاتھ آتا ہے، جو فارسی جانتے ہیں وہ بچوں کو پڑھانے کی نوکری کسی ہندو کے یہاں کرلیتے ہیں اور مقررہ اوقات میں اپنے استاد کی خدمت میں پڑھنے کے لیے حاضر ہوجاتے ہیں، جو طلبا فارسی نہیں جانتے وہ معاشی طور پر بہت پریشان رہتے ہیں۔ اگر خوش نصیبی سے کوئی ہندو یا مسلمان جسے عربی پڑھنے کا شوق ہے۔ ان کے ہاتھ آگیا تو واہ واہ، ورنہ روتے جھینکتے بغیر تحصیل علم کے گھر واپس ہوجاتے ہیں، جب کوئی شخص کسی طالب علم کے لیے آدھا سیر آٹا مقرر کرتا تو وہ طالب علم کہاوت کے طور پر بیان کرتا ہے کہ میرے لیے جاگیر مقرر ہوگئی ہے،،[2]

علما اور طلبا کی بدحالی کا ذکر مرزا قتیل نے اپنے ایک خط میں بھی کیا ہے۔ وہ مرزا امامی کو لکھتے:

''بسا طالب علم وفاضل ہستند کہ بگدائی نان می خورند واز دعائے بد مطعون خلق خدا می شوند،،[3]

بالعموم طالب علموں کو بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور بعض مرتبہ تو تنگ معاشی کی بنا پر انھیں تعلیم چھوڑنی پڑتی تھی۔ مرزا قتیل نے ایک ایسے طالب علم کے بارے میں لکھا ہے جس نے اپنی اقتصادی زبوں حالی کی وجہ سے تعلیم چھوڑ دی تھی اور اپنے وطن کو واپس چلا گیا تھا۔ ''احوال برگشتن طالب علم دریافت شد، ہمہ کم قدر وآں در وقت بہم رسیدن تکہ نانی بدریوزہ باشد باولاد خود ہمیں حال دارند، اگرچہ تعلق بخت واتفاق دارد لیکن بظاہر باعثِ افلاس ہمیں حرکتہا می شوند ودولت مندزادہا ئیکہ باولاد خود شیوہ پیش میگرند، آنہا نیز داخل ہمیں جماعہ ہزار چانہ بی ننگ دعار اند،،[4]

طلبا کی زندگی

اس زمانے کے رواج کے مطابق ہر طالب علم کسی ایک فن میں مہارت حاصل کرتا تھا۔ لہٰذا

---

1. مآثر الکرام 1 / 221۔
2. ہفت تماشا/176-175۔
3. رقعات مرزا قتیل ص65۔
4. رقعات مرزا قتیل 58۔

طالب علموں کو اپنے ذوق کے مطابق در بدر پھر کر تعلیم حاصل کرنی پڑتی تھی، مثلاً چونکہ لکھنؤ علم وادب کا گہوارہ تھا اس لیے دور دور سے طلبا وہاں تحصیل علم کے لیے آتے تھے، مولوی فضل عظمی خاں کے حال میں محمد فیض بخش نے لکھا ہے کہ وہ شفیع پور کے باشندہ تھے، وہ اپنے وطن سے لکھنؤ فارسی پڑھنے آئے تھے، ایک مولوی سے انھوں نے گلستاں کا درس لینا شروع کیا ان کے قیام کے لیے ایک جگہ مقرر کردی گئی۔ اور ایک گھر بتادیا گیا جہاں سے ان کو کھانا ملتا تھا۔ فارسی پڑھنے والے طالب علموں کا یہی طریقہ تھا، لیکن عربی پڑھنے والوں کا نہیں[1] سید نوراللہ کے حال میں آزاد بلگرامی لکھتے ہیں۔

"درایام شباب بہ شوق تحصیل علم در قصبات متردد گردید واز ملا محمد زماں ساکن کاکوری ودیگر فضلاء عصر تحصیل نمود، بعد ازاں بہ خدمت سید حسین شاگردِ رشید میر زاہد رفت و چندی تلمذ کرد، آخر کار بخدمت میر زاہد شتافت وتحصیل را بہ انتہار سانید۔"[2]

مختصر یہ کہ اس زمانے کے تذکروں کے مطالعہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں تحصیل علم میں بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں۔ اور ایک مقام سے دوسرے مقام میں تحصیل علم کرنا پڑتا تھا، اس لیے جس قدیم عالم کا حال پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اس نے کئی استادوں سے استفادہ کیا تھا۔

اس زمانے کے طلبا میں تحصیل علم کا بڑا ذوق پایا جاتا تھا۔ وہ دوران تعلیم میں اپنے گھر والوں سے تقریباً ناتہ توڑ لیتے تھے تاکہ یکسوئی سے علم حاصل کرسکیں، سید محمود اصغر بلگرامی کی طالب علمی کا ذکر کرتے ہوئے آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

"درمبادی حال بہ ارادۂ تحصیل علم بہ قنوج رفت ونزدِ علما آنجا کتب درسی گزراند وکمال استعداد بہم رسانید، ودرایام تحصیل باوجود

---

1. تاریخ فرح بخش 11 /ص 134-133۔

2. ماثر الکرام 1 /ص 118 میر طفیل محمد بلگرامی کی طالب علمی اور ان کے اساتذہ کے ناموں کے لیے دیکھیے۔ ایضاً /150، نیز دیکھیے حال۔ میر عبدالجلیل بلگرامی/258۔

قرب مسافت گاہی میل وطن نہ کرد چہ مسافت مابین بلگرام وقنوج پنج
کردہ است وہمت بر اکتسابِ فنون علم گزاشتہ[1]

ریاضی پڑھنے کے لیے طالب علموں کو دہلی جانا پڑتا تھا۔ میر محمد یوسف کے بارے میں لکھا ہے" دردار الخلافہ شاہ جہاں آباد از بعض علما ریاضی داں آں بلدۂ علوم ریاضی، ہیئت وہندسہ وحساب وغیرہ ہا اخذ کرد وقدرتے عالی در فنون ریاضی بہم رسانید،،[2]

اس زمانے کے قاعدہ کے مطابق اعلیٰ درجے کے طلبا کم درجے والے طالب علموں کو درس دیا کرتے تھے، میر طفیل محمد بلگرامی اپنی طالب علمی کے زمانے میں اپنے سے کم درجے کے طالب علموں کو درس دیا کرتے تھے[3]

درس کا وقت

بالعموم مدرسوں، مسجدوں اور خانقاہوں میں صبح کے وقت تعلیم دی جاتی تھی، طلبا جزدان میں کتابیں رکھ کر لے جایا کرتے تھے، فضل اعظم خاں اپنی طالب علمی کے زمانے میں گلستان جزدان میں لے کر جاتے اور دوسرے طالب علموں کے ساتھ تحصیل علم کیا کرتے تھے[4]

مکتب ومدرسہ کے قواعد وضوابط

مدرسوں کے طلبا اور دار الاقامہ میں رہنے والے طالب علموں پر بڑی کڑی نظر رکھی جاتی تھی اوران کے کردار، اخلاق اوران کی زندگی کے ہر شعبہ کی تربیت پر خاص طور پر دھیان دیا جاتا تھا۔ اگر ایک طالب علم کوئی ایسا کام کرتا جو اس کے استاد کے مرضی کے خلاف ہوتا تو اسے سخت سزا دی جاتی اور بعض مرتبہ تو اسے دار الاقامہ اور مدرسہ سے بھی نکال دیا جاتا تھا۔ ملاّ نظام الدین سہالوی کے مدرسہ میں ایک طالب علم تھا۔ اس طالب علم نے ایک ایسے شخص کے ساتھ مباحثہ کیا جو ملاّ سے بھی بحث کر چکا تھا۔ اس طالب علم نے اپنے استاد کی طرف داری میں اس سے مباحثہ کیا تھا مگر ملاّ

---

1. ماثر الکرام 1/ص 55۔
2. ماثر الکرام 1/ص 297۔
3. ماثر الکرام 1/150۔
4. تاریخ فرح بخش 11/133۔

نظام الدین کو یہ بات ناگوار گزری اور وہ اس طالب علم سے نہ صرف ناراض ہوئے بلکہ اس کو اپنے ہاں سے خارج کر دیا۔ اور کہہ دیا کہ اس قسم کی حرکتوں سے میں راضی نہیں ہو سکتا۔ میں کسی شخص کو بھی رنج پہنچانے کے جرم کا ارتکاب نہیں کرتا ہوں[1]۔

نصاب

قرون وسطیٰ کے مدارس میں پڑھائے جانے والے نصاب کا ہمیں تفصیلی علم نہیں ہے کیونکہ اس زمانے کے مصنفین کی تصانیف میں کسی مستقل نصاب کی تفصیل دستیاب نہیں ہوتی۔ مثلاً مدرسہ فیروز شاہی[2] میں تفسیر، حدیث، اور فقہ کی تعلیم ہوتی تھی۔ چونکہ فیروز شاہ تغلق کو علم نجوم، تاریخ اور فن ادویات سے دلچسپی تھی۔ اور بہت ممکن ہے یہ مضامین بھی پڑھائے جاتے ہوں مگر اس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ درس نظامی سے قبل ہندستان میں کوئی جامع نصاب نہ تھا[3] مختلف اساتذہ اپنی دل چسپی کی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ مثلاً دارات علی خاں[الف] نے بہار دانش، نظامی گنجوی کی شیریں خسرو، اور غنیمت کی مثنویاں پڑھی تھیں۔ اور انشاپردازی سیکھی تھی۔[4] کیونکہ اس زمانے میں ملازمت کے لیے انشاپردازی لازمی تھی، جواہر علی خاں کے درس میں قرآن، گلستان و بوستان اور دیگر فارسی کی کتابیں شامل تھیں، مثلاً بہار دانش، سکندر نامہ (نظامی) یوسف زلیخا (جامی) مثنوی غنیمت، خوش نویسی، انشاپردازی، اور قرأت[5]

لیکن صحیح معنوں میں اسلامی مدارس کے لیے ایک جامع نصاب ملا نظام الدین سہالوی نے

---

1 معارف (ماہ دسمبر 1970) ص 442-421

TRAVELS IN INDIA ,PP. 155.157-

2 Studies in Medieval Indian History and, Culture- P.76-

الف برائے حالات ملاحظہ ہو، تاریخ فرح بخش/193,196۔

3 برنیر کا وہ واقعہ دیکھیے جہاں اورنگ زیب نے اپنے استاد ملا صالح سے اس بات کی شکایت کی ہے کہ جو علم انھوں نے اسے پڑھایا تھا وہ بے حد ناقص تھا۔

4 تاریخ فرح بخش 11 /ص 193۔

5 تاریخ فرح بخش 11 /ص 48۔

ترتیب دیا جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

درس گاہ فرنگی محل کا ارتقا

موجودہ زمانہ میں فرنگی محل لکھنؤ کا ایک محلہ ہے۔ ابتدا میں اس جگہ پر ایک فرانسیسی تاجر سکونت پذیر تھا۔ جس کی وجہ سے وہ علاقہ فرنگی محل کہلاتا تھا۔ جب وہ تاجر اپنے وطن کو واپس چلا گیا تو یہ زمین سرکاری ہوگئی۔[1] اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں ملا قطب الدین[2] سہالوی نے عروج پایا۔ ان کا وطن مالوف قصبہ سہالی تھا۔ وہاں کے انصاریوں اور عثمانیوں کے مابین زمین داری کے معاملہ میں کچھ تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چونکہ ملا قطب الدین انصاری تھے۔ لہٰذا 1103ھ/1691 میں ایک رات کو چند عثمانی ان کے گھر پر چڑھ آئے، ملا کو شہید کر دیا اور ان کا گھر نذر آتش کر دیا۔ ان کے صاحبزادے ملا محمد سعید سہالوی[3] نے عالم گیر اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہو کر داد فریاد کی۔ بادشاہ نے فرنگی محل کا علاقہ ان کو معافی میں دے دیا۔[4] موجودہ علمائے فرنگی محل کا سلسلہ ملا قطب الدین سہالوی تک پہنچتا ہے۔[5]

ملا قطب الدین سہالوی کے بیٹوں میں ملا نظام الدین اپنی علمیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ برگزیدہ تھے۔ ان ہی کے نام سے ''درس نظامی'' مشہور ہے۔ ابھی ان کی عمر 14 سال کی تھی

---

1. تذکرۂ علمائے ہند/ 168.

2. ملا قطب الدین نے ملا عبدالسلام کے شاگرد ملا دانیال اور شیخ محب اللہ الٰہ آبادی کے شاگرد رشید قاضی گھاسی سے کسب علوم کیا تھا۔ اور قاضی گھاسی کے دستِ مبارک پر بیعت بھی کی تھی۔ آپ کی تصانیف میں شرح عقائد علامہ دوانی پر حاشیہ تھا جو آپ کے گھر کی تباہی میں تلف ہوگئی۔ ملا صاحب نے تمام عمر درس و تدریس کا فیض جاری رکھا اور ہزاروں طالب علموں کو منزل تکمیل تک پہونچایا۔ بعد کے علما نے ان کے شاگردوں سے استفادہ کیا۔ برائے تفصیل دیکھیے ماثر الکرام 1 /ص 210-209۔ تذکرہ علمائے ہند/ 167,169 ہفت تماشا/ 172 معارف (دسمبر 1970) ص 24,52۔ تذکرہ فرحت الناظرین (قلمی پٹنہ) / 50۔

3. ملاحظہ ہو، تذکرہ علمائے ہند/ 190۔

4. تذکرہ علمائے ہند/ 169-168۔

5. ماثر الکرام 1 / 209۔

کہ والد نے شہادت[1] پائی۔ تحصیلِ علم کے لیے پورب کے قصبوں میں پھرے اور علمائے وقت سے درسی کتابیں پڑھیں۔ آخر میں شیخ غلام نقشبند لکھنوی کی خدمت میں زانوے ادب تہہ کیا اور بقیہ درسی کتابوں کا مطالعہ کیا اور فارغ التحصیل ہوئے۔ فاتحہ کی رسم ادا ہوئی۔ اس کے بعد ملا نظام الدین نے لکھنؤ ہی میں سکونت اختیار کی۔ تمام عمر درس و تدریس، تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھا۔ اپنے تبحرِ علمی کی وجہ سے بڑی شہرت[الف] پائی۔ ان کے بعد کے اکثر علما کا سلسلۂ تلمذ ان تک یا ان کے شاگردوں تک پہنچتا ہے۔ بعضے عالم ایسے بھی تھے جو دوسرے استادوں سے کسب علم کرتے لیکن فارغ التحصیل کی سند لینے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ شیخ عبدالرزاق[2] بانسوی کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی اور شیخ عبدالرزاق کے خلیفہ میر سید[3] اسماعیل بلگرامی سے بھی روحانی فیضان حاصل کیا تھا۔ ملا صاحب کی تصانیف میں حاشیہ شرح ہدایہ حکمت، حکیم صدر رائے شیرازی اور شرح مسلم الثبوت مشہور ہیں۔ آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ 19/ذی الحجہ 1148 کو انھیں ایک صحبت میں ملا موصوف سے نیاز حاصل کرنے کا شرف ملا تھا۔ 9/جمادی الاول روز چہار شنبہ، 1161ھ کو ملا صاحب نے رحلت فرمائی اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔[4]

قرونِ وسطیٰ کے نصاب کی کوتاہیوں کا ہم نے پہلے ضمناً ذکر کر دیا ہے۔ اس موقع پر مولانا

---

1. معارف (ستمبر 1970) ص 24۔

الف قاضی مرتضیٰ بلگرامی کی ملا صاحب سے ملاقات ہوئی تھی، قاضی صاحب لکھتے ہیں، ،، در علم و فضل ثانی نداشت، حدیقۃ الاقالیم 54

2. قصبہ محمود آباد کے باشندے تھے لیکن بانسوی کے نام سے مشہور ہوئے، چونکہ ان کی والدہ کا تعلق بانسہ کے ایک شیخ قدوائی خاندان سے تھا لہٰذا انھوں نے اپنے ننہال میں سکونت اختیار کر لی تھی، ابتدا میں نوکری کے ذریعہ کسب معاش کرتے تھے۔ بعد میں نوکری سے سبک دوش ہو کر سیر و سیاحت پر قدم رکھا۔ گجرات احمد آباد میں جا کر شاہ عبدالصمد خدا نما کے مرید ہوئے، اور روحانی منزلیں طے کیں۔ اس کے بعد وطن واپس چلے آئے اور کھیتی باڑی کے ذریعہ تحصیلِ معاش کرنے لگے۔ اس علاقے کے عوام و خواص ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ 1136ھ میں وفات پائی اور بانسہ میں دفن ہوئے۔ برائے تفصیل دیکھیے۔ ماثر الکرام 1 /ص 161-160ھ، ملفوظات رزاقی۔

3. برائے تفصیل ملاحظہ ہو ماثر الکرام 1 /ص. 232.235 تذکرہ علمائے ہند/ 23۔

4. ماثر الکرام 1 /ص 221-220، تذکرہ علمائے ہند/ .242-241، ہفت تماشا/ 172۔

عبدالحق کی رائے پیش کرنی ہے جوانھوں نے ازمنہ وسطیٰ کے نصاب کے بارے میں ظاہر کی ہے۔

"لیکن جہاں ہمیں اس زمانے کے علمی ذوق کو دیکھ کر مسرت ہوتی ہے وہاں ایک بات کا بھی افسوس ہوتا ہے۔اس زمانے کے نصاب پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جوحلقہ کچھ عرصہ پہلے علمانے کھینچ دیا تھااس سے باہر قدم رکھنا انھیں قسم تھا۔فقہ،حدیث،تفسیر،منطق وفلسفہ وعلم کلام پر سارازور تھا۔ساری طباعی اور ذہانت اسی پر ختم تھی۔یہاں تک کہ کتابیں بھی زمانہ دراز سے ایک ہی چلی آتی تھیں۔اور انھیں پر حاشیہ پر حاشیہ اور شرح پر شرح اضافہ ہوتی جاتی تھی۔علوم طبیعات وغیرہ کا تو کیا ذکر ہے۔تاریخ وجغرافیہ بھی جس میں مسلمانوں نے خاص امتیاز حاصل کیا تھا،خارج از بحث تھا۔غرض صدہا سال سے ہمارے ہاں تعلیم حالت جمود میں تھی۔" [1]

درسِ نظامی

ان تمام کوتاہیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ملا نظام الدین نے ایک نصاب تیار کیا جو درسِ نظامی، کے نام سے مشہور ہے اوراس نصاب میں درج ذیل علوم وفنون کا درس دیا جاتا تھا۔

(1) صرف: میزان، منشعب، صرف میر، پنج گنج، زبدہ، اصول اکبری، شافیہ۔

(2) نحو: نحو میر، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی۔

(3) منطق صغرا، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی مع میر سلم العلوم۔

(4) حکمت میبذی، صدرا، شمس بازغہ۔

(5) ریاضی خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس مقالۂ اول، تشریح الافلاک، رسالہ قوشجیہ، شرح چغمنی باب اول۔

(6) بلاغت مختصر معانی، مطول تاما انا قلت۔

(7) فقہ شرح وقایہ اولین، ہدایہ آخرین۔

(8) اصول فقہ نورالانوار، توضیح تلویح، مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ)

(9) کلام شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، میر زاہد، شرح مواقف۔

(10) تفسیر جلالین، بیضاوی

1۔ ماثر الکرام/(مقدمہ)1/ص 12۔

(11) حدیث مشکوٰۃ المصابیح[1]

لیکن بعض علما اور صوفیا اس عام روایت سے اتفاق نہیں رکھتے کہ یہ نصاب مولانا نظام الدین نے ترتیب دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نصاب کا ہیولا ملا فتح اللہ شیزاری[2] نے ترتیب دیا تھا۔ جس میں بعد میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور ملا نظام الدین کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا[3] چند سالوں کے بعد اس نصاب میں ذیل مضامین کا اضافہ کر دیا گیا۔

(1) ادب (2) فرائض (3) مناظرہ اور اصول حدیث اور ان کے ساتھ اس موضوع کی کتابیں شامل کر دی گئیں[4]

مگر اس نصاب میں بھی تاریخ اور جغرافیہ جیسے مضامین کو شامل نہ کیا گیا۔ علاوہ ازیں فنِ خوش نویسی دہلی کے مدارس میں ایک مضمون کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس نصاب میں اس فن کا چرچا سرے سے غائب ہے۔ بہر حال ملا نظام الدین کے بعد مدرسہ فرنگی محل میں اس نصاب پر عمل ہوتا رہا۔ ملا حسن فرنگی محلی، میر زاہد، وشرح مواقف کا درس دیا کرتے تھے۔ کرم اللہ خاں نے ملا موصوف سے ان کتابوں کا درس لیا تھا[5]

ملا نظام الدین کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت عبد العلا بحر العلوم لکھنوی کو نصیب ہوئی۔ سترہ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ابتدا میں مدرسہ فرنگی محل میں درس کا شغل کیا لیکن شیعوں کے ہاتھوں تنگ آ کر ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ پہلے شاہ جہاں پور

---

1. شیخ محمد اکرام/ رودِ کوثر، (1958) ص585۔

2. شیراز وطن اور سید النسب تھے۔ اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ تمام علوم عقلی، مثلاً حکمت، ہیئت، ہندسہ، نجوم،، رمل، حساب، طلسمات، جرِ اثقال وغیرہ پر پوری دسترس رکھتے تھے۔ علوم عقلی کی طرح علوم نقلی، حدیث تفسیر اور کلام پر بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ اکبر بادشاہ کے دور حکومت میں ہندستان وارد ہوئے۔ عضد الملک کا خطاب پایا۔ 997ھ میں کشمیر میں وفات پائی۔ منتخب التواریخ (ا۔ت) ص646-645، ماثر الکرام 1/ 236,238۔

3. برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ رودِ کوثر/ 587-586۔

4. ڈاکٹر یوسف حسین خاں Glimpses of Medieval Indian Culture- P.90

5. عماد 156۔

گئے۔ وہاں سے رام پور، اور بنگال ہوتے ہوئے مدراس پہنچے۔ وہاں سے کرنا ٹک گئے، نواب محمد علی خاں نے ان کی بڑی قدر کی اور بحر العلوم کا خطاب عنایت کیا۔ درس کے لیے ایک بڑا شان دار مدرسہ تعمیر کروایا۔ جہاں مولانا بحر العلوم اپنی وفات 1235 / 1819 تک درس وتدریس میں منہمک رہے[1] حالانکہ ملا بحر العلوم فرنگی محل چھوڑ کر چلے گئے لیکن یہ درس گاہ ان کے بعد بھی علم وادب، درس وتدریس کا مرکز بنی رہی۔ ان کے بعد ملا محمد حسن[2] فرنگی محلی، ملا ولی فرنگی محلی اور احمد حسین[3] فرنگی محلی وہاں درس وتدریس میں مشغول رہے۔ رجب علی بیگ سرور نے اس درس گاہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"فرنگی محل کا حال کیا لکھوں کہاں زبان ودست کا یارا، جو شمہ لکھتا۔ مولوی فاضل عدیم المثال ہر شخص جمیع علوم کا استاد، کتب درس ابتدا سے انتہا تک یا منقول ومعقول میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا۔ ریاضی کے ریاض سے آسمان کو زمین کر دیا۔ مولوی انوار کا پرتو فیض جہاں میں روشن، مولوی مبین دور بین، سراج انجمن مولوی ظہور اللہ سبحان اللہ[4] ایسے فقیہ محقق کہاں ہوتے ہیں یہی لوگ نادر الزماں ہوتے ہیں۔"[5]

اپنے زمانے میں علوم وفنون کا ذکر کرتے ہوئے مرزا قتیل نے لکھا ہے کہ قصبات میں علم

---

1. تذکرہ علمائے ہند/123-122، رود کوثر/591، ہفت تماشا/173 مفتی محمد رضا صاحب کے مضمون میں بحر العلوم کی وفات کا سن 1225ھ دیا ہے غالباً یہ غلطی کاتب سے سرزد ہوئی ہے۔

معارف (نومبر 70) ص357۔

2. برائے حالات ملاحظہ ہو۔ تذکرہ علمائے ہند/ 186-185۔

3. تذکرہ علمائے ہند/13۔

4. تذکرہ علمائے ہند/100-99، تاریخ اودھ 4 / 78 'عبد القادر رام پوری نے اپنے لکھنؤ کے قیام کے دوران میں مولوی موصوف سے ملاقات کی تھی۔ لکھا ہے' ایک دن مولوی ظہور اللہ صاحب کی زیارت سے بھی مشرف ہوا جو فرنگی محل (لکھنؤ) کے بزرگوں میں سے ہیں۔ اور وہاں کے معمول کے مطابق فنون مروجہ کی اصطلاحوں اور مسائل کی تعلیم دیتے تھے' وقائع عبد القادر خانی 1 / ص163۔

5. فسانہ عجائب/ص8۔

معقول کا زور تھا اور اودھ کے بعض شہر تو بغداد اور بخارا، شیراز سے بازی لے گئے تھے۔ شمس بازغہ جو علم طبیعی والٰہی کی کتاب ہے پرانے لوگوں کی تصانیف سے پہلو مارتی تھی۔" اس کے بعد مرزا قتیل نے اودھ کے بعض علما اور ان کی تصانیف کی ادبی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، مرزا قتیل کا یہ بھی بیان ہے کہ ہندستان میں علم معقول جا بجا انھیں بزرگوں کے فیض سے پھیلا،، کوئی طالب علم اور کوئی فاضل ایسا نہیں ہے جو ان کی شاگردی کے حلقے سے باہر ہو، کوئی چھ واسطوں سے اور کوئی سات واسطوں سے اور بعضے اس سے بھی کم واسطوں سے تلمذ علمی ان حضرات سے رکھتے ہیں،،[1]

مرزا قتیل کے خطوط سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہر الفصاحت، چار شربت[2] ور رقعہای قتیل بھی فارسی نصاب میں شامل کر لی گئی تھیں۔ مرزا امانی کے والد ان کتابوں کا درس دیا کرتے تھے۔ میر حیدر حسین نامی شخص جو نواب شائستہ خاں کی اولاد میں سے تھا۔ ان کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔[3]

---

1. برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ ہفت تماشا/ص 172،176۔
2. نہر الفصاحت اور چار شربت مرزا قتیل کی تصانیف ہیں۔
3. رقعات مرزا قتیل/39۔

باب ہشتم

مذہب اور اخلاق

نوابان اودھ کی زندگی

برہان الملک اور صفدر جنگ کی زندگی کا زیادہ تر وقت ملکی فتوحات اور انتظامی امور میں صرف ہوا تھا۔ لہٰذا انھیں امن وامان کی زندگی گزارنے کا بہت کم موقع ملا۔ ہم عصر مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان نوابوں کی زندگی بہت سی آلودگیوں سے پاک تھی۔ 1 لیکن ان کے جانشینوں کو ورثہ میں ملک اور ثروت اور امن وامان ملا تھا۔ اس لیے ان کے پاس عیش وعشرت کے لیے کافی وقت اور وسائل تھے۔ نواب شجاع الدولہ کو عورتوں کی صحبت بے حد پسند تھی۔ لہٰذا نواب کے لیے ایک مینا بازار کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ہرچرن داس کا بیان ہے کہ 18 رشعبان 1184ھ کو نواب موصوف اور شیر جنگ بہادر وغیرہ رمنہ کی سیر کو نکلے۔ اس موقع پر طوائفوں، بھانڈوں، دیگر رقاصوں اور موسیقاروں کے طائفے ہم رکاب تھے۔ 2 نواب کے ہمراہ نواب بیگم، نواب کی والدہ ماجدہ، بہو بیگم، بخت النسا خانم عرف نجا خانم صاحبہ محل نواب نجم الدولہ محمد اسحاق خاں نیز دوسرے

---

1 نواب صفدر جنگ کی صرف ایک منکوحہ بیوی تھی ان کے علاوہ اس کے محل میں نہ تو بیوائیں اور نہ ہی داشتائیں تھیں۔ عماد السعادت/36۔

2 چہار گلزار شجاعی/202ب

اقربا بھی تھے۔ ان مستورات نے اس بازار سے کچھ چیزیں بھی خریدیں۔ چیزوں کے فروخت کرنے کی خدمات حسین وجمیل دوشیزاؤں کے سپرد تھی۔[1]

ہرچرن داس کے بیان کے مطابق نواب شجاع الدولہ کے محل میں ''ہفت صدو چند عورات نکاحی اور متاعی تھیں''[2] ان کے علاوہ تقریباً دو ہزار کنیزیں تھیں[3] اس کے باوجود ہرچرن داس نواب کے زہدو تقویٰ کے بیان میں رطب اللسان ہے اور لکھتا ہے:

''دبے متعہ یا نکاح برعورت نظر نمی کرد و گرد شراب و مسکات نمی
گردید و اگر فروش یا نوش شراب رامی یافت گوش و بینی برید''[4]

فی الواقع نواب شجاع الدولہ جنسی تلذذات کا دل دادہ تھا اور خواہش نفسانی اور غلبۂ شہوانی کے وقت بدحواس اور مدہوش ہو جاتا تھا۔ اکثر ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ راہ میں سواری چلی جارہی ہوتی اور شہوت سے بے تاب ہو کر عورتوں کے ساتھ مباشرت کر کے نواب آگے بڑھتے تھے۔ اس وجہ سے ہمہ وقت اور ہمہ جا ان کے لیے عورتیں مہیا رکھی جاتیں تھیں۔ دن رات میں عورتوں کے ساتھ مباشرت کی نوبت دس پندرہ مرتبہ تک پہنچ جاتی تھی۔ چند کٹنیاں اس کام کے لیے مقرر تھیں کہ جابجا سے خوبصورت عورتیں تلاش کر کے نواب کے لیے لائیں، ان کی مدخولہ عورتوں کی تعداد دو ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ کثرت مباشرت کی وجہ سے امراض مزمنہ میں گرفتار رہتے تھے اور آخر کار اسی عارضے میں انتقال کیا۔[5]

1۔ چہار گلزار شجاعی/194، ب195 الف۔

2۔ چہار گلزار شجاعی/221 ب222 الف۔

3۔ چہار گلزار شجاعی/222 الف

4۔ چہار گلزار شجاعی/222 الف نیز دیکھیے تاریخ فرح بخش 11 / 121۔

5۔ تاریخ اودھ 2 / 506، ایضاً 2 / 503 ۔عماد/66 غلام علی نقوی کا بیان ہے کہ بعد میں راجا ہمت بہادر نواب موصوف کے لیے عورتیں فراہم کیا کرتا تھا۔ عماد/66 طباطبائی کا بیان ہے کہ'' عیاشی میں بجز شراب کے اور کل منہیات سے محترز تھا۔ اکثر عورتوں کی مباشرت میں راغب اور لہو ولعب میں مصروف رہتا تھا،، سیر المتاخرین (ا۔ت) 3 / 48۔

نواب شجاع الدولہ کو امرد پرستی کا بھی ذوق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہمت بہادر جب تک کم سن اور امرد رہا، نواب کے ساتھ زنانہ اطوار سے پیش آتا تھا۔ اس کے علاوہ یوسف خواجہ سرا، جو اپنے حسن میں یوسف ثانی کہلاتا تھا۔ نواب کا منظور نظر تھا۔[1]

کثرت ازدواج کی وجہ سے اولاد کی بھی کثرت تھی، بہو بیگم سے صرف آصف الدولہ پیدا ہوا تھا۔ باقی اولاد دوسری عورتوں کے بطن سے تھی[2] جارج فارسٹر کا بیان ہے کہ شجاع الدولہ جنسی اشغال میں بے حد مصروف رہتا تھا اور اس پر کسی قسم کی رکاوٹ قبول نہ کرتا تھا اور اس وجہ سے اس سے بعض مرتبہ ایسی ناشائستہ حرکات سرزد ہوتی تھیں، جو اس کے شایان شان نہ تھیں۔ مزید برآں اس کی صحت کے لیے مہلک تھیں۔ حالانکہ ان وجوہ کی بنا پر وہ لاعلاج امراض میں گرفتار ہو چکا تھا۔ لیکن وہ بڑی بے پرواہی سے عورتوں سے صحبت کرتا رہتا تھا۔ اس کے حرم کی عورتوں کی تعداد آٹھ سو کے قریب تھی جن میں منکوحہ اور غیر منکوحہ عورتیں شامل تھیں، اور ان سے پچاس بچے تولد ہوئے تھے۔[3]

نواب شجاع الدولہ کو رقص وسرود سے بھی بڑی دل چسپی تھی۔ فیض آباد میں ایک بڑی تعداد میں ایسی رقاصائیں تھیں جو نواب کے دربار سے وابستہ تھیں، بازاری عورتوں اور گانے والوں کے طائفے اس کثرت سے تھے کہ کوئی محلّہ اور کوئی کوچہ ایسا نہ تھا جہاں وہ موجود نہ ہوں۔[4] سفر اور حضر میں یہ طائفے نواب کے ہمراہ ہوتے تھے[5] پنو طوائف بڑی شہرت کی حامل تھی اور اسے نواب کی خصوصی سرپرستی حاصل تھی[6] جس زمانے میں نواب کو نواب حافظ رحمت خاں سے معرکہ کے موقع پر

---

1 تاریخ اودھ 2 / 201 "حسن پرست وامرد دوست ہم بود باامراو گر ہمت بہادر بسیار صحبت می داشت،، / 66

2 برائے تفصیل ملاحظہ ہو تاریخ اودھ 2 / 310-305۔

3 TRAVELS IN INDIA, 1,PP.213,214۔

4 تاریخ فرح بخش (انگریزی ترجمہ) 2 / 10-9۔

5 چہار گلزار شجاعی / "برائے سیر شکار منہ تشریف فرماشدہ وقریب پنج ہزار کس از قوم طوائف وبھانڈ وچونہ پزنی ودیگر سازندگان ومطربان وکاسبان درآں مجمع حاضر بودند واز تماشا کسی کی را معترض نہ بود" 203 ب

6 ایضاً / 203 ب۔

بھی نواب کے پڑاؤ میں شرفو نامی ڈومنی موجود تھی۔ اس جنگ میں فتح کی خوشی کے موقع پر شرفو نواب کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس کامیابی پر مبارک باد پیش کی۔ نواب نے فی الفور سات ہزار روپے اسے بطور انعام عطا کیے۔ شرفو نے عرض کیا کہ چکلہ کی باقی رقاصاؤں کے لیے بھی انعام عطا ہو اس پر نواب نے چار لاکھ روپے دیے کہ ان میں تقسیم کر دیا جائے۔[1]

جارج فارسٹر نے اودھ اور روہیل کھنڈ کے لوگوں سے سنا تھا کہ حافظ رحمت خاں پر فتح حاصل کرنے کے بعد نواب نے اس کے حرم کی مستورات کی عصمت دری کی تھی۔ لیکن اس سیاح نے ان کے بیانات پر غیر اعتمادی ظاہر کی ہے۔[2] اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب نواب شجاع الدولہ کو اس اتہام کا علم ہوا تو وہ شرمندگی کی وجہ سے زار و قطار رونے لگا۔[3]

نواب آصف الدولہ لہو ولعب سے شغف رکھتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ علتِ ابنہ کا شکار تھا۔[4] وہ دن رات غیر مہذب اور ہرجائی[5] ہندوؤں کی صحبت میں اٹھتا بیٹھتا تھا اور شراب کے نشے میں پوچ تفریحات میں عمل پیرا ہوتا تھا وہ ممنوع تفریحات کے شغل میں اس درجہ بے شرم اور بے دھڑک تھا کہ بازاری لوگ بھی اس کی ناشائستہ حرکات سے خوف زدہ تھے۔ اور اس کی یہ حرکات خبیثہ اتنی مشہور ہوگئی تھیں کہ قرب و جوار کے ہزاروں لوگ ان پر تبصرہ کیا کرتے تھے۔ عام طور پر ان لوگوں کی یہ رائے تھی آدم کے زمانے سے ان کے زمانے تک ہزاروں بادشاہ ہوئے لیکن ان کے بارے میں ایسی ناشائستہ حرکات کے ارتکاب کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں دستیاب نہیں ہوتا۔ کم مرتبہ اور کم عقل لوگوں، مثلاً حجام، چرواہے، قصاب، لکڑہارے، مہاوت، فراش اور چمار، میں کچھ لوگ ایسے تھے جو اس کے طفیل میں اہلِ ثروت ہو گئے تھے۔ اور بڑے فخریہ انداز میں جھالردار پالکیوں

---

1. عماد/117۔

2. TRAVELS IN INDIA , 1,P.203۔

3. TRAVELS IN INDIA 1,P.202 (فٹ نوٹ)

4. تاریخ فرح بخش،(انگریزی ترجمہ)2/ 17-18 تاریخ اودھ 3/ ''نواب قوت رجولیت سے عاری تھا،،/604

5. عماد/144، سیر المتاخرین (ا۔ت) 3/ 99۔

ہاتھیوں اور سرکاری گھوڑوں پر سوار ہو کر بازاروں میں پھرتے تھے۔ محمد فیض بخش عالمِ حیرت میں لکھتا ہے " یہ تمام واقعات اس بات کے لیے کافی ہیں کہ آسمان ٹوٹ پڑے اور زلزلہ آ جائے اور تمام زمین پانی میں دھنس جائے "۔[1]

نواب دن رات لہو ولعب، تفریحی مشاغل، تماشہ بینی، آتش بازی اور شان دار عمارتوں کی تعمیر میں مشغول رہتا تھا۔ وہ مالی اور ملکی معاملات کی طرف سے مکمل بے توجہی برتتا تھا اور مستقبل سے بالکل بے نیاز تھا[2] اور بقول خوب چند ذکا " طبع رنگین داشت وقدر رنگین طبعان می شناخت "۔[3]

ابتدائی زمانے میں نواب شراب نوشی کا مرتکب ہوتا تھا بعد میں اس شغل سے توبہ کر لی اور بھنگ پینے لگا تھا اور اس کے بعد افیون خوری اور حقہ نوشی کی طرف مائل ہو گیا تھا۔[4]

نواب موصوف کو رقص و سرود سے بھی دل چسپی تھی اور جب اس شغل میں مشغول ہوتے تو دوسرے کاموں سے بالکل بے نیاز ہو جاتے سانورا بھانڈ اور بڑی مصری وغیرہ سفر وحضر میں نواب کے ہمراہ ہوتے تھے[5] نواب کی رقص و سرود کی محفل کا ہدایت نے یوں نقشہ پیش کیا ہے۔ جو گلشن محل میں منعقد ہوئی تھی۔

ناچ اور راگ کے ایک طرف سما کر کے کہنا	دھم ایک طرف ہے ڈھلک اور ایک طرف بھگت
ایک طرفہ نزغہ شہنائی سے فرحت کے پکار	یک طرف گوش مسرت میں سواء نوبت
رقص رقاصوں کے میں رنگ کا کیا ذکر کروں	کیونکہ اندر کے اکھاڑے سے دوں نسبت[6]

1 تاریخ فرح بخش 2 / 24۔

2 تاریخ فرح بخش 2 / 103۔ نیز سیر المتاخرین (ا۔ت) 3 / 104۔

3 عیار الشعرا / 4 ب۔

4 عماد / 157 " در ابتدائے حکومت شراب بسیاری خورد و بعد چندی کہ ازاں توبہ کرد بنگ میز دلیکن با قلیاں گا ہے رغبت نداشت۔ و چند سال پیش از واقعہ ناگزیر افیون استعمال میکرد و کم کم قلیاں نیز میکشید "، نیز ملاحظہ ہو۔ تفضیح الغافلین / 61 تاریخ اودھ 3 / 273، 40،41، 349-350 دیوان مصحفی دوم / 30 ب

5 تاریخ اودھ 3 / 275 کلیات ہدایت،

روز و شب عیش کا اس محل کا کیا بولوں بیاں ☆ گرم ہوئے دل کے جسے دیکھ کے بزم عشرت ص 90۔

6 کلیات ہدایت / 91 برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ ص 300-299۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے نواب موصوف کو عورتوں سے دل چسپی نہ تھی اور ہم عصر مورخین کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ اس میں قوت رجولیت کا فقدان تھا لیکن زمانے کے دستور کے مطابق اس کے محل سرا میں لگ بھگ پانچ سو خوب صورت عورتیں جمع تھیں [1] اور ان میں سے کئی ایسی بھی تھیں کہ ان کو نواب نے حاملہ ہونے کی حالت میں اپنے زنانے محل میں داخل کر لیا تھا۔ ابو طالب لندنی کا اس سلسلے میں بیان قابل مطالعہ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''ملازم او ہرزنے بے سراپارا کہ از جائے حمل بہمر ساندور آغاز آں از دارثان اور اخودش در محل داخل می کنند وگاہے زنے حاملہ سر سواری وزیر رفتہ فریاد میکند کہ اگر باہمیں کہ فلاں وقت بملاقات تو رسیدام، وفاداری نمی کنی، امادر فرزند خود کہ در شکم من است التفات فرمائی۔ وزیر تصدیق کردہ داخل خانہ می کند،، [2]

یہ بیان مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔ ابو طالب لندنی نواب موصوف سے ناراض اور بددل تھا۔ لہٰذا اس نے نواب کے خلاف بہت کچھ زہر اگلا اور مزید برآں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نواب اس لائق نہ تھا کہ اس کو مسند نشین رکھا جائے۔ بلکہ انگریزوں کو جن کی ابو طالب کو سرپرستی حاصل تھی، صوبہ اودھ پر مکمل طور سے قبضہ کر لینا چاہیے تھا۔ کثرت ازدواج کی وجہ سے نواب کی اولاد کی کثرت تھی [3]

کہا جاتا ہے کہ کردار کے لحاظ سے نواب وزیر علی خاں بلند مرتبہ نہ رکھتا تھا۔ مسند نشینی کے بعد اس نے اپنے والد کے حرم کی پانچ چھ عورتوں کو اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا [4]

نواب سعادت علی خاں کی عیش دوستی کا ذکر انشا نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔

---

1. ایک موقع پر نواب دورے پر گیا ہوا تھا تو اس کے ہمراہ کوئی تین سو عورتیں تھیں، اور اس کا حرم وسیع تھا۔
- Twining- Travels in INDIA:P311
2. تفضیح الغافلین/135۔
3. تفضیح الغافلین/134-135۔
4. عماد السعادت/159۔

تیرے ہی مجرے میں گایا کریں سب اہل نشاط　　قول و آہنگ دو نوا ماتھا ترانہ سرگم
بھیرویں کنکلی اور بانسری اور سارنگ　　پوربی گوری یمن پرج ہیں اور جتنے نغم
راجہ اندر کے اکھاڑے میں ہو جوں پریوں کا ناچ　　در دولت پہ ہمیشہ رہے یوں ہی چھم چھم [1]

ایک مرتبہ نواب موصوف سلطان پور کے دورے پر گئے۔ اس ضلع کے تمام رقاص اور لولیاں نواب کے خیمے میں حاضر ہوئیں اور رقص و سرود کی محفل کا انعقاد عمل میں آیا۔ مرزا قتیل کا بیان ہے:

''لولیان آں ضلع ہم در لشکر آمدہ اند عجب صورتی و طرفہ
خواندنی دارند لیکن ایں قدر ہست کہ از طرز خواندن و پوشاک
لکھنؤ دیگر چیز ست صورت باختیار خداست موقوف بر شہر
نیست،، ہمہ زنہار در خواندن بلا بر سر غزلہای فقیری آرند،، [2]

نواب کو کبوتر بازی کا بھی شوق تھا۔ پرتاب گڑھ کے سفر کے دوران ان کے ہمراہ کبوتر خانہ بھی تھا[3] دربار میں پہیلیوں کا بھی چرچا ہوا کرتا تھا۔[4]

نصیر الدین حیدر کی عیاشی کا ذکر کرتے ہوئے رجب علی بیگ سرور رقم طراز ہیں ''عیش و نشاط کی طرف طبیعت جو آئی تو ایک ایک ادنیٰ کنجڑون ہفت ہزاریوں سے اعلیٰ بنائی، محمد شاہ کی گور تھرائی، ہر وقت راجہ اندر کا جلسہ رہا''۔[5]

نوابوں کی طرز زندگی کا اثر ان کے امرا نے بھی قبول کیا، نواب آصف الدولہ کے عہد کے ایک امیر مرزا جعفر کے بارے میں ابو طالب نے لکھا ہے:

''شب در ہجوم مسخرگان و ندیم پیشہ ہانشستہ تا بہ ساعت صبح استماع سرود می فرمود،، [6]

---

1. کلیات انشا/258، نیز ملاحظہ ہو دیوان مجبور/ 233-234۔ نیز دیکھیے۔ رقعات مرزا قتیل/38۔
2. رقعات مرزا قتیل/49 نیز دیکھیے۔ص 38,52۔
3. رقعات مرزا قتیل/41۔　　4. رقعات مرزا قتیل/47۔
5. فسانۂ عجائب/ص 11 نیز تاریخ اودھ 4 / 347-348,352,373۔
6. تفضیح الغافلین/128، برائے حالات ملاحظہ ہو ایضاً / 145 -116 تاریخ اودھ 4 / 90-115
قیصر التواریخ 1 / 229 ریاض الفصحا/69۔

اسی طرح حیدر بیگ خاں عیاشی کی طرف مائل تھا اور عوام کی فلاکت اور مصیبت زدگی سے فائدہ اٹھا کر اپنی شہوانی خواہشات کی تسکین کیا کرتا تھا۔ ابو طالب لندنی نے 1784-1783 میں لکھنؤ کی قحط سالی کا حال لکھا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ "علاوہ آں اکثر زنے خورد سال شیریں شمائل در آنجماعت بنظر درمی آید، فی الحال بجرم سرائے حیدر بیگ رسانید ندچنانچہ اکثر اطفال حیدر بیگ از بطن ہماں کنیزان است،، اس کے بعد عالمِ حیرت میں مصنف ہذا لکھتا ہے:

"معلوم باد کہ ہرگاہ آقا با خلق خدا ایں قدر بے مبالات باشد کہ

دریں وقت تنگ بخیال شہوت رانی افتد، چنیں کساں مصاحب گردد،،[1]

اپنی شہوانی قوت کو بڑھانے کے لیے وہ ادویات کا استعمال بھی کیا کرتا تھا۔ "در سالِ قحط زنان بسیار درخانۂ حیدر بیگ جمع آمدند، بداں سبب، وہم بمقتضائے ہفتاد سالگی در قوت بہیمی اونقصان راہ یافت، اما حرص او شدید تر شدہ، از حکیم شفائی خاں استعلاج کرد، حکیم موصوف بود کہ بیخ کاہی دادر عطر دار چینی فرو بردہ، در پان مالیدہ بروزے یک دووقت خوردہ باشد، وحیدر بیگ لنفع ازیں عمل دیدہ، بے اطلاع حکیم موصوف بکثرت کرد، ولطافت وشدت حرارت عطر دارچینی، رطوبات اصلی اورا، کہ رودادانحطاط داشت، چکانیدہ حرارت غریبہ راکہ از قبیل دق منثبت باعضا بودہ، متولد گردانید واطبادست وپائے بسیار زدند، اما سود نکردہ" اور اس نے اسی مرض میں وفات پائی[2] حیدر بیگ کی اولاد کی تعداد خاصی تھی[3]

مختار الدولہ ابتدا میں صاحب زہد وتقویٰ تھا لیکن اس نے بھی بعد میں عیش پرستی اختیار کر لی اور مے نوشی اور قمار بازی کا شغل کرنے لگا[4] نواب قاسم علی خاں[5] "درتمام عمر گرد شراب وبھنگ نگردید مگر معجون کہ درآں از قسم نشاء بنگ وغیرہ نمی بود تناول می فرمود و بمردمان مجلس ہم تقسیم می نمود[6]

1. تفضیح الغافلین/95-96
2. تفضیح الغافلین/119-120۔ 3. تفضیح الغافلین/121۔
4. متوفی 1168ھ برائے حالات دیکھیے چہار گلزار شجاعی/137 الف۔
5. تاریخ فرح بخش 11/23۔
6. متوفی 1168ھ برائے حالات دیکھیے چہار گلزار شجاعی/148 الف و ب۔

اور ہمیشہ سیر وشکار میں منہمک رہتا تھا۔[1]

جواہر علی خاں کو رقص وسرود اور دیگر تفریحی مشاغل سے بڑی دل چسپی تھی۔[2] نواب تاج الدولہ میرک حسین خاں کی بزم عیش وعشرت کا ذکر ہدایت نے ان اشعار میں کیا ہے:

سریر عیش پر بیٹھا تھا خرم تھے اس کے گرد سارے اوس کے ہمدم
مہیا وہاں سب اسباب طرب تھے وہاں حاضر سبھی اہل طرب تھے
خصوصاً علم موسیقی کا استاد بہادر خاں تھا اس میں مثل بہزاد[3]

اس دور کا ایک اور امیر جھاؤلال تھا جو فیض آباد کا باشندہ اور نیچ ذات کا تھا۔ ابتدا میں اسے مشرف بیوتات کا عہدہ ملا۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں ترقی حاصل کی اس کے عیش وعشرت کا یہ عالم تھا کہ لکھنؤ کے قیام کے دوران میں طعام کے وقت اس کے روبرو مسلمان عورتیں رقص کرتیں اور گانا گاتی تھیں[4] یہی حال ٹکیت رائے کا بھی تھا" بمباشرت جوانان صبیح الوجہ مبالغہ دارد"[5]

لیکن ان امیروں میں کچھ زاہد اور خدا ترس امیر بھی تھے مثلاً خواجہ عین الدین خاں کا یہ معمول تھا کہ شام کو ایک وسیع میدان میں ہزاروں فلاکت زدہ اور مسکین جمع ہو جاتے تھے اور

1۔ چہار گلزار شجاعی/148 الف۔

2۔ تاریخ فرح بخش 11/48,51۔

3۔ کلیات ہدایت/221,225۔

4۔ برائے حالات دیکھیے۔ تفضیح الغافلین/

14,25,26,60,89,90, 92,105, 116, 141.143. 145. 148. 157. 159. 161.

اس کا انتقال 1230ھ میں پٹنہ میں ہوا تھا۔ تاریخ اودھ 3/334۔

5۔ تفضیح الغافلین/142۔ اسی ٹکیت رائے کی ہجو میں قائم چاند پوری نے لکھا ہے:

قائم ہے مہاراج سے کیا تجھ کو شکایت ہرچند یہ کہنا تو لگے گا تجھے کڑوا
کیوں تیری طرف وہ نگہ لطف سے دیکھے ہے کون سی نسبت؟ نہ تو ہے نہ بھڑوا

خواجہ موصوف بذات خود اس جگہ جا کر اپنے ہاتھوں سے لوگوں میں زر تقسیم کرتا تھا۔ علاوہ ازیں بیواؤں' سیدوں اور فقیروں اور گوشہ نشینوں کو ماہانہ روپے بھیجا کرتا تھا۔ بہرائچ میں حضرت سالار مسعود غازی کے مزار کے قریب ایک عالی شان مسافر خانہ تعمیر کروایا تھا۔ بریلی میں عیدگاہ اور ایک اچھا باغ لاکھ لاکھ روپے صرف کر کے تیار کروایا تھا[1]

علمائے سوء بھی عیاشی کے مرض میں مبتلا تھے۔ مولوی علی اصغر بقول بعضے شاہ جہاں آباد اور بروایت دیگر نگینہ کا باشندہ اور ایک شر پسند انسان تھا۔ ہزل گوئی میں دسترس رکھتا تھا۔ 23 روپے ماہوار کی آمدنی میں گزر بسر کرتا تھا۔ میر زین العابدین نامی لڑکے سے عشق کرتا تھا، وہ لڑکا دہلی کا رہنے والا تھا۔ ذات کا کھتری تھا۔ مولوی موصوف نے اس لڑکے کو مسلمان بنالیا تھا۔ اور ہمہ وقت اس کی صحبت میں رہتا تھا۔ یہ مولانا لکھنؤ بھی پہنچے اور نواب آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے تھے[2]

محکمۂ عدالت میں زبوں حالی کا دور دورہ تھا، قاضی رشوت خور تھے۔ جس کی وجہ سے انصاف اٹھ گیا تھا۔ ابوطالب لندنی کا بیان ہے:۔ "باوجود آں کثرت وعظمت لکھنؤ (رسم) حکومت قضا وعدالت در انجا نبودہ است۔ وبدیں سبب ترک دادوستد شدہ، وہر کہ پیشتر قتش می شود تعدی بردیگرے می کند وطریق تنبیہہ ظالم منحصر دریں است کہ تاشخص مظلوم خود از جان گزشتہ بطلب انتقام درآید، وتا یکے از اقوائے شہر حمایت دے نماید وقاضی غلام مصطفیٰ وغلام حضرت مفتی، وبسیارے از علمائے اعلام کہ مردم کامل تمام عیار واز دیگر دیار در انجا بسیار اند، ازبیم استہزاد وتمسخر اہلکاران وزیر ہموار گوشہ نشین مانند"[3]

میر حسن دہلوی نے اپنے ایک مشفق مہربان میاں اسرار کی مجلسِ رقص وسرود کا اپنے انداز میں یوں ذکر کیا ہے:

---

1. تاریخ سعادت جاوید/ 408,411۔

2. برائے تفصیل ملاحظہ ہو، عماد/ 139۔

3. برائے تفصیل دیکھیے۔ تفضیح الغافلین/ص 88,89,91' اس سے قبل یہ محکمہ بھوانی سنگھ راجہ سے متعلق تھا۔ اور بعد میں اس جیسے لوگوں کی نگرانی میں تھا۔ ایضاً/ 88۔

میاں اسرار کے بنگلے کا عالم　　نہ تھا بنگلے سے فیض آباد کے کم
انھوں نے بسکہ تھا اک نقش مارا　　وہاں ہوتا تھا پریوں کا گزارا
سحر سے شام تک رہتا یہی حال　　دکھاتا قرعہ کوئی اور کوئی فال
انھوں کے پاس سب جمع کو آکر　　عطائی جی کو خوش کرتے تھے گاکر
انھوں کی چونپ پر کبھی تھے آتے　　کچھ ان سے سنتے اور اپنا سناتے
طنبورے لے کے مرزائی ومرزا　　سبھی لگتے تھے گانے بے محابا
اگرچہ تھے تو کہنے کو عطائی　　ولے کبھی سے تھی حکمت اڑائی
طنبوروں کی وہ تانوں کا گرجنا　　پکھاوج کا اوران کے ساتھ بجنا
عطائی بھی ہر اک لیتا تھا وہ تان　　کہ جس سے بوعلی سینا ہو حیران
غرض چرچے میں وہاں کٹتی تھی اوقات　　عجب صحبت تھی وہ ہیہات ہیہات[1]

قلندر بخش جرأت نے ایک زاہد کی ہجو لکھی ہے جس میں اسے ریاکاری، بادہ نوشی اور نفسانی تلذذات کا گرویدہ بتایا ہے[2]

خواجہ حسن مودودی معروف بہ خواجہ کمہاری کی رقص وسرود کی دل چسپی کا بھی جرأت نے ذکر کیا ہے وہ بخشی نامی ایک طوائف سے عشق کرتے تھے اور اپنے ہر مقطع میں ''بخشی'' کا نام استعمال کرتے تھے۔ جرأت نے حسن وبخشی کے معاشقے کی داستان بھی لکھی ہے۔ یہ اودھ کے ممتاز صوفیا میں تھے[3]

نہایت تھا سرود و رقص کا شوق　　اسے دیکھنے سننے کا تھا ذوق
جو مطرب خوب رو تھے اوس نگر میں　　نہ تھا پنہاں کوئی سب تھے نظر میں
کبھی جاتے کبھی ان کو بلاتے　　وہ آکر ناچتے گاتے بجاتے

1　مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی (نول کشور 1945) ص۔168-69۔

2　کلیات جرأت ر 451 'الف وب دیوان میر حسن (سبحان اللہ کلکشن)

اون کو بھی ان بتوں نے اب رام کرلیا　　جو بچ رہے تھے زاہد ان سے خدا خدا کر

3　ان کے ملفوظات کا قلمی نسخہ علی گڑھ میں ہے اس کی تفصیل بربان مارچ، اپریل 1971) میں ملے گی۔

سدا تھی خوبرویوں سے ملاقات   کہوں کیا کچھ عجب کٹتے تھے اوقات[1]

عوام کی عیش پرستی

نوابین اور امیروں کی زندگی کا اثر عوام پر پڑا کیونکہ صوبہ اودھ تباہی و بربادی سے محفوظ تھا۔ اس علاقے تک مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں اور ابدالیوں کے تباہ کن قدم نہ پہنچ سکے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ قدرت نے اس علاقے کو بہت سے مصائب سے محفوظ کر دیا تھا۔ اس وجہ سے اودھ کا علاقہ اپنی فارغ البالی اور ثروت کے لیے اٹھارھویں صدی میں مشہور تھا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں دہلی سے ہر فن کے لوگوں نے فیض آباد اور بعد میں لکھنؤ کا رخ کیا۔ انشا اللہ خاں انشا کا بیان ہے:

''یہی حضرات جنھوں نے لکھنؤ میں حسب دل خواہ روپیہ میسر آنے کی وجہ سے چند دل پسند ایجادیں کی ہیں اگر شاہ جہاں آباد میں رہتے اور فارغ البالی ملتی تو وہاں بھی اپنی قوت ایجاد کو ظاہر کرتے۔ ان کا یہ کہنا کہ لکھنؤ کی کسبیوں کو جو شوخ ادائی، راگ اور پوشاک خدا نے بخشی ہے، وہ شاہ جہاں آباد کی عورتوں کو نصیب نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں دہلی کے اس قدر صاحب سلیقہ زن و مرد ٹوٹ پڑے کہ دہلی خالی ہوگئی چونکہ سپاہی اور مصاحب پیشہ، لطیفہ گو اور نقال، گانے بجانے والے، اور قصہ خواں جو لکھنؤ میں ہیں، سب دہلی سے آئے ہوئے ہیں''[2]

ایسی صورت میں لکھنؤ کے معاشرے کی امتیازی خصوصیات عیش پرستی۔[3] تفریح بازی اور قمار بازی[4] تھیں۔ رقص و سرود کی محفلوں کا انعقاد ہر تقریب کا لازمی جز و سمجھا جاتا تھا۔

1۔ کلیاتِ جرأت 468،472۔الف

2۔ دریائے لطافت (ا۔ص 117-116، نیز دیکھیے عماد/144 کلیات جرأت/468الف۔

3۔ کلیات انشا۔

ہزاروں دیوں کو، یہاں کی پریوں نے پچھاڑا ہے
نہیں لکھنؤ اک راجہ اندر کا اکھاڑا ہے /ص 207

عیش و عشرت سے ہے سدا دم ساز ☆ پیر ہو کوئی یا جواں ہووے۔ کلیات سودا/214۔

4۔ رقعات مرزا قتیل' باقر بیگ را در تنہائی بجای خود از طرف من باید فہمانید کہ قمار را کہ بباز د/75۔

پتنگ بازی، بٹیر بازی اور دیگر کھیل تماشے اپنی ترقی کے لحاظ سے نقطۂ کمال کو پہنچ گئے تھے۔ عوام اس عیش پرستی کے مسموم اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے اور ان میں ہر قسم کی اخلاقی کمزوریاں سرایت کر گئیں۔ غلام علی نقوی کا بیان ہے:

''در ہر خانہ از خانہائے ہنود بے محل رقص و سرود منعقد بود، و در اماکن مسلمانان گاہ گاہی ایں جلسہ و اکثر مرغ بازی و پودنہ بازی در یک روز دہ دہ ہزار روپیہ یکی می یافت و یکے می برد،،[1]

مرزا قتیل جیسا قلندر مشرب شخص بھی رقص و سرود کی محفلوں میں شرکت کرتا تھا۔ رقعات قتیل میں ایسی مجالس کا اکثر ذکر ملتا ہے۔ جن میں مرزا مذکور شریک ہوئے تھے۔ ایک محفل کا ذکر کرتے ہوئے موسیقاروں اور رقاصاؤں اور امردوں کے رقص و سرود پر تنقید کی ہے۔ اس نے لکھا ہے:

''در کوٹھی بودم، شش طائفہ، زنان و یک طائفہ مردانہ بود و محبوب شاہ حسینی را کسل طبیعت رخصت حرکت نداد ہمیں طائفہائے بیرنگ و بدگلو بودند الا جادی کہ خواندنش سحر حلال ست دمے چند مجلس را گرم کردہ بود، لیکن ایں در چہ حساب اند فرحت اللہ خانہ خراب آتشی بارید کہ بہزار آب قلزم فرونمی تواند نشست۔ جائے شما خالی بچہ خوبی چند ساعت گزشتہ است۔ من و مرزا حاجی در مکان جداگانہ از مجلس نشستہ مزۂ خود را حاصل کردیم،،[2]

لکھنؤ میں امردوں کے رقص کا بھی عام رواج تھا۔ ہندستان میں کتھک نامی ہندوؤں کا ایک فرقہ پایا جاتا تھا جس کے لڑکوں کو رقص و سرود کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور دولت مندوں اور بازاروں میں انھیں نچوا کر تحصیل دولت کی جاتی تھی۔ مرزا قتیل نے ایسی مجلسوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''امیروں کی مجلسوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کا یہ معمول ہے کہ چند لوگ ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ان لڑکوں کو ناچنے کے لیے مامور کرتے ہیں۔ رقص کی حالت میں ان میں سے ایک شخص جب اپنی جیب سے ایک پیسہ یا ایک روپیہ نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہے تو مجمع کے دوسرے لوگ بھی یہ عمل دیکھ کر ان میں سے اسے حسب حیثیت کچھ نہ کچھ دیتے ہیں،،

1۔ عماد/144۔

2۔ رقعات مرزا قتیل/23۔

مسلمانوں کا شریف النسب طبقہ اس قسم کے رقص وسرود میں شرکت سے پرہیز کرتا تھا لیکن رذیل پیشہ مسلمان ایسی مجالس کے لیے بڑا اہتمام کرتے تھے، مثلاً بعضے چناری، بازاری اور دہقانی جو قصبات اور دیہات میں سکونت رکھتے تھے، اور ملکیوں کے نام سے موسوم تھے، اس فرقے کے لوگ لڑکوں کے ناچ کے عاشق ہوتے تھے۔ اگر کسی عزیز کے وہ کسی تقریب کے سلسلے میں طوائف کے رقص کی خبر سنیں تو وہاں نہیں جاتے، چاہے ان کو مدعو ہی کیوں نہ کیا گیا ہو، اور کوئی نہ کوئی عذر پیش کر دیتے تھے لیکن اگر کسی سے سن لیں کہ فلاں بازار میں، یا فلاں دکان کے سامنے کسی ہندو یا مسلمان لڑکے کا ناچ ہو رہا ہے تو کچھ لوگ جمع ہو کر بڑی خوش دلی سے وہاں جائیں گے چاہے راستہ میں کیچڑ پانی اور شدید بارش ہی کیوں نہ ہو۔[1]

فیض آباد کے بازار میں لونڈوں کے رقص کا ذکر کرتے ہوئے میر حسن نے لکھا ہے:

کہیں بن ٹھن کے لونڈے ہی کھڑے ہیں — انھوں کے گرد عاشق جا اڑے ہیں
کھڑا کوئی کہیں پونگی بجادے — کوئی لونڈے کو آگے سے نچادے[2]

عرسوں، میلے ٹھیلوں اور دیگر تقریبات کے موقعوں پر بھی رقص امارد کا اہتمام ہوتا تھا۔ سعادت یار خاں رنگین نے لکھا ہے کہ الہ آباد کے قیام کے دوران میں پنج شنبہ کو وہ ایک درگاہ میں زیارت کی غرض سے گئے۔ وہاں ایک لڑکا رقص کر رہا تھا، اور مصحفی کا یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

گل کھا موئے تھے جن کے لیے جسم زار پر — دو پھول بھی نہ لائے کبھی وہ مزار پر[3]

اس عہد کے لکھنؤ کے شعرا کے کلام میں رقص امارد کے سلسلے میں اشعار ملتے ہیں۔

میر حسن

کیا دل میرا اس مطرب پسر نے
عجب حرفت سے گا کر چھند پر بند[4]

---

1. ہفت تماشا (ا۔ت) 79-80۔
2. مجموعہ مثنویات میر حسن/152۔
3. مجالس رنگین/ 47۔
4. دیوان میر حسن (سبحان اللہ کلیکشن علی گڑھ)

شاہ کمال

کہیں لونڈے کھٹک کے ہیں گا رہے
روٹھا ہاتھ ہیں بھاؤ بتلا رہے[1]

امرد پرستی کی وبا بھی عام تھی، میر حسن دہلوی نے اس وبا کا یوں ذکر کیا ہے:

زبس افراط ہے یہاں بھیڑیوں کا سدا دھڑکا ہے یوسف طلعتوں کا
رکھے ہے جو کوئی فرزند اطفال ہوا ہے اس کو رہنا یہاں کا جنجال
سحر تک شام سے رہتا ہے دھڑکا مبادا بھیڑیا لے جائے لڑکا
بھلا اس طرح سے آرام کد ہو رہے یہاں وہ جو لاولد ہو[2]

غلام علی نقوی نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

''از کثرت لولیہا وتمول شان کہ از سبب اولاد ہنود و مسلمانان
در ہر کوچہ سامان جشن یافتہ می شد،''[3]

مرزا میر ناصر[4] کے تذکرہ میں مصحفی نے لکھا ہے:

''قضائے کار روز مشاعرہ ارادۂ آمدن مشاعرہ کردہ از خانۂ
خود رواں شدہ بود کہ در اثنائے راہ بابت کودکی حسین بہ پیادہ ہائے چوکی

---

1. دیوان شاہ کمال/855 ڈونالڈ کیمپل نے 1784 میں ہندستان کے اپنے سفر کے دوران میں محسوس کیا تھا کہ اس ملک سے طوائفوں کے رقص کا رواج اٹھتا جا رہا تھا اور عوام کو امردوں کے رقص سے دل چسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ ملاحظہ ہو۔

A Journey over land to INDIA (London-1796) Part III.P125.

-George LLOYD NARRATIVE of A Journey etc. (London.1840),J 1 94-97

2. مجموعہ مثنویات میر حسن/144 ہدایت نے اختلاف زمانہ کے نام سے 64 بند کی ایک نظم لکھی ہے جس میں لکھنؤ کی عام بداخلاقیوں کا ذکر کیا ہے۔ کلیات ہدایت/275، مابعد۔

3. عماد/144۔

4. یہ واقعہ 1230ھ میں پیش آیا تھا۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو، ریاض الفصحا/323۔

مناظرہ درمیان آمد حتیٰ کہ نوبت بکشت وخون رسید، آخر بزخمِ شمشیر زندگی راجواب داد،[1]

محمد فیض بخش نے نوابان اودھ کی عیش پرستی اور اس کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شاہی افواج کے سوار و پیادے بلا کسی خوف وخطر کے تلذذات نفسانی میں ملوث ہوتے تھے۔[2] جارج فارسٹر نے ایک افغان کی طوائف بازی اور عیش دوستی کا تفصیلی حال چشم دید مشاہدہ کی بنا پر لکھا ہے جو اس کا ہم سفر تھا۔ اور لکھنؤ سے واپس اپنے وطن کو آرہا تھا۔ اس افغان نے اپنی ملکیت کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں طوائف بازی اور شراب نوشی کی نذر کر دیا تھا، آخر کار وہ بے حد شراب نوشی کا مرتکب ہونے لگا تھا۔ ڈھائی گھنٹے کے وقفہ میں اس نے دو بوتلیں خالی کر دیں۔ جارج فارسٹر بڑی حیرت سے اس کے اس فعل کا مشاہدہ کرتا رہا۔ اس کے بیان کے مطابق وہ شراب اتنی سخت تھی کہ صرف ہاتھی کے لیے ہی مناسب تھی۔ اس عیاش مسلمان کے ساتھ ایک زنِ رقاصہ بھی تھی، جو بدنما لباس پہنے ہوئے تھی، اور اس کے کئی دانت ٹوٹ چکے تھے، وہ رقاصہ اس کے سامنے رقص کر رہی تھی اور حافظ شیرازی کی غزلیں گا رہی تھی مگر اس کی آواز بڑی کرخت تھی، بانگر مئو کے مقام پر پہونچنے کے بعد اس افغان نے ان سب پیسوں کی شراب خرید لی۔ جو اس کے پاس بچ رہے تھے، اور ایک خاندانی رکابی بھی تین روپے میں فروخت کر دی۔ اس شام اس نے چھک کر شراب پی اس موقع پر اس نے وہاں کی ایک رقاصہ کو بلایا اور اسے ڈیڑھ روپیہ دے کر اس کا کافی رقص دیکھا۔[3]

مہجور نے اپنے ایک شعر میں یہ بتایا کہ باپ بیٹے ایک ہی طوائف کے ہاں خفیہ طور پر آمد ورفت رکھتے تھے۔

کرتے تھے رنڈی بازیاں وہ ہم نشین ☆ دونوں آپس میں خفیہ بہت کم وبیش[4]

جرأت نے ایک فاحشہ عورت کی ہجو لکھی ہے اور اس میں ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو اس کے

---

1. ریاض الفصحا ص/323۔
2. تاریخ فرح بخش/ (انگریزی) 2/ص10۔
3. TRAVELS IN INDIA,1/P.104.۔
4. برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ دیوان مہجور/ 14-13۔

ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے تھے[1] لکھنؤ اور فیض آباد میں بالخصوص اور اودھ کے دوسرے شہروں میں بالعموم زنا کا رواج پایا جاتا تھا، مرزا قتیل نے اس موضوع پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ بعض عورتیں، کشمیری عورتوں کے فیض صحبت سے جو امیروں کے گھروں میں آتی جاتی تھیں۔ بہت سے فوائد کی امید میں ان امیروں کے گھروں میں آمد و رفت شروع کر دیتی تھیں اور بعض گھروں میں لولیوں کے ذریعہ آنے جانے کی راہ کھل جاتی تھی۔ بعض امیر زادے اور شرفا عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب بھی پیتے تھے اور امیروں کے گھروں میں اکثر لونڈیوں کی اولادیں ہوتی تھیں۔ بعض خالائیں اپنی بھانجیوں کو اور بعض پھوپھیاں اپنی بھتیجیوں کو طالبوں کے پاس پہنچا کر خوب روپیہ بناتی تھیں اور کبھی مائیں خود اپنی بیٹیوں کو زرنقد کے لالچ میں آدھی رات کو کسی بزرگ کی قبر کی زیارت کے بہانے یا کسی اور حیلے سے عشاق کے پہلو میں سلادیتی تھیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مشائخ شہر یا ان کے خلیفہ طالب اور مطلوب کا ہاتھ پکڑ لیتے تھے۔ یعنی دونوں کو اپنا مرید بنا لیتے اور پھر ان دونوں دینی بھائی اور دینی بہن کو اپنے جدِ امجد کے عرس کے دن اپنے گھر بلا کر حضرت مقرب درگاہ الٰہی کے حجرۂ عبادت کو شاہی ''عیش محل'' کے لیے بھی باعثِ رشک بنا دیتے تھے[2]

شراب نوشی کے علاوہ افیون خوری، چرس اور گانجا پینے کی لت بھی عوام میں پائی جاتی تھی۔ مہجور نے ایک افیونی کا قصہ بیان کیا ہے۔ مطلع یہ ہے:

قاعدہ افیون کا ہے اے دوستو　　قبض کرتی ہے اسے کھاتا ہے جو[3]

فیض آباد کے بازار کے عام منظر کو پیش کرتے ہوئے میر حسن دہلوی چرس اور گانجا پینے والوں کا یوں ذکر کرتے ہیں:

کہیں ککڑ کوئی پیتا ہے باہم　　لگاتا ہے چرس کا ہی کوئی دم[4]

میلے ٹھیلوں میں مرد اور عورتیں شرکت کرتیں اور ان موقعوں پر وہ اپنے ہر قسم کے جنسی جذبات

---

1 کلیات جرأت/451ب

2 برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ ہفت تماشا (ا۔ت) 163،166۔

3 دیوان مہجور/11۔

4 مجموعہ مثنویات میر حسن/152۔

کی تسکین کرتے تھے۔ انھی اغراض و مقاصد کو لے کر وہ لوگ ان جگہوں پر جاتے تھے۔ انشا اپنے ایک شعر میں میلوں میں عورتوں کی شرکت کا ذکر کرتا ہے:

کچھ نہیں معلوم پوچھو کون سا میلا ہے آج ☆ جاتیاں ہیں جو کھچا کھچ ڈولیوں پر ڈولیاں[1]

اسی طرح عاشورۂ محرم میں امام باڑوں میں مجالس مرثیہ خوانی منعقد ہوتیں۔ عورتیں اور مردان میں شریک ہوتے۔ ان موقعوں پر طالب اور مطلوب کو اپنی جنسی خواہشات کو پورا کرنے کا سنہرا موقع ہاتھ آجاتا تھا۔[2]

لکھنؤ اور فیض آباد کی معاشرت میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی تھی کیونکہ اودھ کی حکومت کا پہلا دارالخلافہ فیض آباد ہی تھا اور پھر آصف الدولہ کے زمانے میں معاشرت کی جو بساط وہاں سے اٹھی، وہ اسی انداز اور طرز سے لکھنؤ میں بچھائی گئی۔ میر حسن دہلوی نے اپنی مثنوی گلزار ارم میں فیض آباد کی معاشرت کا بہت دل چسپ نقشہ پیش کیا ہے:

چلا میں وہاں سے اپنا دل اٹھا کر ☆ کہ کیجیے سیر فیض آباد جا کر
کھلا جنت کا دروازہ نظر میں ☆ جو نہی داخل ہوا میں اس نگر میں
مثلِ گل ہر اک دل شاد پایا ☆ عجب معمورۂ آباد پایا
اِرمؔ جس کے حسد سے داغ دیکھا ☆ وہ انگوری وہ موتی باغ دیکھا
کہ جس نے عرش کی خوبی اٹھالی ☆ عمارت شہر کی دیکھی وہ عالی
بیاض جدولی ہو جیسے سادہ ☆ کھلا بازار اور رستے کشادہ
لڑی موتی کی ہو جیسے نموودار ☆ دورستہ اہل حرفہ اور دکاندار
شب راحت کا دن کو حظ اٹھاوے ☆ جو کوئی شام کو واں چوک جاوے[3]

اس کے بعد میر حسن نے فیض آباد کے بازار کا نقشہ پیش کیا ہے جو اپنی دل چسپی کے علاوہ، فیض آباد کی معاشرت کا بھی بہترین مرقع ہے۔

1. کلیات انشا/201۔
2. ہدایت المومنین/(قلمی) ص 15-14۔
3. مجموعہ مثنویات میر حسن۔ ص 147-146۔

کہیں بن ٹھن کے لونڈے ہی کھڑے ہیں | انھوں کے گرد عاشق جا اڑے ہیں
کہیں ہیں رنڈیاں ہی ماہ پارہ | انھوں کا کرتا ہے کوئی نظارہ
پھریں کتھرانیاں سنتوں کے ہمراہ | کہیں ہندو بچے پھرتے پھریں آہ
کہیں لکڑ کوئی پیتا ہے باہم | لگاتا ہے چرس کا ہی کوئی دم
رزالے طوطیاں لے ہاتھ اپنے | جدی پھرتے ہیں لے کر ساتھ اپنے
کوئی سیٹی سی زیں چہ چہ کرے ہے | کوئی دم منھ سے طوطی کا بھرے ہے
ضلع بولے ہے کوئی کوئی پھکو | کہیں ٹھٹا کہیں ہے دھول تھپڑ
کہیں سکھیاں کہیں کھنڈ اور جگت ہے | اِدھر ہے سانگ اور اُدھر کسنکت ہے
کھڑا کوئی کہیں پونگی بجاوے | کوئی لونڈے کو آگے سے نچاوے
روا بیچے کوئی کوئی کرے کھیل | لیے بیٹھا ہے سانڈے کا کوئی تیل
کوئی کھولے کتابیں مورتوں کو | دکھاوے نیک وبد کی صورتوں کو
زبس ہے عیش وعشرت کا وہاں ماٹھ | کہیں ناچیں ہیں کشمیری کہیں بھانڈ
کبوتر کے کہیں شوقین ہیں جمع | کہ جوں پروانے ہو ویں برسر شمع
غرض موجود ہے سب جنس دنیا | کہیں بلبل کہیں ہے لال منیا
کہیں انڈے پچک اور سرلڑے ہیں | ید بیضا لیے مہ رو کھڑے ہیں
فقط نوروز پر کیا برس کے برس | اسی تفسیر بیضاوی کا ہے درس
کسی کا کوئی وہاں مانع نہیں ہے | کہیں ہے نقل اور قصا کہیں ہے
بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد | کسے را با کسے کارے نہ باشد[1]

اٹھارھویں صدی کی دنیائے اسلام میں مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت کا ہم مختصراً جائزہ پہلے حصے میں لے چکے ہیں۔ یہاں اعادہ لاحاصل ہوگا۔ اودھ کا علاقہ ان مذہبی اور اخلاقی حالات میں کوئی مستثنیٰ نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ یہاں کے معاشرے میں بھی وہ سب خرابیاں موجود تھیں، جن کا مطالعہ ہم دہلی کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ صرف فرق اتنا ہے کہ

1۔ مجموعہ مثنویات میر حسن۔ ص153-151 نیز ملاحظہ ہو ص153 تا165۔ نیز تاریخ فرح بخش۔

اودھ میں ایک آزاد اور مطلق العنان حکومت کے قیام سے شیعی عقائد کا فروغ ہوا جس کا اختصار سے یہاں جائزہ لیا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے مذکور ہوا سعادت خاں برہان الملک نیشاپوری ایرانی النسل تھا اور اس لحاظ سے اثنا عشری مذہب کا پیرو تھا۔ شاہ اسمٰعیل صفوی (جلوس 907 / 1501) نے مذہب اثنا عشری کی ترویج و اشاعت میں بڑی گرم جوشی سے کام لیا اور بابر کو بھی اس کے زیر اثر اور نامساعد حالات میں شیعی عقائد اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ بعد میں ہمایوں نے بھی اثنا عشری عقائد اپنا لیے تھے۔ شاہ اسمٰعیل کے جانشین شاہ طہماسپ کو اہلِ بیت کرام سے بڑی عقیدت تھی اور اس بنا پر بادشاہ کی فرمائش پر محتشم کاشی نے اپنا مشہور ہفت بند لکھا جس سے ایرانی ادب میں مراثی امام حسین کی ادبی حیثیت کی ابتدا ہوتی ہے۔[1]

ایران کا یہ رنگ جہانگیر کے زمانے میں ہندستان پہونچا اور نور جہاں کی سرپرستی میں اثنا عشری عقائد کو تقویت حاصل ہوئی۔ اورنگ زیب[الف] کے مابعد کے زمانے میں[2] شیعی عقائد کو اس وجہ سے ترقی حاصل ہوئی کہ سادات بارہہ کو سیاسی اقتدار حاصل تھا۔ اور بعد میں نجف خاں نے ان عقائد کی اشاعت میں بڑا کام کیا۔ ان حالات نے دہلی کی سماجی اور مذہبی زندگی کو بہت متاثر کیا تھا۔ شیعہ امرا نے بالخصوص اور دوسرے شیعہ حضرات نے بالعموم سنی علما پر بڑے مظالم توڑے اور سنی مسلمانوں میں خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا۔ مجبوراً بہتوں نے اثنا عشری عقائد اپنا لیے تھے۔ نواب نجف خان کی امیر الامرائی کے زمانے میں مصحفی دہلی پہنچے لوگوں میں اتنا خوف و ہراس تھا کہ انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ خود لکھتے ہیں۔

''دوازدہ سال در شاہ جہاں آباد بہ دور نواب نجف خاں مرحوم بگوشہ عزلت گزیدہ،،[3]

---

1. لکھنؤ کا دبستانِ شاعری (لاہور 1955) ص 28۔

الف اورنگ زیب کے زیادہ تر افسران شیعی فرقے کے تھے۔

2. MEMOIRS, 1,P.146-147,152

MEMOIRS, 1.P.164,166.

3. تذکرہ ہندی / 248۔

یہاں تک کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اثنا عشری مذہب اختیار کر لیا تھا۔ مرزا مظہر جان جانان کو شہید کیا گیا[1] شاہ عبدالعزیز کے چھپکلی کا ابٹن ملوایا گیا،[2] اور شاہ فخر الدین دہلوی کے قتل کی فکر میں لگے رہے۔[3]

سعادت خاں برہان الملک کے ساتھ اثنا عشری عقائد اودھ کی سرزمین میں پہنچے، اس نے اور اس کے جانشینوں نے اثنا عشری مذہب کی اشاعت و ترویج میں حتی الامکان کوشش کی[4] اور نواب سعادت خاں کے زیر اثر بہت سے سنی مسلمانوں نے شیعی مذہب اختیار کیا۔ مثلاً مدار الدولہ میر یوسف کے آبا و اجداد سنی عقائد کے پیروکار تھے لیکن "در ہندستان چوں صحبت نواب برہان الملک دریافت بمذہب اثنا عشری میل نمود لیکن باکمال اخفاو مدار الدولہ ہرگز اخفای مذہب کہ در اثنا عشری تقیہ ہمتیست بخاطر ندارد باعلان تمام تعزیہ داری میکر دومی کند،"[5]

اس کوشش میں نواب سعادت خاں اور نواب صفدر جنگ نے سنی علما کو نان شبینہ تک سے محتاج کر دیا۔ ان کی جاگیریں چھین لیں، وظائف سے محروم کر دیا اور علمی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں۔[6] سری واستو نے لکھا ہے کہ نواب سعادت خاں سنی مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں پر زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ اور انھیں اعلیٰ عہدے دیتا تھا۔ آگرہ کی گورنری کے زمانے میں اس نے نیل کنٹھ ناگر کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ ہنڈون اور بیانہ کی تقرری کے زمانے میں اس کا دیوان مالیات آتما رام تھا۔ اس طرح اس نواب کے دورِ حکومت میں سنی مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں اور شیعوں کو ہی اعلیٰ عہدے عطا ہوئے[7] اور یہی حال نواب صفدر جنگ کا تھا۔ اس نے اپنے زمانے میں نول رائے

---

1. تذکرہ گلشن ہند/ص 217۔ عقد ثریا/55 سفینۂ ہندی/ص 187 معمولات مظہریہ/ص 141-140۔
2. تاریخ مشائخ چشت/ص 363،367۔
3. مناقب فخریہ/55۔
4. لکھنؤ کا دبستان شاعری۔ ص 28 تاریخ سعادت جاوید، ص 307۔
5. عماد/126۔
6. برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ ماثر الکرام (دفتر اول) ص 221،223۔
7. برائے تفصیل دیکھیے۔ First Two Nawabs of Oudh: P.79 ۔

کو اپنا نائب اعلیٰ مقرر کیا تھا۔[1]

نواب صفدر جنگ نے شیعہ علما کی سرپرستی کی اور ہر طرح سے انھیں اعزاز بخشا اور اس طرح شیعی عقائد کی اشاعت اور ترویج کا کام کیا۔[2]

نواب شجاع الدولہ سادات کے ساتھ بڑی عقیدت سے پیش آتا تھا اور انھیں خوب عطیات دیتا تھا، ہرچرن داس کا بیان ہے:-

''اکثر اوقات نواب شجاع الدولہ زری بطریق نیاز حضرات بنابر سادات بہ حکیم معالج خاں پسر مقرب خاں حکیم میداد۔ میگفت کہ ایں زر را بہ سادات برساں،،[3]

نواب بڑے اہتمام سے تعزیہ داری کرتا تھا اور بسا اوقات بذاتِ خود تابوت اپنے کاندھے پر اٹھا کر امام باڑہ تک لے جاتا تھا۔ 1181 ھ کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ہرچرن داس رقم طراز ہے:-

''نواب تعزیہ امام حسن و حسین گرفت و تعزیہ خانہ بہ تمام جلوس و شوکت استادہ کرد و نذر و نیاز بہ سادات و خیرات بمردماں فقرا بسیار داد،،[4]

ایام محرم میں نواب سیاہ لباس زیب تن کرتا تھا اور ماتم اور عزاداری کے تمام مراسم جزوی و کلی ادا کرتا تھا۔[5] سفر و حضر دونوں موقعوں میں ان مراسم کی ادائیگی میں کسی قسم کا فتور نہ آنے دیتا تھا یہاں تک کہ میدان جنگ میں بھی مراسم عزا ادا کرتا تھا۔ پانی پت کی تیسری جنگ (1762) کے موقع پر بھی میدان جنگ میں اس نے تعزیہ داری کے رسوم ادا کیے تھے۔[6] روہیلوں اور نواب شجاع الدولہ کے مابین جنگ کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ روہیلہ سنی عقائد کے

---

1. عماد/224۔
2. عماد/25۔ سیر المتاخرین (انگریزی ترجمہ) 11/ 615,618۔ 111/ 878۔
3. چہار گلزار شجاعی/202ب
4. چہار گلزار شجاعی/ص192الف
5. عماد/83۔
6. تاریخ اودھ 2/ص56۔

پیرو کار اور طاقتور رہتے تھے۔نواب ان کی ترقی کو ایک آنکھ نہ دیکھ سکتا تھا۔اس نے جب تک ان کا قلع قمع نہ کر دیا، اسے چین نہ آیا۔

اپنے اسلاف کی پیروی کرتے ہوئے آصف الدولہ نے بھی مذہب اثنا عشری کی ترویج واشاعت میں حتی الامکان کوششیں کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اودھ کے بیشتر علاقوں میں اس زمانے میں عقائد اثنا عشری نے جڑ پکڑ لی۔ مولف گلِ رعنا کا بیان ہے:

''نواب آصف الدولہ کے زمانے کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لہو ولعب میں مشغول ہونے کے ساتھ مذہب تشیع کی اشاعت میں انھوں نے دل سے کوشش کی۔ ان کے نائب حسن رضا خاں بھی مذہبی آدمی تھے، وہ بھی اسی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ان کی کوشش سے ہزاروں خاندان سنی سے شیعہ ہو گئے اور ان کو جاگیریں ملیں، جو اپنی ضد پر قائم رہے، ان کی جاگیریں جو شاہانِ مغلیہ کے وقت سے چلی آتی تھیں، ضبط کر لی گئیں۔ شاہ علی اکبر چشتی مودودی[1] کے مشورہ اور ملا محمد علی فیض آبادی کی تحریک سے نواب حسن رضا خاں نے جمعہ اور جماعت قائم کر کے سب سے پہلے مولوی سید دلدار علی نصیر آبادی[2] کی اقتدا میں 13 / رجب 1200ھ کو نماز ادا کی۔ یہ پہلا دن تھا کہ وسط ہند میں شیعوں نے اپنی جمعہ کی جماعت کی نماز علاحدہ کر لی۔ نائب امام کی

---

1 وہ سلسلۂ چشتیہ کے شیخ طریقت تھے۔ سرفراز الدولہ حسن رضا خاں اور نواب آصف الدولہ دونوں خواجہ مودودی کا بڑا ادب ولحاظ کرتے تھے۔ معارف (ماہ نومبر 1970) ص355۔

2 مولوی سید دلدار علی ابن مولوی معین الدین بن عبد الہادی 1166ھ قصبہ جائس یا نصیر آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اہلِ تشیع میں مجتہد ہونے کا دعویٰ کیا اور اسی مذہب میں جمعہ اور جماعت کو رواج دیا۔ علوم عقلیہ انھوں نے سید غلام حسین دکنی الہ آبادی مولوی حیدر علی ولد ملا احمد اللہ سندیلوی اور باب اللہ کے شاگرد ملا حمد اللہ سندیلوی سے تحصیل کیے۔ اس کے بعد کربلائے معلیٰ گئے اور وہاں آقا باقر بہبہانی و سید علی طباطبائی سے کسب علوم فقہ، حدیث، اصول کیا، اور مشہد میں سید مہدی بن سید ہدایت اللہ سے استفادہ کر کے ہندستان واپس آئے۔ یہاں انھوں نے درس وتدریس کا شغل شروع کیا اور شیعی عقائد کی تبلیغی جدوجہد میں مصروف ہوئے۔ اثنا عشری عقائد پر ان کی کئی تصانیف ہیں غازی الدین حیدر کے دور حکومت میں 1235ھ میں بمقام لکھنؤ وفات پائی۔ اور مقبرہ حسنیہ میں دفن کیے گئے۔ برائے تفصیل دیکھیے۔ تذکرہ علمائے ہند/ 60-61۔ مولانا سید دلدار علی، غفران مآب کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، معارف (نومبر 1970) ص354،355۔

حیثیت سے مجتہدین کے ہاتھ میں زمام مذہب دے دی،،[1]

آزاد بلگرامی کی مصنفہ ماثر الکرام کے مقدمہ میں مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ ''ایک بات تاریخی حیثیت سے اس تذکرہ میں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔ وہ یہ کہ ان علما وفضلائے بلگرام میں سے جن کا اس میں ذکر ہے ایک بھی اہلِ تشیع میں سے نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب شیعہ نے وہاں بعد کے زمانے میں رواج پایا۔ اور اگر ان علما میں سے بعض کی اولاد اب بھی وہاں باقی ہے اور وہ مذہب شیعہ پر ہے یا ان کے نسب ناموں میں ان علما کے نام نکلیں تو ہمارا یہ خیال اور بھی قوی ہو جائے گا۔ یہ امر واقعی ہے کہ اودھ کی سلطنت نے خاص کر آس پاس کے اضلاع وقصبات پر اور بعض اوقات دور دراز کے مقات پر بھی مذہبی لحاظ سے خاص اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ جونپور اور دیگر مضافات لکھنؤ وغیرہ کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ امر پایۂ تیقن کو پہونچ جاتا ہے، جب مذہب کی پشتی پر حکومت ہوتی ہے تو حالت اندیشہ ناک ہو جاتی ہے۔ میرا اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سلطنت اودھ نے مذہب کے معاملہ میں کبھی جبر وتعدی سے کام لیا۔ بلکہ بات یہ ہے کہ جاہ طلبی اکثر لوگوں کی نیت کو، جو اعتقاد کے کچے ہوتے ہیں، ڈانواڈول کر دیتی ہے۔ ایسا ہر جگہ ہوا ہے اور یہی اودھ کے اکثر مقامات میں ہوا۔ اور قصبہ بلگرام بھی اس اثر سے نہ بچا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد بلگرامی کے زمانے میں اہلِ تشیع وہاں نہ تھے اور اگر تھے تو خال خال، لیکن بعد کے زمانے میں حکومت کے اثر سے اس کا قدم وہاں پہونچا ہے،،[2] اپنے مذہبی جوش وعقیدت کی وجہ سے نواب آصف الدولہ بڑے شدومد کے ساتھ تعزیہ داری کرتا تھا اور بعض مرتبہ سینہ کوبی کی وجہ سے لہولہان ہو جاتا تھا۔ ہرچرن داس کا بیان ہے:

''چوں در عشرہ محرم در ہر سال نواب آصف الدولہ بہادر برسینہ بچینہ زد سینہ کوبی در ماتم

---

1 گل رعنا۔ مولوی عبدالحی (دارالمصنفین اعظم گڑھ) ص 153، نیز ملاحظہ ہو۔ عماد/ 137 تاریخ فرح بخش (انگریزی) 11 /ص 147-146، اشاریہ 152۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے محمد فیض بخش کے بیان کی بنیاد پر لکھا ہے کہ فیض آباد میں جواہر علی خاں کی کوششوں سے شیعوں میں باجماعت جمعہ کی نماز کا آغاز ہوا۔ میر حسن/ 309، تاریخ فرح بخش 11 / 590، 46۔

2 ماثر الکرام (مطبع مفید عام'' آگرہ (1328ھ/ 1910) ص 14۔

حضرت امام حسن حسین می نمایند امسال در عشرہ محرم 1199ھ کہ بچینہ بر سینہ زدند، خون بسیار جاری شد، ودر ہماں جانب سینہ کوباں و ماتم کناں تا بدریا رفتند،،[1]

نواب موصوف ہر سال کئی لاکھ روپے اس تہوار میں صرف کیا کرتے تھے[2] مجلس عزا کے لیے نواب نے ایک امام باڑہ بھی تعمیر کیا تھا جس سے آج بھی ان کا مذہبی جوش عقیدت ظاہر ہوتا ہے[3] نواب نے ڈاکٹر بلین سے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ ولایت سے دو شیشے کے تعزیہ بنوا کر بھیجوائیں۔ ان میں سے ایک سیاہ اور دوسرا سبز ہونا چاہیے۔ ہر ایک تعزیہ کی قیمت لاکھ روپے طے ہوئی تھی۔ 1211ھ میں ایک تعزیہ ہندستان پہونچا۔[4] بہو بیگم سالانہ تعزیہ داری کی مجالس میں شرکت کرتی اور فاتحہ پڑھتی تھی[5]

نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور عقائد اثنا عشری کی نشر واشاعت میں بڑی سرگرمیوں کا مظاہرہ ہوا۔ مرزا قتیل، جو پہلے سنی عقائد کا پیرو تھا بعد میں شیعی عقائد اپنا لیے تھے، لکھتا ہے کہ ''یمن الدولہ ناظم الملک سعادت علی خاں کے عہد میں مرزا محمد حسین کربلائے معلیٰ سے تشریف لائے جو اثنا عشریوں کی کثرت کی وجہ سے ''رشکِ شیراز وصفاہان ہے،،[6] نواب کی ان سرگرمیوں کا انشا نے ایک شعر میں ذکر کیا ہے۔

مدد ائمہ اثنا عشری نمود ندت ☆ خوشا سعادت طالع زہے ہمایوں فال[7]

نواب بذات خود مجلس تعزیت سید الشہدا کا اہتمام کرتے تھے اور لوگوں کو شرکت کے لیے مدعو کرتے تھے۔ مرزا قتیل کے ایک خط سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کو نواب مدعو کرتے

1. چہار گلزار شجاعی/254 ب، تاریخ اودھ 3/ص 351 نیز تاریخ فرح بخش 11/ص 22-21۔
2. تاریخ اودھ 3/ص 1 تفضیح الغافلین/115۔
3. تفضیح الغافلین/ص 115, 112
4. تفضیح الغافلین/ص 115۔
5. تاریخ فرح بخش 11/293۔
6. ہفت تماشا/(ا۔ت) ص 3۔
7. کلیات انشا/252۔

اور وہ شرکت کرنے میں گریز کرے، تو یہ بات نواب کے لیے بار خاطر ہوتی تھی۔ مرزا قتیل مرزا امانی کو لکھتے ہیں:

''فردا در حضور پر نور مجلس تعزیت امام علیہ السلام است صحی، ارشاد شدہ بود کہ بخواجہ امامی بنویسید کہ فردا با ہر دو برادرِ خود چار گھڑی روز بر برآمدہ اینجا برسند، عرض کردم کہ خواجہ امامی دریں مجلسہا کم می روند فرمودند کہ ایں چہ معنی دارد کہ آدم در مجلس تعزیت سید الشہدا حاضر نشود و در خانۂ ما قاعدہ نیست کہ کسی سب اصحاب بکند گفتم کہ خواجہ امامی ایں ہمہ تعصب ندارد اگر کسی بدبگوید بدہم نمیزند چرا کہ ایشاں کار با جناب امام علیہ السلام دارند اگر کسی بد خواہد گفت سزائے خود را خواہد یافت۔ یقین کہ مرد بالیاقت ایں حرکت نخواہد کرد کہ علی روس الاشہاد تبرا بکند و آدم رذیل مقام شکوہ ہم نیست بہر صورت ایشاں، حاضر خواہند شد...... فردا بہر صورت آمدن ضرور است زیرا کہ حضرت خود فرمودہ اند در نیامدن گمان تعصب خواہند برد و سوائے ایں مکروہ است کہ در مجلس رقص باید آمد و در تعزیت کنارہ باید کرد،،[1]

نواب سعادت علی خاں نے درگاہ حضرت عباس کی تعمیر کروائی اور اس طرح حضرت عباس سے اپنی عقیدت کا مظاہرہ کیا نتیجتاً عوام کو بھی اس درگاہ سے ارادت اور عقیدت پیدا ہوگئی۔ اس درگاہ کے بارے میں غلام علی نقوی نے لکھا ہے کہ لکھنؤ کا مرزا فقیر بیگ نامی ایک شخص رستم نگر میں رہتا تھا۔ اس کے گھر میں ایک علم تھا جس کے بارے میں اس نے مشہور کر دیا تھا کہ وہ علم حضرت عباس کا ہے۔ حالانکہ یہ بات بے بنیاد تھی۔ لیکن چونکہ اس نے اس علم کو حضرت عباس سے منسوب کر رکھا تھا اس لیے عوام و خواص اس کی زیارت کو جانے لگے۔ اور نذر میں جو رقم جمع ہوتی تھی، اس پر صاحب خانہ کی بسر اوقات منحصر تھی۔ ساتویں محرم کو تمام شہر کے علم اس مقام پر جمع ہوتے تھے۔ اس تاریخ کے علاوہ محرم کے دنوں میں بڑا مجمع ہوتا تھا۔ لیکن مذکورہ بالا تاریخ کو شہر میں کوئی ایسا علم نہ تھا جو وہاں نہ لے جایا جاتا ہو۔ مرزا فقیر بیگ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مرزا فتح علی اپنے باپ کا قائم مقام ہوا اور اس علم کا نگراں بنا۔ مختصر یہ کہ نواب آصف الدولہ

1. رقعات مرزا قتیل/52۔

کے زمانے میں وہ مکان صرف ایک مکان ہی تھا۔ اس مکان کی کچی دیواریں کچی چھت اور مختصر سا صحن تھا۔ نواب سعادت علی خاں نے وہاں ایک عالی شان عمارت تعمیر کروائی جس کا گنبد طلائی تھا اور وسیع صحن کو پختہ دیواروں سے گھیر دیا گیا تھا۔ ایک بلند دروازہ بنایا گیا تھا جس کے سامنے صبح وشام گل فروش اور حلوائی بیٹھنے لگے۔ علاوہ ازیں شہر کے اکثر اجلاف اور اراذل وہاں جانے لگے۔ نواب سعادت علی خاں کے حکم سے اب کوئی کم مرتبہ کا انسان وہاں رات بسر نہیں کر سکتا تھا۔ اس درگاہ کی حفاظت کے لیے پیادہ سپاہی اور داروغہ حکومت کی طرف سے تعینات تھے۔[1]

نواب غازی الدین حیدر کی بیگم نے باقاعدہ امام مہدی کی چھٹی کی رسم شروع کی۔[2] ایک دوسری رسم کی ابتدا بادشاہ بیگم سے ہوئی کہ سیدوں کی خوب صورت لڑکیوں کو محل میں بلا کر رکھا جاتا تھا اور انھیں گیارہ (یازدہم) اماموں کی بیویوں کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ان لڑکیوں کے والدین کو بھاری رقم ادا کی جاتی تھی وہ بخوشی اپنی بیٹیوں کو بیگم صاحبہ کے حوالے کر دیتے تھے۔ اس کے برعکس، اگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوتے تو زبردستی اور دوسرے طریقوں سے لڑکیاں حاصل کی جاتی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک لڑکی یازدہ اماموں میں سے کسی ایک کے ساتھ منسوب کر دی جاتی تھی، اسلامی تاریخ سے تلاش کر کے ان کے نام رکھے جاتے تھے۔ وہ تمام لڑکیاں ''اچھوتن'' کہلاتی تھیں۔[3] یہ رسم ہندو تہذیب کے زیر اثر مسلمانوں میں آئی تھی۔

نواب امجد علی شاہ ایک متقی اور پرہیزگار نواب تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں حکومت کی باگ ڈور علما اور مجتہدین کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی۔ نواب واجد علی شاہ عیش پرست تھا اور لہو ولعب میں مصروف رہتا تھا۔ لیکن اپنے عقیدے میں وہ بھی بڑے غلو سے کام لیتا تھا۔ ان نوابوں کی کوششوں سے شیعی مذہب لکھنوی تہذیب کا سب سے نمایاں عنصر بن گیا۔[4]

---

1. عماد/172، تاریخ اودھ 30 /ص 300,303۔
2. تاریخ بادشاہ بیگم (انگریزی ترجمہ) ص6، تاریخ اودھ 4 /ص 170 ,168۔
3. تاریخ بادشاہ بیگم (انگریزی ترجمہ) ص6، تاریخ اودھ 4 /ص 6-7۔
4. لکھنؤ کا دبستان شاعری/ 28۔

نوابان اودھ کے زیر اثر ہندو اور سنی امرا بھی بظاہر اثنا عشری عقائد سے دل چسپی رکھنے لگے اور بہتوں نے تعزیہ داری شروع کر دی۔ مثلاً خواجہ عین الدین انصاری، صوبہ دار بریلی، سنی ہونے کے باوجود ائمہ اطہار سے دلی عقیدت رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عشرہ محرم میں اس کا یہ معمول تھا کہ عاشورہ کے دن وہ اپنا تمام مال و متاع، نقد و جنس، عمارات اور زن و فرزند بلکہ اپنی ذات سمیت جناب سید الشہدا کے نام خیرات کر دیتا تھا۔[1] موجودہ زمانے میں سارے بندیل کھنڈ کے سنی مسلمان تعزیہ دار ہیں۔

اس طرح جھاؤ لال ایک ہندو امیر بڑے تکلف سے ہمیشہ تعزیہ داری کے رسوم ادا کرتا تھا۔[2] اس کی سرکار سے برسوں تک شیخ محمد عطا مرثیہ خواں وابستہ رہا تھا۔[3] ہندو عوام بھی تعزیہ دار اور مسلمانوں کی تقلید میں اپنے دروازوں پر تعزیہ رکھواتے تھے۔[4] نواب کے فوجی ملازمین، چاہے شیعہ ہوں یا سنی سب تعزیہ دار تھے۔[5]

شیعہ و سنی مناظرے

نوابانِ اودھ کی پشت پناہی کی بنا پر شیعوں نے تشدد سے کام لیا اور سنیوں سے مناظرے کر کے انھیں ذلیل و خوار کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً ملا عبد العلی بحر العلوم لکھنوی کو ایک خونریز شیعہ سنی قضیہ کے سبب سے ترک وطن کرنا پڑا۔[6] ایسا ہی واقعہ ملا حسن فرنگی محلی کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یہ شجاع الدولہ کا دورِ حکومت تھا۔ اس کا دار المستقر فیض آباد تھا۔ جب شیعہ حضرات نے علمائے فرنگی محلی کو تنگ کرنا شروع کیا تو ملا حسن ایک وفد لے کر نواب کے پاس فیض آباد آ گئے اور نواب سے

---

1. تاریخ اودھ 3/153۔
2. تاریخ اودھ 3/344۔
3. تاریخ فرح بخش (انگریزی) ص 11/ص 256۔
4. ہفت تماشا/156، مراۃ الاوضاع ص 101 الف۔ 102 الف، نیز Observatons etc.1, P.27.
5. عماد/128,168۔
6. تذکرہ علمائے ہند/122۔

شکایت کی کہ لکھنؤ کے حکام شیعہ سنی قضیہ بھڑکاتے اور خوں ریزی کراتے ہیں اس وفد نے خیر اللہ حسینی اور محمد عطا حسینی کے خونِ ناحق کی بھی فریاد کی۔ مگر نواب نے ان کی کوئی شنوائی نہ کی۔ اس کے بعد ملا حسن نے ترکِ وطن پر کمر باندھی۔[1]

اس ماحول کا اثر یہ ہوا کہ سنی علما اور ادبا نے بھی ائمہ اطہار سے عقیدت کا اظہار کرنا شروع کر دیا کیونکہ ان میں بہت سے ترکِ وطن کر کے اودھ گئے تھے اگر وہ وہاں کے ماحول کو سازگار نہ بناتے تو پھر کہاں جاتے۔

نوابانِ اودھ کے اسی جانب دارانہ رویے کی وجہ سے اودھ اور روہیل کھنڈ میں شیعیت کو خوب فروغ ہوا اور بعض شہروں میں جہاں شیعہ بالکل نہ تھے یا بہت ہی ناقابلِ لحاظ تعداد میں تھے ان کی اکثریت ہوگئی۔ امروہہ، بلگرام، ہردوئی وغیرہ اس کی مثالیں ہیں، امروہہ کے قریب ایک بستی نوگاواں سادات کہلاتی ہے۔ یہاں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے بھانجے اور داماد سید بدرالدین اسحاقؒ کی اولاد آباد ہے ان میں نوابانِ اودھ کی حکومت سے پہلے کوئی شیعہ نہیں تھا لیکن اب نوے فیصدی مسلمان شیعی عقائد کے ہیں اور باقی دس فیصدی بھی ان کے اثرات سے آزاد نہیں ہیں۔ شیعیت کو یہ فروغ اودھ کی حکومت کی سرپرستی ہی میں ہوا تھا۔ خود امروہہ میں حضرت شاہ شرف الدین شاہ ولایت کا خاندان دو تین گھرانوں کو چھوڑ کر سب کا سب نوابانِ اودھ کے زمانے میں شیعہ ہوگیا۔ اس لیے کہ ان کی جاگیریں ضبط کر لی گئی تھیں۔ اور جو حکومتِ وقت کا عقیدہ اختیار کر لیتا تھا اس کی جائیداد واگزار کی جاتی تھی بلکہ اس پر کچھ اضافہ بھی کر دیا جاتا تھا۔

حکومت کی پشت پناہی دیکھ کر شیعہ علما بھی مناظرے کر کے سنی علما کو نیچا جھکانے کی فکر میں رہتے تھے اسی لیے علمائے فرنگی محل نے درسِ نظامی میں منقولات کے ساتھ معقولات کا بڑا حصہ رکھا تھا کہ شیعہ علما کو معقول دلیلوں سے قائل کرنا ممکن تھا۔

---

1. معارف (ماہ نومبر 1970) ص 359-358۔ فیض آباد میں شیعہ سنی پارٹیوں میں مناظرہ اور فساد کے لیے دیکھیے۔ تاریخ فرح بخش 11 /ص 38،46 میر حسن/ص 117،119،127 ملا محمد حسن۔
تذکرہ علمائے ہند/185،186۔

عام مسلمانوں کی مذہبی حالت

اسلام کے عقائد بالکل واضح ہیں اور اس میں تو ہم پرستی بالکل نہیں ہے لیکن اودھ اور الہ آباد کے عام مسلمان آثار شریفہ اور مزاروں کی پرستش کرتے تھے۔ قاضی مرتضیٰ بلگرامی کا اس ضمن میں بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس دور کے عام مسلمانوں کے مذہبی رجحانات پر روشنی پڑتی ہے اگر ہم ان سطور کے لفظی معنوں کو نظر انداز بھی کر دیں تو بھی اس کی روح کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔ قاضی صاحب نے لکھا ہے۔

''متوطان ہندستان اکثر بت پرست اند و دیگر ہر نوع ہر کسی کہ خواہد نماند، منعی و تکلفی نمی باشد...... وایں ساکنان ممالک دور دست چوں رومی، و فرنگی و ایرانی و تورانی ہم در ہند می آیند، ورفتہ رفتہ ہندستانی می شوند،''[1]

مزاروں کی زیارت

شمالی ہندستان کے دوسرے علاقوں کی طرح اودھ کی سرزمین میں بزرگوں کے بہت سے مزارات تھے کچھ ایسے تھے جن کے زائرین مقامی ہوتے تھے مگر کچھ ایسے بھی ہوتے تھے جن کی زیارت کے لیے زائرین دور دراز کا سفر طے کر کے آتے تھے[2] مثلاً غازی سالار مسعود کے مزار پر بہرائچ میں ہر سال ایک بڑا میلہ لگتا تھا اور دور دور سے زائرین آتے تھے۔ علم اور نذریں چڑھاتے تھے اور منتیں مانگتے تھے[3] ملفوظ رزاقی میں مرقوم ہے کہ

''چوں مرشد زادہ بن شاہ غلام علی) یازدہ سالہ شدہ والدہ ماجدہ شاں نیت کردہ بود کہ در سال یازدہم برای زیارت مرقد سالار مسعود غازی خواہم فرستاد، چنانچہ مرشد زادہ دام برکاتہ

1۔ حدیقۃ الاقالیم/35۔

2۔ OBSERVATIONS etc. P.19۔

3۔ حدیقۃ الاقالیم/135، خلاصۃ التواریخ/43، کلیات انشا/86،94،157، ہفت تماشا/105-106۔ مفتاح التواریخ/36، دیوان مصحفی پنجم (قلمی پٹنہ) ص45الف خزینۃ الاصفیا 1/217،

تاریخ سالار مسعود غازی۔

رابہ بہرائچ روانہ فرمود"[1] نواب آصف الدولہ بذاتِ خود سالانہ عرس کے موقع پر بہرائچ جایا کرتا تھا[2]

مکھن پور میں شاہ مدار کا مزار زیارت گاہ خاص و عام تھا[3] اور اب بھی ہے۔ وہاں ایک بڑا میلہ لگتا تھا۔ علما اور فضلا بھی وہاں جاتے تھے۔ آزاد بلگرامی برائے زیارت جایا کرتے تھے۔ ایک موقع پر لکھتے ہیں:

"فقیر از کانت گولہ بتقریب زیارت مزار فائض انوار بدیع الحق والدین شاہ مدار قدس سرہ بہ مکھن پور رسید"[4] نشا نے اپنے اشعار میں مداری فقیروں کے حرکات و سکنات کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً دھمال کھیلنا۔ ملنگ فقیروں کا ایک خاص وضع سے بل بل کرنا چنا، کودنا اور شور و غل کرنا۔

کھینچتا ہوں نعرۂ حق کھیلتا دھمال ہوں اے میرے سائیں مدد داتا مدد مولا مدد
جتنے ہیں ناسوت کی ابدھوت بھاگیں ہو کے بھوت ایک چٹکی بھر جو کر بیٹھے بھبھوت اپنا مدد[5]

1۔ ملفوظ رزاقی/232-233۔

2۔ تاریخ فرح بخش (انگریزی) 11/221،
چہار گلزار شجاعی/55 ب

3۔ برائے تفصیل دیکھیے۔ حدیقۃ الاقالیم/172، کاشف الاستار/146، مجمع الاخبار/549، ہفت تماشا ص 98،101 خزینۃ الاصفیا 11/ص 310۔

OBSERVATIONS etc.1, PP. 372-75.

4۔ مآثر الاکرام/28۔

5۔ کلیات انشا 48، نیز ملاحظہ ہو۔ نصیحۃ المسلمین/6 ب، 18 ب، 20 الف، 24 الف خلاصۃ التواریخ/41-40۔ سلک گوہر ص 29، ہفت تماشا/99،101 خزینۃ الاصفیا 1/ص 422 اخبار الاخیار (ا۔ت) 292۔ دیوان مصحفی ہشتم (قلمی پٹنہ)

مصحفی مجھ کو نہ جنس دے سکا پاپی خیال ☆ سیکڑوں چھڑیاں بھی آئیں سینکڑوں میلے ہوئے

/45 الف بلگرام اور مارہرہ میں شاہ مدار کی فاتحہ کے لیے علیحدہ مخصوص تھا۔ کاشف الاستار/368۔

یوں چلی مژگاں سے اشکِ خونفشاں کی میدنی[1] جیسے بہرائچ چلے بالے میاں کی میدنی
لختِ دل مسعود غازی نیلی گھوڑی داغ ہے جلوۂ انوار ہی کرذ بیاں کی میدنی
دم مدار آپہونچے مکناد یو ہو حضرت جنوں کانپ اوٹھی جن کے آتے ہی جہاں کی میدنی
ای مکن پور کی تمنا زور ہی کچھ شان سے کھیلے ہے دھمال تیرے عاشقوں کی میدنی
ہاں بدیع الدین الفت آتے ہیں حضرت مسیح دیکھنے کو آپ کو دیوانگان کی میدنی[2]

بعض مرتبہ لوگ اپنے لڑکوں کا نام شاہ مدار رکھتے تھے، شاہ عبدالرزاق بانسوی کے ایک عزیز کا نام ''شیخ مداری تھا'' (ملفوظ رزاقی/138) اجودھیا میں حضرت نوح اور شیث بن حضرت آدم وایوب پیغمبر علیہم السلام ''زیارت گاہ اہلِ اسلام است[3]'' میر حسن دہلوی نے ان درگاہوں میں زائرین کے مجمع کا اپنے مخصوص انداز میں یوں ذکر کیا ہے۔

وہ سیر رمنہ اپنے حسب دل خواہ وہ نوح اور شیث پیغمبر کی درگاہ
وہ پنج شنبہ کا درگاہوں میں جانا ہزاروں پری زادوں کا آنا۔[4]

مجملاً ہر قصبے میں کسی نہ کسی صوفی کی قبر ایسی ضرور ہوتی تھی جنھیں مخدوم صاحب کہا جاتا تھا اور اس ولایت کا والی سمجھا جاتا تھا۔ یعنی اس قصبے کی آبادی کو ان کے قدموں کی برکت سمجھتے تھے۔ ان کی کرامتوں کے دفتر کے دفتر محفلوں اور مجلسوں میں بیان کیے جاتے تھے[5] پیر اشرف[6] سلونی، کے مرید یہ کیا کرتے تھے کہ طوطی خرید کر اسے شیخ کا نام رٹا کر سلون کے جنگلوں میں چھوڑ دیتے تھے، وہ طوطی ہر درخت کی ٹہنی پر بیٹھ کر، پیر اشرف پیر اشرف،، کی رٹ لگاتی تھی تاکہ

---

1. قاضی مرتضیٰ بلگرامی نے میدنی کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے "ہر سال در عشرہ خلقی کثیر از دکن و بنگالہ و دیگر امصار ہند باعلم ہای رنگا رنگ آنجا جمع آیند و بعد از اختتام عرس باوطان خود باروند و آن جماعہ را میدنی شاہ مدار نامند،، حدیقۃ الاقالیم/172۔

2. کلیات انشا/157۔

3. خلاصۃ التواریخ/43۔

4. مجموعہ مثنویات میر حسن/159۔

5. ہفت تماشا/168۔

6. مفتاح التواریخ/335،339۔ ملفوظ رزاقی/33۔

جنگل سے گزرنے والے مسافر یا درخت کے نیچے آرام لینے والے ان کے فضل وکمال کے معترف ہوں اور طوطی کا ان کے نام کی رٹ لگانا ان کی کرامت سمجھیں۔ اس طرح سننے والوں کے دلوں میں اعتقاد بیٹھ جاتا تھا کہ یہ اپنی اصل فطرت سے ایسی باتیں کرتے تھے[1]

لکھنؤ میں شاہ[2] مینا کا مزار زیارت گاہ خاص وعام تھا[3] بلگرام میں خواجہ عمادالدین بلگرامی[4]، میر عبدالواحد[5]، میر عبدالجلیل[6]، بن عبدالواحد، سید برکت اللہ[7] اور بی بی خورد[8] کے مزارات پر زائرین کا اژدہام ہوتا تھا۔ خیر آباد میں شیخ سعدالدین خیر آبادی کے مزارات پر زائرین کا اژدہام ہوتا تھا۔ خیر آباد میں شیخ سعدالدین خیر آبادی کے مزار پر لوگ زیارت کے لیے جاتے تھے[9] کچھو چھہ شریف میں سید اشرف[10] جہانگیر کے مزار پر زائرین کا مجمع ہوتا تھا۔ شفیق علی خاں، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں زیارت کے لیے وہاں گئے تھے[11] بانسہ میں شاہ عبدالرزاق کے مزار پر زائرین کا ہجوم ہوتا تھا[12] نواب سعادت علی خاں درگاہ حضرت عباس سے بڑی عقیدت رکھتا تھا، وہ بڑی شان وشوکت سے زیارت کے لیے جاتا اور عوام کو بھی رجوع کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

1. ہفت تماشا/169-168۔
2. برائے حالات ملاحظہ ہو۔ خلاصۃ التواریخ/44، خزینۃ الاصفیا 1/48۔
3. خلاصۃ التواریخ/44۔
4. ماثر الکرام 1/ص 10-9۔
5. ماثر الکرام 1/ص 32،25، کاشف الاستاد (قلمی) ص 3۔
6. ماثر الکرام 1/44-43 کاشف الاستاد/149-148۔
7. ماثر الکرام 1/123۔
8. ماثر الکرام 1/175
9. ماثر الکرام 1/191۔
10. برائے حالات دیکھیے۔ اخبار الاخیار (ا۔ت) ص 297،294۔ خزینۃ الاصفیا 1/377،371۔
11. چہار گلزار شجاعی/46 الف
12. ملفوظ رزاقی/192،123۔

عام لوگ بھی درگاہ میں نذر و نیاز چڑھانے جانے لگے۔ اور مصائب سے نجات پانے کے لیے منتیں ماننے لگے[1] نواب سعادت علی خاں ایک مرتبہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ زیارت کے لیے درگاہ گیا تھا۔ مرزا قتیل نے ان سطور میں اس جلوس کا ذکر کیا ہے:

''بدرگاہ حضرت عباس سواری جناب عالی بایں جبروت رفتہ بود کہ تمام بازار رنگین کردہ بطور آئینہ بندی اخباس فاخرہ در ہر دکان پہن شدہ بود و چند جادر راہ بالای بام نوبت می زدند، بر سر ہر بام لولیہا رقص می کردند و سامان سواری چہ بگویم کہ در تقریر نمی آید، ہودج زریں جواہر نگار و زیں ہای مرصع کار و دیگر حشم و خدم کہ چشم فلک ندیدہ بود ہمراہ بود، واز کثرت خلق دو قدم راہ طے کردن برابر دو کردہ مسافت بود، مردم بسیارے در کوچہار بزمین غلطیدند و ضربہا خوردند، الحاصل جناب عالی در تمام راہ زر نقد بہر دو دست بر لولیاں و فقرای انداختند و بدرگاہ رسیدہ یکصد و یک اشرفی و یک نان طلا کہ پاؤ بالا یک سیر در وزن بودہ است نذر کردند، بعد مراجعت ہم تا شام انبوہ مردم کم نبودہ،''[2]

نواب وقت کا یہ طرز عمل عوام کی کشش کے لیے کافی تھا۔ جب نواب بذات خود نذر چڑھاتا تھا تو عوام کیسے اس بات سے گریز کر سکتے تھے۔

نواب واجد علی شاہ نے اپنی ایک مثنوی میں درگاہ حضرت عباس کے میلے اور شاہی مستورات کا اس میلے میں جانا اور درگاہ میں نذر چڑھانے کا یوں ذکر کیا ہے:

کہ درگاہ عباس ابنِ علی علم دار افواجِ سبط علی
جو اس شہر میں ہے بزیب تمام زیارت کو جاتے ہیں واں خاص و عام
رجب کی جو نوچندی آئے قریب رسا ہو گئے زائروں کے نصیب
ہوئیں ملتجی صاحبات محل کہ نوچندی میں ہم بھی جائیں گے کل
کوئی کہتی تھی ہے زیارت کا شوق کہ ہے یہ زیارت عبادت پہ فوق

---

1. برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ عماد/173-172، مفتاح التواریخ/373، نصیحۃ المسلمین/6، ب 18 الف۔

OBSERVATIONS etc: 34-36۔

2. رقعات مرزا قتیل/74-73۔

کسی نے کہا دیں اجازت حضور کہ چلہ مجھے باندھنا ہے ضرور
کسی کی تمنا کہ جاؤں گی میں آنکھوں سے شمعیں جلاؤں گی میں
ہوا سانحہ یہ میری گوزد کہ کثرت تماشائیوں کی تھی حد
یہ گستاخی وحیلہ سازی ہوئی کہ درپردہ نظارہ بازی ہوئی۔[1]

نذرونیاز کی رسمیں

عام مسلمان عورتوں کی دینی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ مزاروں اور بزرگوں سے بے حد عقیدت رکھتی تھیں۔ یہ بات سنی اور شیعہ دونوں میں یکساں پائی جاتی تھی۔ وہ بعض اکابر صوفیہ کی نذر کا کھانا پکاتی تھیں اور ان کو من جملہ اولیاء مشکل کشا سمجھتی تھیں۔ مثلاً سید جلال بخاری[2] بچوں کی سلامتی کے لیے عورتیں ان کے نام کے چاول پکا کر مٹی کے برتن میں بھرتی تھیں اور دہی اور شکر اس پر ڈال کر شریف اور غریب مسلمانوں کو کھلاتی تھیں[3] ایسی ہی عقیدت سید احمد کبیر[4] کے ساتھ تھی ان کے نذر کی گائے ذبح کر کے اس کے کباب خود کھاتی تھیں اور دوسروں کو بھی کھلاتی تھیں۔ بچا ہوا گوشت ابدالی لوگ جو ان کے مرید کہلاتے تھے۔ نقد پیسہ سے خرید کر لے جاتے تھے۔ یہ ابدالی لوگ گائے کے ذبح کیے جانے کے وقت کوئلے روشن کرتے تھے۔ جب وہ خوب دہک جاتے تھے تو برہنہ ہو کر ان کوئلوں پر لیٹتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ بجھ جاتے تھے۔ ان کے بدن کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا تھا۔ اس سبب سے شیعہ لوگ ان کے کمال کا لوہا مانتے تھے[5] مختصر یہ کہ سید احمد کبیر کی

---

1 مثنوی واجد علی شاہ (قلمی) ص164-165، تاریخ اودھ 3 / 301۔ مثنوی فریب عشق، از شوق۔ ملاحظہ ہو۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں/ 14۔

2 اخبار الاخیار (ا۔ت) ص226,254۔   3 ہفت تماشا/153۔

4 ان کا مزار راجپوتانہ میں تھا۔ ہفت تماشا، ص153، مگر بیل نے لکھا ہے کہ ان کا مقبرہ ملتان میں اچھ نامی مقام میں واقع ہے۔

5 ہفت تماشا/ 153-154۔ BEAL E T.W. ORIENTAL BIOGRAPHICAL DICTIONARY:P مسز میر حسن علی نے اس موقع کا حال جلبداروں کے ضمن میں لکھا ہے، جہل بدار، سید احمد کبیر کے پیروؤں کو کہتے تھے۔ ص370,372 ,30۔

گائے۔ شیخ سدو الف کا بکرا۔ سدو شاہ مدار کا مرغا، اور کھیت اور سوداگری میں منافع کے لیے غوث الاعظم اور شاہ مدار کی نذور چڑھائی جاتی تھیں۔[1] اس طرح حضرت علی کے نام کا روزہ رکھا جاتا تھا بعضے تمام دن کا اور بعضے ہندوؤں کی طرح سوا پہر کا۔[2] مسلمانوں میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے نذر کے دستر خوان کا رواج بھی پایا جاتا تھا۔ مرزا قتیل کا خیال ہے کہ یہ رسم پہلے تورانیوں میں مروج تھی اور بعد میں ایرانیوں نے بھی اختیار کر لی تھی۔ مجملاً امیر المومنین تشریف لائیں گے، اور ان میں سے بعض کھانے تناول فرمائیں گے، اس لیے ان کے اعتقاد کے مطابق ایک وقت مقرر تھا پھر ان کھانوں پر جناب امیر المومنین کے نذر کا دستر خوان بچھایا جاتا تھا۔ اور اس پر قسم قسم کے کھانے چن دیے جاتے تھے۔ پھر منتظر رہتے تھے کہ جناب امیر المومنین کے دستِ مبارک کے نشانات تلاش کرتے تھے۔[3] مکھن پور میں مخدوم اخی کے مزار پر مرغ و نان۔ کھچڑی، دروغن زرد، برہ پر فاتحہ ہوتی تھی۔[ج]

توہم پرستی

اٹھارھویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے نصف اول زمانے میں اودھ اور الہ آباد کے صوبے اسی طرح سے اخلاقی اور مذہبی زبوں حالی میں گرفتار تھے۔ جس طرح شمالی ہندستان کے دوسرے علاقوں کی حالت تھی ان صوبوں میں بھی انسانی زندگی کے کسی بھی شعبے میں کوئی قابلِ ذکر کارنامہ منظرِ عام پر نہیں آیا اور نہ آرٹ اور ادب میں کوئی دائمی اضافہ کیا گیا۔ مسیز میر حسن علی نے لکھا ہے کہ ہندستانی بے حد توہم پرست ہیں اور کسی طرح سے بھی ان کے دل سے یہ بات نکالنی مشکل ہے۔[الف]

الف مسیز میر حسن علی/375,382، نیز فٹ نوٹ ملاحظہ ہو۔

1 نصیحۃ المسلمین/9الف میر حسن علی/372,375۔

2 نصیحۃ المسلمین/20ب۔

3 ہفت تماشا/156-155۔

ج ملفوظ رزاقی/103-102۔

الف مسیز میر حسن علی/387۔

فال اور شگون

عوام وخواص دونوں شگون اور نجوم پر عقیدہ رکھتے تھے[1] صفدر جنگ، جس نے مسلم سماج کو ایک نئی شاہ راہ پر ڈالنے کی کوشش کی تھی، جس کی وجہ سے اودھ میں ایک نئی تہذیب نے جنم لیا، جو لکھنؤ تہذیب کے نام سے موسوم ہوئی، بذاتِ خود کسی نئے کام کے کرنے یا فوج کشی پر جانے اور میدانِ جنگ میں جنگ شروع کرنے کے لیے کئی دن تک وقتِ سعید کا انتظار کرتا تھا[2] حیدر بیگ خاں (نائب سلطنت در عہد نواب آصف الدولہ) اہلِ تنجیم سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ مرزا ابوطالب لندنی نے حیدر بیگ خاں کی اس توہم پرستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"وحیدر بیگ بخیال تقسیم کہ دست وپا وسر فقرا شکستہ شود، از ابتدائے عہد خود معتاد بود، زیرا کہ برقول ہائے منجمین اعتماد داشت وآنجماعت گاہے اورا در تراز ونشانیدہ، بموزن او نقرہ وس وپارچہ می گرفتند، وگاہے تقسیم فلوس برفقرار ہنموئی میکردند، وخود ہم حیدر بیگ گاہے کہ خوف از جہتے در دل داشت، بایں امر اقدام می نمود،"[3] نئے مکان میں نجومی کے کہنے کے مطابق وقت سعید میں سکونت اختیار کی جاتی تھی[4]

فیض آباد[5] اور لکھنؤ[6] کے بازاروں میں نجومی اور جوتشی اپنی دکان سجا کر بیٹھتے تھے اور

---

1 میر حسن دہلوی نے اپنی مثنوی "سحر البیان" اودھ میں لکھی تھی، اور جس بادشاہ کا اس مثنوی میں ذکر کیا گیا ہے وہ شاہ مغلیہ یا نواب اودھ ہی ہوسکتا ہے۔ اس کے نجومیوں اور وقت سعید کے متعلق عقیدے کے بارے میں دیکھیے مجموعہ مثنویات میر حسن ص 17,19 'نیز دیکھیے فسانۂ عجائب/18,75۔

2 سیر المتاخرین/نوابین اودھ اور نجوم پر ان کے عقائد کے بارے دیکھیے ۔Observations etc.1,38-39۔

مرزا وزیر علی خاں کی توہم پرستی کے لیے دیکھیے۔ تفضیح الغافلین/134۔

۔ Von. Orlich: Travels in INDIA LL. 1845) PP 100-101'

3 برائے تفصیل دیکھیے تفضیح الغافلین/96، تاریخ فرح بخش (انگریزی) 11 /ص 125۔

4 رقعات مرزا قتیل/47۔

5 مجموعہ مثنویات میر حسن/152۔

6 فسانۂ عجائب/18 نیز دیکھیے ۔ نصیحۃ المسلمین/21 ب۔

عوام اپنے مستقبل کے بارے میں معلوم کرنے کی غرض سے ان کی خدمت میں جایا کرتے تھے۔

نصیر الدین حیدر اولاد نرینہ کی جستجو اور خواہش کے تحت فقراء اسلام اور ہنود کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان سے دعا کے لیے منت وسماجت کیا کرتا تھا[1] اور بالآخر اس نے ایک سنی صوفی کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔[2]

خواجہ خضر کی کشتی

اس رسم کا ہم پہلے باب میں ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنا لکھنا مقصود ہے کہ اودھ میں بھی یہ رواج پایا جاتا تھا۔ مرزا قتیل نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ ''مادر محسن بعد پنج وشش روز کہ برائے دوروز برائے فرستادن کشتی نیاز خضر بکنار دریا خرد و کلاں اینجا آمدند، بعد حصول فراغت ازیں مہم والدہ میاں کمو با اولاد امجاد خود بجای خود مراجعت نمود،،[3] یہ رسم شعبان، ہندی ساون کے مہینے میں ادا کی جاتی تھی۔

انشا نے متذکرہ موضوع پر شعر کہے ہیں۔

یقیں کہ خواجہ خضر تھے بچھائی جائے نماز
جو بیٹھی جاتی تھی ایک بوڑھی گھاگ پانی میں[4]

---

1. تاریخ اودھ/4/ ,316-373-374

2. تاریخ اودھ 4/310، اولاد کے لیے لوگ دوسرے طریقے بھی استعمال کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ میر عبدالجلیل بلگرامی کے مزار کے قریب واقع پیلو کے درخت کی پتیاں وہ عورتیں کھایا کرتی تھیں جن کے ہاں صرف لڑکیاں پیدا ہوتی تھیں اور وہ نرینہ اولاد کی متمنی ہوتی تھیں،، اس کا طریقہ یہ تھا کہ'' بعد گزشتن دو ماہ کم بیش روز پنج شنبہ حاملہ غسل کنانیدہ پارچہ صاف و پاکیزہ پوشانیدہ و مستورات قبیلہ راموافق استعداد جمع نمودہ برنج و جغرات شیریں کہ توشہ آنحضرت است پزانیدہ برآں فاتحہ کردہ آں پتی را کہ دو سہ برگ می باشند باآں حاملہ خورانیدہ آں توشہ را بمصلیان می خورانند و عطر بہای سرانید، غالب کہ پسر متولد می شود''۔ کاشف الاستار/148۔

3. رقعات مرزا قتیل/47 مسیز میر حسن علی/154,156۔

4. کلیات انشا/60۔

ایسے میں چلیے کیجیے تماشا اکثر پریاں آئی ہیں۔
ندی کے اندر خواجہ خضر کے نذر کے بیڑے پڑتے ہیں[1]

ماتھے پر ٹیکا

نظر بد سے بچنے کے لیے بچوں کے ماتھے پر کالے ٹیکے لگائے جاتے تھے۔

سو کالے ٹیکے تھے گویا رخ نزاکت کے کہیں نظر نہ لگے اس لیے رہی تھی لپٹ[2]

بلائیں لینا

اپنے کسی عزیز کے مصائب کو اپنی جانب مطلق کرنے سے متعلق فعل کو "بلائیں لینا" کہا جاتا تھا۔ یہ فعل ہر کسی خوشی کے موقع پر عمل میں آتا تھا۔ معاصر شعرا کے کلام میں اس مضمون پر اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ مثلاً

مکھڑے پہ اس کے صرف نہ بلبل نے غش کیا
چٹ چٹ بلائیں غنچوں نے لیں گل نے غش کیا[3]

نچھاور اُتارنا

اسی طرح رفع بلیہ کے لیے نچھاور اتاری جاتی تھی اور مساکین و غربا میں وہ اشیا تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ انشا کا شعر ملاحظہ ہو۔

کیا فقط ان کے نچھاور کے لیے اے انشا اپنی مٹھی میں ہر ایک غنچہ زر لیتا ہے۔[4]

کسی عزیز یا اولاد کی علالت کے زمانے میں شفاعت کے لیے بطور خیرات اور صدقہ غلہ اور زر غربا میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ نواب آصف الدولہ ایک مرتبہ علیل ہوئے تو نائب سلطنت امیر الدولہ حیدر بیگ خاں نے 25 پیالے روغن سیاہ، اور بیس من ماش، و پانچ سو تنکہ خام، بیس جاموش، ایک ہاتھی اور پانچ سو روپے فقد، و سو گوسفند" برائے تصدق فرستاد" اور دوسرے امرا نے اپنی حیثیت کے مطابق زر نقد و جنس برائے خیرات نواب کے محل میں بھیجی تھی۔ "نواب آں ہمہ را و بسیاری از

1۔ کلیات انشا/88 'نیز دیکھیے فسانہ عجائب/100۔

2 کلیات انشا/261۔

3 کلیات انشا/5۔

4 کلیات انشا/171 'نیز دیکھیے۔ فسانہ عجائب/182۔

نقد وجنس غلہ وغیرہ از سرکار خود بفقرا دمساکین داد۔[1]

گنڈے وتعویذ

دہلی کی طرح لکھنؤ میں بھی گنڈے تعویذوں کے استعمال پر بڑا زور تھا۔کاشف الاستار کے مصنف نے اس کتاب میں سیکڑوں تعویذیں لکھی ہیں جن میں ہر قسم کے امراض اور توہمات سے نجات کے متعلق تعویذ تھے۔مثلاً برائے شفا بیماری، برائے حاجت روائی، برائے حمل، برائے آسیب وغیرہ[2] اس مضمون کے بارے میں انشا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تعویذ ونقش سے جو نہ آیا تو اپنے ہاتھ　　　صفحے پہ دل کے نام تیرا منقش کیا۔[3]

بالعموم ان تعویذوں کو نیلے ڈورے سے گلوں میں ڈالتے تھے یا بانہوں میں باندھتے تھے۔

تعویذ لعل ہی کے نہ پھرئے کے گھمنڈ پر　　　ایک نیلا ڈورا باندھیے اس گوری ڈنڈ پر[4]

دکھتی اگر ہے آنکھ تو تعویذ ان یکاد　　　بازو پہ اپنے توپے رفع گزند باندھ[5]

یہ بھی ایک خیال تھا کہ اگر سپند (کالا دانہ) کو جلایا جائے تو بلیات دفع ہوتی ہیں۔انشا نے اپنے ایک شعر میں اس کا ذکر کیا ہے:

سونے کا چھلا مور کا پَر ہی نہیں فقط نہیں
ایک زرد پوٹلی میں بھی تھوڑا اسپند باندھ[6]

انشا کے اس شعر سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سونے کا چھلا اور مور پنکھ بھی بلاؤں سے نجات کے لیے استعمال میں آتے تھے۔

---

1. چہار گلزار شجاعی/254 ب خیرات اور صدقے دینے کا عام قاعدہ تھا۔بالعموم روزآنہ شام کو کسی غریب کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔مسیز میر حسن علی/139۔
2. کاشف الاستار/ص 369,417۔
3. کلیات انشا/6۔
4. کلیات انشا/51۔
5. کلیات انشا/117۔
6. کلیات انشا/117۔

یہ بھی ایک عام تصور تھا کہ اگر ہُدہُد (ایک مشہور پرند، فارسی میں پوپک کہتے ہیں) کے خون سے کوئی تعویذ لکھا جائے تو زود اثر ہوتا ہے۔

اب کوئی ہما ہو تو اسے ذبح کریں ہم   تعویذ بہت لکھ چکے ہُد ہُد کے لہو سے[1]

انشا نے ایک غزل میں بہت سے ایسے افعال کا ذکر کیا ہے جن سے اس عہد کی توہم پرستی پر کافی روشنی پڑتی ہے:

غش ہوئے ہم تو اجی قہر تھا اس کافر کا
لال ناڑے میں بندھا ہائے نیلا تعویذ
گرچہ سیانوں نے پڑھ افسوں بہت اتوار کے دن
خون ہُدہُد سے میرے واسطے لکھا تعویذ
جس پری کا مجھے سایہ تھا نہ اترا لیکن
کام آیا نہ کسی شخص کا گنڈا تعویذ
جی چلا اپنا سا پھونکا کیے لونگ اور اسپند
مشک سیندور اگر مرچ فلیتا تعویذ
خیر انشا کی جو چاہو تو پلادو دھو کر
اس کے بازو کا وہ تنہا سا روپہلا تعویذ[2]

چھینکنا

اگر کوئی شخص کسی نیک کام کے لیے روانہ ہو رہا ہو یا کسی کام کو انجام دینا شروع کررہا ہو، تو ایسے موقع پر اگر کوئی چھینک دے تو اس فعل کو منحوس اور بدشگون سمجھا جاتا تھا۔

---

1 کلیات انشا/181، میرحسن دہلوی نے میاں اسرار کے مکان پر تعویذ گنڈے لینے والوں کے جم غفیر کا ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

مجموعہ مثنویات میرحسن/161-160۔

2 کلیات انشا/50۔

کوئی اللہ کرے چھینک پڑے جلدی سے
وہ چھپر کھٹ میں تو ہے چھوڑ کر بھاگا جیسے[1]

اے مصحفی نہ دیکھا روئے وطن پھر آخر
شاید کہ چھینکتے تو اے یار گھر سے نکلا

جادو پر عقیدہ[2]

جادو اور ٹونے پر بھی عام لوگ عقیدہ رکھتے تھے۔

ارواح خبیثہ پر عقیدہ

پہلے حصے میں اس بات کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں میں بالعموم اور جہلا میں بالخصوص ارواح خبیثہ پر اعتقاد پایا جاتا تھا۔ مثلاً شیخ سدو[3]، میاں زین خاں، میاں صدر جہاں، ننھے میاں، چہل تن، اور میاں شاہ دریا، اور میاں سکندر شاہ[4] اسی طرح کچھ اختراعی اور مصنوعی عورتوں کی ارواح پر بھی عقیدہ عام تھا۔ مثلاً لال پری، سبز پری، زرد پری، سیاہ پری، آسمان پری، دریا پری، نور پری[5]۔ انشا نے ان ارواح خبیثہ کے مضمون کو اپنے اشعار میں باندھا ہے:

کیا ترے سر آچڑھے چاروں کے چاروں الاماں
شاہ دریا، شیخ سدو، زین خاں، ننھے میاں[6]

---

1. کلیات انشا/209، دائیں آنکھ کے پھڑکنے کو بدشگون یا نحس سمجھا جاتا تھا۔ فسانہ عجائب/109۔
2. مسز میر حسن علی/388,393۔
3. دیوان مصحفی سوم (ق۔رام پور)/70ب۔

مقام اس کا گر امروہہ میں ہو تو کاش بازوں سے
کوئی یہ شیخ سدو کی ہے یہاں درگاہ بول اٹھے

OBSERVATIONS etc. 375,382-

4. کلیات سودا1/ 340-341' دریائے لطافت (ا۔ت) ص183۔
5. دریائے لطافت (ا۔ت) 183، تاریخ بادشاہ بیگم (انگریزی) ص10-9 نصیحۃ المسلمین/11ب۔12الف۔
6. کلیات انشا/202۔

نہ یہ حال لال پری سے کہہ نہ تو زین خاں ولی سے کہہ

ارے انشا اپنے ہی جی سے کہہ کہ کسی پہ دل نہ دھرے دھرے [1]

آسیب سے نجات حاصل کرنے کے لیے کچھ ٹونے ٹوٹکے کیے جاتے تھے۔ شیخ سدو کی روح سے نجات پانے کے افعال کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ بلگرام میں میر عبدالجلیل [2] بلگرامی کے مزار کے قریب ایک درخت پیلو کا تھا۔ اس درخت کی پتیوں کو کالی مرچ کے ساتھ پیس کر آسیب زدوں اور بالخصوص سدو کے آسیب زدوں کو پلاتے تھے۔ علاوہ ازیں اس فعل پر عمل پیرا ہوتے تھے [3]

مختصر یہ کہ جب چودہ ارواح خبیثہ میں سے کوئی کسی عورت کی روح میں حلول کر جاتی تھی تو آسیب زدہ کو آسیب سے نجات دلانے کے لیے ایک مجلس کا اہتمام ہوتا تھا۔ جسے بیٹھک [4] کہا جاتا تھا۔ مرزا قتیل نے اس مجلس کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

''اس میں یہ شرط ہے کہ جس عورت کے لیے بیٹھک جمع ہو تو وہ خود کو عمدہ لباس اور زیوروں سے آراستہ کرے۔ بعض نسوانی اطوار رکھنے والے مرد بھی ان چودہ مرد عورتوں میں سے کسی کو اپنے سر پر سوار کر لیتے ہیں۔ وہ اس دن کے لیے رنگین لباس اور زیور اور بقچہ رکھتے ہیں [5]'' ایک مرتبہ شاہ عبدالرزاق بانسوی نے ایک آسیب زدہ عورت کو پانی دم کر کے پلایا اور اس کو نجات مل گئی اور دوسری مرتبہ پانی میں تھوک دیا اور اس پانی کو آسیب زدہ کو پلایا گیا اور اسے ارواح خبیثہ کے اثرات سے خلاصی نصیب ہوئی۔ [6]

---

1. کلیات انشا/207۔

2. برائے حالات دیکھیے۔ ماثر الکرام 1/ص 44-43۔

3. کاشف الاستار/148، ارواح خبیثہ پر عقیدہ کے متعلق تفصیل کے لیے دیکھیے۔

OBSERVITIONS etc. 99,393

4. ہفت تماشا/'' بیٹھک ایک مقررہ مدت تک بیٹھنے کے معنی ہوتے ہیں۔ اور برادری اور پڑوس کی عورتوں کا تمام رات اس عورت کے ارد گرد بیٹھنا جس میں چودہ عورت مرد میں سے کوئی حلول کر گیا ہو۔ اصلاحی معنی ہوتے ہیں'' ص 178۔

5. ہفت تماشا/177۔

6. ملفوظات رزاقی (قلمی) ص 11-10۔

بدھی

ریشم کے ڈورے کی طرح بٹی ہوئی ایک ڈور ہوتی ہے۔ یہ بازار میں بکتی تھی، شاہ مدار کے عرس کے دنوں لوگ اسے دفع بلیہ کے لیے بچوں کے گلے میں ڈالتے تھے[1]

یہ زوال نور بلا ہے بدھی اسی سے تنگ ہوں حد سے حد

کرویا علی مدد اسی اپنے پاؤں کی خاک سے[2]

نقل سکونت

مسلمان امیروں میں یہ بات عام طور پر پائی جاتی تھی کہ جس مکان میں کوئی امیر فوت ہو جاتا تو کوئی دوسرا امیر اس مکان میں سکونت نہیں کرتا تھا یہی وجہ تھی کہ داراب[3] علی خاں نے اس مکان کو امام باڑہ میں منتقل کر دیا تھا جس میں جواہر علی خاں نے رحلت کی تھی[4]

ستیلا کی پرستش

پہلے حصے میں ہم ستیلا دیوی کی عظمت اور مسلمان عورتوں میں اس پر عقیدہ پائے جانے کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اودھ کے علاقوں میں بھی چیچک کی وبا کے زمانے میں ستیلا دیوی کا احترام کیا جاتا تھا اور اسے خوش کرنے کے لیے نذر و نیاز چڑھائی جاتی تھی[5] ایک دوسری دیوی بھوانی تھی جس سے مرادیں مانگی جاتی تھیں[6]

سورج و چاند گرہن

ہندو تہذیب کے زیر اثر مسلمانوں میں بھی سورج اور چاند گرہن کے موقعوں کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی اور ہندوؤں کے طرز عمل پر مسلمان بھی بہت شور و غل کے ساتھ گرہن کی ابتدا کا اعلان

---

1. کلیات انشا/76,178۔
2. کلیات انشا/164۔
3. وفات 1818 تاریخ فرح بخش (انگریزی) 11/ 319۔
4. تاریخ فرح بخش/ 11 /ص666۔
5. ہفت تماشا/ 85-84 نصیحۃ المسلمین/ 12 الف۔
6. نصیحۃ المسلمین/ 12 الف، ملفوظات شاہ عبدالرزاق (قلمی) ص14,18۔

کرتے تھے۔ بالعموم گرہن کا وقت نزولِ مصائب کا وقت تصور کیا جاتا تھا۔ لہٰذا عام طور پر اس وقت تک مسلمان عبادت میں مصروف رہتے اور روزہ رکھتے۔ جب تک سورج اور چاند کو گرہن سے چھٹکارا نہ مل جاتا۔ مسیز میر حسن علی کا بیان ہے کہ اس زمانے میں عورتیں غربا و مساکین میں غلہ، تیل اور روپیہ پیسہ بطور تصدق اور خیرات تقسیم کرتی تھیں۔ شرفا مستحقین کو تحفے تحائف دیتے۔ جوتشی کو دربار سے روپے، ایک جوڑا خلعت بطور انعام دیا جاتا۔ ایک منگیتر اپنے متوقع شوہر کو بطور صدقہ ایک بکری کا بچہ بھیجا کرتی تھی جسے گرہن کے دوران اس کی چارپائی کے پایہ سے باندھا رکھا جاتا تھا۔ اور مابعد صدقہ میں دے دیا جاتا۔ حاملہ عورتوں اور جانوروں کو گرہن کے منحوس اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے کچھ رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔[1]

دیگر توہمات

بعض گھروں میں کنواری لڑکی کا ہونا مبارک نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح مربہ اور اچار مدت العمر دوست کے گھر سے یا بازار سے خرید کر کھایا جاتا تھا۔ گھر میں نہیں تیار کرتے تھے[2] سفر پر جاتے وقت مسافر کے بازو پر امام ضامن کا روپیہ برائے تحفظ باندھا جاتا تھا[3] مشکلات کے وقت مختلف طرح کی منتیں ماننے کا رواج تھا۔ کوئی کہتی تھی ہمارا الشکر اس بلا سے نکل گیا تو مشکل کشا کا کھڑا دونا دوں گی، کوئی بولی میں سہہ ماہی روزہ رکھوں گی، کونڈے بھروں گی، صحنک[4] کھلاؤں گی، دودھ کے کوزے بچوں کو پلاؤ گی۔ کسی نے کہا میں اگر جیتی چھٹی جناب عباس کی درگاہ جاؤں گی، سقائے سکینہ کا علم چڑھاؤں گی، چہل منبر کر کے نذر حسین کی سبیل پلاؤں گی[5] نقشِ سلیمانی پر لوگوں کو بڑا عقیدہ تھا[6] محرم کے زمانے میں تعزیوں کے سامنے بہت سے ایسے اعمال اور افعال

---

1. برائے تفصیل دیکھیے۔ OBSERVATIONS etc. 156-161.
2. ہفت تماشا/142۔
3. نصیحۃ المسلمین/9الف فسانۂ عجائب/102۔
4. نصیحۃ المسلمین/24الف، فسانۂ عجائب/72۔
5. فسانۂ عجائب/134۔
6. فسانۂ عجائب/132۔

ظہور میں آتے تھے۔ جن کی بنیاد توہم پرستی پر تھی، مثلاً سُرخ اور سبز موم بتیاں جلانا[1] بعض مرتبہ عبدالقادر جیلانی کی فاتحہ بطور منت مانی جاتی تھی[2]

چاند سے متعلق بھی مسلمانوں نے کچھ ایسے تصورات قائم کر رکھے تھے، جن سے ان کی وہم پرستی کا علم ہوتا ہے۔ مثلاً پورا چاند شادی و بیاہ کے لیے مبارک سمجھا جاتا تھا۔ اگر کسی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہوتا تو اس بات کا ضرور خیال رکھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ہر ایک اہم کام کے شروع کرنے سے پہلے جوتش سے معلوم کرلیا جاتا تھا کہ چاند کس گرہ میں ہے اسی طرح چاہے مکان کی تعمیر ہو، درخت کا لگانا ہو، دوا کا کھانا ہو، یا کسی معاملہ کا ضبط تحریر میں لانا ہو، لکھنؤ میں ایک عجیب وغریب رسم تھی، یہ "ایک گھونٹ میں چاند پینا" کہلاتی تھی، اس کا طریقہ یہ تھا، ایک رو پہلے برتن میں پانی پر پورے چاند کا عکس پڑے اور جس شخص کو یہ پانی پلانا مقصود ہوتا تھا اس کے لیے یہ لازمی تھا کہ وہ ٹکٹکی باندھ کر اس برتن میں چاند کو دیکھے۔ پھر آنکھ بند کر لے اور اس پانی کو ایک گھونٹ میں پی جائے۔ یہ بھی عقیدہ عام تھا کہ اگر کوئی شخص پورے چاند کے موقع پر عبادت کرے اور دعا مانگے تو اس کی دلی تمنا بارآور ہوگی چودھویں رات کے چاند کے دنوں میں گنڈے تعویذ لکھے جاتے تھے اور سلامتی کے لیے بچوں کے گلے میں ڈالے جاتے تھے۔[3]

شادی بیاہ کے زمانے میں بہت سی ایسی رسموں پر عمل ہوتا تھا جن کی کوئی مذہبی حیثیت نہ تھی بلکہ ہندوؤں سے لی گئی تھیں اور وہم پرستی کی وجہ سے عمل میں آتی تھیں۔ مثلاً "موسل سے ناڑا باندھنا"[4] لکھنؤ کی عورتوں میں اور بلکہ ہندستان کی مسلمان عورتوں میں یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ اگر خاندان میں کوئی شخص علیل ہو تو اگر پرند کو آزاد کر دیا جائے تو وہ مرض کو ساتھ لے کر اڑ جاتا ہے۔ یہی

---

1. رسالہ تعزیہ داری/5،19،21، نیز OBSERVATIONS etc. P.51۔

2. نصیحۃ المسلمین / 24الف۔

3. برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔

OBSERVATIONS etc: 156-158

4. برائے تفصیل دیکھیے۔

۔OBSERVATIONS etc: PP. 206-209

وجہ تھی کہ جب کوئی بادشاہ یا خاندانِ شاہی کا کوئی فرد علیل ہوتا تھا تو اس کی شفاعت کے لیے غلاموں کو آزاد کر دیا جاتا تھا۔ غلاموں کے آزاد کرنے کے بہت سے مواقع تھے [1]

ہندو جشن و تہوار

مسلمانوں پر ہندو تہذیب کے اثرات کا ہم پہلے حصہ میں تفصیلی ذکر کر چکے ہیں، یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ دہلی کی طرح اودھ میں بھی ہندو مسلم تعلقات بڑے شگفتہ تھے اور تہذیبی یک رنگی پائی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طبقے کے مسلمان ہندو جشنوں، تہواروں اور میلہ ٹھیلوں میں بڑی گرم جوشی سے شرکت کرتے تھے۔ محمد فیض بخش کا بیان ہے کہ اجودھیا میں ہندوؤں کا ایک بڑا میلہ لگتا تھا۔ اس میلے میں ہزاروں مسلمان شریک ہوتے تھے [2] میر حسن دہلوی نے اودھ کے میلوں میں مسلمانوں کی شرکت کا ذکر کیا ہے:

نہانوں کا اودھ کی سیر کرنا ہر اک کافر کے غم میں جا کے مرنا
کہیں گپتار میں جانا گپت ہو بہانا عشق کے دریا میں دل کو
وہ سورج کنڈ [3] کے میلے میں چلنا ہر ایک خورشید کے غم میں جلنا [4]

مرزا امانی کو اپنے ایک مکتوب میں مرزا قتیل نے لکھنؤ کے چند میلوں کا اور ان میں اپنی شرکت کا ذکر کیا ہے۔ صرف مرزا قتیل ہی نہیں بلکہ لکھنؤ کے دوسرے مسلمان بھی ان میلوں میں شریک ہوتے تھے۔ مرزا قتیل کا بیان ہے کہ جس دن سے لکھنؤ آیا تھا، تمھارے سر کی قسم اور امیر المومنین علیہ السلام کی

---

1. برائے تفصیل دیکھیے۔ OBSERVATIONS etc: PP. 226 ۔

2. تاریخ فرح بخش 11 / 284، دریائے لطافت (ا۔ت) ص 85۔

3. معبد یست۔ از دور دست خلائق براں فراہم آیند، خلاصۃ التواریخ / 44، مرزا قتیل نے اپنے ایک خط میں سورج کنڈ کے میلے میں شرکت کے بارے میں لکھا ہے۔ ''از یک سال داماد کو چِپ میر انشاءاللہ خاں صاحب عرصہ بر من تنگ کردہ بود کہ برای خدا یکبار مرا ہم ہمراہ خود در میلۂ سورج کنڈ باید برد'' رقعات مرزا قتیل' 50-49۔

4. مجموعہ مثنویات میر حسن/159۔

قسم میں نے میلہ ٹھیلوں کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی لیکن جس دن سے مولوی عبدالقادر[1] اور اس کے رفقا اس شہر میں داخل ہوئے تھے اور مجھ سے گھل مل گئے تو ایک مرتبہ عصر کے وقت دو گھڑی کے لیے میلہ آٹھوں[2] دیکھنے گیا اور ایک دن میاں فتح علی کے تالاب پر منعقد میلے میں گیا تھا، علاوہ ازیں میلہ ہنومان' سورج کنڈ ا اور گومتی کے کنارے پر ہونے والے میلوں میں بھی جانے کا اتفاق ہوا جس کی وجہ تمھارے والد ماجد اور چچا خواجہ امیر خان تھے، کیونکہ وہ لوگ مجھے ہمیشہ میلہ ٹھیلوں میں جانے کی ترغیب دیتے تھے۔ اور مجھ پر کاہلی اور سستی کا الزام لگا کر مجھے اس بات پر آمادہ کرتے تھے کہ میں بھی ان کے ہمراہ ان میلوں میں شرکت کروں، آگے لکھتے ہیں، ''شما بفضلِ الٰہی میلہ ہا دیدہ اید وتماشاہا کردہ اید وسوائے ایں پیشتر ہم بتحریک پدر وعمومی می رفتند، مثل دیگر بچیا گاہی بے اختیار بنودہ اید۔''[3]

بسنت

نوابان اودھ بسنت کے جشن کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ تاریخ اودھ میں لکھا ہے کہ نواب آصف الدولہ بسنت اور دوسرے جشنوں میں ہر سال لاکھوں روپے صرف کر دیتا تھا۔[4] سیف الملوک کے مصنف نے آصف الدولہ کے دربار میں جشنِ بسنت کی تعریف ان اشعار میں کی ہے:

بہار اور بسنت آمد وشگوفہ در باغ   گل واشرفی ونرگس شگفتہ ہیچوایاغ
سرور کرد بمسند کشاد دست کرم   گل وگلاب وہم جعفری دہد ابلاغ[5]

---

1 عبدالقادر رام پوری، مصنف وقائع عبدالقادر خانی۔

2 اس میلے کا ذکر دوسری جگہوں پر ملتا ہے۔ انشا نے کئی مرتبہ اس میلے کا ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو، کلیات انشا ص 35، 97،201، نیز دیکھیے۔ تاریخ فرح بخش 1 /ص 53،88-387 ،Observations etc.1۔

3 رقعات مرزا قتیل/ص۔50/

4 تاریخ اودھ 3 /ص 1۔

5 سیف الملوک (مصنف نامعلوم) ص 84 الف مصحفی نے بسنت کی تعریف میں ایک پوری غزل لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو، دیوان مصحفی ج/ہشتم۔ (قلمی پٹنہ) ص 17 ب نیز کلیات انشا/ 33-32۔

ہولی

میر تقی میر نے ہولی پر دو مثنویاں لکھی ہیں جن میں اس نے نواب آصف الدولہ کے دربار میں اس تہوار کے انعقاد، آتش بازی اور رنگ کھیلنے، رقص وسرود کی جو تفصیل کی ہے وہ بہت دل چسپ ہے۔ یہ دونوں مثنویاں دور آصفی کی شان وشوکت اور عیش وعشرت کی منظر کشی کرتی ہیں۔ اور ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نوابان اودھ کو ہولی کے جشن سے کتنی گہری دل چسپی تھی۔

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر　　رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر

رنگ کھیلنے کا منظر

دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جوان　　جیسے گلدستہ تھے جوؤں پر رواں
زعفرانی رنگ میں رنگیں لباس　　عطر پاشی سے سبھوں میں گل کی باس
رنگ افشانی سے پڑتی تھی پھوار　　رنگِ باراں تھا مگر ابرِ بہار
قمقمے جو مارتے بھر کر گلال　　جس کے لگتا آن کر پھر منھ ہے لال
برگِ گل ملواں اڑاتے تھے عبیر　　تھی ہوا میں گردتا چرخِ اثیر

روشنی و چراغاں

روشن الدولہ کی تھی یہ روشنی　　کب ہوئی تھی لیکن ایسی روشنی
وہ چراغاں گرچہ تھے درگاہ تک　　تھے تماشائی گدا و شاہ تک
راہ میں تر پولیے مینار تھے　　روشنی کے کوچۂ و بازار تھے
اب تو ہفت اقلیم کا عالم ہے یاں　　دیکھو تو ہر جنس کا آدم ہے یاں

سوانگ بھرنے کا ذکر

سوانگ کیا کیا بن کے آئے درمیاں　　پھبنے کا سوانگ تھا سارا جہاں
آئے کس کس رنگ سے دامن سنوار　　باد کے رنگوں جنھوں کا تھا گزار
کیسی کیسی دیکھی شکلیں تازیاں　　سحر کرتے تھے کہ صورت بازیاں

آتش بازی

کیا ہوائی چھوٹنے کا ہے بیاں　　ذوذنب جیسے ستارے ہوں یہاں

جاہی جوہی چھوڑتا ہے یاد بود روشنان ذو ذوائب تھے نمود
گنج چھوٹے ایک سے روشن تھے جھاڑ دو طرف جس طرح سے جھڑتی ہے باڑ
اس روش سے تھے ستارے چھوٹتے ناگہاں جو ہوویں تارے ٹوٹتے
کیا ہے آتش دستیاں دے کر گئے شعلوں سے پانی کی لہریں بھر گئے۔[1]

مہجور[2] نے نواب سعادت علی خان کی مجلس ہولی کا بہت ہی دل چسپ نقشہ پیش کیا ہے:

موسم ہولی کا تیری بزم میں دیکھا جو رنگ ٹمکی نمٹ باندھی ہوں دامن کو اپنے مہوشاں
پھرتے ہیں رنگ شفق میں سب ڈوبے ہوئے ہاتھ میں مثل ثریا سب لے کے پچکاریاں
آنکھ اٹھا کر یک طرف دیکھا تو باندھے اپنا غول پھرتی ہیں اِدھر اُدھر اس روپ سے سب رنڈیاں
ہاتھ میں لے کر کے دف اور گیند گل صد برگ کے چھاتیوں پر بھی دوپٹوں کے بندھی ہوویں گاتیاں
اور کہیں آپس میں ہولی کھیلتی تھیں وہ جو سب ان پری رووں کا نقشہ کیا کروں میں اب بیاں
کوئی کسی کے منھ کو ملتی ہے عبیر اور گلال اور کسی کی کوئی پہنچی دے ہے تڑتڑ تالیاں
اور کہیں آپس میں سب وہ بادف و چنگ و رباب یہ غزل مہجور کی پڑھتی ہیں ہر سو گاتیاں۔[3]

مرزا قتیل کا بیان ہے کہ نواب سعادت علی خاں کی مسند نشینی کے ابتدائی دور میں بھی ہولی کا ہنگامہ گرم ہوتا تھا۔ لاکھوں روپے نقد اور مرصع جواہر نگار زیور اور قیمتی لباس لولی عورتوں کو بطور بخشش مرحمت ہوتے تھے۔ اور درباریوں کو قیمتی لباس عطا ہوتے تھے۔[4]

1۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو، کلیات میر
(آسی نول کشور لکھنؤ 1941 ص783,788-789,791 ' نیز ملاحظہ ہو۔ عماد السعادت/172، معاصر، ج/1/ آصف الدولہ کا جشن ہولی اور افسوس کی مثنوی، ص20,29۔
MEMOIRS ETC 11:P 231-32۔ ہفت تماشا/92-93۔

2۔ نام شیخ محمد بخش، تخلص مہجور، ولد حکیم خیر اللہ، جو فتح پور کے باشندہ تھے، مہجور لکھنؤ میں مفتی گنج محلے میں رہتے تھے۔ ریاض الفصحا/315-316۔

3۔ دیوان مہجور (قلمی) ص228,234۔ نیز ملاحظہ ہو، عماد/172، دریائے لطافت۔ (ا۔ت107۔ نیز ملاحظہ ہو۔ 4۔ عماد/قلمی/ص19 الف۔

دسہرہ

ہولی کے علاوہ دسہرہ کا تہوار بھی بڑی شان وشوکت سے منعقد ہوتا تھا۔[1]

شہزادہ سلیمان شکوہ نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرلی تھی، وہ بھی جشنِ ہولی بڑے اہتمام سے منعقد کرتے تھے۔ انشا نے ان کی مجلس کا یوں ذکر کیا ہے:

سانگ ہولی میں حضور اپنے جو لاویں ہر رات
کہ کنہیا بنیں اور سر پہ وہ دھر لیویں مکٹ
گوپنیں ہو کے پڑی ڈھونڈیں کدم کی چھائیں
بانسری دہن میں دکھا دیویں وہ ہی جمنا ہٹ
گانوں گوکل کا ہے پنڈا ہی نرالا ہے کہیں
گوالنیں بن کے کہیں ہنس کے وہ ہے جنسی پٹ
گاگریں لیویں اٹھا اور یہ کہتی جاویں
دیکھت دھوندری جو دزم اوتی ہے پنگھٹ
سونے روپ میں جو لد جائیں گنواروں کی طرح
دہام گھر کو کہیں نزدیک کو بولیں دونکہٹ[2]

عام مسلمان اور ہندو جشن وتہوار

دسہرہ کے دنوں میں ہندوؤں کی طرح کچھ مسلمان بھی نیل کنٹھ کے دیدار کے اشتیاق میں شہر کے باہر جاتے تھے۔ اور خصوصاً وہ مسلمان امیر جو حاکمِ شہر ہوتا تھا۔ اس کے لیے یہ لازمی تھا کہ اس دن وہ اپنے گھوڑوں اور ہاتھیوں کو مہندی اور دوسرے رنگوں سے رنگین کر کے نقرئی اور طلائی ساز وسامان اور زرنگار جھول کے ساتھ سونے چاندی کے حوضے اور عماریاں لگا کر فوج اور خدم وحشم کے ساتھ اور ذی مرتبہ مصاحبوں کو ہمراہ لے کر بازار میں نکلتا تھا۔ وہ ہر فرقے کے لوگوں میں گراں بہا نقدی بطور انعام واکرام تقسیم کرتا تھا اور شہر کے باہر جا کر میدان میں نیل کنٹھ کا دیدار کرتا تھا۔

1. ہفت تماشا/93۔
2. کلیات انشا/249۔

شام کو گھر واپس آکر وہ پری زاد شوخ وطناز رقاصاؤں کے رقص وسرود سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

ہندو بچوں کی طرح مسلمان بچوں میں بھی یہ رسم تھی کہ دسہرہ سے دس دن پہلے مٹی کی ایک صورت بناتے تھے اور اسے لکڑیوں پر لٹکاتے تھے۔ اس کا نام ٹیسورائے ہوتا تھا۔ روزانہ شام کے وقت کچھ بچے اور کچھ جوان مل کر اپنے رشتہ داروں کے دروازوں پر ایک مخصوص لَے میں بلند آواز اور خوش الحانی کے ساتھ ہندی کے چند بیت پڑھتے تھے اور ایک پیسہ یا اس سے زیادہ لے کر دوسرے دروازے پر جاتے تھے۔ اس طرح جو رقم جمع ہو جاتی تھی ان پیسوں سے دسہرے کے دن مٹھائی خرید کر آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ اس کے برعکس لڑکیاں ٹیسورائے کے بجائے جالی دار کوزہ ہاتھ میں لے کر دروازوں پر جاتی تھیں اور پیسے جمع کرتی تھیں۔ مجملاً دسہرہ کے دن ہر شخص اپنے مخصوص ٹیسورائے کو نشان ونقارہ کے ساتھ باہر نکالتا تھا۔ اور بڑی شان وشوکت سے جلوس کے ساتھ ندی کی طرف لے جاتا تھا۔ اور ٹیسورائے کو پانی میں بہا کر واپس آتا تھا۔[1]

مسلمان سلونو کے جشنوں میں شریک ہوتے تھے۔[2] یو پی کے گاؤں میں اب بھی یہ رسم ہے کہ مسلمان عورتیں اپنے بھائیوں کی کلائیوں میں راکھیاں باندھتی ہیں۔

دیوالی کے دنوں میں ہندوؤں کی طرح مسلمان بھی قمار بازی کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے اور جو مسلمان جُوا کھیلنے میں پرہیز کرتے تھے وہ کم از کم اپنے گھروں میں چراغاں کرتے تھے۔ اور شب دیوالی میں عورتیں سب بچوں کے نام سے الگ الگ مٹی کے کھلونے منگواتی تھیں اور طرح طرح کی مٹھائیاں اور کھانڈ کے کھلونے ان پر اضافہ کر کے پہلے گھر کو چراغاں کرتی تھیں پھر اس حصۂ مکان کو جہاں کھلونے اور مٹھائیاں رکھی جاتی تھیں، روشنی سے ''رشکِ وادی ایمن'' بناتی تھیں۔ یہ رسم اصطلاحاً ''دیوالی بھرنا'' کہلاتی تھی۔ اس عمل کو بچوں کی حفاظت کے لیے اچھا سمجھا جاتا تھا۔[3]

جنم اشٹمی کے تہوار میں مسلمان، اپنے ہندو بھائیوں کی تقلید میں کنس کا مجسمہ بنا کر اس کے

---

1. ہفت تماشا/(ا۔ت) ص 78-77۔

2. ہفت تماشا/ص 80-79۔

3. برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ 84-83، دیوان مصحفی پنجم (ق۔ پٹنہ) 6ب، 8الف، 91الف۔

پیٹ کو چاک کرتے تھے اور جو شہد اس میں پہلے سے بھر دیتے تھے، اسے اس کا خون سمجھ کر پیتے تھے۔اور رہس[1] میں مسلمان بھی شریک ہوتے تھے[2]

بسنت کے دنوں میں گانے والے مسلمان اور دیگر لوگ مٹی کے برتن میں سبز خوشے اور گل شریف ڈال کر روزانہ کسی بزرگ کے مزار پر جاتے تھے۔اور بسنت کی تہنیت نیز صاحب مزار کی مدح میں اشعار گاتے تھے، ہندوؤں اور مسلمانوں کی ٹولیاں ان کے ہمراہ ہوتی تھیں اسی طرح لولیاں بھڑ کیلے لباسوں میں قبروں پر جا کر رقص کرتی تھیں۔اور اس دن مسلمان پیلے لباس زیب تن کرتے تھے۔اور ہزاروں کی تعداد میں اکٹھا ہو کر شہر کے باہر جاتے اور کاغذ کے پیلے پتنگ بنا کر زرد ڈوری سے اڑاتے تھے[3]

افغانوں اور بعض پارسا مسلمانوں کے علاوہ سبھی مسلمان دل کھول کر ہولی میں ہندوؤں کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ ہر طبقے کے لوگ اپنے ہم مرتبہ لوگوں کے ساتھ ہولی مناتے تھے۔ جب ہولی جلانے میں تین دن باقی رہ جاتے تھے تو رنگ کو چھوڑ کر نالے کے کیچڑ بلا تفریق اچھالتے تھے۔اس زمانے میں ہر مسلمان کے گھر پر روزانہ لولیوں کا رقص ہوتا تھا اور رات کو اس میں بہروپوں اور نقلوں کا مزید اضافہ کر دیا جاتا تھا۔

نواب آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ میں بڑی بے تکلفی سے ہولی کا جشن منایا جاتا تھا۔ تمام دن رنگ اور گلال وعبیر اڑتا تھا اور رات کو لولیوں سے اختلاط ہوتا تھا۔دریا کے کنارے ایسی روشنی اور آتش بازی ہوتی تھی کہ اس کا تماشا دیکھنے کے لائق ہوتا تھا۔عوام ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے تھے۔اور ہر قسم کا بہروپ بھرتے تھے۔ پھر ہر راہ رو کی خواہ وہ آشنا ہو یا بیگانہ، بے صرفہ گالی گلوج اور فحاشی سے تواضع کرتے تھے[4]

---

1 برائے تفصیل دیکھیے۔ہفت تماشا/86-87۔

2 برائے تفصیل دیکھیے۔ہفت تماشا/87۔ OBSERVATIONS etc. 387-88،

3 ہفت تماشا/ص88۔دربار اودھ میں بسنت منایا جاتا تھا۔رقص وسرود کی محفلیں بجتی تھیں۔تفصیل کے لیے دیکھیے۔سیف الملوک ص84الف

4 ہفت تماشا/92-93۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ہندستان میں انگریزوں نے ''تفریق پیدا کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی اختیار کی تھی لہٰذا اس حکمت عملی کے تحت انھوں نے قانوناً مسلمانوں پر ہولی کا رنگ ڈالنا ممنوع قرار دے دیا[1] اس طرح انھوں نے مسلمانوں پر بھی پابندی لگادی کہ وہ ہولی کا تہوار نہ منائیں اور اس طرح انھوں نے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ناقابل عبور خلیج پیدا کردی۔

خلاصہ

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی زندگی اچھی نہ تھی۔ اکثر پیرزادے جھنڈے نشانوں سے روزی کماتے تھے۔[2] چوری اور مکروفریب کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ محرم کے زمانے میں ایک امام باڑے میں مرثیہ کی مجلس تھی، وہاں ایک چاندی کا پیکدان رکھا ہوا تھا۔ ایک صاحب نے اس پر ہاتھ صاف کردیا۔[3] جارج فورسٹر نے ہوسکتا ہے مبالغہ سے کام لیا ہو مگر اس کا بیان ہے کہ ہندستان کے مسلمان مذہب سے بیگانہ تھے، ان کو مذہب سے کوئی خاص عقیدت نہ تھی، بہت سے لوگ آں حضرت کا نام بھی احترام سے نہ لیتے تھے۔ مسجدیں برباد اور اجاڑ تھیں۔ ان کی بے حرمتی کی جاتی تھی۔[4] شراب نوشی[5] افیون خوری اور دیگر منشیات کے استعمال کی برائیوں کے علاوہ اعلیٰ اور متوسط طبقے کے لوگوں میں زنا، کثرت ازدواج اور کنیزیں رکھنے کا عام رواج تھا اور ان آلائشوں میں غرق تھے۔ غلام رکھنے کی خرابی بھی پائی جاتی تھی۔ گورکھپور سے کنیزیں اور غلام خریدے جاتے تھے۔[6] مرزا قتیل نے زن فروشی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے: '' دیگر امور غیرت ست، شاہ پیرائے مادر قحبہ کہ جہاں را مسخر کرد بہمیں صفات پسندیدہ ایں چک وچانہ داشت لیکن زن جلب مکر وفریب بسیاری فروخت ،،[7]

---

1. ہفت تماشا/92۔
2. نسیخۃ المسلمین/27 الف وب۔
3. تاریخ فرح بخش/ص 53۔
4. GEORGE FORSTER: TRAVELS IN INDIA. 1,P 106۔
5. کاشف الاستار'' مسلمانان ایں جا کلہ لحو بودند وشراب خور'' / 158 ہفت تماشا/163۔
6. حدیقۃ الاقالیم/152، غلام مردوں کے لیے دیکھیے۔ مسیز میر حسن علی/41۔
7. رقعات مرزا قتیل/65، غلام عورتوں کے لیے دیکھیے۔ مسیز میر حسن علی/ص 41۔

بیوہ گان کو نکاح ثانی سے محروم رکھنے کی وجہ سے بھی اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو گئیں تھیں۔ مرزا قتیل کا بیان ہے کہ ''اگر لڑکی بذاتِ خود ہزار مَردوں سے تعلق پیدا کر لے تو اس سے نہیں جھجکتے، مگر اپنی خوشی اور دِلی رغبت سے اس کا نکاح ایک دوسرے مرد سے نہیں کرتے ،،[1]

امرا اور دولت مندوں میں زنا کاری کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔

لڑکیوں کی ولادت خوشی کا باعث نہ ہوتی تھی[2] اور بعض مرتبہ ایسے واقعات بھی پیش آتے تھے کہ اس خوف سے کہ لڑکی نہ ہو، حمل گرائے جاتے تھے۔ میر حمزہ نے پیلو کی پتیوں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے جن سے حمل گرائے جاتے تھے۔ ''در بطن حاملہ دختر بودہ باشد، اسقاط حمل میگردد وایذا بحاملہ نمی رسد،،[3]

قمار بازی کی وبا بھی پائی جاتی تھی[4]

اصلاحی تحریک

ہم عصر کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ جیسا کوئی مصلح اودھ کی سرزمین میں جلوہ نما نہیں ہوا جس نے وہاں کے مسلمانوں میں تبلیغ اسلام کے ذریعہ ان کی دینی زندگی اور کردار کی اصلاح کی کوشش کی ہو مگر مرزا قتیل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے ربع اول میں اودھ کے مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی زندگی کی اصلاحی کوششیں ضرور ہوئیں اور یہ فرض شیعہ علما نے انجام دیا۔ مرزا قتیل نے لکھا ہے۔ ''ہندستان میں فقہ کے عالم بھی ہوئے ہیں، اگرچہ کچھ نہیں ہوا تو مذہب اثنا عشری کے علما نہیں ہوئے۔ اب خدا کے فضل سے یہ بھی ہونے لگے ہیں، ان میں سے ہندستان کے بعض ان علما کی کوششوں کا دخل ہے جو ولایت کے ملکوں میں گئے اور وہاں کے مجتہدوں سے مل کر ہر گتھی کو سلجھایا پھر ہندستان آ کر ان علوم کو یہاں رواج دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے زمانے کے علما کی کوششیں درجۂ کمال کو پہنچ گئیں، یہی وجہ ہے کہ ہمارے

---

1. ہفت تماشا/138,151۔
2. مسز میر حسن علی/186۔
3. کاشف الاستار 148۔
4. ملفوظ رزاقی/66۔

موجودہ زمانے تک شیعہ گھروں میں شاہ مدار کی بدھی ہر سال کالے نشان کے ساتھ طول عمر اور سلامتی کے لیے بچوں کے گلے میں ڈالتے ہیں، اور شیخ سدو کی نیاز کا بکرا ذبح کرتے ہیں، یعنی یہ علم دین کا عدم رواج ہے۔ کیونکہ اگر ان شہروں میں علم دین رائج ہوتا تو یہ سب رسمیں کیوں رواج پاتیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب مرد اس سلسلے میں سست عقیدہ ہو گئے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے۔[1]

1۔ ہفت تماشا/176۔

باب نہم

میر کا لکھنؤ میں آخری دور

(1810-1781)

میر دلی سے لکھنؤ کے لیے ہجرت کے بارے میں خود یوں بیان کرتے ہیں: ''فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جاؤں مگر اسباب و وسائل کا فقدان قدم نہیں نکالنے دیتا تھا۔ (بارے) میری عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر آصف الملک کو خیال آیا کہ میر میرے پاس نہیں آتا، نواب سالار جنگ پسر اسحاق خاں موتمن الدولہ نے جو اسحاق خاں نجم الدولہ کے چھوٹے بھائی اور وزیر الممالک کے خالو ہوتے تھے، ان پرانے روابط پر نظر کر کے جو میرے (سوتیلے) ماموں (خان آرزو) سے تھے، کہا، ''اگر نواب صاحب ازراہِ عنایت زادِ راہ کے لیے کچھ مرحمت فرمادیں (تو) میر ضرور آجائے گا۔ حکم ہوا کہ ایسا کیا جائے۔ انھوں نے سرکار سے زادِ راہ لے کر مجھے ایک خط لکھا'' نواب والا جناب تمھیں طلب فرماتے ہیں۔ جس طرح بھی بن پڑے خود کو یہاں پہونچاؤ۔'' میں تو دل برداشتہ بیٹھا ہی تھا۔ خط پاتے ہی لکھنؤ روانہ ہوگیا۔ چونکہ خدا کی امداد شامل حال تھی بغیر یار و مددگار اور قافلہ یا رہبر کے چند دنوں میں فرخ آباد پہونچا۔''

وہاں نواب مظفر جنگ[1] نے میر کی بڑی خاطر تواضع کی اور کچھ دنوں قیام کرنے کی درخواست

1۔ برائے حالات ملاحظہ ہو۔ عہد بنگش۔ از ولی اللہ فرخ آبادی (پاکستان۔ 1965) ص 169، 194۔

کی لیکن میر نے یہ درخواست قبول نہ کی۔ ایک دو دن کے قیام کے بعد لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔[1]

اس کے برعکس سعادت خاں ناصر لکھنوی نے میر کے اس سفر کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ میر بیل گاڑی میں روانہ ہوئے۔ اور حسنِ اتفاق سے ایک سنی بھی اس گاڑی میں سوار تھا۔ سوار ہوتے وقت اندھیرا ہو چکا تھا لہذا یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کون ہمراہ ہے۔ جب صبح ہوئی اور اس کی صورت دیکھی تو منھ اپنا دوسری طرف پھیر لیا۔ اور لکھنؤ تک اس کی طرف منھ پھیر کر نہ دیکھا۔[2] لکھنؤ پہنچنے کے بعد مسافروں کے قاعدہ کے مطابق میر ایک سرائے میں جا اترے، مرزا مغل سبقت[3] کا بیان ہے کہ وہ میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور شرف دست بوسی سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد مرزا مغل نے میر صاحب سے کچھ کلام سنانے کی فرمائش کی۔ میر صاحب نے بے تامل فرمایا۔

''کہ تمھارے بشرہ سے شعر فہمی معلوم نہیں ہوتی سخن کے ضائع کرنے سے کیا حاصل''[4]

ایک دوسرے موقع پر شاہ قدرت اللہ قدرت[5] اور میر صاحب کشتی پر سوار تھے۔ قدرت نے اپنے دیوان سے چند غزلیں پڑھیں اور بعد میں میر صاحب سے ملتمس ہوئے کہ وہ بھی کچھ سنائیں، ثانی الذکر نے کہا۔ ''صوابدید یہ ہے کہ تم دیوان کو دریا میں ڈال دو''[6] یہ تھا میر کا مزاج اور خودداری اور نازک مزاجی بلا کی تھی۔ ان کی بے دماغی کے چند واقعات احمد علی خاں یکتا نے

---

1. میر کی آپ بیتی/179-178۔

2. تذکرہ خوش معرکۂ زیبا (ق) ص 27 الف آب حیات/228، اس سفر میں غالباً میر کے ہمراہ میر ضیاء الدین ضیا تھے۔ ملاحظہ ہو، دلی کالج میگزین (میر نمبر جلد اول)۔

مرتبہ نثار احمد فاروقی (1962) ص 61.63۔ گمان غالب ہے کہ میر کی مثنوی ''ننگ نامہ'' اسی سفر کے بارے میں ہے۔ کلیات میر۔ ص 959.967۔

3. برائے حالات دیکھیے۔ تذکرہ ہندی/132۔

4. تذکرہ خوش معرکۂ زیبا/27 الف۔

5. برائے حالات ملاحظہ ہو، تذکرہ شعرائے اردو/133۔

6. تذکرہ خوش معرکۂ زیبا/27 الف۔

دستورالفصاحت[1] میں لکھے ہیں۔

محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ جس دن میر صاحب لکھنؤ پہنچے اسی دن کسی کے ہاں مشاعرہ تھا لہٰذا انھوں نے فوراً ایک غزل لکھی اور مشاعرہ میں جا شامل ہوئے۔ آزاد نے جس طرح یہ واقعہ لکھا ہے اسے قبول کرنے میں تامل ہو سکتا ہے۔ ایک تو میر نواب سالار جنگ کی دعوت پر گئے تھے۔ اس لیے لکھنؤ میں ان کا ورود کسی ''اجنبی'' کی طرح نہ ہوا ہوگا، دوسرے میر جیسا نازک دماغ انسان ایک طرف تو جو لوگ گھر پر کلام سننے آئیں انھیں یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گے[2] دوسری طرف وہ شہر کے ایک مشاعرے میں بغیر بلائے غزل لکھ کر پہنچ جاتا ہے اور سنانے پر اصرار کرتا ہے۔ واقع میں یقیناً کچھ رنگ آمیزی ہوئی ہے۔

محمد حسین آزاد نے جو قطعہ میر سے منسوب کیا ہے کہ انھوں نے فی البدیہہ کہا اور بر سر مشاعرہ پڑھا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

یہ قطعہ کلیات میر کے کسی قلمی یا مطبوعہ نسخے میں نہیں ہے لیکن بعد میں ایک قدیم قلمی بیاض کے حوالہ سے جناب نثار احمد فاروقی نے ثابت کیا ہے کہ یہ قطعہ میر ہی کا ہے[3]

اس کے بعد آزاد رقم طراز ہیں کہ یہ جان کر کہ موصوف میر صاحب تھے، حاضرین نے معذرت کی۔ ''صبح ہوتے ہوتے شہر میں مشہور ہو گیا کہ میر صاحب تشریف لائے ہیں رفتہ رفتہ

1. برائے تفصیل دیکھیے۔ دستورالفصاحت/25-26۔
2. آب حیات/243۔
3. دید و دریافت/190۔

نواب آصف الدولہ مرحوم نے سنا اور دو سو روپے مہینہ مقرر کر دیا،‘‘[1]

اس کے برعکس میر کا خود بیان ہے کہ ’’پہلے نواب سالار جنگ کے گھر گیا۔ خدا انھیں سلامت رکھے، انھوں نے میری بڑی عزت کی اور میرے لیے ضروری چیزیں بندگانِ عالی، (آصف الدولہ) سے کہہ کر بھجوا دیں،‘‘[2]

ان تینوں کے بیانات کی روشنی میں یہ بات کہیں نہیں ثابت ہوتی کہ میر صاحب نواب آصف الدولہ کے مہمان رہے یا نواب سالار جنگ کے، میر نے خود اس بات کی وضاحت نہیں کہ بلکہ ان کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ پہنچ کر ان کے ہاں مقیم نہیں ہوئے۔ میر کا محولہ بالا بیان ’’میرے لیے ضروری چیزیں بندگانِ عالی (آصف الدولہ) سے کہہ کر بھجوا دیں‘‘ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میر کہیں اور ٹھہرے تھے۔ اگر وہ اپنے کسی آشنا کے ہاں ٹھہرے ہوتے تو مصحفی کی طرح وہ بھی بیان کر دیتے۔ اس خاموشی سے پتا چلتا ہے کہ وہ سرائے ہی میں ٹھہرے ہوں گے۔ اس لیے ’’آبِ حیات‘‘ اور تذکرہ خوش معرکہٗ زیبا کے اندراجات کو سراسر غلط بھی نہیں کہا جا سکتا۔

خواجہ احمد فاروقی صاحب نے بھی آزاد کے بیانات کی تردید نہیں کی، بلکہ لکھا ہے ’’اس زمانے میں آزاد کی پہنچ جن تذکروں اور شہادتوں تک تھی آج ہماری نہیں۔ اس لیے اس کے ہر بیان کو بلا استثنا، ’’خیالی طوطے مینا‘‘ کہہ کر رَد کر دینا مناسب نہیں ہے۔[3]

میر کے خود کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نواب آصف الدولہ نے جتنے اشتیاق سے میر کو لکھنؤ بلایا تھا اتنی خواہش اور اشتیاق ان سے ملنے میں نہیں دکھایا۔ میر لکھنؤ پہنچ گئے۔ نواب سالار جنگ سے ملاقات بھی ہوئی۔ انھوں نے میر کی بڑی عزت کی اور ضروری سامان مہیا کرا دیا۔ نواب کو میر کے ورود کی اطلاع بھی مل گئی مگر ملاقات چار پانچ روز بعد اور وہ بھی دربار میں نہیں بلکہ مرغ بازی کے میدان میں اور حسن اتفاق سے میر اس واقعہ کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

’’چار پانچ روز کے بعد اتفاقاً نواب عالی جناب مرغ لڑانے کے لیے تشریف لائے، میں

---

1. آب حیات/229-228۔

2. میر کی آپ بیتی/180-179۔

3. میر تقی میر حیات اور شاعری/249۔

بھی وہاں موجود تھا، حاضر خدمت ہوا، فراست سے تاڑ لیا اور فرمانے لگے، "میر تقی ہو؟" پھر بڑی عنایت سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ اپنی نشست گاہ پر لے گئے۔ اور مجھے مخاطب کر کے اپنے اشعار سنائے۔ میں نے کہا سبحان اللہ، بادشاہوں کا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے،، فرط مہربانی سے مجھے بھی شعر خوانی کا موقعہ دیا، اس روز میں نے غزل کے چند شعر کہے، جب نواب صاحب اٹھ کر جانے لگے تو نواب سالار جنگ نے کہا کہ "میر حسب الطلب آئے ہیں اور بندگانِ عالی مختار ہیں انھیں کوئی جگہ عنایت فرمائیں اور جب مرضی مبارک ہو خدمت میں بلوا بھیجیں"۔ نواب آصف الدولہ نے فرمایا۔ میں کچھ (تن خواہ) مقرر کر کے تمھارے پاس بھیج دوں گا۔" دو تین دن بعد یاد فرمایا تو میں حاضر ہوا اور مدح میں جو قصیدہ کہا تھا وہ سنایا، سماعت فرمایا اور بڑی عنایت سے اپنے ملازموں کی صف میں داخل کر لیا۔ اور اب تک میرے حال پر عنایت و مہربانی فرماتے ہیں،،[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے دو نتائج نکلتے ہیں، اول، لکھنؤ میں میر کی قدر و منزلت تو ضرور[2] ہوئی مگر نواب نے میر کا وہ خیر مقدم نہیں کیا جیسا اسے کرنا چاہیے تھا کیونکہ اس نے میر کو بڑے اشتیاق سے بلوایا تھا۔ علاوہ ازیں بعد میں نواب کو غالباً یہ خیال بھی نہ رہا تھا کہ انھوں نے میر کو بلایا ہے۔ کیونکہ جب نواب اور میر کی پہلی ملاقات ہوئی تو نواب سالار جنگ نے نواب کو یاد دہانی کرائی کہ میر "حسب الطلب آئے ہیں" دوم، میر کا قیام نہ تو نواب کے ہاں تھا اور نواب سالار جنگ کے یہاں۔

میر نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ان کو ملازمین کی صف میں نوکر کر لیا گیا مگر کہیں یہ نہیں لکھا کہ ان کی تنخواہ کیا مقرر ہوئی۔ دوسرے تذکرہ نگاروں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سو یا تین سو[3] روپے ماہوار ان کی تنخواہ مقرر ہوئی تھی، اور تحسین خاں ناظر کے سپرد کیے گئے تھے[4] غالباً میر

1. میر کی آپ بیتی/180-179۔
2. تذکرہ ہندی/204۔
3. آب حیات/229۔
4. تذکرہ گلشن ہند/210 ۔

اس تنخواہ سے خوش نہ تھے اس لیے انھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ اس زمانے کے لحاظ سے یہ تنخواہ کم نہیں تھی۔[1]

بڑی حیرت کی بات ہے کہ میر 29 سال لکھنؤ میں رہے اور وہیں سپردِ خاک ہوئے لیکن نہ تو انھوں نے خود اور نہ کسی ہم عصر صاحب علم وفضل نے ان کے حالات مفصل لکھے ہیں۔ اور نہ ہی ان کے کلام سے اس بات کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے کہ لکھنؤ میں میر کی زندگی کس ڈھب سے گزری۔ ان کے اشعار سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ میر لکھنؤ میں خوش نہ تھے اور ان کے اشعار سے یہاں سے بے زاری کی نشان دہی ہوتی ہے۔ وہ ''متاعِ ہنر'' پھیر کر لے جانا چاہتے تھے۔ وہ اشعار بعد میں پیش کیے جائیں گے، تذکرہ گلشن ہند اور تذکرہ خوش معرکۂ زیبا میں جو کچھ تھوڑا بہت میر کے حالات میں ملتا ہے اس سے میر اور نواب آصف الدولہ کے آپسی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں لکھنؤ میں میر کی زندگی کی صحیح تصویر نہیں ملتی اور ہم عصر تذکروں کی بنیاد پر کوئی واضح تصویر تیار نہیں کی جاسکتی۔ محولۂ بالا تذکروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر اور نواب آصف الدولہ کے تعلقات خوش گوار نہ تھے اس کی وجہ میر کی خودداری اور نازک مزاجی ہوسکتی ہے۔[2] محمد حسین آزاد لکھتے ہیں: ''عظمت واعزاز جوہر کمال کے خادم ہیں، اگرچہ انھوں نے لکھنؤ میں بھی میر صاحب کا ساتھ نہ چھوڑا، مگر انھوں نے بد دماغی اور نازک مزاجی کو جوان کے ذاتی مصاحب تھے، اپنے دم کے ساتھ ہی رکھا چنانچہ کبھی کبھی نواب کی خدمت میں جاتے تھے۔''[3]

نواب آصف الدولہ کے کردار کا پہلے جائزہ لیا جاچکا ہے جس سے یہ تصویر بنتی ہے۔ حالانکہ نواب علم وادب، فن اور فنکاروں کی سرپرستی کرتے تھے مگر اپنے لہو ولعب وتغافل شعاری کی بنا پر

---

1. میر تقی میر، حیات اور شاعری/224-225۔

2. عقد ثریا میں مصحفی میر کی نازک مزاجی کے بارے میں لکھتا ہے ''باوجود عیال داری توکل اختیار کردہ۔ روئے نیاز بہ ایں تو کیسہ بائے چند نمی آرد، واز بسکہ از بنائے زمانہ کسے را مخاطب صحیح نمی پندارد و سخن بہر کس و ناکس نمی کند، ازیں جہت اعزہ او را کج خلق و بر خود غلط و انصاف دشمن قرار می دہند،، ص 54-53۔

3. آب حیات/229۔

اور مزید برآں، بہر حال دماغ ایک نواب کا پایا تھا، ان فنکاروں کی ویسی عزت اور قدر دانی نہیں کر پاتے تھے جو ان کے شایان شان ہوتی، جو میر جیسے خوددار شاعر کے لیے بے حد گراں گزرتی تھی۔ میر جن امیدوں کو لے کر لکھنؤ آئے تھے، ان پر پانی پھر گیا، روزی کا انتظام تو ہو گیا مگر قدر و عزت نہ ملی ہوگی جس کے لیے میر اتنا دور دراز کا سفر طے کر کے اور سفر کی صعوبتیں اٹھا کر یہاں آئے تھے۔ غالباً میر کو اس بات کا احساس نواب سے پہلی ملاقات کے بعد ہی ہو گیا ہوگا۔ اس لیے وہ دربار میں کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔ مرزا علی لطف کا بیان ہے ''اگر چہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی نہ قصور ہوا۔[1]

مولانا محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ ایک دن نواب نے میر سے ایک غزل کی فرمائش کی، دوسرے تیسرے دن جب وہ نواب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے پوچھا کہ میر صاحب'' ہماری غزل لائے؟ میر صاحب نے تیوری بدل کر کہا۔

'' جناب عالی! مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہیں نہیں، کہ کل آپ نے فرمائش کی آج غزل حاضر کر دے، اس فرشتہ خصال نے کہا خیر میر صاحب، جب طبیعت حاضر ہوگی کہہ دیجیے گا،،[2]

سعادت خاں ناصر لکھنوی ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں:۔

ایک دن نواب صاحب کتب خانہ میں تھے اور دواوین زیر و بالا رکھے ہوئے تھے۔ ایک جلد نواب کے ہاتھ سے بہت دور تھی اور میر صاحب سے نزدیک۔ نواب نے فرمایا'' مجھے اٹھا دیجیے،، میر صاحب کو یہ ارشاد ناگوار گزرا اور انھوں نے ایک خادم سے کہا جو وہاں موجود تھا،، سنو، تمھارے آقا کیا فرماتے ہیں،، نواب نے راست ہو کر وہ جلد اٹھا لی مگر یہ بات ان کو بہت ناگوار خاطر ہوئی، مگر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا، چند لمحوں کے بعد فرمایا'' میر صاحب، مرزا رفیع سودا کیسے شاعر ہیں مسلم الثبوت تھا'' میر صاحب نے جواب دیا، بجا ہر عیب را کہ سلطان بہ پسندد ہنر است،، نواب نے کہا کہ'' ہم عیب پسند ہیں'' اسی دوران میں میر سوز جو نواب کے استاد تھے، واسطے مجرا کے حاضر

---

1. تذکرہ گلشنِ ہند/210۔
2. آب حیات/229۔

ہوئے۔حضور نے فرمایا،، کچھ اپنے شعر پڑھو،، حسب الحکم میر سوز نے اپنی دو تین غزلیں پڑھیں، نواب نے تعریف کی اور اس بارے میں مبالغہ فرمایا، میر صاحب کو میر سوز کی دلیری اور نواب کی تعریف بہت ناگوار گزری۔ میر سوز سے کہا ''تمھیں اس دلیری پر شرم نہ آئی،، میر صاحب نے آگے کہا'' صاحب بندہ کیا، میں شاہ جہاں آباد میں بھاڑ جونکتا تھا، بزرگی اور شرافت میں تمھاری کیا تامل مگر شعر میں میری کسی کو ہمسری نہیں، موقع اور محل تمھاری شعر خوانی کا وہ ہے جہاں لڑکیاں جمع ہوں اور ہنڈکلیاں پکتی ہوں نہ کہ میر تقی کے سامنے،، میر سوز سے تو یہ کہا اور وہ شقہ جو میر کی طلب کا حضور نے لکھا تھا جیب سے نکال کر حضور کے سامنے رکھ دیا اور یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے خانہ آباد دولت زیادہ، نواب صاحب نے فرمایا'' خدا حافظ'' دو تین مہینے بعد تحسین علی خاں نے نواب سے میر کی تنگی اور عسرت اور غریب الوطنی کا تذکرہ کیا، نواب صاحب نے پہلے تو میر کی بے اعتنائی کا گلہ وشکوہ کیا لیکن خواجہ سرا اور ناظر کی شفاعت قبول فرمائی، تحسین علی خاں خوشی خوشی میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور نواب سے جو اس کی گفتگو ہوئی تھی، وہ بیان کی میر صاحب نے ایک خواجہ سرا کی معرفت دربار میں جانا اپنے لیے کسر شان سمجھا اور دربار میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ایک دن کا ذکر ہے کہ نواب صاحب عتیق اللہ کے امام باڑہ کی طرف تشریف لائے۔ تحسین علی خاں کو اشارہ کیا کہ وہ میر صاحب کو منالائیں۔خواجہ سرا نے میر صاحب سے درخواست کی'' چلو، تمھارے لینے کو حضور آئے ہیں،،[1]

اس کے برعکس محمد حسین آزاد نے نواب اور میر کے تعلقات میں کشیدگی کا دوسرا واقعہ لکھا ہے۔ان کا بیان ہے کہ ایک دن نواب نے میر کو بلوایا، جب میر وہاں پہنچے تو نواب صاحب ایک حوض کے کنارے کھڑے پانی میں مچھلیوں کے تیرنے کے منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔میر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ان سے کچھ کلام سنانے کی فرمائش کی، میر صاحب نے ایک غزل سنانی شروع کی، نواب صاحب سنتے بھی جاتے اور اپنی چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے کھیلتے بھی جاتے، میر صاحب چیں بہ چیں ہوتے، اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے تھے۔نواب صاحب کہے جاتے تھے، کہ ہاں پڑھیے۔آخر چار شعر پڑھ کر میر صاحب ٹھہر گئے۔اور بولے پڑھوں کیا،

1۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا ص 28 الف دب۔

آپ مچھلیوں سے کھیلتے ہیں متوجہ ہوں تو پڑھوں، نواب صاحب نے کہا جو شعر ہوگا، آپ متوجہ کرلے گا۔ میر صاحب کو یہ بات زیادہ تر نا گوار گزری، غزل جیب میں ڈال کر گھر کو چلے آئے۔ اور پھر...... جانا چھوڑ دیا،، چند دنوں کے بعد ایک دن کا واقعہ ہے کہ میر صاحب بازار میں جارہے تھے کہ اتفاقاً نواب کی سواری کا گزر ہوا۔ دیکھتے ہی بڑی محبت سے کہا'' میر صاحب آپ نے بالکل ہی آنا چھوڑ دیا، کبھی تشریف بھی نہیں لاتے،، میر صاحب نے کہا'' بازار میں باتیں کرنا آداب شرفا نہیں'' یہ کیا گفتگو کا موقع ہے،، غرض بدستور اپنے گھر میں بیٹھے رہے اور فقر و فاقہ میں گزارتے رہے۔[1]

تذکرۂ گلشن ہند کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانے میں میر صاحب نے نواب آصف الدولہ سے قطع تعلقی اختیار کرلی تھی، مرزا علی لطف رقم طراز ہیں'' روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی، لیکن تنخواہ میں کبھی نہ قصور ہوا اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہدِ وزارت میں آج کے دن تک 1215 / 1800-1801 وہی حال ہے جو اوپر مذکور ہوا۔،،[2]

محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ نواب آصف الدولہ کے دربار سے قطع تعلق ہونے کی وجہ سے غالباً میر گم نامی کے شکار ہوئے اور نواب سعادت علی خاں کو اپنی مسند نشینی کے بعد یہ خیال نہ رہا کہ میر صاحب بھی دربار سے وابستہ تھے۔ ایک روز نواب صاحب کی سواری جارہی تھی۔ میر صاحب، تحسین کی مسجد پر سرِ راہ بیٹھے ہوئے تھے۔ سواری سامنے آئی، سب کھڑے ہوگئے مگر میر صاحب اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انشا اور رنگین نے جو نواب کے ساتھ خواصی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب موصوف کو بتایا کہ وہ میر صاحب تھے۔ رنگین نے انشا کی وساطت سے میر صاحب کو راضی کیا اور وہ کبھی کبھی دربار میں جانے لگے۔[3]

ان تمام تذکروں کے بغور مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں میر صاحب کو بڑی عسرت، تنگ دستی اور افلاس میں اپنی زندگی گزارنی پڑی۔ آخری زمانے کے اپنے حالات کے بارے میں

1. آب حیات ص230۔
2. تذکرہ گلشن ہند/210۔
3. آب حیات/244۔

میر صاحب خود لکھتے ہیں۔

''اس تھوڑی سی مدت میں اس ایک قطرہ خون نے جسے دل کہتے ہیں، طرح طرح کے ستم جھیلے اور تمام خون ہو گیا۔ میرا مزاج ناساز تھا۔ ہر شخص سے ملنا جلنا چھوڑ دیا، اب بڑھاپا آ گیا ہے یعنی عمر عزیز ساٹھ سال کی ہو چکی ہے۔ اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں۔ کچھ دن آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا رہا۔ بینائی کمزور ہو گئی اور عینک کی ضرورت پڑی۔ میں نے کفِ افسوس ملے۔ اور اس شعر کو یاد کر کے ذوقِ نظر چھوڑ دیا کہ:

دیدہ چوں محتاجِ عینک گشت فکرِ خویش کن

برنفس دارند روزِ واپسیں آئینہ را

اور دانتوں کے درد کی بات کیا کہوں۔ حیران تھا کہ کب تک علاج کروں، آخر مجبور ہو کر ایک ایک دانت جڑ سے اکھڑوا دیا۔

روزی خود رابرنج ازدرد دنداں می خورم

نان بخوں ترمی شود تاپارۂ نان خورم

غرض کہ ضعفِ قویٰ، بے دماغی، ناتوانی، دل شکستگی اور آزردہ خاطری سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بہت دن نہ جیوں گا، زمانہ بھی (زندہ) رہنے کے لائق نہیں رہا ہے۔ اب اس سے دامن کھینچ لینا ہی اچھا ہے۔ اگر خاتمہ بخیر ہو جائے تو یہی آرزو ہے ورنہ اختیار تو اسی (ذاتِ بے ہمتا) کے ہاتھ ہے۔''[1]

لکھنؤ کے سوقیانہ اور پوچ ماحول میں وہ کم و بیش گم نامی میں رہے اس دور میں لکھنؤ میں اکثر و بیشتر مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ لیکن کسی میں بھی میر صاحب کی موجودگی کا ذکر نمایاں حیثیت سے دستیاب نہیں ہوتا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میر صاحب وہاں کے مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے ہوں گے کیونکہ وہ مشاعرے بالعموم رزمی میدان بن جاتے تھے۔ شاعر آپس میں ایک دوسرے کی ہجو کہتے، اور ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کے درپے ہوتے اور کلام بھی ایسا پڑھا جاتا جو ابتذال اور فحاشی سے پُر ہوتا تھا۔ اشعار کے حسن اور تخیلات کے پرواز کی داد دینے والے کہاں

1. میر کی آپ بیتی/192-191۔

تھے۔ میر زمانہ کے مزاج کے مطابق شعر نہ کہہ پاتے ہوں گے، اور عام پسند شعر کہنا اپنے لیے کسرِ شان سمجھتے ہوں گے، مرزا قتیل کے رقعات تقریباً 1225ھ تا 1227ھ میں لکھے گئے تھے۔ اپنے ایک دوست کے نام ایک خط میں مرزا قتیل نے ایک مشاعرہ میں میر صاحب[1] کی شرکت کا ذکر کیا ہے۔ مگر اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ آیا وہ میر تقی میر ہی تھے یا کوئی دوسرا شاعر تھا۔ مگر بعد کی عبارت سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالباً یہاں مرزا قتیل نے میر تقی میر کی طرف اشارہ کیا ہے ''خنجرہ میر صاحب باوصف خوش گوئی بدستور بودہ است، تمام جسمِ مبارک ایشاں رعشہ داشت، و آواز را ہم کسی نمی شنید لیکن من وخدا کہ غزلہا خوب گفتہ بود،''[2] اس عبارت سے قیاس ہوتا ہے کہ غالباً میر صاحب اپنی ضعیف العمری کے باوجود کسی مشاعرے میں شریک ہوئے ہوں۔

میر کے کلیات میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ میر لکھنؤ جا کر پشیمان تھے اور وہاں کی زندگی اور ماحول سے بیزار تھے[3] اور یہ بیزاری نواب آصف الدولہ کے بعد اور بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہو، جس میں میر نے نواب آصف الدولہ کی تحسین و توصیف بیان کیے ہیں اور آخر میں اپنی بے قدری[4] کا نوحہ لکھا ہے:

پئے آصف الدولہ میں نے بھی میر کیے صیدنامے بہت بے نظیر
مگر نام نامی یہ مشہور ہو گئے پر بھی لوگوں میں مذکور ہو

---

1. یہاں میر انشاءاللہ کی طرف اشارہ نہیں ہے کیونکہ مرزا قتیل نے انشا کو کبھی بھی میر صاحب کہہ کر مخاطب نہیں کیا بلکہ ہمیشہ خاں صاحب کہتے تھے اور لکھا بھی یہی کرتے تھے، رقعات مرزا قتیل/ص 71 ''احوال خاں مزبور''

2. رقعات مرزا قتیل/54۔

3. میر کے کردار کے بارے مفصل مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو، میر تقی میر، حیات اور شاعری/ص 409.414۔

4. اپنے عہد میں شاعروں کی بے قدری کا مرثیہ مصحفی نے بھی لکھا ہے۔ ویسے ہر شاعر کے ہاں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن سے ہنروروں کی بے قدری کا علم ہوتا ہے۔

نکتہ چین اب تو سخن پر بھی سخن رکھتے ہیں قدر تھی اگلے زمانے میں سخن والوں کی
قدرِ ہنر کی جو ہوئی دیکھ لی اب ہنر بے ہنری کیجیے

(دیوان مصحفی سوم (ق۔ ر) ص 73 ب بقیہ صفحہ 546 پر)

زہے آصف الدولہ، داد گر سخن درنواز اور عاشق ہنر

اس کے بعد میر نے نواب کی سخاوت اور عدل گستری کی تعریف اور ان کی طول عمر کی دعا کی ہے اور پھر کہتے ہیں۔

قفائے غزل اک رباعی کہو سخن آگے موقوف چپکے رہو
بہت کچھ کہا کرو میر بس کہ اللہ بس اور باقی ہوس
جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا خریدار لیکن نہ پایا گیا
متاع ہنر پھیر لے کر چلو
بہت لکھنؤ میں رہے بس گھر چلو[1]

مصحفی نے لکھا ہے کہ لکھنؤ میں میر کی وہ قدر نہ ہوئی جس کا مستحق تھا۔

"درعہد فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) اکثر ارکان پایہ تخت (دہلی) ہو کسانے کہ نسبت داشتند اور تعظیم و توقیر بمراتب بہتر از دگراں می کردند اکنوں کہ بایں خرابہ کسے درمیان نیست و زمانہ از قدر دان یکلی خالی شد"[2]

یہی وجہ تھی کہ میر دلی واپس جانے "متاع ہنر" پھیر لے جانے کے لیے بیکل تھے۔ اس بے چینی کا پتا ان کے ذیل کے اشعار سے چلتا ہے۔

آباد اجڑا لکھنؤ چغدوں سے اب ہوا
مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بودوباش
خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مرجاتا، سراسیمہ نہ آتا یہاں[3]

بقیہ حاشیہ صفحہ 545 کا)..

کون ہے ان باتوں کا مانع میاں خوب سی بیداد گری کیجیے

(دیوان مصحفی سوم/187 الف۔

---

1. کلیات میر (مرتبہ آسی) ص 882۔

2. عقد ثریا/53-54۔ شعرا کی بے قدری کے لیے دیکھیے، مجموعہ نغز 1/ 17-16۔

3. کلیات میر/356۔

مربوط کیسے کیسے کہے ریختے والے   سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزر
کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حال زار
خاک دلی سے جدا ہم کو کیا یک بارگی
آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار
منصب بلبل غزل خوانی تھا سو تو ہے اسیر
شاعری زاغ وزغن کا کیوں نہ ہووے اب شعار
کیا قدر تھی سخن کی جب یاں بھی صحبتیں تھیں
ہر بات جائزہ ہے ہر بیت پر صلے ہیں
ہیں دلی لکھنؤ کے خوش اندام لیک
راہ وفا و مہر ہے مسدود ہر جگہ
اب بھی دماغ رفتہ ہمارا ہے عرش پر
گو آسماں نے خاک میں ہم کو ملادیا
برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجھ کو لیک
بانکے چلن سے رکھتا ہوں عزم سفر ہنوز
تاجر ترک فقیر ہوئے اب شاعر عالم کامل ہیں
پیش گئی میر نہ اپنے سوانگ بہت سے لائے ہیں

لکھنؤ میں شعرا کی بے قدری کا مرثیہ مصحفی نے بھی لکھا ہے:

اے مصحفی مت پوچھ کہ دلی سے نکل کر   کیا کہیے کہ ہم کتنے پشیمان ہوئے ہیں [1]
مصحفی لکھنؤ میں آیا دلی سے   آیا طے کر کے راہ دور و دراز
لیکن اب خاک میں بھی اس نے کہیں   کچھ نہ دیکھا بجز نشیب وفراز [2]

---

1 دیوان مصحفی (مرتبہ حسرت موہانی) ص61۔

2 دیوان مصحفی ص49۔

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے
میں کہاں کہاں یہ لکھنؤ کی خلعت اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے[1]

میر کے کلام کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا کہ فلاں غزل یا مثنوی وغیرہ دلی میں کہی تھی یا لکھنؤ میں بڑا مشکل ہے۔ میر نے اگر ہر غزل یا اپنے دوسرے صنف سخن کے ساتھ اگر سنہ تحریر لکھ دیا ہوتا تو ہماری مشکل بڑی آسان ہو جاتی اور ہم بڑی آسانی سے میر کے اپنے عہد کے تاثرات کا اندازہ لگا سکتے تھے۔ ایسی صورت میں صرف قیاس کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے۔ مثلاً مثنوی مسمیٰ بہ تنبیہ الجہال میں شاعروں پر طنز کیا ہے کیونکہ اس زمانے میں ہر کس و ناکس شاعری کرنے لگا تھا۔[2] جس کی وجہ سے ادبی ماحول پراگندہ ہو گیا تھا۔[3] ہم عصر تذکروں اور شعرا کے کلام میں اس کے خلاف ردِعمل پایا جاتا ہے۔ لکھنؤ میں بھی یہی حال تھا۔ بہت ممکن ہے کہ میر نے یہ مثنوی لکھنؤ میں لکھی ہو اور وہاں کے شعرا پر طنز کیا ہو۔

گر چمار اس کارخانہ میں نہ ہو ٹوٹے جوتے کو کہاں لے کر پھرو
چار و ناچار اس کنے جانا پڑے کوڑیاں دے جوتی گٹھوانا پڑے
حاجت اس فرقے سے مطلق یاں نہیں جو نہ ہو شاعر تو کچھ نقصان نہیں[4]

میر کی وفات

میر کی تاریخ وفات میں اختلاف نہیں ہے لیکن عمر کے بارے میں ضرور ہے۔[5] میر کی وفات

---

1. دیوان مصحفی ص101۔

2. تذکرہ شعرائے اردو (مقدمہ) ص14.16 قدرت اللہ قاسم اپنے زمانے کے شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "از حال ایں زماں چہ برطرازم واز قال ومقال ایں دوراں چہ برنگارم کہ دریں ماتم خانہ سینہ چاک نمودہ سیاہ می کند کاغذ جگر پارہ فرسودہ شکن بر پیشانی می افگند، بہر سو کہ می نگرم شاعرے می بینم و بہر طرف کہ گوش فرامی کنم زمزمہ شعری شنوم وطرفہ ایں است کہ باہم نااہلیبا ہر یک دم از ملک الشعرائی زند و خود را ہمسر بلکہ برتر از دانایانِ ایں فن می شمرد،، مجموعہ نغز 1 / ص16۔

3. مجموعہ نغز 1 / اس فن شریف بدست جاہلان افتاد، بجوم عامیان مرتبہ ایں فرقہ راشکست،، ص/16۔

4. کلیات میر/825۔

5. ملاحظہ ہو۔ کلیات میر (مرتبہ آسی) مقدمہ، ص6-7، تذکرہ ہندی کی تصنیف کے وقت یعنی 1209 / 1794 میں میر صاحب کی عمر اسی سال لکھی ہے۔

پر ناسخ نے اس مصرعہ سے تاریخ نکالی تھی۔ ''واویلا مردشہ شاعراں'' [1]

اس سے 1225ھ/1810 نکلتی ہے۔ میر کا انتقال 20رشعبان 1225 / 1810 کو ہوا تھا۔ 21رشعبان کی دوپہر کو اکھاڑہ بھیم سین میں اپنے اقربا کی قبروں کے درمیان مدفون ہوئے۔ [2] تذکرہ خوش معرکۂ زیبا میں لکھا ہے کہ آخری زمانے میں میر صاحب کو ولولۂ عشق پیدا ہوا'' اور صورت کسی کی آئینۂ خورشید میں معائنہ ہوئی، پیر جوان ہمت ایسوں کو کہتے ہیں۔ کسی نے پوچھا کہ اس پیرانہ سالی میں کدخدا ہونے کا کیا باعث ہوا، فرمایا فقط اس واسطے کہ سسرال والے کہیں لڑکا آیا، جب مرض الموت کے بیمار ہوئے وصیت کی کہ میرے جنازہ کو اٹھانے میں تعمل (تامل) نہ کرنا۔ جو سنے گا کہ میری رحلت ہوئی ہے۔ خواہ مخواہ نقد اور سامان معقول بھیجے گا۔ بموجب وصیت کے صبح سے شام ہوئی۔ کسی نے کچھ نہ بھیجا۔ آخر شیخ ناسخ کی اعانت زاد آخرت ہوئی،، [3]

میر کی قبر

میر کی قبر کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لکھنؤ میں اب اس کا پتہ نہیں ہے اور نہ اس مقام کی نشاندہی ممکن ہے۔ جہاں میر کو دفنایا گیا تھا۔ جناب شریف الحسن عثمانی صاحب اپنی یادداشت کی بنا پر میر کی قبر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی طالب علمی کے

---

1. آب حیات/230 مصحفی نے میر کی رحلت پر یہ تاریخی قطعہ کہا تھا۔

وہ محمد تقی میر کہ تھا ریختہ میں ہر ایک کا سرتاج
ہند جنت نشان رکھتے تھے غزل عاشقانہ اس سے رواج
خرمن عمر اس کا برق اجل گر گئی جس دم آن کرتاراج
از میر درد مصحفی نے کہا حق میں اس کے موانظیری آج

دیوان مصحفی ششم (قلمی رام پور) ص538۔

2. کلیات میر (مقدمہ (ص8۔

3. تذکرہ خوش معرکۂ زیبا/28ب، میر نے اپنی آپ بیتی میں آخری زمانے کی اپنی حالت کی مجملاً عکاسی کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ میر کی آپ بیتی/192-191۔

زمانے میں میر کی قبر دیکھی تھی اور اس پر فاتحہ بھی پڑھی تھی، بیس سال قبل جناب شریف الحسن عثمانی صاحب گورنمنٹ جبلی انٹر کالج لکھنؤ میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور ڈالی گنج میں رہا کرتے تھے۔ ڈالی گنج سے کالج جانے میں اس ریلوے چھتہ کے نیچے سے گزرنا پڑتا تھا۔ جس سے ایک سڑک میڈیکل کالج کو چلی جاتی ہے۔ جواب جگت نرائن روڈ کہلاتی ہے۔'' دوسری سڑک جبلی کالج کو جاتی ہے۔ ریلوے چھتہ کے پاس بائیں جانب ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ اس سے ملا ہوا ایک قبرستان کچی پکی قبروں کا تھا۔ اسی قبرستان میں میر کی قبر تھی۔ سفید پتھر کا کتبہ تھا۔ قبر چبوترے کے ساتھ نہایت خستہ حالت میں تھی۔ اس قبرستان میں شہر اسٹیشن سے لائن پار کر کے بھی آیا جا سکتا تھا۔ جب طلبا کی نگرانی ہونے لگی تو سگریٹ پینے والے طلبا کا اڈہ قبرستان میں جمنے لگا۔ یہ اڈہ میر کی قبر کے پاس ہی جمتا تھا۔،،

1947 کے بعد لکھنؤ میں بھی نئی نئی کالونیاں جگہ جگہ بن گئیں۔ اس قبرستان میں بھی کچے پکے مکانات بن گئے۔ پرانے نقشہ کی روشنی میں اب جو جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ میر کی قبر کی جگہ ایک مکان کا پائخانہ تعمیر ہے۔ اس طرح میر کی قبر کا نام ونشان بھی مٹ گیا۔ اور اب میر کی قبر لاپتہ ہے۔[1]

---

1. ملاحظہ ہو۔ مراسلہ جناب شریف الحسن عثمانی۔ ہماری زبان (جلد 27، شمارہ 18، مئی 1968 ص 7۔
مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے۔ خواجہ احمد فاروقی۔ میر تقی میر، حیات اور شاعری۔ علی گڑھ 1954 ص 260،264۔

اہم ماخذوں کی فہرست

فارسی

احوال الخواقین	محمد قاسم اورنگ آبادی	روٹوگراف۔علی گڑھ یونیورسٹی
اخبار محبت	محمد بن فیض عطا خاں	روٹوگراف۔علی گڑھ یونیورسٹی
احوال محمد شاہ تا آصف الدولہ	منشی مترسین	(قلمی) عبدالسلام کلیکشن۔علی گڑھ یونیورسٹی
انفاس العارفین	شاہ ولی اللہ دہلوی	مطبع احمدی دہلی
اقتباس وقائع بدائع	آنندرام مخلص	اورینٹیل کالج میگزین، اگست 1950 لاہور
ارشاد الطالبین	ثناء اللہ پانی پتی	(قلمی) سلیمان کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی
بیاض یوسف علی خاں	یوسف علی خاں	(قلمی) مملوکہ جناب قاضی عبدالودود، پٹنہ
بیان وقائع نادرشاہ	خواجہ کریم الدین	(قلمی) عبدالسلام کلیکشن، یونیورسٹی، علی گڑھ
تذکرہ نتائج الافکار	محمد قدرت اللہ گوپاموی	(قلمی) حبیب گنج کلیکشن $\frac{51}{19}$۔ علی گڑھ یونیورسٹی
تذکرۃ الملوک	یحییٰ خاں میر منشی فرخ سیر بادشاہ	روٹوگراف، علی گڑھ یونیورسٹی
تاریخ مظفری	محمد علی خاں	(قلمی)۔علی گڑھ یونیورسٹی

تاریخ ہندی	رستم علی بن محمد خلیل شاہ آبادی	روٹوگراف، علی گڑھ یونیورسٹی
تاریخ شہادت فرخ سیر	مرزا محمد بخش آشوب،	روٹوگراف، علی گڑھ یونیورسٹی
بادشاہ وجلوس محمد شاہ		
تاریخ چغتائی	محمد شفیع	روٹوگراف، علی گڑھ یونیورسٹی
تاریخ جہاں کشای نادری	محمد مہدی بن محمد نصیر الہ آبادی	مطبع حیدری، بمبئی 1875
تاریخ راحت افزا	سید محمد علی الحسینی بن صادق الحسین	اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد
تاریخ محمدی	مرتبہ، مولانا امتیاز علی خاں عرشی	علی گڑھ
تاریخ سعادت جاوید	ہرنام سنگھ نامی	روٹوگراف، علی گڑھ یونیورسٹی
تاریخ محتشم	محمد محتشم خاں	(قلمی) خدا بخش لائبریری پٹنہ
تاریخ فرح بخش		
(تاریخ رام پور)	شیو پرشاد	(قلمی) عبدالسلام کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی
تاریخ ممالک ہندستان	غلام باسط	روٹوگراف، علی گڑھ یونیورسٹی
تاریخ احمد شاہ	مصنف نامعلوم	روٹوگراف، علی گڑھ یونیورسٹی
تاریخ عالمگیر ثانی	مصنف نامعلوم	(قلمی) خدا بخش لائبریری، پٹنہ
تذکرہ طبقات الشعرا	قدرت اللہ شوق	
	مرتبہ نثار احمد فاروقی،	مجلس ترقی ادب لاہور
تفضیح الغافلین	ابو طالب لندنی	مرتبہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار، رام پور 1965
تذکرہ علمائے ہند	رحمان علی صاحب	مطبع نول کشور پریس لکھنؤ، 1914
تذکرہ مجمع الانتخاب	شاہ محمد کمال	(قلمی) انجمن ترقی اردو، لائبریری، علی گڑھ
تذکرہ ریاض الفصحا	غلام ہمدانی مصحفی	برقی پریس دہلی، 1934
	مرتبہ مولوی عبدالحق	
تذکرہ ید بیضا	غلام علی آزاد بلگرامی	(قلمی) ضمیمہ فہرست فارسیہ سبحان اللہ کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی

تکملہ سیر الاولیا	خواجہ گل محمد احمد پوری	مطبع رضوی، دہلی 1312ھ
تذکرہ ریختہ گویان	سید فتح علی گردیزی	
	مرتبہ مولوی عبدالحق	اورنگ آباد دکن، 1933
تذکرہ ہندی	غلام ہمدانی مصحفی	
	مرتبہ مولوی عبدالحق	جامع برقی پریس دہلی 1993
تاریخ مبارک نامہ	میر مبارک اللہ اعظم خاں	(قلمی) عبدالسلام کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی
تذکرہ مشاہیر عالم	مصنف نامعلوم	(قلمی) انجمن ترقی اردو، علی گڑھ
تاریخ شاکر خانی	شاکر خاں بن شمس الدولہ	روٹوگراف، علی گڑھ یونیورسٹی
تذکرہ شعرائے اردو	میر حسن دہلوی	
	مرتبہ حبیب الرحمان خاں شیروانی	دہلی 1940
تذکرہ گلزار ابراہیم	نواب امین الدولہ علی ابراہیم خاں	(قلمی) رضا لائبریری، رام پور
تذکرۃ الشعرا	میر غلام حسن، حسن	(قلمی) رضا لائبریری، رام پور
تذکرہ مردم دیدہ	عبدالحکیم لاہوری	(قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ
تاریخ چہار گلشن محمد شاہی	رائے چتر من کایستھ	(قلمی) فہرست لٹن، علی گڑھ یونیورسٹی
تذکرہ نتائج الافکار	محمد قدرت اللہ گوپاموی	(قلمی) حبیب گنج، علی گڑھ یونیورسٹی
ثمرات البدائع	مرزا محمد حسن قتیل	مطبع محمدی 1261ھ
جام جہاں نما	شیخ قدرت اللہ	(قلمی) رضا لائبریری، رام پور
چہار گلزار شجاعی	ہرچرن داس	روٹوگراف، علی گڑھ یونیورسٹی
چمنستان الشعرا	لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی	انجمن ترقی اردو، ہند۔1928
چہار چمن	آنند رام مخلص	(قلمی) انجمن ترقی اردو، علی گڑھ
چمنستان	آنند رام مخلص	(قلمی) انجمن ترقی اردو، علی گڑھ
حدیقۃ الاقالیم	قاضی مرتضیٰ حسین المعروف	
	بہ اللہ یار خاں عثمانی	نول کشور لکھنؤ، 1879

خلاصۃ التواریخ	مہاراجہ کلیان سنگھ	(قلمی) مملوکہ جناب قاضی عبدالودود صاحب، پٹنہ
خزانۂ عامرہ	میر غلام علی آزاد بلگرامی	نول کشور کانپور، 1871
خلاصۃ التواریخ	آنند رام مخلص	(قلمی)
خلاصۃ التواریخ	سبحان رائے بھنڈاری	جی اینڈ سنس پریس، دہلی 1918
خیر المجالس	حمید قلندر	مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی، علی گڑھ
خزینۃ الاصفیا	مولوی غلام سرور	مطبع نول کشور، کانپور 1320ھ
دریائے لطافت،	انشاء اللہ خاں انشا	
مرتبہ مولوی عبدالحق اردو	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی، مطبوعہ 1935	
دستور الفصاحت	احمد علی یکتا۔ مرتبہ مولوی امتیاز خاں عرشی	ہندستان پریس، رام پور 1943
رسالہ محمد شاہ و خاندوراں خاں	مصنف نامعلوم	روٹوگراف، علی گڑھ یونیورسٹی
رقعات مرزا قتیل	محمد حسن مرزا قتیل	نول کشور، کانپور 1881
رسالۂ نوبادہ	ملا منیر	قلمی سلیمان کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی
رسالۂ نالۂ درد	خواجہ میر درد	شاہ جہاں پریس، بھوپال
رسالۂ در تحسین اطعمہ در مطبخ محمد شاہ	مصنف نامعلوم	(قلمی) سلیمان کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی
ریاض السلاطین	غلام حسین سلیم	(انگریزی ترجمہ) کلکتہ 1902
روزنامچہ شاہ عالم ثانی	رائے ٹیک چند	(قلمی) خدابخش لائبریری، پٹنہ
رسالۂ درد دل	خواجہ میر درد	شاہجہانی پریس، بھوپال
سفرنامۂ آنند رام مخلص	آنند رام مخلص	مرتبہ ڈاکٹر سید اظہر علی ہندستانی پریس، رام پور 1946

سفینۂ ہندی	بھگوان داس ہندی	مرتبہ عطاءالرحمان کاکوی، پٹنہ 1958
سیر المتاخرین (فارسی)	غلام حسین خاں طباطبائی	نول کشور لکھنؤ 1867
سیر المتاخرین (اردو ترجمہ)	منشی گوکل پرشاد لکھنوی	نول کشور لکھنو، 1998 طبع دوم
سیر الاولیا میر خورد	مرتبہ چرنجی لال	محب ہند پریس، دہلی 1302ھ
سیر الاقطاب	الہدایہ چشتی	نول کشور، لکھنؤ 1913
سفینۂ خوشگو	بندرابن داس خوشگو	مرتبہ عطاءالرحمان کاکوی، پٹنہ 1958
سنگاسن بتیسی	بکرماجیت شاگرد خواجہ میر درد	(قلمی) منیر عالم کلیکشن علی گڑھ یونیورسٹی
سرگزشت نجیب الدولہ	سید نورالدین حسین خاں فخری	علی گڑھ 1924
شجرۃ الانوار	مولانا رحیم بخش	(قلمی) مملوکہ پروفیسر خلیق احمد نظامی (علی گڑھ)
شاہنامہ منور کلام	شیوداس لکھنوی	(قلمی) رضا لائبریری، رامپور
شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات	شاہ ولی اللہ مرتبہ خلیق احمد نظامی	(علی گڑھ اول ایڈیشن)
صحیفۂ اقبال	مصنف نامعلوم	روٹوگراف، علی گڑھ یونیورسٹی
ضمیمہ مقامات مظہری	شاہ عبدالغنی خلیفہ شاہ غلام علی	مطبع مجتبائی، دہلی 1309ھ
عماد السعادت	سید غلام علی خاں نقوی	مطبع نول کشور۔ لکھنؤ، 1897
عقد ثریا	غلام ہمدانی مصحفی مرتبہ مولوی عبدالحق	برقی پریس، دہلی 1934
عیار الشعرا	خوب چند ذکا	(قلمی) انجمن ترقی اردو، علی گڑھ
عبرت نامہ	مولوی خیر الدین الہ آبادی	(قلمی) رضا لائبریری، رام پور
فخر الطالبین	سید نورالدین حسینی فخری	(قلمی) مملوکہ پروفیسر خلیق احمد نظامی، علی گڑھ
فہرست خاندان مغلیہ	جانکی رام	(قلمی) عبدالسلام کلیکشن، علی گڑھ

کاشف الاستار	سید حمزہ	(قلمی) عبدالسلام کلیکشن، علی گڑھ
کلمات طیبات		مفید عام پریس، آگرہ 1914
کارنامہ عشق	آنند رام مخلص	(قلمی) انجمن ترقی اردو، علی گڑھ
کلمات الشعرا	مرزا محمد افضل سرخوش	مرتبہ صادق علی، لاہور 1942
گلستان رحمت	نواب مستجاب خاں	(قلمی) خدا بخش لائبریری، پٹنہ
گل عجائب	اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی	اورنگ آباد دکن، 1936
گلزار ابرار (اردو ترجمہ)	محمد غوثی شطاری	مطبوعہ
ماثر الامرا	نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں،	کلکتہ 1888
منتخب التواریخ	خافی خاں	مولوی کبیر الدین احمد، کلکتہ 1874
ماثر الکرام (سرو آزاد)	میر غلام علی آزاد بلگرامی	حیدر آباد، دکن 1913
ماثر الکرام	میر غلام علی آزاد بلگرامی	مفید عام پریس، آگرہ 1910
میزان دانش	آنند روپ	روٹوگراف علی گڑھ، یونیورسٹی
مفتاح التواریخ	تھامس ولیم بیل	نول کشور، کانپور 1867
ملفوظ رزاقی	نواب محمد خاں شاہ جہاں پوری،	مرتبہ سید شاہ غلام جیلانی رزاقی مجتبائی پریس، لکھنؤ
مراۃ الاوضاع	منشی لال ولد سیتل پرشاد	(قلمی) مملوکہ پروفیسر شیخ عبدالرشید سابق صدر شعبہ تاریخ علی گڑھ یونیورسٹی
مناقب فخریہ	غازی الدین خاں نظام الملک نظام	(قلمی) مملوکہ پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ
مخزن نکات	شیخ محمد قیام الدین قائم	مرتبہ مولوی عبدالحق اورنگ آباد دکن، 1929
مرات آفتاب نما	شاہ نواز خاں	(قلمی) لٹن فہرست فارسیہ، علی گڑھ، یونیورسٹی
مجمع النفائس	سراج الدین علی خاں آرزو	(قلمی) علی گڑھ، یونیورسٹی
مجمع الاخبار	ہر سکھ	(قلمی) فہرست لٹن اردو فارسیہ (2) علی گڑھ یونیورسٹی
مکتوبات	امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی	کانپور، نول کشور۔ 1891
مجموعہ نغز	میر قدرت اللہ قاسم	مرتبہ محمود شیرانی لاہور 1933

مراۃ الاشباہ	فخر الدین حسینی	مطبع سلطانی
ملفوظات	شاہ عبدالعزیز دہلوی	مجتبائی پریس میرٹھ 1314ھ
مرقع دہلی	درگاہ قلی خاں	تاج پریس حیدرآباد دکن
معمولات مظہری	مولوی نعیم اللہ بہرائچی	نظامی پریس کانپور 1275ھ
مقامات مظہری	شاہ غلام علی	مطبع مجتبائی دہلی 1309ھ
مناقب محبوبین	حاجی نجم الدین	رام پور 1289ھ
مجالس رنگین	سعادت یار خاں رنگین	مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ 1929 (پہلا اڈیشن)
مراۃ الاصطلاح	آنند رام مخلص	(قلمی) انجمن ترقی اردو، علی گڑھ
مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی		نول کشور، 1882
درکر خدائی	فرخ میر بادشاہ بادختر راجہ اجیت سنگھ	
نور القلوب	سید امجد علی خاں	(قلمی) رضا لائبریری، رام پور
نالۂ عندلیب	خواجہ محمد نصیر عندلیب	شاہ جہانی پریس بھوپال 1308ھ
نادر نامہ	ملا عبدالکریم کشمیری	(قلمی) عبدالسلام کلیکشن، علی گڑھ
نکات الشعرا	میر تقی میر	مرتبہ مولوی عبدالحق، دکن 1935ھ
وقائع عالم شاہی	کنور پریم کشور فراقی	مرتبہ مولوی امتیاز علی خاں عرشی ہندستانی پریس، رام پور 1949
وقائع بعد از وفات عالمگیر	مصنف نامعلوم	(قلمی) علی گڑھ، یونیورسٹی
واقعات اظفری	مرزا علی بخت بہادر محمد ظہیر الدین اظفری	اردو ترجمہ عبدالستار، دلوی اردو مدارس 1937
وقائع آنند رام مخلص	آنند رام مخلص	(قلمی) فہرست لٹن اردو فارسیہ (2) علی گڑھ یونیورسٹی
ہفت تماشا۔	مرزا محمد حسن قتیل	(اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد عمر) مکتبہ برہان، دہلی 1968

اُردو

اخبار الصنادید	مولوی نجم الغنی	مطبع نول کشور لکھنؤ، 1918
الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر (بریلی)	مرتبہ منظور نعمانی	بریلی 1359ھ
آب حیات	محمد حسین آزاد	لکھنؤ اڈیشن
آئین اکبری	ابوالفضل	ترجمہ مولوی محمد فدا علی طالب حیدرآباد 1938
آثار الصنادید سرسید احمد خاں	ترتیب وتدوین خالد نصیر ہاشمی	سنٹرل بک ڈپو اردو بازار دہلی 1965
اخبار الاخیار	عبدالحق محدث دہلوی	ترجمہ مولانا اقبال الدین احمد پاکستان 1963
اردو معلیٰ	غالب	مطبع نامی دہلی 1882
البلاغ المبین	شاہ ولی اللہ	مکتبہ شعیب حدیث منزل کراچی
انتخاب طلسم ہوش رُبا	محمد حسن عسکری	مکتبہ جدید، لاہور 1953
بزم آخر	منشی فیاض الدین	رحمانی پریس، دہلی 1920
تاریخ مہاراج گان ہند	مولوی نجم الغنی	ہمدم پریس، لکھنؤ 1927
تاریخ اودھ	مولوی نجم الغنی	نول کشور، لکھنؤ 1919
تاریخ مرہٹہ وابدالی	علی ابراہیم خاں	مطبع احمد، بنارس 1794
تحریر	مرتبہ مالک رام جلد (2) شمارہ (3) دہلی 1968	
تذکرہ گلشن ہند	مرزا علی لطف	مرتبہ مولوی عبدالحق، لاہور 1906
تاریخ مشائخ چشت	پروفیسر خلیق احمد نظامی	ندوۃ المصنفین، دہلی 1953
تذکرہ خوش معرکہ زیبا	سعادت خاں ناصر لکھنوی	(قلمی) منیر عالم کلیکشن علی گڑھ، یونیورسٹی
تاریخ بلدۂ نجیب آباد	نواب محمد سعید اللہ خاں	(قلمی) عبدالسلام کلیکشن علی گڑھ، یونیورسٹی

تذکرہ طبقات الشعرا ہند	مولوی کریم الدین	دہلی، 1848
تقویت الایمان	شاہ اسماعیل شہید	نول کشور، 1888
تاریخ عزیزی	غلام حلیم معروف بہ شاہ عبدالعزیز دہلوی بن مولانا صہبائی	(قلمی) سلیمان کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی
حیات حافظ رحمت خاں	سید الطاف علی بریلوی	پاکستان، 1963
حیات ولی	مولانا رحیم بخش	دہلی، 1319ھ
حجۃ اللہ البالغہ	شاہ ولی اللہ	ترجمہ خلیل احمد، لاہور 1897
دیوان مصحفی اول تا ہشتم		(قلمی) رضا لائبریری، رام پور و خدا بخش لائبریری، پٹنہ
دیوان جرأت	قلندر بخش جرأت	(قلمی) عبدالسلام کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی
دیوان شاہ	کمال الدین حسین	(قلمی) رضا لائبریری، رام پور
دیوان عیشی	میاں طالب علی عیشی	(قلمی) سلیمان کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی
دیوان حسرت	جعفر علی حسرت	(قلمی) رضا لائبریری، رام پور
دیوان زادہ	شاہ حاتم	(قلمی) عبدالسلام کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی
دیوان یقین	انعام اللہ خاں یقین	مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ مطبوعہ
دیوان مصحفی	غلام ہمدانی مصحفی	مرتبہ مولانا حسرت موہانی علی گڑھ 1905
دیوان قائم چاند پوری	شیخ محمد قیام الدین قائم	(قلمی) رضا لائبریری، رام پور
دیوان بیدار	مرزا محمدی بیدار دہلوی	(قلمی) رضا لائبریری رام پور
دیوان تاباں	میر عبدالحی تاباں	مرتبہ مولوی عبدالحق حیدر آباد، 1935
دیوان رشید	رشید الدین	(قلمی) سلیمان کلیکشن علی گڑھ یونیورسٹی
دلی کی چند عجیب ہستیاں	اشرف صبوحی دہلوی	دہلی، 1943

دیوان جوشش	میاں محمد روشن جوشش	مرتبہ قاضی عبدالودود دہلی، 1941
دہلی کا دبستان شاعری	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	طبع اول۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔ 1949
دیوان مہجور	صدرالدین مہجور	(قلمی) انجمن ترقی اردو، علی گڑھ
رسالہ تعزیہ داری	شاہ عبدالعزیز دہلوی	(قلمی) انجمن ترقی اردو، علی گڑھ
سلک گوہر	انشااللہ خاں انشا	مرتبہ مولوی امتیاز علی خاں عرشی، رام پور 1948
سوانحات سلاطین اودھ	سید کمال الدین حیدر	نول کشور، لکھنؤ 1896
سفینۃ الاولیا	داراشکوہ ترجمہ محمد علی لطفی	پاکستان طبع دوم 1961
شباب لکھنؤ	محمد احد علی	مطبوعہ، لکھنؤ 1899
فسانۂ آزاد	پنڈت رتن ناتھ سرشار	جلد اول، نول کشور لکھنؤ 1949
فسانۂ عجائب	مرزا رجب علی بیگ سرور	نول کشور، لکھنؤ 1964
فرہنگ زیورات	از سید محمد	(قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ
کلیات انشا	انشااللہ خاں انشا	نول کشور، لکھنؤ 1876
کلیات ہدایت	غلام حسین ہدایت	(قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ
کلیات سودا	محمد رفیع سودا	مرتبہ عبدالباری آسی نول کشور، لکھنؤ 1932
کلیات میر حسن	میر حسن دہلوی	(قلمی) لٹن لائبریری اردو، علی گڑھ
کلیات نظیر اکبرآبادی	مرتبہ عبدالباری آسی	لکھنؤ، 1941
کلیات میر	میر تقی میر	مرتبہ عبدالباری آسی، لکھنؤ 1941
کلیات جرأت	قلندر بخش جرأت	(قلمی) سبحان اللہ کلیکشن، علی گڑھ
کلیات قاسم	قدرت اللہ قاسم	(قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ
کلیات قائم	قائم چاند پوری	(قلمی) رضا لائبریری، رام پور

گزشتہ لکھنؤ	مولوی عبدالحلیم شرر	نسیم بک ڈپو لکھنؤ
لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	لاہور، 1955
میر کی آپ بیتی	میر تقی میر	ترجمہ ذکر میر، نثار احمد فاروقی مکتبہ برہان دہلی، 1957
مجموعہ مثنویات میر حسن	میر حسن دہلوی۔ مرتبہ عبدالباری آسی	نول کشور، لکھنؤ 1945
مثنوی واجد علی شاہ	نواب واجد علی شاہ	(قلمی) انجمن ترقی اردو، علی گڑھ
مسائلہ	سعادت یار خاں رنگین	(قلمی) سلیمان کلیکشن، علی گڑھ
مثنوی سراپائے عشق	میر غلام علی آزاد بلگرامی	سبحان اللہ کلیکشن، علی گڑھ یونیورسٹی
میر حسن دہلوی اور ان کا زمانہ	ڈاکٹر وحید قریشی	لاہور، 1959
میر تقی میر حیات اور شاعری	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	علی گڑھ، 1954
نصیحت المسلمین	مولوی خرم علی	(قلمی) انجمن ترقی اردو، علی گڑھ
نادرات شاہی	شاہ عالم ثانی	مرتبہ مولوی امتیاز علی خاں عرشی رام پور 1944
نقوش		لاہور، اکتوبر 1962-1961
وقائع عبدالقادر خانی	عبدالقادر خاں رام پوری	ترجمہ مولوی معین الدین افضل گڑھی پاکستان، 1960
وزیر نامہ	محمد امیر علی خاں	نظامی پریس کانپور 1876
وقائع سیر و سیاحت (اردو ترجمہ)	ڈاکٹر برنیر	مطبوعہ
واقعات دارالحکومت دہلی	منشی بشیر الدین احمد	آگرہ 1919
وصیت نامہ شاہ ولی اللہ	شاہ ولی اللہ	اردو ترجمہ جامعہ پریس قرول باغ۔ دہلی
ہندو تیوہاروں کی اصلیت	منشی رام پرشاد	لاہور
ہدایت المومنین	مولوی سید حسن قنوجی حسن	(قلمی) انجمن ترقی اردو، علی گڑھ
ہفت قلزم	منشی گوری شنکر	ستارہ ہند پریس، دہلی 1879

Memoirs of Delhi and Faizabad , Eng. Trans. of Tarikh-i-Farah Bakhsh, Mohd Faiz Bukhsh, by william Hoey. Allahabad:1888.

Farazer: The History of Nadir Shah, London 1742.

Lockhart, L.: Nadir Shah, London 1938.

Grose, J.H.: A voyage to the East Indies, London, 1766.

K.K. Datta: Aliverdi And His Times, Calcutta, 1963.

Srivastava, A.L. : First Two Nawabs of Oudh, Agra 1954(2 Edition)

George Forster: Journey from Bengal to England etc., London 1808.

Dow, Alxender: History of Hindostan, London.

George william Forrest: Selections from the Letters etc., Calcutta, 1890.

Polier, A.H.: Shah Alam IInd And His Court, calcutta, 1947.

Twinning, Thomas: Travels in India, A Hundred Years Ago. (1794) London, 1893.

Lumsdon: A Journey from Merut to London, London, 1822.

David'son,: Diary of Travels and Adventures in Upper Inida, London 1843.

William Hodges: Travels in India, during the Years, 1780,1781,1782,1783. London, 1793

Mrs Mir Hasan Ali : Observations on the Musalmans of India, Etc., London, 1832 Ist edition two vols. 2nd edition 1917, 1 volume.

James Forbes: Oriental Memoires, etc., London, 1814.

Ross, sir, E. Denison: Hindu-Muhammadan feasts and festivals etc., Calcutta, 1914.

Jamila Brij Bhusan: The Costumes and Textiles of India, Bombay, 1958.

Orlich, Capt.L.Von: Travels in Inida etc. London. 1845.

Sarkar, Jadunath: Fall of the Mughal Empire, (3rd-ed.)

Shatish Chand: Parties and Politics at the Mughal Court, Aligarh, 1959.

Ganda Singh: Ahmad Shah Durrani

William Franklin: The History of the reign of Shah Allum. London, 1738.

Smith, V.A.: Oxford History of India, Oxford, 1923.

Keaye: Rulers of India, Oxford. 1901.

Qanungo. K.R.: History of the Jats, Cacutta. 1969.

Spear, P.: Twilight of the Mughals, Delhi, 1969.

Vansittart, Henery: A Narrative of the Transaction, in Bengal etc, London, 1766.

Jafar Sharif: Qanun_e_Islam, London , 1921.

Della Valla Pietro: The Travels etc. Lonon,(n.d) (1623-24)

Mondelslo Robert: Voyags and Travels etc., (2nd Ed.) London, 1669.

Jamila Brij Bhushan: Indian Jewllery, Ornaments etc., Bombay .

Manucci: Storia Do Mogor or Mughal India(1653-1708) Calcutta. 1965 IV Vols.

Ovington, J.: Avôyage to Suret in the Year, 1689. London 1696.

Donaldson: The Shiite Religion' London.1933

Sarkar , Jadunath: Studies in Mughal India, calcutta. 1919.

Bland: Peirsian Game of Chess, London-1850.

Chopra, P.N. : Society and Culture in Mughal Age, Agra, 1955.

Stoddard: The New World of Islam, New York. 1921.

ISBN-978-81-7587-901-0

₹177/-

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025